

UNIVERSAL  
LIBRARY

**OU\_224456**

UNIVERSAL  
LIBRARY





**OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY**

Call No. 291, 12.0

Accession No. U. 1311

Author معارف

Title

31920

معارف  
جلد 4 نمبر 1

This book should be returned on or before the date last marked below.

---



جلد ششم  
رجسٹر نمبر ۱۰۷

# معارف

مجلس دارالافتاء کا ماہوار علمی رسالہ

مترجم

سید سلیمان ندوی

قیمت: پانچ روپیہ سالانہ مع محصول

مطبع معارف میں چھپکر  
دفتر دارالافتاء عظیم گڑھ سے شائع ہوا

# کتبخانہ دارالمنصفین عظیم گدہ

حمامہ شبلی نعمانی

سیرۃ النبی صلعم قسم اول مجلد معہ غیر مجلد معہ

سیرۃ النبی، مجلد دوم قسم اول معہ

ایضاً، قسم دوم معہ قسم سوم معہ

الفاروق، حضرت فاروق عظمیٰ کا لفظ و طرز حکومت

انقرضانی، امام غزالی کی سوانح عمری اور انکا فلسفہ

المامون، خلیفہ مامون الرشید عباسی کے حالات

شعر العجم حصہ اول، شاعری کی حقیقت فارسی

شاعری کا آغاز و قدما کا دور زیر طبع

ایضاً حصہ دوم شعرے عمدہ و عوسط

ایضاً حصہ سوم شعرے متاخرین

ایضاً حصہ چہارم فارسی شاعری پر دیوید

ایضاً حصہ پنجم قسم اول عجم حصہ دوم

مقالات شبلی پندرہ علمی و تاریخی مضامین کا مجموعہ

الاستقاء علی التمدن الاسلامی، جرجی زیدان کے

تمدن اسلامی پر عربی میں دیوید

تذکرہ خمس و بیانیہ خمسہ کے حالات اور انکی

شاعری، مائتہ و اربعہ شعرا عجم

مضامین عالمگیر، شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر پر

اعترافات اور انکے جوابات

مکاتیب شبلی، مولانا مہموم کے خطوط کا

مجموعہ جو علمی، قومی، ادبی، اخلاقی

معلومات کا خزانہ حصہ اول

ایضاً، جلد دوم

دستہ گل، مولانا کی فارسی غزلوں کا مجموعہ

برگ گل، مولانا کے آخری زمانہ کے فارسی

قصائد اور غزلوں کا مجموعہ

قصیدہ ام تر، ام تر کے اجلاس ندوۃ العلماء

مولانا نے جو فارسی قصیدے لکھے

طبع رنگین و انٹلی

مجموعہ کلام شبلی اردو

مشنوی صبح امید اردو

نوحہ اسحاق، مولانا کا اپنے بھائی کی وفات پر

مچرورہ و مرثیہ

مولانا حمید الدین صاحب بی بی

تفسیر سورہ تحریم جدید طرز پر عربی میں قرآن مجید کی تفسیر

تفسیر سورہ قیامہ

تفسیر سورہ وائش

تفسیر سورہ الکافرون

تفسیر سورہ العصر

اسباق النحوی سہل طرز پر عربی گرامر اردو

دیوان حمید مولانا کا فارسی دیوان مع تصویر

خرونامہ منظوم خالص فارسی زبان میں شمال سیما کا ترجمہ

تمتہ الاعراب عربی کی نحو جدید اردو نظم میں

دیوان انصاف

ہندوستان کے ایہ نازا استاد دہسے لن فیض کن

سہا زبوری کا عربی کلام صفحہ ۸۲

بدیمہ گوئی، غزل، ہریم گو کے پچھلے حالات تحریر

جلد ششم      ماہ شوال ۱۳۸۸ھ مطابق ماہ جولائی ۱۹۶۷ء      عدد اول

### مضامین

۱۱ - ۲	شذرات
۲۸ - ۱۲	قصہ بکاؤلی اور مسائل تصوف مولوی عبدالماجد علی اے،
۳۸ - ۲۹	حقیقت علم مولوی محمد یونس فرنگی علی
۵۰ - ۳۹	خراج سلطنت اسلام پروفیسر جمیل الرحمن اے، عثمانیہ یونیورسٹی
۵۶ - ۵۱	دین حنیف مولانا عبدالسلام ندوی
۶۱ - ۵۷	بہاء اللہ (از ہندوستان ریلوے)
۶۵ - ۶۲	فرقہ پریزیہ (از پانیر)
۶۸ - ۶۵	مذہب بودھ اور عالم جنات (از تیا سوفٹ)
۷۴ - ۶۹	اخبار علیہ
۷۸ - ۷۷	ادبیات اکبر و نواب
۸۰ - ۷۹	مطبوعات جدیدہ

### جدید مطبوعات

روح الاجتماع، یعنی ڈاکٹری بان کی کتاب جماعت کے انسانی کے اصول نفیہ کا ترجمہ، از مولانا محمد یونس انصاری فرنگی علی، قیمت دو روپیہ،

”میخبر“

## تَشْدِیْک

فن تفسیر کو علوم اسلامیہ میں جو اہمیت حاصل ہے، اسکا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس فن میں جو قدر کتنا بہن لکھی گئیں، کسی فن میں بہنیں لکھی گئیں، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ آج یہی فن تمام فنون سے زیادہ نادار ہے، کیونکہ قدامت کی تصنیفات جو در حقیقت اس فن کی روح و روانہ ہیں سرے سے ناپید ہیں، بہنا تنک کہ چوتھی صدی کی ایک تفسیر بھی موجود ہیں ہے، اور زمانہ مابعد کا سرمایہ جو بظاہر ایک دفتر بے پایان نظر آتا ہے، بقول مولانا شبلی مرحوم ایک ہی نعمت ہے جو مختلف ساز و ن سے ادا ہوتا ہے، اس بنا پر سخت ضرورت تھی کہ اس فن کے متعلق قدامت کی تصنیفات ڈھونڈ ڈھونڈ کر پیدا کیجا بیٹن اور انکی طبع و اشاعت کا سامان بہم پہنچایا جائے

مفسرین کی جماعت میں ابو مسلم صفہانی چوتھی صدی کا مشہور راویب اور مفسر گذرا ہے جس نے عقلی اصول کے موافق چودہ جلدوں میں ایک تفسیر لکھی تھی، اور اسلام میں عقلی مذاق پر جو تفسیریں لکھی گئی ہیں، ان میں سب سے بڑی اور سب سے پہلی اسی کی تفسیر تھی، اس لئے امام رازی کے زمانہ سے پہلے وہی تفسیر کبیر کے نام سے پکاری جاتی تھی، یہ تفسیر آج اگرچہ بالکل ناپید ہے، لیکن امام رازی کے زمانہ تک موجود تھی، اور امام موصوف نے اس سے اپنی تفسیر میں اکثر فائدہ اٹھایا ہے، اور اسکے حوالہ سے ابو مسلم کے بہت سے اقوال نقل کئے ہیں جو انکی تفسیر میں متفرق طور پر ملتے ہیں، ہماری دلی خواہش یہ تھی کہ یہ تمام اقوال ایک رسالہ کی

صورت میں بجا کر دیئے جائیں، اور اسکو چھاپکر دوبارہ دنیا کے سامنے پیش کیا جائے،

خوشی کی بات ہے کہ رفقائے دارالصفین میں مولوی محمد سعید صاحب انصاری نے اس اہم کام کو اپنے ذمہ لیا، اور امام رازی کی تفسیر کو جو تقریباً دس ہزار صفحات کی کتاب ہے چار مرتبہ حرفاً حرفاً پڑھکر ابوسلم کے تمام اقوال جمع کئے، اور ان کو ایک سالے کی صورت میں مرتب کیا، جس سے اس قدیم تفسیر کا نہایت ضروری حصہ ہمارے سامنے آگیا ہے، یہ کام اگرچہ ۱۹۱۶ء میں مکمل ہو چکا تھا، تاہم اسکی طباعت کا اب سامان ہوا ہے، چنانچہ کئی مہینہ سے یہ کتاب البلاغ پریس کلکتہ میں نہایت اہتمام کے ساتھ چھپ رہی ہے، اس مہینہ میں اسکی پروف آخر تک آچکے ہیں، اور امید ہے کہ آئندہ ماہ تک اسکی چھپائی کا کام ختم ہو جائیگا، اور اسوقت ہم علمی دنیا کے سامنے اس کارنامہ کو پیش کرینگے تو سب کو معلوم ہوگا کہ

ہنوز در کفم از عمر رفتہ تارے بہت بدتم از سر زلف تو یادگارے بہت

مولانا سید سلیمان کے جو مکتوبات ہر ہفتہ بعض اجاب کے نام موصول ہوتے رہتے ہیں انکا ایک حصہ اخبارات میں شائع ہوتا رہتا ہے، پھر بھی بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں جنکا ذکر معارف ہی کے صفحات میں ہونا چاہیئے، مولانا پیرس سے اپنے ایک تازہ عنایت نامہ میں فرماتے ہیں۔

”یہاں کی دو انجمنوں میں آج جانا ہوا، ایک انجمن حقوق انسانیت، دوسری انجمن سیر عالم، یہ دوسری انجمن شہر سے باہر ایک سنسان باغ کے سایہ میں واقع ہے، مختلف کچھ درخت میں مختلف عمارتیں ہیں، اس میں ایک فوٹو گرافی اور ایک سینما کی عمارت ہے، مختصر کتب خانہ ہے، ہمارے فوٹو یہاں لئے گئے، سینما میں میدان جنگ کے مختلف سان ادہ

دہلی و آگرہ کے عجائبات تعمیری دکھائے گئے، یہ انجن اپنے ممبروں کو دنیا کے مختلف حصوں میں سیر کے لئے مناظر کے فوٹو لینے کے لئے بھیجتی ہے، اسکو دیکھ کر ہکا بپنا دار المصنفین یاد آگیا، وہی درختوں کے جنگل اور وہی خاموشی و سکون۔“

پیرس جی سے ایک دوسرے عنایت نامہ میں تحریر ہے :-

”ہمان اگر مین نے چند مضامین لکھے، مسئلہ خلافت پر جو مضامین لکھے، وہ مسلم آؤٹ لک مین چھے، ایک مضمون ”اسلام اور دنیا“ کے عنوان سے مؤثر ضامنہ نوا سٹیشن لندن مین چھپا ہوتا، مین نے اسکا جواب لکھا، اور وہ اس ہفتہ میں شائع ہوا، بریٹن اینڈ انڈیا، ایک بیار سالہ ایک انگریز خاتون کی ایڈیٹری مین نکلا ہے، اپریل نمبر میں پردہ اور موجودہ نسوئیت ہند پر ایک مضمون نکلا ہوتا، اسکا جواب لکھ کر اسکو بھیج دیا ہے، ایک جلسہ مین مین نے تقریر کی تھی وہ بھی اس نے لیلی تھی کہ رسالہ مین شائع کر دنگی، پیرس مین مین نے عربی مین جو تقریر کی تھی وہ یونس کے اخبار الصواب مین شائع ہوئی ہے، میسولی بان سے ملے کا ارادہ ہے اور خصوصاً اردو کے پروفیسر سے، کیمبرج کی مجلس طلبہ ہند مین مین نے اردو یا ہندوستانی زبان کی ضرورت پر تقریر کی تھی۔“

ایک تیسرے مکتوب مین جو لندن سے موصول ہوا ہے، تحریر ہے :-

”بھلی ڈاک مین انڈیا آفس لائبریری کی آرڈر کتابوں پر مضمون بھیجا ہے پنچا ہنگامین قلمی کتابوں کا تذکرہ مین ہے، کیونکہ اسکی کوئی فہرست مرتب نہیں ہے، تاہم مین پروفیسر اسٹوری کے ذریعہ سے (جو بیان اب اسسٹنٹ لائبریرین مین) پروفیسر بلوہمارٹ سے



ملا جو قلی اردو کتابوں کے انچارج ہیں، دیکھ کر سخت تعجب ہوا، بہت بڑھے آدمی، اسے کم عمر نہنگی، بالکل سن سفید اور پیری سے خمیدہ پشت ہیں اسلئے میں ہندوستان گئے تھے اردو عمدہ اور صحیح مخارج کے ساتھ بولتے ہیں، برٹش میوزیم میں بھی اردو کا صحنہ انہیں کے متعلق ہے، انھوں نے انڈیا آفس کی اردو قلی کتابوں کا مسودہ فرست اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا مجھے دیا، لیکن یہ فرست بالکل بے ترتیب ہے، اس سے کسی چیز کا نکالنا مشکل نظر آیا، بہر حال اتنا معلوم ہوا کہ اردو کی کل تین سو قلی کتابیں بیان ہیں، یہ زیادہ تر دلی سے ہاتھ آئی ہیں، سعادت علی خان رنگین کی دس بارہ تصنیفات ہیں، ہندی کی قلی کتابیں (سنو) میں، ہندی بھی پروفیسر بلوہارٹ ہی سے متعلق ہے، پروفیسر موصوف اردو کے بہت مداح ہیں، اردو کو ہندوستان میں ذریعہ تعلیم بنانے کے موید ہیں، ہندی کے مقابلہ میں اردو کو ہندوستان میں زیادہ پھیلنے والی قوت تسلیم کرتے ہیں۔“

سعادت یار خان رنگین، خوش قسمت تھے، کہ انکی متعدد تصانیف کے مسودات کو انڈیا آفس کے کتب خانہ میں جگہ ملی، لیکن کیا رنگین کے بعد اردو میں کوئی اور مصنف یا شاعر اس پایہ کا نہیں ہوا ہے؟ کیا حالی و شبلی، اکبر و اقبال کا مرتبہ رنگین سے بھی فروتر نہ تھا گیا ہے؟ اردو کا افلاس و ناداری مسلم ہے، لیکن بابرین ہمہ جہد اللہ رنگین سے بہتر تو انکے بعد صد شعراء و مصنفین پیدا ہو چکے ہیں، یہ دوسری بات ہے کہ ادسے و گلکرسٹ، ہارلاند و لائٹیز، ہیمر و فیلن کے ہم قوموں سے ذوق علم و شوق ادب رخصت ہو گیا ہے، انوار شمع طور آج بھی بدستور ہیں، البتہ سینہ کلیم شاید تنہا سے دیدار سے بے نور ہو چکا ہے،

پونہ کی زنانہ یونیورسٹی کا تذکرہ اس سے پیشتر ان صفحات میں آچکا ہے، حال میں بمبئی کے مشہور مہاجن سروٹل داس تیسکرے نے اسکو جو عطیہ عنایت کیا ہے اسکی تعداد پندرہ لاکھ ہے، اس شاہانہ عطیہ کو ملا کر یونیورسٹی کے پاس اسقدر مجموعی سرمایہ ہو گیا ہے، جسکے منافع کی آمدنی ستر ہزار سالانہ ہوگی! یونیورسٹی کا آئینہ مرکز بمبئی قرار پایا ہے، اور پونہ بمبئی و احمد آباد وغیرہ میں متعدد کالج اور اسکول کہلے جا رہے ہیں، جو سب کے سب اسی یونیورسٹی سے ملحق ہونگے! ارکان مجلس انتظامیہ نے تجویز کیا ہے کہ کل مجوزہ مصارف کے لئے کم از کم ایک لاکھ سالانہ یعنی موجودہ آمدنی سے تیس ہزار سالانہ زائد آمدنی کی ضرورت ہوگی، یہ رقم بظاہر بہت بڑی معلوم ہوتی ہے، لیکن جس قوم کا ایک ایک فرد اسقدر اوالو العزم ہو، اسکے لئے اتنی رقم کی فراہمی چند روز کا سوال ہے، یہ سوال اس قوم کے سامنے نہیں، جسکے پاس لے دیکے لکھنؤ و علی گڑھ کے کل دو مدارس نسوان ہیں، اور ان میں بھی پہلے کی حالت نیم خفۃ اور دوسرے کی نیم مردہ ہے،

ہندو یونیورسٹی کی تحریک سلمہ سے شروع ہوئی، اور سلمہ میں یونیورسٹی قائم ہوئی، بیسویں یونیورسٹی کا تعین سلمہ میں پیدا ہوا، اور سلمہ سے باضابطہ تعلیم شروع گئی، پٹنہ یونیورسٹی کی تجویز کل ہوئی اور آج کل ہونے لگا، دہاکہ یونیورسٹی کا نقشہ چند سال آدھرتیار ہوا، اور اسوقت تک مسودہ قانون منظور ہو چکا، لکھنؤ یونیورسٹی کا خواب شب کو دیکھا تھا اور صبح ہوتے ہی اسکی تعبیر پوری ہونے لگی ہے، غرض اس دس برس کے عرصہ میں متعدد سرکاری و غیر سرکاری یونیورسٹیاں عدم محض سے وجود میں آچکی ہیں، لیکن اس شرف مخصوص میں مسلم یونیورسٹی کا کوئی شریک نہیں، کہ گوا اسکی تجویز سب سے قدیم تر ہے، اگر اسکا وجود سب سے زیادہ ضروری ہے

اور گوسکا غیر مقدم انتہائی جوش و خروش کے ساتھ ہوا تھا تاہم عملی حیثیت سے آج بھی یہ تحریک ہٹیک اسی جگہ پر ہے، جہاں ہمیشہ تھی! دوسروں کو اگر اپنی حرکت و رفتار عمل پر ناز ہے تو ہوا کرے، لیکن اس فخر سے کون محروم کر سکتا ہے کہ جو دوسکون میں ہمارا مرتبہ سب سے بلند ہے۔ ۹۔

حاشا اس سے یہ مقصود نہیں کہ حکومت جن شرائط پر یونیورسٹی دے رہی تھی، انہیں کو منظور کر لینا چاہیے، یا خواجہ اپنی یونیورسٹی کو سرکاری ہی رکھنا چاہیے، لیکن آخر کوئی قدم تو آگے بڑھنا چاہیے، آزادانہ و خوددارانہ شرائط پر خواہش حصول یونیورسٹی کے یہ معنی تو نہیں ہو سکتے کہ اسے آڑ بنا کر دست و پا شکستہ اشخاص کی طرح اپنے تئیں بالکل معطل بنا لیا جائے دوسرے قافلے جو ہم سے کہیں بعد کو روانہ ہوئے تھے وہ ہماری آنکھوں کے سامنے پوری تیز روی کے ساتھ گزرتے ہوئے چلے گئے، لیکن آج تک

ہم محض نالہ جرس کا روانہ رہے

بعد اود و دمشق، قرطبہ و غرناطہ کو علمی مراکز بنانے والے اسلاف نے کیا ساری دماغ سوزی و جگر کاوی اسی لئے کی تھی کہ اپنے اخلاف کو ہمیشہ کے لئے علمی و تعلیمی جدوجہد کے فرض سے سبکدوش کر جائیں۔ ۹۔

کلکتہ یونیورسٹی نے اپنے ہان (پوسٹ گریجویٹ کلاسز) بی، اے پاس طلبہ کے لئے اس سال حالیہ کا جو نصاب درس رکھا ہے، اس میں اردو کو کئی سال سے داخل ہے، حال میں بی یونیورسٹی نے بھی اپنے ہان بی، اے اور ایم اے کی جماعتوں میں ایک مضمون اردو زبان کا

رکھنا طے کیا ہے، اور منتہی طلبہ کے لئے ایک اردو پکھار کا تقرر منظور کیا ہے، پنجاب یونیورسٹی سالہا سال سے جو خدمت اردو زبان و ادب سے متعلق انجام دی رہی ہے اسکا اعتراف بھی سب پر واجب ہے، اور تو اور مدراس یونیورسٹی تک اردو کی جانب سے بے التفات ہینن، البتہ سرکاری یونیورسٹیوں میں سے اگر کسی کا طرز عمل اردو سے متعلق سرورہی دے اعتنائی کا مجسمہ ہے تو وہ الہ آباد یونیورسٹی ہے جو اردو کے مرکز عملی میں واقع ہے اسکا بکخانہ اردو کتابوں سے بیکسر خالی ہے، اسکے اعلیٰ نصاب درس میں اردو کی کوئی گنجائش نہیں، اسکی فہرست اساتذہ میں تعلیم اردو کے لئے کسی ہستی کا وجود ہینن، اسکے خزانہ عامرہ میں اردو ارباب قلم کی اعانت کی کوئی مدہین، اسکا نظام امتحانات، اردو کے عنوان سے نا آشنا، اسکی تالیف اردو کی قدر دانی کے ذکر سے خاموش ہے، اور اسکا نظام کار اردو کے واجبی حقوق کے اعتراف سے نامانوس ہے، جو خطہ اردو زبان کا سب سے بڑا مرکز ہے، جہان کے بچہ بچہ کی مادری زبان اردو ہے، جسکے حلقہ میں لکھنؤ، اگرہ، فیض آباد شامل ہیں، کیا اس خطہ کے خدایان تعلیم کا اپنے صوبہ کی زبان کے ساتھ یہی برتاؤ ہونا چاہیے تھا؟ دنیا کی تعلیمی تالیف میں یہ واقعہ آپ اپنی نظیر رسیدگا۔

خیر الہ آباد یونیورسٹی نے تو اس معاملہ میں اپنے فرائض کو جقدر یاد رکھا اور جیسی کچھ داد دیانت دی ہے، اسکا فیصلہ تالیف پر چھوڑا جاسکتا ہے، لیکن کیا لکھنؤ یونیورسٹی میں بھی یہ ظلم روا رکھا جائیگا؟ اردو زبان کا حق تو یہ ہے کہ اب اسے لکھنؤ یونیورسٹی میں بطور آلہ تعلیم کے رکھا جائے، اور جملہ علوم و فنون کی تعلیم بجائے انگریزی کے اردو ہی کے ذریعہ سے ہو لیکن اس تجویز پر عملدرآمد اگر سرورست حال ہے تو کم از کم اتنا تو بہر حال ہونا چاہیے کہ

اردو کو عربی، سنسکرت، و فارسی کی طرح یونیورسٹی کے نصابِ افسانہ میں جگہ دیجائے، اردو زبان اپنے موجودہ سرمایہٴ ادب کے لحاظ سے ہرگز اس سے زیادہ مفلس نہیں، جتنی انگریزی زبان آگسٹ ڈوگمبرج یونیورسٹیوں کے قیام کے وقت تھی جس زبان میں میروڈ و غالب و مومن، انیس و میر، اکبر و انبال، سرسید و چراغ علی، آزاد و نذیر احمد، عالی و شبلی کے پایہ کے شعراء و مصنفین پیدا ہو چکے ہوں اور جس کے خزانہٴ ادب میں عربی و فارسی، سنسکرت و انگریزی کے بہترین جواہر ریزے منتقل ہو چکے ہوں، اسے لٹریچر کے اعلیٰ اصناف سے محروم سمجھنا خود اپنی نادانیت کا ثبوت دینا ہے،

گاندھی صاحب کے حسبِ ہدایت اور الہ آباد کی ہندی سمیٹن کی زیر نگرانی اس میں جو کوششیں ہندی زبان کی ترویج و اشاعت کے لئے دو برس سے جاری ہیں وہ ایک بڑی عذتک بار آور ہو چکی ہیں، اور اس مشن کو پانچ سال تک اور جاری رکھنے کے لئے حال میں بمبئی کے ماڈراریون نے پچاس ہزار کا سرمایہ بھی فراہم کر دیا ہے۔ ستر گاندھی فرماتے ہیں کہ زبان تو ہندی و اردو دونوں ایک ہی ہیں، فرق صرف رسم الخط کا ہے، اور انہیں تو یہ ہے کہ مسلمان ایک بڑی آبادی کی سہولت کے خیال سے اپنے اوپر تھوڑی سی تکلیف گوارا کر کے ناگری رسم الخط بہ مسرت تمام سیکھ لیں گے، گاندھی صاحب کا خلوص نیت قطعاً ہر قسم کے شک و شبہ سے ارفع ہے، لیکن ان کے اس مشورہ پر مسلمان غالب کی زبان میں صرف اتنا عرض کر دینا چاہتے ہیں ۔

عشق و مردوری عشرت گزشتہ کیا ہو  
ہو سکھ سلیم کو نائی فرما دینیں

پچھلے نمبر میں اخبار علیہ کے زیر عنوان ایک جدید آلہ کی اختراع کا حال درج ہوا ہے جسکے ذریعہ سے ملزمین کو جھوٹ بولنے کا موقع نہ ملیگا، اسلئے کہ جب وہ اپنے دیکھے ہوئے کسی واقعہ سے انکار کرینگے تو فوراً ان کا جھوٹ اس آلہ کی وساطت سے کھل جائیگا، یہ آلہ چونکہ اپنی نوعیت میں عجیب و غریب ہے، اسلئے بعض ناظرین معارف اس خبر کو باور نہ کر کے ہم سے اسکی تصدیق چاہتے ہیں، ہم اسکے جواب میں اور کیا عرض کر سکتے ہیں کہ انکی طرح ہم بھی اس آلہ کی زیارت سے مشرف نہیں ہوئے ہیں، اللہ اعز جماسے عدالت کے سامنے لائے ہوئے ملزموں کے اسکا تجربہ ایوان وزارت کے کرسی نشینوں، سفارت خانوں کے عہدیداروں میدان سیاست کے پہلوانوں، اخبارات کے مقالہ نگاروں، اور قومی لیڈروں پر کامیاب ثابت ہو تو بیشک یہ ایک ایسا معجزہ ہوگا جسپر سب کو ایمان لے آنا پڑیگا،

مسلمان اپنے مذہب سے جس تشنگان کا اظہار کرتے ہیں، اسکا تقاضا یہ تھا کہ یورپ میں تبلیغ اسلام کے لئے یورپین زبانوں میں قرآن مجید کے متعدد تراجم مستند و ذلیل علم مسلمان ارباب قلم کی طرف سے شائع ہو چکے ہوتے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ اب تک کسی مغربی زبان میں ایک بھی صحیح ترجمہ قرآن موجود نہیں، انگریزی میں متعدد تراجم سبیل، پامر، راول، وغیرہ یورپین اشخاص کے موجود ہیں، لیکن انہیں دیکھ کر یورپ کی عربی دانی سے حیرت کے ساتھ بدگمانی ہوتی ہے، تعصب و عداوت کی رنگ آمیزیوں سے قطع نظر کہ قرآن کی معمولی عبارتوں کے کچھ میں ان حضرات سے جو حیرت انگیز غلطیاں واقع ہوئی ہیں، ان کا اندازہ بغیر اسکے جو ناممکن ہے کہ ان ترجموں کو قرآن کے پہلو پہلو رکھ کر پڑھا جائے، اس سفر و کیمبرج کے علماء و شرفیات کی یہ غلطیاں اکثر اس درجہ کی ہیں جو مبتدی عربی خوانوں سے بھی نہیں ہو سکتیں

مولوی محمد علی (احمدی) ایم، اسے کانگریزی ترجمہ بعض حیثیات سے نسبتاً بہتر ہے پھر بھی سو تفہیم کی بہ کثرت مثالوں سے خالی نہیں، لیکن آج کسین اتنی ہمت ہو جو مسلمانوں کو ضروری "دائم" مشاغل سے ہٹا کر اس ضرورت کی جانب منوجہ کر سکے؟

مستند انگریزی ترجمہ قرآن کی جب قدر ضرورت یورپ میں تبلیغ اسلام کے لئے ہے، اسقدر خود ہندوستان کے ان علاقوں میں ہے، جہاں مادری زبان اردو نہیں، ان آبادیوں تک پیام حق پہنچانے کا بہترین ذریعہ تو یہ تھا کہ بنگالی، مرہٹی، گجراتی، ہندی، تامل، تملگولی وغیرہ ہندوستان کی ہر زبان میں اسکا صحیح ترجمہ موجود ہوتا، لیکن اگر سروسٹ یہ ممکن نہیں تو اس مقصد کو ایک حد تک انگریزی ترجمہ کی مدد سے پورا کیا جاسکتا ہے، لیکن موجودہ صورت میں غیر عربی دان وغیرہ اردو دان قوموں کو چار و ناچار انگریزی کے غلط و ناقص تراجم ہی پر اعتماد کرنا ہوتا ہے اور رقیب کے ذریعہ سے پیام رسائی کے جو نتائج ہو سکتے ہیں وہ کسی پر مخفی نہیں،

گزشتہ نمبر میں ہم ایک کرم فرما کی علی فیاضی کا شکریہ ادا کر چکے ہیں لیکن اس سلسلہ میں ہمیں ایک اور عنایت فرما کا بھی شکریہ ادا کرنا ہے، چودہری محمد علی صاحب راولی (ادوہ) کے ایک علم دوست رئیس ہیں، جنھوں نے دارالمصنفین کو مسطور میںسٹریٹ آف دی درلٹ (موضوعین کی تاریخ عالم) کی مکمل پچیس جلدیں عنایت کی ہیں، دارالمصنفین کا انگریزی کتب خانہ ابھی بالکل ابتدائی حالت میں ہے اسلئے یہ عطیہ خصوصیت کے ساتھ قابل شکریہ ہے، اس کتاب کو یورپ کے شاہیہ علماء و تاج کی ایک جماعت نے اپنی مشترکہ محنت سے ۱۲، ۱۳ سال ہوئے تالیف کیا تھا اور اگرچہ اسکا میاں تحقیق مسطور ہند نہیں جسکی تفسیر کجائی تھی پھر بھی لحاظ جامعیت کتاب قابل قدر ہے۔

# مقالات

## قصہ بکاؤلی اور سایل تصوف

کیلنگ نے جو دور جدید کا ایک مشہور انگریز ادیب ہے، عرصہ ہوا ایک نظم کی مٹی جس کا ایک شعریہ تھا کہ

”مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب، دونوں کبھی متحد نہیں ہو سکتے۔“

کیلنگ اس وقت لاہور کے ایگلو انڈین روزنامہ سول اینڈ ملٹری گزٹ کے حلقہ ادارت میں تاجو ہندوستانیوں سے تعصب رکھنے میں مشہور ہے، اور خود اس نظم کا مقصد بھی مغرب کی افضلیت ثابت کرنا تھا، اسلئے اہل مشرق کو قدرۃً اسکی اشاعت سے سخت اشتغال پیدا ہوا، اور ہندوستان میں کئی انگریزی نظمیں اس نظم کے جواب میں لکھی گئیں،

لیکن کیا جو خیال اس شعر میں ادا کیا گیا ہے، اسکی واقعیت سے انکار ممکن ہے؟ کیا یہ واقعہ نہیں کہ مشرق مشرق ہے، اور مغرب مغرب، اور دونوں میں ”بعد المشرقین“ حایل ہے، فضایل و ردایل کا سوال الگ ہے، لیکن اس حقیقت سے کسکو انکار ہو سکتا ہے کہ صورت و شکل، رنگ روپ، قد و قامت، زبان و لہجہ، رسم و رواج، اخلاق و معاشرت، وضع و لباس مذہب و عقاید، غرض ایک ایک چیز میں مشرقی، مغربی سے الگ ہے؟

ان میں سے بعض ایسے اختلافات ہیں جو بالکل قدرتی و طبعی ہیں، اور انسانی تصرف و اختیار سے خارج ہیں، مثلاً صورت، رنگ اور زبان کی خصوصیات، لیکن اکثر اختلافات ایسے ہیں جو اس حد تک انسانی ارادہ کی دسترس سے باہر نہیں بلکہ جنہیں انسان اپنی پسند



خواہش سے اختیار کرتا رہتا ہے مثلاً قوانین حکومت یا آداب معاشرت،

اس آخری شق کے، یا اختیاری، اختلافات تعداد میں بہت زیادہ ہیں، لباس میں ہمارے ان کے کوئی مناسبت نہیں، طریقہ تعلیم میں ہمارے ان کے سخت اختلاف ہے، ہمارے ہاں کے مراسم نکاح پر وہ ہنستے ہیں، ہکو ان کے ہاں کی "کورٹ شپ" ایک عجیب بات معلوم ہوتی ہے، ہماری معاشری زندگی کی روح خاندان مشترک ہے، ان کے نزدیک یہ ایک احمقانہ دستور ہے، مردوں کے فاتحہ کا رواج ہندوؤں اور مسلمانوں میں عام ہے، اہل مغرب کی نظر میں اس سے بڑھکر ضعیف الاعتقادی کی کوئی مثال نہیں، غرض اس طرح کے صد ہا بلکہ ہزار ہا اختلافات پائے جاتے ہیں، اور گوہر دور میں انکے جزئیات بدلتے رہتے ہیں، تاہم اصلاً دونوں کے حدود بجائے خود قائم رہتے ہیں، موجودہ دور نے بیشک ان امتیازات کو دور کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن اس کوشش کا اثر اتنا بہت ہی محدود رہا ہے، ہندوستان کی آبادی کا شاید ایک یا دو فیصد ہی حصہ ایسا ہے جو اس وقت تک انگریزی معاشرت اختیار کر سکا ہے، اور مغرب میں تو جتنے انتخابی مشرقیات سے متاثر ہوئے ہیں، ان کا شمار انگلوں پر ہو سکتا ہے،

ان تمام امتیازات و اختلافات کو اگر کسی بڑے اصول کی ماتحتی میں لانا چاہیں تو صرف دو الفاظ کافی ہونگے، روحانیت و مادیت، روحانیت کا گہوارہ مشرق ہے، اور مادیت کا مجاد و امن مغرب ہے، ریل اور تار برقی، ہوائی جہاز اور مشین گن مغرب کے اختراعات ہیں، مذہب عالم مشرق کے پیداوار ہیں، خود حضرت مسیح کا جبکہ خدا ہونے پر سارا مغرب متفق اللفظ ہے، (گو عملاً وہ انہیں خدا کیا معمولی انسان سے بھی فروتر سمجھتا ہے) مولود نشاء بھی مشرق تھا، مغرب کو کپلر و نیوٹن، مارکونی و ایڈلین، پاسیورڈ و دارون پرناز ہے، جنوں نے علوم مادی کے خزانوں کی گنجیان ایک ایک کے ہاتھ میں دیدیں مشرق انکے

مقابلہ میں کرشن، گوتم بدھ، کنفو شس، وزر تشت، رودی و جیلانی کے نام پیش کرتا ہے، جو اقلیم باطن کے غیر فانی تاجدار ہوئے ہیں، مغرب اپنے سب سے زیادہ قیمتی مقبوضات اپنی یونیورسٹیوں اور کالجوں، کتب خانوں اور عجائب خانوں، تماشگا ہوں اور ناولنگا ہوں کو بھٹاتا ہی مشرق اپنی خانقاہوں اور درگاہوں، مندر دھن اور شوالوں، عبادت گاہوں اور زیارت گاہوں پر جان دینے کو تیار رہتا ہے،

مشرق و مغرب کا یہ اصولی فرق، علم و فن، اخلاق و سیاست، تمدن و معاشرت، تعلیم و تربیت، غرض زندگی کے چھوٹے بڑے ہر شعبہ میں نظر آتا ہے، یہاں تک کہ جو چیزیں بظاہر دونوں میں مشترک معلوم ہوتی ہیں، بخور دیکھا جائے تو ان میں بھی یہی امتیاز قائم ملے گا، اور ایسی ایک مثال پر اس وقت نظر کرنا ہے،

اصناف ادب، میں افسانہ ایک ایسی چیز ہے جسکے متعلق پہلا فیاس یہ ہوتا ہے کہ مشرق و مغرب میں کوئی امتیاز نہ ہوگا، کہا بیوں سے جو دلچسپی یہاں کے بچوں کو ہوتی ہے، وہی وہاں کے بچوں کو بھی ہوتی ہے، حسن و عشق کے تذکرے جیسے ہمارے نوجوانوں کو مرغوب ہیں ویسے ہی ان کے ہاں بھی ہیں، غم و مسرت، لذت و الم، درد و حسرت کے جذبات جیسے ہم میں ہوتے ہیں ویسے ہی ان میں بھی ہوتے ہیں، لیکن با این ہمہ مشرق و مغرب کے افسانوں میں آسمان و زمین کا فرق ہوتا ہے، نہ صرف ان ظاہری حیثیات سے جنہیں ناول و افسانہ کے درمیان مابہ الاختیار قرار دیا جائے بلکہ اصلی روح یا اسپرٹ کے لحاظ سے اقصیٰ مشرقی و مغربی ایک دوسرے سے محض طرز ادا و پیرایہ افسانہ گوئی کی بنا پر متماز نہیں ہوتے، بلکہ جان و سخن و مغز و کلام کے لحاظ سے بھی بالکل الگ الگ ہوتے ہیں،

مادیت و روحانیت کے حدود حکومت اس میدان میں نمایان طور پر نظر آتے ہیں،

ہجر، شکسیر، میگو، لوسا، ڈکنس، تھیکرسے، جارج ایلیٹ، وغیرہ مغرب کے بہترین دماغوں کے افسانوں کو دیکھو۔ (بہ امتیاز شاذ و بہرہ گاہی مادی دنیا کی کشمکش کے واقعات و مناظر رو برو ہونگے، بخلاف اسکے مشرق کا ہر افسانہ جو ذرا بھی منظرِ نظم سے نکلا ہوگا، اپنے اندر ردِ حاکمیت کے عناصر ضرور رکھیکا، ہا ہا بھارت اور راما یں سے قطع نظر کر کے جو سرتا سر مذہبی افسانہ ہیں، عام مذہب و عقیدہ فسانے بھی اسی رنگ میں رنگے ہوئے نظر آئینگے، یہاں تک کہ جو افسانے موجودہ ہندو جماعت کے نزدیک نہایت عامیانا بلکہ بتندل سمجھے جاتے ہیں، اور واقعہً ان میں فحش و ابتذال کی مثالیں قدم قدم پر ملتی ہیں، اگر تلاش کیا جائے تو ان دریاؤں میں موعظت و اخلاق، تزکیہ نفس و صفائے روح کے موتی بکثرت دستیاب ہونگے، بلکہ اکثر یہ ثابت ہوگا کہ مجاز کے پردہ میں پوری داستان حقیقت و معرفت بیان ہو رہی ہے، حافظ کے جام و بادہ ساتی و پیمانہ ابر و میخانہ کے معانی سے کون نا واقف ہے؛ لیکن دراصل مطالب عالیہ کی رمز بیانی کے لئے خواجہ حافظ جیسی جلیل القدر ہستینوں کی تخصیص نہیں بلکہ مشرق کا یہ عام مذاق ہے کہ رندی و عاشقی کے مصطلحات میں حقائق و معارف کی تعلیم دیا جاتی ہے،

الف لیلہ، داستان امیر حمزہ، بوستان خیال، و طلمسم ہوشربا، اس نوعیت کی کتابوں میں سے کوئی بھی اس قابل نہیں بھی جاتی کہ آج اسکا نام شایستہ و تعلیم یافتہ جماعت کے سامنے بغیر شدید مضحکہ کے لیا جاسکے، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ ان میں سے ہر کتاب باوجود خوارقِ عادت کے تذکرہ اور پیرایہ بیان کے ابتذال کے ایک گنجینہ اسرارِ تصوف ہے، جسکے نظر آئیے لے کسی غیر معمولی روحانی بصارت و بصیرت کی ضرورت نہیں، البتہ یہ ضرور ہے کہ مغربی سطحیت کی جو عینک آنکھوں پر چڑھی ہوئی ہے اُسے اتار کر رکھ دیا جائے،

اسی قسم کے افسانوں میں ایک قصہ گل بگادلی ہے، جسکے مطالب سے اگرچہ ہمارے

ہان کا بچہ وائف ہے، تاہم اس تبذل قصہ کے نام پر مضحکہ کرنا ہمارے تعلیم یافتہ طبقہ میں روشن خیالی کی مستحکم دلیل سمجھی جاتی ہے، صفات ذیل میں یہ دکھانا ہے کہ یہ افسانہ بھی درحقیقت اسرار تصوف کا معلم ہے، اور یہ کوئی راز نہیں، بلکہ مصنف خود، بار بار اسکی تصریح کرتا جاتا ہے، حیرت اس پر ہے کہ اتنی کٹلی ہوئی بات پر بھی نگاہیں نہیں پڑتیں!

بکاؤلی کا اصل قصہ نہایت ہی قدیم ہے، جسکی تاریخ کا علم خود تاریخ کو بھی نہیں، اور نہ اس بحث میں پرنے کا یہ موقع ہے، مختصر یہ کہ ہندوؤں کی بعض قدیم ترین کتابوں میں اس کے حوالے ملتے ہیں، جس سے قیاس ہوتا ہے کہ ابتداء اس کے متعلق کوئی کتاب سنسکرت میں لکھی گئی ہوگی، تقریباً ۲۲ھ میں شیخ عروت اللہ بنگالی نے اسے فارسی زبان میں مرتب کیا، اور لارڈ ویلزلی کو رنر جنرل ہند کے عہد میں لاکھ نہا چنڈ لاہوری نے جسکا مولدہ ملی تھا اور جو کلکتہ میں مقیم رہتے تھے، اردو زبان کے نامور محسن جان گلکرسٹ کے حسب فرمائش اسکا ترجمہ اردو میں کیا، ترجمہ کا سنہ قطعی طور پر معلوم نہیں، لیکن یہ معلوم ہے کہ لارڈ ویلزلی کی مدت حکومت ۱۸۵۷ء سے ۱۸۵۸ء تک تھی، اس حساب سے اس کتاب کو اردو میں آئے ہوئے کم و بیش سوا سو سال ہوئے ہیں، اسکا پورا نام ”مذہب عشق معروف بہ گل بکاؤلی“ ہے، یہی وہ کتاب ہے جو کچھ کم سو صفحات کی ضخامت کے ساتھ حنائی کاغذ پر چھپی ہوئی عام طور پر بازاروں میں ملتی ہے، اور یہی شہنوی گلزار نسیم کا ماخذ ہے (اس کے علاوہ ایک دوسرا قصہ گل بکاؤلی بھی اردو میں موجود تھا، لیکن اب وہ نایاب ہے)

(۱) قصہ کے پلاٹ کا آغاز یہ ہے کہ زمین الملوک ایک فرمان روا سے بااقبال تھا، اسکی نظر جب اس کے محبوب فرزند تاج الملوک پر پڑی تو دفعۃً بصارت جاتی رہی، اطباء نے بتایا کہ اگر گل بکاؤلی کہیں سے دستیاب ہو سکے تو بینائی عود کر سکتی ہے، تاج الملوک کے چاروں

بڑے بہائی ایک ساتھ اور تنہا تاج الملوک الگ اس گل نایاب کی تلاش میں روانہ ہوئے ملک بکا دلی میں داخل ہونے سے پہلے ایک اور شہر پڑتا تھا، اس میں ایک عیار طوائف ہتھی جی جو چوسر کیلئے بین اپنا جواب نہیں رکھتی تھی، اور ایک بلی اور چوسے کی مدد سے ہمیشہ بازی جیت جاتی تھی، چار دن شہزادے اسکے ہاں گئے، اور اپنی تمام دولت بلکہ آزادی کو بھی ہار کر اسکے غلام بن گئے، چند روز کے بعد تاج الملوک پہنچا، اس نے اس عیارہ کے مکرو فریب کو تار لیا، اور ایک نیوے کی مدد سے اسے کھیل میں شکست دیکر اسے خود اپنی لونڈی بنایا، اور تمام شامزادوں کو اسکی غلامی سے نجات دلائی، لیکن جانتے ہو یہ مجاز بیانی کی کس گنجینہ معارف کا طلسم ہے؟ اسکی شرح خود مصنف کی زبان سے سنو:-

”اے عزیز تو نے معلوم کیا کہ میں نے کیا کہا، اس بات کا حاصل یہ ہے کہ دل عرش منزل تیرا جو روئی بخش تخت بادشاہی کا اور دیکھنے والا مادہ اور مجرّد کا تھا، جب اسکی آنکھ اس خلقت ناپاک پر پڑی، اسکی بصارت کو زنگ لگا، اور دیدہ روشن تار کیلئے گیا اب اُٹھ اور سرمہ بینائی ڈھونڈ، یعنی کل مراد کی تلاش کر، لیکن راہ میں دنیاے عیارہ کی بازی میں کہ تختہ فریب کا دہرا ہوا ہے، مشغول ہونا، مبادا وہ فاحشہ پہلے جھکوفیت کر کے بنا دے، اور بعد اسکے مکر کی بلی اور فریب کے چوسے کی مدد سے اچھا پانسہ اپنے حب مرضی پسینے، اور اچانک تیرے توکل کا سراپہ آخو ہو جائے، تب جھکودالم الجس کر رکھے اگر تو صبر کے نیوے کی اعانت سے اس مکارہ کی بازی طلسم کو درہم کر دے، تو وہ فاحشہ جو بادشاہوں اور گردن کشوں کی ہم نشین ہے، تیری فرمان بردار لونڈی ہو کر چاہے کہ جھکواپنے من بھالے بھائے، پھر اگر تو اسے خوبراغت سے نگاہ نہ کرے تو یقین ہو کہ گل مراد کے واسطے تک نیز دسترس ہو۔“

صوفیہ کرام اس سے ناپید کس شے کی ہدایت کر سکتے ہیں؟

(۲) تاج الملوک سفر کرتے کرتے سرحد ملک بکا دلی تک پہنچا ہے، لیکن وہاں پہنچا اسے معلوم ہوا کہ قلعہ بکا دلی جہاں وہ گل مراد پوشیدہ ہے، اٹھارہ ہزار دیودن کی حفاظت میں ہے اور سال سال بھر کی مسافت کے مقامات تک انکی چوکیاں بیٹھی ہوئی ہیں، انکے علاوہ بیشمار پر بان ہر وقت نگرانی کرتی رہتی ہیں، کہ کوئی پرندہ ہوا کے راستے سے بھی نہ پہنچ سکے، نیز چوہون کا بادشاہ بے حد و حساب لشکر لے ہوئے زمین و وزراستون کی پاسبانی کرتا رہتا ہے، تاج الملوک نے یہاں پہنچ کر ایک قوی سیکل دیو کو کسی طرح اپنے موافق بنایا، اور اسکی ہن حاکم کو جو سب دیودن کی سردار تھی ملایا، یہاں تک کہ اس نے اپنی پردردہ ایک حسین لڑکی محمودہ کو اسکے نکاح میں دیدیا مصنف ان اسرار معرفت کی ترجمانی ان الفاظ میں کرتا ہے :-

”اے عزیز، روشنی چشم ظاہر بین کی سات پردوں میں ہے، اور پھلی باری تنہا لے کہ نور دیدہ اولیا ہے، ستر ہزار پردے میں ہے، اگر یہ ارادہ ہے کہ وہ پردے درمیان سے اٹھیں تو پہلے اس بڑے نگہبان دیونفس کا حجاب پنج سے اٹھا کر اسکو بس میں کر کہ وہ عین اپنی کج روی کو چھوڑ کر محمودہ کے مقام میں پہنچائے، لیکن یہ بات یاد رکھ کہ اگر دیو سے لٹا کیجے تو بد ہا پڑے“ (صفحہ ۲۲)

تزکیہ نفس و عرفان حق کی اس رسم واضح تربتعلیم اور کیا ہو سکتی ہے؟

(۳) پھول تاج الملوک کے ہاتھ لگ گیا ہے، بادشاہ کی آنکھیں روشن گہن میں، ادھر بکا دلی خواب سے بیدار ہوتی ہے، اور پھول کو غائب پا کر سخت مضطرب ہوتی ہے، ساتھ ہی اسے پھول چرانے والے سے فابانہ عشق بھی پیدا ہو جاتا ہے، اور خود تاج الملوک بھی اسے جو خواب دیکھ کر اس پر دل و جان سے عاشق ہو چکا ہے، بکا دلی اپنے پھول اور اپنے دل کے چور کی تلاش میں نکلتی ہی اور اگر بادشاہ کے ہاں خواصوں میں داخل ہوتی ہے، یہاں اسکی نظر چارون بڑے شاہزادوں پر

پڑتی ہے، مگر اسکا دل کسی پر نہیں جتا، اسے یقین ہے کہ اسکے دل کا چرانے والا کوئی اور ہی ہے اور وہ اسکے انتظار میں رہتی ہے، گویا عاشق مطلوب بن جاتا ہے، اور معشوق طالب، ان اردو بات قلب کی تصویر مصنف کا حقیقت شناس قلم کس خوبصورتی سے کہنیچتا ہے :-

”سبحان اللہ، کیا آئنی بات ہے کہ معشوق طالب عاشق کا ہوا اور عاشق اسکا مطلوب، لیکن نظر تحقیق سے جو غور کرے تو سید ہی لگے، کیونکہ جب تک معشوق کو خواہش عاشق کی ہو اسکی چاہت ا کارت ہے اور کوشش میفائدہ، آتش طلب کی جو عاشق کے گریبان سے شعل ہے فی الحقیقت کھالی ہوئی معشوق کی ہے، ۱۵

عشق اول در طلب معشوق پیدا میشود      ثانوی ذمہ کے پروانہ پیدا میشود

بات بڑھ گئی، قلم کہتا ہے اسے تنہا بس کر میں نے کہنے میں بہت ہی کوشش کی اور بات اپنی سی کے دعویٰ کرتے ہیں کہ قلم نے کیا کیا ہم نے کہا، باز وہ اپنے تردد کا دم مارتا ہے کہ دست و قلم سے کیا ہوا، جو کچھ کیا میں نے کیا، عرض اسی طرح اسباب تحریر کے بڑے، اور ایک ایک پر فروغیت ہوتی گئی، و نعمتہ ایک سبب ایسا پایا گیا کہ وہ محتاج کسی سبب کا نہ تھا، پس اسے عزیز اگر تو بتا دے کہ فی الحقیقت کہنے میں کی سی ہے، اور ظاہر میں کی تو میں بھی عاشق اور معشوق کی سی کا جواب دوں،“ (صفحہ ۳۲، ۳۳)

کیا عام مغربی انسانوں میں مجاز سے حقیقت کی طرف عطف توجہ کی مثال ملتی ہیں؟  
(۴) تاج الملوک نے اپنے والد کی سرحد حکومت سے متصل دیودن کی مدد سے ایک جنت نظیر شہر آباد کیا ہے، بادشاہ اپنے سفیر کو دریافت حال کے لئے بھیجتا ہے، تاج الملوک اس خلق و ملاطفت سے گفتگو کرتا ہے کہ بادشاہ کو خود اس اجنبی فرمان روا کے ہاں جے وہ اتناک اپنا حریف سمجھ رہا تھا، یہ طور ہمان آئین کی ترغیب ہوتی ہے، یہاں پہنچکر وہ اپنے سعادت مند

فرزند کو بچا رہتا ہے، اسے سینہ سے لگاتا ہے، اور چار دن بڑے لڑکوں کو جنھوں نے اتناک  
ساج الملوک کو طح طح کے نقصان پہنچائے تھے، سخت سزا دیتا ہے، اس باب کے خاتمہ پر  
جو رشحات معرفت مصنف کے قلم سے نکلے ہیں، انکا نمونہ ملاحظہ ہو:-

”اے عویز، میری عورت بادشاہ کے دربار میں تیری خدمت کے موافق ہوگی، چاہو کہ  
شاہزادے کے مانند کارشائستہ کرے، تو تیری محبت شاہ کے دل میں موثر ہو، اور پیغام  
اپنی ملاقات کا تجھے بھیجے، بلکہ مہیا کا نہ آپ ہی تیرے پاس چلا آئے، اور بے اختیار  
سراپی چاٹی سے لگا لے، اگرچہ پہلے دیدار کے لائق نہ ہو، لیکن آخر کار اسی مقام میں آپکو  
پہنچائے کہ وہاں تیرا کوئی شریک نہ ہو سکے، پھر ایسا کام نہ کیجئے کہ شاہزادوں کے مانند  
داغ لعنت اُٹھائے، اور کس و ناکس کے در بدر سوا ہو۔“

دکنس دتھیرے کے شیدا ایون کو افسانہ گوئی کے درمیان درمیان یہ درویشانہ  
صدائیں سخت نامانوس اور بے محل معلوم ہوتی ہوگی،

(د) ساج الملوک کو ایک طلسمی عصا دکلاہ ہاتھ لگ جاتے ہیں جنھیں اسے ہر قسم کے گزند سے  
محفوظ رکھنے کی قوت ہے، وہ ایک خوش منظر چٹنہ کے کنارہ انہیں غلطی سے رکھ کر غوطہ لگاتا ہے،  
لیکن جب سر نکالتا ہے تو اپنے تئیں عورت پاتا ہے، ایک زمانہ عجیب قسم کے مصائب میں  
گزرتا ہے، اسکے بعد پھر ایک حوض میں غوطہ لگاتا ہے، اور اب کی جو سر نکالتا ہے تو پھر اپنے  
تئیں صورت اصلی میں پاتا ہے، اب دیکھو کہ ان شعبہ بازیون کے پس پردہ مصنف کس طرح  
جمال حقیقی کا جلوہ دکھاتا ہے،

”اے یاران دہر، حق تعالیٰ نے بنی آدم کے سر پر کرامت کی ٹوپی پہنا کر اور عصمت کا

لے بادشاہ سے ظاہر ہے کہ یہاں بادشاہ حقیقی مراد ہے،



عصا ہاتھ میں دیکھ کر غم گاہ دنیا میں کہ مزرع آخرت ہے، عاقبت کی تکمیل کے لئے  
 بیجا ہے، پس انسان کو چاہیے کہ گل و غار اور آب و سراب خوب پہچانے، ہر ایک  
 باغ کے پھول کو نہ سونگے، ہر ایک نہر سے گھڑانہ بھرے، کہ میان کانٹے گل سے رنگین اکثر  
 ہیں، اور شراب بصورت آب (دہراؤ ہے) ،

اسے عزیز، اگر گوہر دنیا کے لینے کو چشمہ جہان میں غوطہ مارینگا، مقر اپنا کلاہ اور  
 عصا بھونکے، یہ حکم اس بات پر ہے کہ طالب دنیا سونٹ میں، اور طالب مولیٰ مرد میں،  
 تیرا پیکر معافی جو مانند مرد کامل ہے، بصورت زنان ناقص العقل ہو جائیگا، پس اس وقت  
 شکیبائی کے سوا کچھ چارہ نہیں ہے، چاہیے کہ دم بخود ہو کر پھر دریائے ذکر الہی میں غوطہ  
 مارے، اسکے بعد جو سر اٹھائیگا، وہی عصا ہاتھ میں اور وہی ٹوپی سر پر دیکھیگا۔ (صفحہ ۵۵)  
 کیا جو کتاب اس قسم کی تعلیمات سے بریز ہو، وہ اسی بے وقعتی و تحقیر کی مستحق ہے جو اسکے  
 ساتھ برتی جا رہی ہے؟

(۶) تاج الملوک بگا دلی کی خالہ زاد بہن کو قید شدید سے نجات دلاتا ہے، جس سے اسکی  
 مان (بگا دلی کی خالہ) قدر تاتا اسکی نہایت ممنون ہو جاتی ہے، اور وہ اپنی بہن جمیلہ خاتون  
 (والدہ بگا دلی) سے سفارش کرتی ہے کہ بگا دلی کو تاج الملوک کے عقد میں دیدیا جائے،  
 جمیلہ خاتون کہتی ہے کہ انسان اور پری کا کیا جوڑ؟ اسکے جواب میں اسکی بہن شرف ہستی  
 انسانی پر ایک خطبہ دیتی ہے:

”تو سچ کہتی ہے، لطیف کو ہم صحبت کینف کرنا البتہ دانائی سے بعید ہے، لیکن تو  
 حضرت انسان کے کمالوں سے اگر واقف ہوتی تو ایسے ایسے خیال فاسد دل میں ہرگز  
 نہ لاتی، سن اسے نادان، بشر خلیفہ برزوان ہے، اور اسکی صفت بے پایان میں اشرف

و افضل ہے، اسکے رتبوں اور درجوں کی انتہا نہیں، وہ ایک ہنگ ہے دریا کا بہنے والا  
اور ایک قطرہ ہے حقیقت میں دریا، جامع ہے کمالات علم کوئی و اہمی کا یعنی مادیت اور  
مجردات کا، اور مجمع ہے مراتب بندگی اور بادشاہی کا، ۵

انسان کی ذات بنیخ جامع ہتیکان      ظل خدا و صورت خلق اسین ہر عیان  
جان، کہ صوفیہ ہر ایک کو عالم ارواح کے نوعون میں سے باری تعالیٰ کے ایک ایک  
اسم اور صفت کا منظر خاص جانتے ہیں، اور اس عالم صورت کو کہ جو اس ظاہری اور  
باطنی سے نسبت رکھتا ہے، اس عالم کا سایہ، پس ہر ایک ذرہ فرد کائنات سے  
روشن ایک قلبی ابدی، اور سیراب ایک قطرہ سردی سے ہے، ۵

برگ درختان سبز و زلف ہوشیار      ہر دے و فقریت از معرفت کو نگار  
اس عالم میں انسان کہ سارے افراد کو ن و فساد اسکے لازمی ہیں، خدا کے سارے اسموں  
اور صفیوں کا مصدر ہے، اور اسکی تجلیات خاص کا مقام کلام فضیلت انسان میں  
دریائے بلے پایان ہے، اسقدر پر اکتفا کیا۔ (صفحہ ۶۳)

اس عبارت کو اگر شروع شنوی مولانا روم، یا پھر حدیقہ سنائی یا تحفۃ الاحرار جامی  
میں سے کسی کی جانب منسوب کر دیا جائے تو شاید کسی کو وجہ انکار نہ پیدا ہو سکے؟  
(۱) سنگدپ کے راجہ کی لڑکی تاج الملوک کے حسن پر عاشق ہوتی ہے، راجہ چاہتا ہے کہ  
اسے اسکے عقد میں دیدے، لیکن خود تاج الملوک جبکہ آنکھوں میں بگا دلی کی تصویر بھر رہی ہے  
اسے کسی طرح قبول نہیں کرتا، راجہ براؤدختہ ہوتا ہے، وزیر کسی حکمت سے تاج الملوک کو  
گرفتار کر کے قید میں ڈالتا ہے، لیکن یہ اسیری اسکی آئندہ مسرتوں کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے  
مشرقی افسانہ نویس اس موقع پر ایک صوفی منش حکیم اخلاق کا لب و لہجہ اختیار کر لیتا ہے

کہتا ہے :-

”مجھے ہے کہ جو کوئی حکمت عظیم مطلق کی گوناگون تامل کی نظر سے دیکھے تو کسی چیز کو خالی شر سے  
نپا دے، اور ہر ایک شر کے بعد فیض ملاحظہ کرے، اسے عزیز، حق تعالیٰ نے عالم ارواح کو  
بدن سے رخصت دی ہے، پس جو حرکت کہ بظاہر بدن سے ہو حقیقت میں روح سے ہی، غرض کہ  
جو فساد اس عالم کون و فساد میں ہو تو اس کی طرف سے جان لیکن شر نہ سمجھ کہ درپردہ وہ غیر ذی  
کیونکہ دیان شر کی گنجائش نہیں“ (صفحہ ۷۶)

اہیات کی کتابوں میں کیا مسئلہ خیر و شر کی اس سے کچھ مزید توضیح مل سکتی ہے؟

(۸) راجہ کی لڑکی چڑاوت اپنے صن و جمال کی انتہائی ترین درآرائش کے ساتھ تاج الملوک  
ساتھ آتی ہے لیکن یہ سارے حربے بے اثر رہتے ہیں تاہم چڑاوت کا عشق ناشی نہیں، اسکی  
محبت بالکل خالص و بے آمیز ہے، وہ کتنا بے اثر رہتی، بالآخر اس کے جذب صادق کا اثر  
ہوا، اور تاج الملوک با این گریز و احتیاط خود بھی متاثر ہو گیا، کوئی دوسرا افسانہ نہیں ہوتا تو  
اس واقعہ کا ذکر کر کے بلا تامل آگے بڑھتا، لیکن ہمارا مصنف اس مقام پر پہنچکر مصنف  
گلستان نجاتا ہے، اور سعدی کے لب و لہجہ میں کہتا ہے،

”من اسے عزیز، رسول مقبول صلم نے عبادت کو بادشاہ حقیقی کی نذر کے لائق نہ دیکھا

عجز سے کہا کہ عبادت تیری جیسی چاہیے، میں نے نہیں کی، پھر کہ منہ ہے کہ اپنی عبادت پر  
نازان ہو، بہتر یہی ہے کہ آپ کو اسکی محبت کی گھڑیا میں یہاں تک پگھلائے کہ اس کے مانند  
خاک ہو جائے تا شاہان اکیر ہند کی آنکھوں میں سونے سے زیادہ نظر آئے“ (صفحہ ۷۷)

اس واعظانہ و حقیقت سنانہ انداز بیان پر مغربی افسانہ نویس اپنے اصول کے لحاظ سے

مصدقہ بھی حیرت کرے بجا ہوگی،

(۹) تاج الملوک کو چتر اودت کے ساتھ نکاح کئے ہوئے ایک عرصہ ہو چکا ہے، دونوں کا ہر وقت ساتھ رہتا ہے، چتر اودت اپنی نوعمری کے ساتھ حسن و جمال میں بیکتا ہے، اور تاج الملوک اپنے اوپر فروغیتہ کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتی، پھر بھی اسے چتر اودت کی طرف مطلق التفات نہیں ہوتا، اسلئے کہ اسکی آنکھوں میں بکاؤلی بسی ہوئی ہے، مصنف اس واقعہ سے بھی ایک درس معرفت پیدا کرتا ہے،

”اے عزیز، تیرے دل کی آنکھیں جب تک اغیار کے حسن کو دیکھنے والی ہیں، تجھے یار کی صورت نظر نہیں آتی، ہر جذبے پردہ ہو، پہلے فخر و رغبت اغیار کو دل کی سرزمین سے اکھاڑ کر پھینک دے، پھر گل رخسار یار کو آئینہ دل میں دیکھ لے، اگر تو اپنے نگہن وجود کو بے نظر تامل دیکھے تو ان میں رنگ و بو کے سوا کچھ نہ پائے“ (صفحہ ۸۰)

اگر ان پیہم تصریحات کے بعد بھی قصہ بکاؤلی کا شمار ادنیٰ و مبتذل کتابوں میں ہے تو معلوم نہیں اعلیٰ مضامین کے لئے کیا معیار رکھنا پڑیگا؟

(۱۰) تصوف و انبیات سے قطع نظر کر کے کتاب میں جا بجا عشق مجازی کے واردات و کیفیات نفسی سے مشعلق بھی نکات موجود ہیں، تاج الملوک کا نوجوان وزیر ہرام بکاؤلی کی خالہ زاد بہن روح افزا پر عاشق ہوتا ہے، لیکن خود روح افزا بھی برابر اسکی یاد میں گہماتی تھی غمی اور بظاہر احوال صورت وصل نامکن معلوم ہوتی تھی، مصنف اس موقع کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتا، بلکہ اپنے ناظرین کو اس حقیقت سے روشناس کرتا ہے، کہ

”سچ ہے، جو کوئی دیدہ غور سے ملاحظہ کرے تو عشق کی تیبالی مشوق میں زیادہ دیکھے یہ درگزر ہے کہ کسی کے گلے میں کند عشق ڈال کر دور سے اپنے حضور میں کھینچ لے اور کسی کو تلاخین عجز سے دور پھینک دے“ (صفحہ ۸۲)

اس قسم کے جملہ معترضہ کی مثالیں بیشک مغربی لٹریچر میں بھی بکثرت ملتی ہیں۔  
 (۱۱) کہیں کہیں مصنف نے فلسفہ عشق کے نکات کو اپنی زبان سے نہیں بلکہ اشخاص افسانہ  
 لکیر کیکرز کی زبان سے ظاہر کیا ہے، مثلاً ایک مقام پر قہقہہ یہ ہے کہ بہرام، شہزادی  
 روح افزا کا عاشق اسکی مشاطہ بنفشہ کی مدد سے شہزادی کے کمرہ تک پہنچ جاتا ہے، اور اپنے  
 در و دل کے ترجمان بعض اشعار آئینہ کی پشت پر لکھ جاتا ہے، دوسرے روز صبح کو جب شہزادی  
 کی نظر اس آئینہ پر پڑتی ہے تو اس کے دل میں شبہ پیدا ہوتا ہے کہ کہیں یہ حرکت بہرام کی تو نہیں،  
 لیکن اس شبہ کو ظاہر بھی نہیں کر سکتی، آخر اس نے مشاطہ سے مخاطب ہو کر کہا:-

”اے بنفشہ، جو چیز ہمیشہ ہے وہ کیا ہے، اور جو شے مدام غم کے ساتھ ہے کون شے ہو؟  
 اس (بنفشہ) نے ہر چند غور کیا، لیکن جواب معقول نہ سوجھا، غرض کی کہ اسکا جواب لونڈی  
 کل دیگی، اسوقت معاف کیجئے، یہ کہہ کر گھرائی، مگر اس پیلی کے بوجھ میں نہایت متفکر تھی،  
 اسکی گھرائی صورت بہرام نے دیکھ کر پوچھا کہ بوا آج اتنی بھوس کیوں ہوا تب بنفشہ نے  
 سوال روح افزا کا اس کے سامنے بیان کیا، اور کہا مجھ کو اس کے سو اچھے جواب ہیں سوچتا کہ  
 ”اس حکیم مطلق کا نیزنگ دوام ہے، اور شادی غم سے وابستہ مدام ہے، بہرام نے یہ  
 سن کر کہا، ”اس سوال کا یہ جواب ہرگز نہیں، بلکہ یہ ہے کہ جس عاشق کے منہ پر عشق کے  
 ہاتھ کے لمبا پنے لگے ہیں وہ ہمیشہ سرخرو ہے، اور مدام ناخوشی سے تلخ کام وہ ہے کہ جبکا  
 مطلوب محبوب ہے، اور وہ ہر ایک کو اپنا محبوب سمجھتا ہے۔“ (صفحہ ۸۶)

(۱۲) بہرام زمانہ لباس پہنکر روح افزا تک تھلیہ میں پہنچتا ہے، بجز اس صورت کے رسائی  
 کی اور کوئی تدبیر نہ تھی، اور یہی تدبیر بالآخر کامیابی و شادمانی کا مقدمہ ثابت ہوئی، نکتہ سنج مصنف  
 اس بات سے بھی ایک بات پیدا کرتا ہے:-

”فی الواقع جو عاشق کہ مشوق کا رنگ پکڑتا ہے، مشوق خود اس کا عاشق ہو جاتا ہے چنانچہ  
پینہ خدا صلعم نے بھی اس وضع کا کلام فرمایا ہے، چل اس کا یہ ہے کہ خصال خدا کی  
پیروی کرو تا قربت اس سے چل ہو“ (صفحہ ۸۷)

(۱۳۱) روح افزا بہرام کو پہچان کے ڈانٹا شروع کرتی ہے، کہ غیر محرم مرد ہو کر اس نے اُسکی  
خلوت سرا میں قدم رکھنے کی کیونکر جرأت کی، اور چاہتی ہے کہ اس گستاخی کی اسکو پوری سزا  
دے، بہرام عقوبت شاہی کے خوف سے بیہوش ہو جاتا ہے، روح افزا اسے قریب الموت  
خیال کر کے اپنے رُخ کلفام کی خوشبو سونگھا کر اسے ہوش میں لاتی ہے، بہرام جب غش سے  
آنکھیں کھولتا ہے تو اپنے تئیں ”جنت نگاہ“ ”فردوس گوش“ کے عالم میں پاتا ہے مصنف اس  
واقعہ سے بھی ایک مختصر درس معرفت پیدا ہی کر لیتا ہے:-

”اے عزیز، اگر اپنے ذوق عقل کو حکمتوں سے زیادہ نہ چمکائیگا، تو خلی یار سے فائدہ نہ پائیگا،  
اگر تو یہ ہستی موبہوم نہ چوڑے تو حیات ابدی کب تیرے پاس آئے، جو راہ عشق میں آپ سے  
نہ گذرا، وہ منزل مقصود میں کب پہنچا“ (صفحہ ۸۷)

(۱۳۲) روح افزا اپنی رسوائی کے خوف سے طلسمی قوت سے مدد لیکر بہرام کو دن بھر قمری کی  
شکل میں تبدیل رکھتی ہے، اُسکے نگلے میں ایک طلسمی لوح ڈالے رکھتی ہے، اور پھرے کو ہر وقت  
بیش نظر رکھتی ہے، لیکن رفتہ رفتہ یہ چہرے سارے پرستان میں ہونے لگتے ہیں کہ شب کو  
ایک آدم زاد کی آمد و رفت روح افزا کے خلوت سرا میں رہتی ہے، عتاب سلطانی نازل  
ہوتا ہے، اور ہزار ہا جاسوس تلاش میں مصروف ہو جاتے ہیں جو زمین و آسمان کا گوشہ گوشہ  
تک چھان ڈالتے ہیں لیکن اس پنجرے پر کسی کی نظر نہیں پڑتی، اس سب مجاز سے دیکھو، مصنف  
”حقیقت“ کی طرف کیسا موثر عطف توجہ کرتا ہے:-

”اے عزیز، تو عیش پر کسی کے دہونڈنے کا ارادہ رکھتا ہے جو تیرے خانہ دل میں ہے

اسکی توجھے خبر نہیں، واہ وا، دور کا وہ بیان، اور نزدیک آپ سے انجان،

(صفحہ ۸۸)

کون ہو گھر میں جب اتنی ہی نہیں تھک کر

پھر تو یہ کیا جائے کیا ہوا جہاں بام چرخ پر

(۱۵) خاتمہ کے قریب، اسی قمری کی اصلیت کہلنے کے ضمن میں مصنف اپنی تمام مجاز طرازیوں سے

بھی پردہ اٹھا دیتا ہے، اور ارباب بصیرت کو صاف صاف دکھا دیتا ہے کہ طلسم سے مراد

طلسم حیات، طایر سے طایر روح، اور نفس سے نفس وجود ہی، و قس علیٰ ہذا، کہتا ہے:-

”اُسکی کنہہ سمجھ لے اے نادان، یہ سبب علاقہ، روح سبزہ زار دنیا کی میر کو آتی ہے،

جب تک یہ مریخ طلسم عناصر کے گئے میں پڑا ہے، اور نفس وجود میں طوق بندگی اُسکا

گلو گر ہے چشم ظاہر میں مشت خاک کے سوا کچھ نہیں دیکھتی، جس دن یہ طلسم ٹوٹ گیا،

کیفیت اُسکی کہل جائیگی کہ وہ کون ہے، اور یہ نیزنگ کیا ہے، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

بھی فرمایا ہے کہ جب لوگ آئینگے، اس حال سے آگاہ ہونگے، وجود مطلق ایک دریا یا در

ہر موجود مثل حجاب ہے، جب حجاب سے ہوا نکل گئی، دریا کے سوا کچھ نہیں پس تل سے

دیکھ کہ اصل ہستی دریا کی ہے، لیکن فرق مرتبہ کا اللہ ہے، حجاب کو کوئی دریا نہ کہیگا اور

درباکو حجاب اور کعبہ کو تباہ کہتے ہیں، اور بتخانہ کو کنشت جہنم کو دوزخ اور جنت کو بہشت،

ہر مرتبہ میں اور ہی حکم وجود ہے

زندقی ہی جو حفظ مراتب کرے نہ کو

واقفی مسئلہ وحدت وجود کا مشکل ترین مسائل ہے، اور بہتر ہے اس بحر عقیق میں

گر کہ مذہب جبری کے بھنور میں جا پڑے، اور اکثر مسلک دہری کے گرداب میں ڈوبے

ہادی بیان فضل الہی اور کرم رسالت پناہی کے سوا کوئی نہیں“ (صفحہ ۸۹)

قصہ گل بجا دلی کا اخلاقی حیثیت سے مشرقی لٹریچر میں کوئی درجہ نہیں، اور اگر ہے

تو ہی: جو انگریزی لٹریچر میں ریٹالڈ زکے ناولوں کا ہے، با این ہمہ اسکا ایک ایک درتی  
 ریٹالڈ زکے ہینن بلکہ ٹکسپیرا وٹسلا کے دفتر تصانیف پر بہاری ہے، اس سے قیاس  
 ہو سکتا ہے کہ رومی و غزالی، سعدی و حافظ کے مقابلہ میں لائے کے لئے مغرب کو اپنے کسی  
 فرزند کے نام تلاش کرنے میں کیسی سخت وقت پڑیگی، ایسی حالت میں اگر یورپ میں ڈارون  
 پیدا ہوں اور ایشیا میں منصور، تو حیرت نہ کرنا چاہیئے، اوہ قوت اجتہاد و اکتشاف کا  
 تنہا سے کمال یہ ہے کہ ”انسان فی الہل بند رہے“ اور ادھر انتہا سے از خود فکری و بدستی  
 میں بھی یہ صفا نکلتی ہے کہ ”انسان فی الہل خدا ہے“



## حقیقت علم (منہد)

ان دونوں کیفیتوں کی حقیقت پر بحث کرتے وقت سب سے پہلے ہمیں یہ ذہن نشین کھنا چاہیے کہ حس تصور میں جو سب سے اہم فرق ہر وہ یہ ہے کہ جس کا شمار ان کیفیات نفسیہ میں ہے جن کا وجود اس وقت ہوتا ہے جب کسی خارجی مہیج سے ہمارا احساس متاثر ہوتا ہے بخلان تصور کے کہ اس کی پیدائش کے لیے کسی خارجی مہیج کے مہیج و تاثیر کی حاجت نہیں ہوتی اسی وجہ سے ہنہ شروع مضمون میں یہ بات بتادی تھی کہ حیات و ادراکات کو الگ الگ نوع شمار کرنا چاہیے حیات کی پیدائش مہیج خارجی سے ہوتی ہے اور تصور کی پیدائش کو العت نفسانی کی اندر دنی ترتیب سے لیکن اس فرق کے علاوہ حس و تصور میں بڑا فرق جو ہے وہ یہ ہے کہ حس کے ذریعہ سے جو ادراک نفس کو حاصل ہوتا ہے وہ اس قدر قوی اور اس قدر واضح ہوتا ہے کہ نفس کو ادراک کا ادراک کرنے میں نہ کسی واسطہ کی حاجت ہوتی ہے اور نہ نفس کو اس میں کچھ دشواری پیش آتی ہے بخلان تصورات کے کہ ان کے ذریعہ سے نفس کو جو ادراک حاصل ہوتا ہے وہ محسوسات کی طرح قوی اور واضح نہیں ہوتا یہ بہت صاف بات ہے کہ جب ہم آگ کو چھو کر جلن محسوس کرتے ہیں تو یہ جلن کا احساس اتنا قوی ہوتا ہے کہ ہم بیتاب ہو کر فوراً اپنا ہاتھ آگ پر سے اٹھا لیتے ہیں بخلان اسکے اگر ہم اس جلن کا تصور کریں تو اس تصور سے گو ہوا اس جلن کا ادراک تو ہو جاتا ہے مگر نہ تو اس جلن سے ہمارے کسی جسمانی عضو یا خود نفس کو کوئی تکلیف محسوس ہوتی ہے اور نہ ہم اس تصور کے ذریعہ سے اس تکلیف کا پورا اندازہ کر سکتے ہیں جو آگ کو چھوتے وقت ہو جاتی تھی اسی طرح مثلاً اگر ہم غصہ کریں اور پھر حالت سکون میں غصہ کی اس کیفیت کا تصور

کریں تو ان دونوں حالتوں میں ہکوا باعتبار شدت وضعف بڑا محسوس فرق ہوتا ہے گو یہ ممکن ہے کہ ہم اپنے تصور میں اپنے حس کی پوری پوری نقل اتار لیں لیکن باوجود سخت کوشش کے یہ ناممکن ہے کہ اصل کو نقل سے شدت وضعف میں کوئی معمولی مناسبت پیدا ہو یا ان البتہ اگر نظام دماغی میں کسی خاص سببے اختلال پیدا ہو گیا ہے تو اسوقت یہ بیشک ممکن ہے کہ انسان اپنے تصور سے ہی اسی شدت کے ساتھ اثر پذیر ہو جس شدت سے کہ وہ اپنے حس سے اثر پذیر ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ جن لوگوں کے نظام دماغی میں اختلال پیدا ہو جاتا ہے وہ اکثر ایک معمولی تصور سے بھی ہیجان میں آ جاتے ہیں بلکہ بعض اوقات یہ ہیجان شدت و قوت میں اس ہیجان سے بڑھا ہوا ہوتا ہے جو اصلی واقعہ سے انکی طبیعت میں پیدا ہوا تھا۔

ان دو فرقوں کے علاوہ حس و تصور میں ایک بڑا فرق یہ بھی ہے کہ حس حاسہ کے سامنے سے شئی خارجی کے ہٹتے ہی معدوم ہو جاتا ہے مگر تصور اسکے خلاف مدتوں باقی رہتا ہے بلکہ بعض اوقات تصور کی شدت اثر میں اسکی مدت قیام سے نمایاں فرق پیدا ہو جاتا ہے یعنی یہ کہ وہ تصورات جو دیر پا ہوتے ہیں اپنی مدت قیام کی وجہ سے زیادہ شدید الاثر ہو جاتے ہیں یہی وجہ ہے کہ زیادہ دیر تک باقی رہنے والے تصورات سے انسان کی جسمانی اور دماغی تندرستی پر بہت بڑا اثر پڑتا ہے۔

غرض حس و تصور کے باہمی فرق حسب ذیل نوعیت کے ہوتے ہیں جنکو ہم دفعات ذیل میں ترتیب دیکتے ہیں۔

(۱) اختلاف نوعیت۔ یعنی یہ کہ حس ایک خاص نوع کے ادراک کا نام ہے اور تصور ایک دوسری نوع کا ادراک ہے جو حس سے مختلف ہے۔

کہتا ہے :-

”جہ ہے کہ جو کوئی حکمت عظیم مطلق کی گونا گوں نامل کی نظر سے دیکھے تو کسی چیز کو خالی شر سے  
نپا دے، اور ہر ایک شر کے بعد خیر ملاحظہ کرے، اسے عزیز، حق تعالیٰ نے عالم ارواح کو  
بدن سے رخصت دی ہے، پس جو حرکت کہ بظاہر بدن سے ہو، حقیقت میں روح سے ہی، غرض کہ  
جو فساد اس عالم کون و فساد میں ہو، تو اس کی طرف سے جان لیکن شر تو سمجھ کہ درپردہ وہ خیر ہی  
کیونکہ وہ ان شر کی گنجائش نہیں“ (صفحہ ۷۶)

اہیات کی کتابوں میں کیا مسئلہ خیر و شر کی اس سے کچھ زاید توضیح مل سکتی ہے؟  
(۸) راجہ کی لڑکی چتراوت اپنے حسن و جمال کی انتہائی ترہیں و آرائش کے ساتھ تاج الملوک کے  
سامنے آتی ہے، لیکن یہ سارے حربے بے اثر رہتے ہیں، تاہم چتراوت کا عشق نمائشی نہیں، اس کی  
محبت بالکل خالص و بے آمیز ہے، وہ کہتے کہ بے اثر رہتی، بالآخر اس کے جذب صادق کا اثر  
ہوا، اور تاج الملوک باہرین گریز و احتیاط خود بھی متاثر ہو گیا، کوئی دوسرا افسانہ نویس ہوتا تو  
اس واقعہ کا ذکر کر کے بلاتامل آگے بڑھتا، لیکن ہمارا مصنف اس مقام پر پہنچ کر مصنف  
گلستان بنجاتا ہے، اور سعدی کے لب و لہجہ میں کہتا ہے،

”من اسے عزیز، رسول مقبول صلعم نے عبادت کو بادشاہ حقیقی کی نذر کے لائق نہ دیکھا  
عجز سے کہا کہ عبادت تیری جیسی چاہیے، میں نے نہیں کی، پھر کہہ رہا ہے کہ اپنی عبادت پر  
نازناں ہو، بہتر یہی ہے کہ آپ کو اس کی محبت کی گھریا میں یہاں تک پگھلائے کہ اس کے مانند  
خاک ہو جائے تا شاہان اکیر ہند کی آنکھوں میں ہونے سے زیادہ نظر آئے“ (صفحہ ۷۷)

اس واعظانہ و حقیقت سنانہ انداز بیان پر مغربی افسانہ نویس اپنے اصول کے حقائق  
مبعدہ بھی حیرت کرے بجا ہوگی،

لیکن اس لاتناہی کے علاوہ تصورات میں یہ بھی ایک عجیب صفت پائی جاتی ہے کہ انکی قوت بے پناہ اور زبردست ہوا کرتی ہے یعنی تصور ایک ایسی طاقت ہے جو عجیب سے عجیب و متنقض سے تناقض اشیا کو پیدا کر سکتی ہے وہ ہر کو ایک دم زمین سے آسمان پر چڑھا لیجا سکتی ہے دم کے دم میں ہم اپنے تصور کے ذریعہ سے لامکان اور عالم ملکوت کی سیر کر سکتے ہیں۔ تحت الثری کی بے پایاں پستی اور فضا کی لاتناہی بلندی تصور کے آگے پہنچ ہیں صرت اسقدر نہیں بلکہ ہم تصور کے ذریعہ سے عالم کے اوس حصہ تک بھی پہنچ سکتے ہیں جہاں قانون قدرت کا بھی گزرنین ہو سکتا اور جہاں کارخانہ قدرت تتر بتر نظر آتا ہے پھر اسکے علاوہ ہم اپنے تصور کے ذریعہ سے خود اس عالم میں بھی عجیب تصورات کر سکتے ہیں تصور کے تصرف کی ایک سادہ مثال جس سے شاید کسی کو انکار نہ ہو یہ ہے کہ ہم اپنے تصور کے ذریعہ سے اپنی جسمانی بیماریوں کو بعض اوقات دفع کر سکتے اور بعض اوقات اپنے تئیں بیمار ڈال سکتے ہیں تصور کا تصرف ہماری جسمانی حالت پر اکثر ہوا کرتا ہے رعب و خوف اور دیگر کیفیات نفسیہ کی پیدائش کے وقت ہمارے جسم میں جو بعض تئیرات پیدا ہو جاتے ہیں انکی توجیہ تصور کے تصرف کے علاوہ اور کیا ہو سکتی ہے؟

غرض ہماری ذہنی دنیا بلکہ ہماری حیات کا ایک ایک لمحہ تصور کے تصرفات کی شہادت دیتا ہے یہاں تک کہ ہماری مسرت اور ہماری الم میں بھی ہمارے تصور کو بڑی مداخلت ہوتی ہے مظاہر کائنات اور عالم کی بوقلمونی انسان کے تصور پر اپنا اثر کرتی ہے اور اس اثر کی وجہ سے ہمارے تصور میں بھی بوقلمونی پیدا ہو جاتی ہے ابھی ہم بنجیدہ تھے کہ ہمارے سامنے ایک ایسا واقعہ گذرا جس پر ہم کھلکھلا کر ہنس پڑے اسطرح کے واقعات ہماری زندگی میں اکثر پیش آتے ہیں لیکن یہ صرف اس واقعہ کا ایک پہلو ہے حقیقت یہ ہے کہ اسطرح واقعات عالم

ہمارے تصور پر اثر کرتے ہیں اس طرح دوسرا جوابی اثر ہمارے تصور کا بھی واقعات علم پر ہوتا ہے یہ ہمارے تصور ہی کی کرشمہ سازی ہے کہ ہم جس رنگ میں واقعات کو دیکھتے ہیں ان واقعات سے اسی قسم کا اثر ہمارے نفس پر مترتب ہوتا ہے مسرت و الم دراصل نفسانی کیفیتیں ہیں عالم کی کوئی چیز نہ اپنے اندر سامان مسرت نہ ان رکھتی ہے اور نہ سامان الم ہے صرف ہمارا تصور ہی ہے جو عالم کی اشیاء کو ان دو مختلف رنگوں میں ہمارے سامنے پیش کیا کرتا ہے ہم جس چیز سے جو اثر حاصل کرینگے اسی اثر کے رنگ میں ہموادہ چیز رنگی ہوئی نظر آئیگی پس عالم کی بوقلمونی اور کائنات کے متنوع حالات کے اندر زندگی بسر کرتے ہوئے انسان کا فرض ہے کہ وہ اپنے تصور پر قابو رکھے اور اپنے تصور کو مطلق العنان نہ چھوڑے انسان اپنی سعادت اپنے باہر ناحق ڈھونڈھتا ہے حالانکہ اسکی سعادت خود اس کے اندر موجود ہے انسان اپنی راحت و عیش کے سامان دنیا کی چیزوں میں ناحق تلاش کرتا ہے حالانکہ تمام حظوظ و آلام اور تمام نیکیوں اور برائیوں کا سرچشمہ خود انسان کا تصور ہے غرض تصور ایک عجیب طاقت ہے جو انسان کو عطا کی گئی ہے دنیا کی تمام چیزیں اس طاقت کے ذریعہ سے انسان کے قبضہ میں آجاتی ہیں اور انسان کی زندگی کا ہر لمحہ تصور کی ہمہ گیری اور اسکی عالمگیر وسعت و قوت کی شہادت دیتا ہے انسان کے ان روزمرہ حالات کے علاوہ انسان کی داغی ترقی میں بھی تصور کا بڑا اثر ہوتا ہے تم ایک ایسے عالم کا اپنے ذہن میں تصور کرو جو ارضی و سماوی اشیاء کے حالات و خواص کا علم رکھتا ہے اور اپنے اس علم سے خلق اللہ کو نفع پہونچاتا ہے پھر اسکے مقابل تم افریقہ کے اس وحشی کو دیکھو جسکا ذہن اپنی اس پاس کی چیزوں سے آگے نہیں بڑھ سکا ہے ان دونوں میں تم کو نمایان فرق نظر آئیگا پھر اسکے علاوہ اگر تصور کی طاقت انسان کے قبضہ

میں نہوتی تو غالباً انسان تہذیب و تمدن میں اتنی عظیم نشان ترقی کبھی نہ حاصل کر سکتا جو  
 آج اسے حاصل کر لی ہے دنیا کا کوئی علم و فن ایسا نہیں جس میں تخیل کی حاجت نہ پڑتی ہو  
 شاعری، لطیفہ، فنون لطیفہ، تاریخ، فسانہ نگاری، مذہبی ترغیب و ترہیب، منطق، فلسفہ،  
 سائنس، کیمسٹری، علم النبات، علم طب، غرض دنیا کا کوئی علم و فن ایسا نہیں جو تصور و  
 تخیل سے بے نیاز ہو عموماً یہ سمجھا جاتا ہے کہ سائنس و فلسفہ یعنی علوم ذہنیہ تخیل سے بے نیاز  
 ہیں اور تخیل کی حاجت صرف شاعری اور فسانہ نگاری میں ہوتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے  
 کہ اگر اِسْطَوَاتِ تخیل سے کام نہ لیتا تو وہ منطق کے اصول کبھی مرتب نہیں کر سکتا تھا  
 سرائق نیوٹن کا ایک واقعہ مشہور ہے کہ ایک روز وہ اپنے باغ میں سیر کر رہا تھا اُس نے  
 دیکھا کہ ایک پھل ایک درخت سے ٹوٹ کر زمین پر آ رہا بظاہر کچھ یہ واقعہ عجیب نہ تھا لیکن  
 فوراً اسکے ذہن میں یہ واقعہ دیکھ کر یہ خیال پیدا ہوا کہ آخر اسکی کیا وجہ ہے کہ تمام چیزیں زمین  
 کی جانب مائل ہوتی ہیں ایک ڈھیلے کو اگر تم اچھا لو تو وہ اوپر جانے کے بجائے زمین پر  
 آ رہے گا یہ خیال آتے ہی اسے فوراً جذبِ کوشش کے مسئلہ کی تحقیقات شروع کر دی وہ  
 یہ تخیل کا اثر تھا جسکے باعث اسکے ذہن کو ایک معمولی جڑی واقعہ کے دیکھنے سے اس حیرت انگیز  
 مسئلہ کی جانب تبادر ہوا جسے طبعیات میں انقلاب پیدا کر دیا حاصل یہ کہ تصور کی قوت  
 انسان کی نفسانی اور جسمانی زندگی میں حیرت انگیز اثر کرتی ہے اور یہی قوت ہے جو حقیقت  
 استدلال، نظر و فکر، استقرار اور تجربہ کی بنا ہے۔ اور اس قوت سے انسان کبھی بے نیاز  
 نہیں ہو سکتا۔

لیکن اس ساری تقریر کا تعلق صرف اس حقیقت کے انتہائی پہلو کے ساتھ ہے اور  
 تا وقتیکہ ہم اس حقیقت کے منغیا نہ پہلو پر بھی نظر نہ ڈال لیں اس وقت تک تصور کی وسعت کے

بارے میں ہمارا فیصلہ نامکمل رہیگا حقیقت یہ ہے کہ دنیا کی کوئی شے غیر متناہی نہیں ہو سکتی اور کارخانہ قدرت میں لاتناہی کی کوئی مثال نظر نہیں آتی اور اس بنا پر باوجود تصور کی اتنی زبردست قوت کی یہ ضروری ہے کہ اسکی کوئی حد و انتہا بھی ہو اس مسئلہ کے منفیانہ پہلو کو اسی حد و انتہا کا پتہ لگتا ہے اور اس لیے ہمیں اس حقیقت کے دونوں پہلوؤں پر نظر ڈالنا چاہیے تاکہ واقعہ کے دونوں رخ ہماری نگاہ کے سامنے آجائیں۔

حقیقت یہ ہے کہ گو ہم اپنے تصور کے ذریعہ سے ان دیکھی چیزوں کو دیکھتے اور ان گنت چیزوں کو پیدا کر لیتے ہیں لیکن تصور کی اتنی وسعت و ہمہ گیری کا خیال ہی مبالغہ سے خالی نہیں ہے اگرچہ ایسی بہت سی چیزیں ہیں جنکو نہ جتنے کبھی دیکھا اور نہ کبھی سنا ہے اور باوجود اسکے ہم برابر انکا تصور کرتے ہیں ہم نے لکڑی کو غور و نہیں دیکھا مگر اپنے ذہن میں ان واقعات و حالات کی بنا پر جو ہم نے کتابوں میں پڑھے اور دوسروں سے سنے ہیں اسکا تصور کر سکتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر زیادہ غور سے دیکھو تو نظر آئیگا کہ ہمارے تمام تصورات کی بنیاد ہمارے کسی نہ کسی حاسہ کی کسی نہ کسی شہادت پر ہو ا کرتی ہے اور ایسی چیزیں جو خود ہمارے یا ہمارے ہی ایسے کسی دوسرے ذی حس و داغ کے تجربہ حسی میں نہیں آتیں ان کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے ہیں چھوٹے بچے یا ادنیٰ لوگوں کو دیکھو جنہیں لذت جلال کا تجربہ حسی کبھی نہیں ہوا اسکے ذہن میں کبھی اسکا ادنیٰ تصور بھی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ راقم حروف کا اپنا ذاتی تجربہ ہے کہ اسکے ذہن میں کبھی ان چیزوں کا تصور نہیں پیدا ہوتا جو اسکے تجربہ حسی (جسمین سماعت بصارت اور ہر تمام حواس کا تجربہ) شامل ہے کہ تحت میں کبھی نہیں آئیں یہ نظریہ چونکہ معرکہ الارا ہے اسلئے اپنے باطن کی شہادت ماد و مطلقہ ذہن سے قطع نظر کر کے ہم مندرجہ ذیل دلائل بھی اپنے دعویٰ کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں۔ ہمارا دعویٰ یہ ہے کہ انسان کے ذہن میں کبھی

اوس چیز کا تصور نہیں پیدا ہو سکتا جس کا تجربہ حسی اوسکو کبھی نہیں ہوا ہے اس دعویٰ پر ہمارے پاس پہلی دلیل یہ ہے کہ

(۱) انسان کے جتنے تصورات ہوتے ہیں بلائط سے لیکر مرکب اور پیچیدہ تصورات تک ان سب کی تحلیل اگر کی جائے تو انکی انتہا حیات پر ہوتی ہے اور ہکوانکی تحلیل کرنے سے نظر آتا ہے کہ ان تصورات کی پیدائش کی باعث چند حسی کیفیات نفسیہ ہیں جو پہلے ذہن میں پیدا ہو چکی ہیں اس نفسانی اصول کی ایک سادہ مثال ہم نے کیفیت حس کے تفریعات کے ضمن میں یہ دی تھی کہ مثلاً ایک کلیہ یہ ہے کہ اجتماع صدین محال ہے ظاہر ہے کہ یہ علم انسان کو کسی حاسہ سے حاصل نہیں ہوتا یہ علم نہ ہمنے قوت با صر سے حاصل کیا ہے اور نہ قوت سامعہ اور نہ کسی اور حاسہ سے اور اس بنا پر یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ علم اپنی پیدائش میں حیات مابین کا محتاج نہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس علم کی بنا پر بھی بسیط احساسات پر ہے اور اگر یہ احساسات ہمیں نہ حاصل ہو چکے ہوتے تو یہ علم ہکوکبھی نہیں حاصل ہو سکتا تھا دیکھو ہمارا یہ ذاتی تجربہ ہے کہ ہم نے کبھی شیرینی کو تلخی کے ساتھ، پستی کو بلندی کے ساتھ، خوشبو کو بدبو کے ساتھ، اور سیاہ رنگ کو سپید رنگ کے ساتھ، جمع ہوتے نہیں دیکھا اور ہمارے تجربہ حسی میں کبھی یہ بات نہیں آئی کہ وہ دو متباہن کیفیتیں جنکا ادراک ہمیں مختلف حواس سے ہوتا ہے یکجا جمع ہوتی ہوں اس بنا پر ہم نے ان مختلف حیات اور تجربات کو ایک کلیہ کے تحت میں لا کر ان سب کیفیات کے لیے بحیثیت مجموعی یہ حکم ثابت کر دیا کہ اجتماع صدین محال ہے۔ بیطرح مثلاً اقلیدس کے جتنے علوم متعارفہ ہیں وہ بھی تحلیل ہو کر حیات ہی پر آکر ٹھہرتے ہیں مثلاً یہ ایک علوم متعارفہ ہے کہ ہر کل اپنے جنس سے بڑا ہوتا ہے اس قضیہ کے متعلق ہی یہ خیال ہوتا ہے کہ اسکا ادراک کسی حاسہ سے نہیں ہوتا حالانکہ واقعہ یہ ہے



کہ اس تفسیر میں کل کے لیے عظمت کا جو حکم ہے ثابت کیا ہے وہ درحقیقت کل کے تصور کا ایک جز ہے کل کی تعریف ہی یہ ہے کہ جو جز سے بڑا ہو پس دراصل عظمت کل کی حقیقت سے خارج نہیں ہے اور کل جز کا تصور ہوا ہے تجربہ حسی کی بنا پر ہوا ہے وہ دو خطوط مستقیمہ جن میں سے ایک بڑا اور دوسرا چھوٹا ہو ہم اپنے سامنے کسی سطح پر کھینچ کر کل کی عظمت اور جز کی اصغریت کا تجربہ حسی ہر وقت کر سکتے ہیں اور اس قسم کی چھوٹی بڑی چیز میں جو ہمارے ذہن میں اس تصور کی پیدائش کی باعث ہوتی ہیں انکا تجربہ حسی ہیں اکثر انہی روزانہ زندگی میں ہوتا رہتا ہے۔

اسی طرح وہ تمام امور غائبہ جنکا تجربہ حسی بظاہر ہوا اپنی روزانہ زندگی میں نہیں ہوتا ان پر بھی ہم محض ایسے سے ایمان رکھتے ہیں کہ ہمیں انکا خود یا انکے نظیر کا تجربہ کسی نہ کسی رنگ میں اپنی روزانہ زندگی میں ہوتا رہتا ہے اور اگر ہمیں انکا تجربہ نہ ہوا ہوتا تو کبھی انکا تصور ہمارے ذہن میں نہیں پیدا ہو سکتا تھا ان تصورات کی بھی تحلیل جست کی جاتی ہے تو انکی بھی انتہا تجربہ حسی پر ہوتی ہے خدا کی ذات و صفات پر ہم اوجہ سے ایمان رکھتے ہیں کہ ان صفات کو ہم خود اپنے اندر پاتے ہیں اور اسی مثال اور نمونہ کو پیش نظر رکھ کر ہم ایک ایسی ذات کا تصور کرتے ہیں جو تمام صفات کمالیہ کی جامع ہے مثلاً ہم کہتے ہیں کہ خدا قدیر ہے یہ خیال ہمارے ذہن میں کیوں پیدا ہوتا ہے محض ایسے کہ ہم خود اپنے اندر قدرت کا مشاہدہ کرتے ہیں اور اپنے متین اس صفت سے متصف پاتے ہیں اور قدرت کے اسی نامکمل نمونہ کو پیش نظر رکھ کر ہم ایک ایسی ذات کا تصور کرتے ہیں جسکی قدرت ہم سے ارفع اور بالاتر ہوتی ہے حاصل یہ کہ ہم مثلاً خدا کے اوصاف پر محض ایسے ایمان رکھتے ہیں کہ ان صفات کے ادنیٰ نامکمل نمونے کا ہم خود اپنی ذات کے اندر

مشاہدہ کرتے ہیں اور اس نامکمل نمونے کے مشاہدہ سے ہمارے ذہن میں مکمل اوصاف کا تصور پیدا ہوتا ہے لیکن اگر ہم ان اوصاف کا اپنی ذات کے اندر مشاہدہ نہ کرتے ہوتے تو ایک ایسی آن دیکھی ذات کا تصور جو تمام اوصاف کی جامع ہو جائے ذہن میں کبھی نہ پیدا ہوتا یہی تمام مثالیں ہیں جن سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ بسیط تصورات سے لیکر مرکب تصورات تک کبھی ہمارے ذہن میں اس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتے جب تک وجود خارجی میں کسی نہ کسی رنگ میں انکا تجربہ حسی ہو نہ ہوا ہو لیکن ان مثالوں کے علاوہ ادراکات کی بعض مثالیں ایسی ہیں جنکے متعلق بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ انکی تحلیل کر نیے انکی انتہا حیات پر نہیں ہوتی اور جو بظاہر اس کلیہ سے مستثنیٰ نظر آتی ہیں کہ تمام تصورات اپنی پیدائش میں اپنے احساسات اسبق کے محتاج ہوتے ہیں انہیں مثالوں کو دیکھ کر بعض فلاسفہ یہ کہنے لگے ہیں کہ بعض اشیاء ایسی ہیں جنکا ادراک ہمیں اپنے حواس سے نہیں ہوتا بلکہ یہ ادراکات ہو خدا کی طرف سے عطا ہوتے ہیں اس قسم کے ادراکات کی تحدید فلاسفہ نے کلیت اور وجوب کے ادراکات میں کی ہے یعنی وہ یہ کہتے ہیں کہ اپنی روزانہ زندگی میں ہمارے حواس کے سامنے سے کبھی وجوب اور کلیت کی مثالیں نہیں گذرتیں اور اس بنا پر وجوب و کلیت کے ادراکات ان فلاسفہ کے نزدیک تجربہ حسی سے بالا اور محض خدا کے عطا کردہ ہیں۔ (باقی آئندہ)

## سلطنت اسلام کا خراج

انتہائی عروج کے زمانہ میں

(انپرفیکٹ ریپبلک) عثمانیہ دیندریشی حیدر آباد دکن)

کسی سلطنت کے محصول اراضی (خراج) کے اعداد و شمار اگر معلوم ہو سکیں تو ان سے دو باتیں حاصل ہوتی ہیں۔ اول تو اس بات کا تقریباً صحیح اندازہ لگ جاتا ہے کہ سلطنت کے ذرائع آمدنی کیا تھے اور دوسرے اس سے ملک کی زرعتی حالت پر بھی روشنی پڑتی ہے ان دونوں باتوں کے معلوم ہونے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ملک کی خوشحالی یا مغلسی کا حال کھل جاتا ہے کسی قوم کے ذرائع آمدنی اور اسکے کارناموں کا دار و مدار تا حد اسکی آزادی پر ہوتا ہے۔ اگر ہم کہ کسی ملک کے مختلف زمانے کے محاصل اراضی کے اعداد و شمار کا پتہ لگ سکے تو ہم نہایت آسانی سے اُنکی حکومت کی پالیسی کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ کہ آیا انکے حکمرانوں نے ملک کی فلاح و بہبود میں اتنا حصہ لیا جتنا کہ لینا چاہیے تھا یا نہیں۔ کیونکہ بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ باوجود اسکے کہ سلطنت بالکل برباد ہو چکی ہو شاہی دربار کے تزک و احتشام میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اور چونکہ مورخ عام طور پر ملک کی خوشحالی یا افلاس کا اندازہ شاہی دربار سے کیا کرتے ہیں۔ اس لیے ہمیشہ غلطی ہوتی ہے۔ اور اس بات کا صحیح اندازہ نہیں لگ سکتا۔ بونٹی چارٹرڈ شاہ فرانس کے زمانے میں ایسی ہی غلطی ہوئی تھی،

ہمارے خیال میں یہ بالکل غیر ضروری ہے کہ ہم خلافت عباسیہ کے خراج کی اہمیت کو ظاہر کریں۔ سانکی خلافت زمانہ وسطیٰ اور زمانہ جدید کے درمیان کا وقت ہے۔ اور اسی وجہ سے انکے خراج سے ہم کو یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ ممالک جو آجکل بالکل ویلان اور برباد

پڑے ہوئے ہیں۔ ان کے زمانے میں کس درجہ شاداب اور سرسبز تھے۔ اور اگر کوشش کی جائے تو پھر ویسے ہی سرسبز اور شاداب ہو سکتے ہیں،

عربوں نے سلطنت قائم کرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ محاصل سلطنت کی طرف خاص توجہ کی اور اسکو تقریباً علم ادب کا ایک حصہ بنا دیا۔ دوسری صدی ہجری کے آخر یا تیسری صدی کے شروع ہی میں مختلف بڑے بڑے شہروں کے متعلق ایسی کتابیں موجود تھیں جو گائڈ کا کام دے سکیں۔ ان میں ان شہروں کے اور عجائبات کے علاوہ ان کے محاصل ارضی۔ کارخانجات۔ پیداوار۔ جہازوں کی آمد و رفت وغیرہ کا مکمل حال لجا تا تھا اس قسم کی ایک کتاب (کتاب البصرۃ) عمر ابن شیبہ نے بصرہ کے متعلق لکھی تھی۔ ابن حوقل کا بیان ہے کہ ایسے گائڈ کہ اور کو فد کے متعلق بھی دستیاب ہوتے تھے۔ اور مشرق و مغرب میں عام طور پر لوگ انکو استعمال کرتے تھے۔

حضرت سرور کائنات کی وفات کے بعد جب عربوں نے اپنے رگستانوں سے نکل کر بیرونی ممالک پر فوجبشی شروع کی تو وہ حملہ کرنے سے پہلے ہمیشہ اپنے دشمنوں کے سامنے تین شرطیں پیش کیا کرتے تھے۔ (۱) یہ کہ مسلمان ہو جائیں۔ اس صورت میں انکے حقوق عربوں کے برابر ہو جاتے تھے۔ اور ہر قسم کی تفریق اٹھ جاتی تھی۔ (۲) یا جزیہ اور خراج دینا قبول کریں یعنی بغیر ٹپے اطاعت قبول کر لیں۔ اور اگر یہ بھی منظور نہ تو (۳) لڑنے مرنے کے لیے تیار ہو جائیں تیسری حالت میں تمام مفتوحہ آبادی اور انکا مال و متاع مسلمانوں کی غنیمت شمار ہوتا تھا۔ اور وہ انکے مالک ہو جاتے تھے۔ مگر عام طور پر ان مفتوحہ اقوام کے ساتھ ایسا برا سلوک نہیں کیا جاتا تا جس کے کہ وہ مستحق تھے۔ ان کے مردوں کو قتل نہ کیا جاتا تھا۔ اور

انکی عورتیں اور بچے آزاد اور ہتے تھے، وہ مسلمانوں کے ذمی بنجاتے تھے، بشرطیکہ وہ جزیہ اور خراج برابر ادا کرتے رہیں۔ ان کی مقدار کا فیصلہ عام طور پر ہر ایک مفتوحہ علاقے کے ساتھ علیحدہ علیحدہ ہوا کرتا تھا۔ اور فیصلہ کے بعد اس مقدار میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا تھا،

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں جب سواد کا علاقہ فتح ہوا تو سب سے پہلے اس بات کی ضرورت پیش آئی کہ اس کے خراج کا انتظام کیا جائے۔ چنانچہ جو انتظام حضرت عمرؓ نے اس علاقے کے خراج کا کیا وہی آئندہ دوسرے بادشاہوں کے لیے نمونہ کا کام دیتا رہا۔ حضرت عمرؓ سے اصرار کیا گیا کہ سواد کے علاقے کو مسلمانوں کی فاتح فوج میں اور مال غنیمت کی طرح تقسیم کر دیں مگر انھوں نے ایسا کرنے سے انکار کیا اور کہا کہ ”اگر میں اس علاقے کو اس وقت تقسیم کر دوں تو مسلمانوں کی آئندہ نسلوں کی حق تلفی ہوگی۔ اور تم لوگ فراغ البال ہو جانے کی وجہ سے جہاد میں حصہ نہ لو گے لیکن اگر میں یہ علاقہ ان ہی لوگوں کے ہاتھ میں چھوڑ دوں۔ تو ہماری سرحد دشمنوں کے حملہ سے محفوظ رہیگی۔ اور ہکو سامان حب اور رسد برابر وصول ہوتی رہیگی، اسی بنا پر انھوں نے تمام زمین کو اس کے پرانے مالکوں کے ہاتھ میں چھوڑ دیا اور خراج کا انتظام کیا۔

تمام سواد کے علاقے کی مردم شماری کی گئی اور کل (۵۰۰۰۰) شخص جن میں بچے اور عورتیں شامل نہ تھیں ایسے نکلے جنہر جزیہ لگایا جاسکتا تھا۔ چنانچہ دولت مند و غیر سبب (۴۸) درہم فی کس سالانہ۔ متوسط الحال لوگوں پر (۲۴) درہم اور غریب پر (۱۲) درہم جزیہ لگایا گیا۔ سواد کی باقاعدہ پیدائش کی گئی۔ اس کا طول علف سے عبداً و ان تک

۱۵ ابن حوقل۔ صفحہ ۱۵۱۔ کتاب الممالک والممالک لابن خرداد بہ مصحح ڈی غویہ۔ لیڈن ۱۸۸۹ء صفحہ ۱۵۱

۱۶ ابن خرداد بہ مصحح۔ ابن حوقل صفحہ ۱۵۱ (نوٹ)

(۱۲۵) فرنگ اور عرضِ حُلوان سے عذیب تک (۸۰) فرنگ تھا۔ اس طرح اس علاقے کا رقبہ (۳۶۰۰۰۰۰) جریب تھا۔ ہر جریب پر جس میں گندم کاشت ہو (۴) درہم خراج لگایا گیا جو پر فی جریب (۲) درہم مکھڑ پر (۸) درہم ایسے باغوں پر جسکی زمین کاشت نہوتی ہو (۶) درہم فی جریب اور دیگر سبزمیوے اور ترکاری پر (۶) درہم فی جریب خراج مقرر کیا گیا۔ گھاس پر اور ایسی چیزوں پر جو جلد خراب ہو جائیں خراج نہیں لگایا جاتا تھا۔ دیگر اشیاء پر بھی اسی وقت خراج لگایا جاتا تھا جبکہ زمین کی پیداوار کم از کم (۱۸) سیر ہو۔ اگر زمین قابل کاشت نہوتو مالک زمین خراج ادا نہ کرتا تھا۔ اگر آب پاشی بذریعہ انہار کی گئی ہوتو نصف خراج لیا جاتا تھا۔

یہ تھے مختصر اہ اصول جو حضرت عمرؓ نے سواد کے لیے مقرر کیے۔ اور چونکہ آئندہ ان ہی اصولوں پر عمل درآمد ہوتا رہا۔ اس لیے ان پر غور کرنے سے آئندہ کا حال معلوم ہوتا ہے۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان حکومت کو کسی قسم کا ٹیکس ادا نہ کرتے تھے۔ بلکہ صرف زکوٰۃ اور مال کی درآمد اور برآمد پر محصول ادا کرتے تھے۔ جو عام طور پر قیمت کا چالیسواں حصہ ہوتا تھا یہ مال مسلمان قیدیوں کو آزادی دلانے غریب کی مدد، شہرکون کی مرمت۔ اور انبار اسبیل کے زاد راہ کے انتظام کرنے میں کام آتا تھا۔ جس کا تیسرا حصہ بھی اسی طرح صرف ہوتا تھا اور باقی ماندہ دو حصہ خلیفہ کا حق سمجھا جاتا تھا۔

حکومت اور فوج کا تمام خرچ ذمی برداشت کرتے تھے۔ فوج کے سپاہیوں کو باقاعدہ تنخواہ نہ ملتی تھی بلکہ مال غنیمت کے ایک حصہ کے وہ حقدار سمجھے جاتے تھے۔ اور اسکے علاوہ وہ زمینیں جو مال غنیمت سمجھی جاتی تھیں ان میں تقسیم کر دی جاتی تھیں۔ یہ زمینیں قطائع کہلاتی تھیں۔ مگر ان تمام باتوں کے باوجود ذمی زیادہ سے زیادہ ٹیکس کی رقم صرف

خراج ہی ادا کرتے تھے۔ جو بعض اوقات پیداوار (۵۰) فی صدی حصہ ہوتا تھا۔

حضرت عمرؓ کے اس تمام مالی انتظام کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف تو مسلمان دیگر فکروں سے آزاد ہو کر تمام تر جنگ و جدل میں مشغول ہو گئے۔ اور دوسری طرف خلفاء فتوحات کی طرف مائل ہوئے کیونکہ یہی ایک صورت تھی جس سے وہ اپنے خراج اور آمدنی میں اضافہ کر سکتے تھے۔ مگر فوج میں زمینوں کی تقسیم اور جزیہ کی رقم کی زیادتی کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں میں عام طور پر سستی اور کاہلی پیدا ہو گئی۔ اور خلفاء جو پہلے محض عامل و ناظر تھے بالکل خود مختار ہو گئے۔ انہوں نے آخر میں صدقات اور زکوٰۃ کو بھی اپنا مال سمجھ لیا۔ اور مسلمانوں اور ذمیوں میں محاصل کا فرق اٹھ گیا۔ اس وقت سے تمام محاصل خواہ وہ خراج ہو۔ یا دیگر ذرائع سے وصول ہوئے ہوں جبائیہ کہلانے لگے۔ چنانچہ ابن خلدون لکھتا ہے ”جون جون عیش و عشرت بڑھتی گئی۔ حکومت اور اسکے ملازمین کی ضرورتیں زیادہ ہوتی گئیں۔ مگر کام کرنے کا سلیقہ جاتا رہا۔ اس وجہ سے یہ ضروری ہوا کہ زیادہ آدمی نوکری کھائے جائیں۔ اور انکو معقول تنخواہیں دی جائیں نتیجہ یہ ہوا کہ محاصل بڑھانے پڑے۔ یہاں تک کہ زمین کے مالک اور انکے کاشتکار انہیں ادا نہ کر سکے جس کی وجہ سے ہنر و امان میں ہمیشہ فتور پڑا رہا۔ بقول ابن خلدون مامون کے زمانے ہی میں خراج اور صدقات کا فرق جاتا رہا تھا۔ اور تمام محصول کو جبائیہ ہی کہنے لگے تھے۔

اب ہم سواد کے خراج کے اعداد و شمار نقل کرتے ہیں۔ یہ اعداد مسلسلہ ۷ کے دیوان الخراج سے ماخوذ ہیں۔ یہی وہ تاریخ ہے جسکے اعداد بالتفصیل ہم کو معلوم ہیں۔ کیونکہ

لہ نبذ من کتاب الخراج وصنعة الکتابۃ لابی الفرج قد امته بن جعفر الکاتب  
البغدادی معجمہ ڈی غویہ مطبوعہ لیڈن ۱۸۸۹ء۔ صفحہ ۲۳۶،

اس سے پہلے اعداد امین الرشید کے قتل کے وقت ۱۹۸ھ میں بغداد کے فتنہ و فساد میں  
جلادیں گئے ان اعداد سے اس علاقے کی خوشحالی اور شادابی پوسے طور پر واضح ہو جائیگی،

### سواد الجانب الغربی

نام علاقہ تعداد تعداد انبارہ کر گندم کر جو تعداد درہم کیفیت

انبارہ	۵	۲۵۰	۲۳۰۰	۱۳۰۰	۱۵۰۰۰۰	گندم (۱۱۸۰۰۰) کر جو (۶۳۰۰۰) درہم
مَسْکِن	۶	۱۵۰	۳۰۰۰	۱۰۰۰	۱۵۰۰۰۰	کر گندم (۳۰۰۰۰) درہم
قَطْرَبِل	۱۰	۲۲۰	۱۰۰۰	۱۰۰۰	۲۰۰۰۰۰	گندم (۲۰۰۰۰) کر جو
باد و سَیَا	۱۳	۳۲۰	۳۵۰۰	۱۰۰۰	۲۰۰۰۰۰۰	درہم
بَحْر سَیْر	۱۰	۲۳۰	۱۹۰۰	۱۴۰۰	۱۵۰۰۰۰	کر گندم (۱۴۰۰۰) درہم
رُومَقَان	۱۰	۲۳۰	۳۳۰۰	۳۳۰۰	۲۵۰۰۰۰	درہم
گوٹھ	۹	۲۱۰	۳۰۰۰	۲۰۰۰	۱۵۰۰۰۰	درہم (۳۵۰۰۰) درہم
نَہْر دُر قِیْط	۸	۱۲۵	۲۰۰۰	۲۰۰۰	۲۰۰۰۰۰	درہم
نَہْر جَوْبَر	۱۰	۲۲۴	۱۴۰۰	۶۰۰۰	۱۵۰۰۰۰	کر گندم (۱۵۰۰۰) درہم
کَوْرَة الزَّوَابِی	۲۳۳	۱۳۰۰	۷۲۰۰	۲۵۰۰۰۰		درہم (۱۳۰۰۰) درہم
بَابِل اور خُطْرَنِیَہ	۱۶	۳۴۸	۳۰۰۰	۵۰۰۰	۳۵۰۰۰۰	درہم
فَلَوْجَة العُلَیَا	۱۵	۲۳۰	۵۰۰	۵۰۰	۷۰۰۰۰۰	درہم

لہ کر غلہ کا ایک پیمانہ تھا اور عراق میں استعمال ہوتا تھا۔ ایک گرد (۱۰۰) صاع کے برابر ہوتا تھا۔  
عہ ابن خرازمی صفحہ ۱۸۰ عہ کتاب الخراج۔ لقمان ابن جعفر صفحہ ۲۳ آخر +



نام علاقہ	تعداد وہ قلاؤں یا آبادیوں	گرگندم	کڑ جو	مقدار کل درہم	کیفیت
قَلْوَجَةُ السُّفْلِ	۶	۷۲	۲۰۰۰	۳۰۰۰	۲۸۰۰۰۰
نھرائیں	۳۰	۱۸۱	۳۰۰	۳۰۰	۴۵۰۰۰
عَيْنُ التَّمْرِ	۳	۱۳	۳۰۰	۳۰۰	۴۵۰۰۰
جَبَّةُ وَالْبَلَدِ	۸	۷۱	۱۲۰۰	۱۶۰۰	۱۵۰۰۰۰
سُورَا وَبَرِسِيَا	۱۰	۲۶۵	۷۰۰	۲۳۰۰	۱۰۰۰۰۰۰
بَارُوسَا	۱۰	۷۶۳	۱۵۰۰	۲۵۰۰	۲۵۰۰۰۰۰
السُّلَيْمِيَّةُ الْوَقُوفِيَّةُ	+	+	۵۰۰	۵۵۰۰	۵۰۱۰۰
فُرَاتُ بَادِ قَلْبِي	۱۶	۲۷۱	۲۰۰۰	۲۵۰۰	۹۰۰۰۰۰
سَلْحِيْن	+	۳۳	۱۰۰۰	۱۷۰۰	۱۴۰۰۰۰۰
وَرُوسْتَانُ	+	+	۵۰۰	۵۰۰۰	۱۰۰۰۰
هَزْمُزْجَرْد	+	+	۵۰۰	۵۰۰۰	۲۰۰۰۰
نِسْتَرِيَّة	۷	۱۷۳	۱۲۵۰	۲۰۰۰	۳۰۰۰۰۰
اِيغَارِيقِطِيْن	+	+	۱۲۰۰	۲۰۰۰	۴۰۰۰۰۰
کِسْکَرِيَّة	+	+	۳۰۰۰	۲۰۰۰۰	۲۰۰۰۰۰

۱۷۔ یہ بہت سے جائیدادیں ہیں۔ جو مختلف علاقہ جات سے لیکر ایک علاقہ میں جمع کر دی گئی تھیں  
 بہتیت مجموعی یہ دو علاقوں کے رقبے سے ہی بڑی تھیں (ابن خرداد ذہ ص ۱۱۱)

۱۸۔ اس میں نہر الصلۃ۔ بزرگہ اور دِیَان شامل تھے۔ اس کی محاصل کی مقدار میں میں خرارج اور تمام  
 دیگر محاصل ہیں (۷۰۰۰۰۰۰) درہم تھی۔ (ابن خرداد ذہ ص ۱۱۲)

## سواد جانب الغربی

نام علاقہ	تعدادہ تلوہا ہائیکند	کرگندم	کر جو	تعدادہ کلا درہم	کیفیت
میرزا جسا بوس	۹	۲۶۳	۲۵۰۰	۲۲۰۰	۳۰۰۰۰۰
ترا اذائین	۱۶	۳۶۲	۴۸۰۰	۴۸۰۰	۱۲۰۰۰۰
نصر لوق	+	+	۲۰۰	۱۰۰	۱۰۰۰۰۰
کلوادی خیرین	۳	۲۳	۱۶۰۰	۱۵۰۰	۳۳۰۰۰۰
جازرہ	۷	۱۱۶	۱۰۰۰	۱۵۰۰	۱۳۰۰۰۰ (۲۳۰۰۰۰ درہم)
ملایئۃ العتیقہ	+	+	۱۰۰۰	۱۳۰۰	۱۷۰۰۰۰ (۲۳۶۰۰۰ درہم)
راستقبار	+	+	۲۰۰۰	۲۵۰۰	۲۵۰۰۰۰ (۱۵۰۰۰۰ درہم)
مضروز	+	+	۲۰۰۰	۲۵۰۰	۲۵۰۰۰۰ (۱۵۰۰۰۰ درہم)
سیل	+	+	۲۰۰۰	۲۵۰۰	۲۵۰۰۰۰ (۱۵۰۰۰۰ درہم)
جلوک	۵	۷۶	۱۰۰۰	۱۰۰۰	۱۰۰۰۰۰
جللتا	۵	۷۶	۱۰۰۰	۱۰۰۰	۱۰۰۰۰۰
زینب	۴	۲۳۰	۷۰۰	۱۳۰۰	۲۰۰۰۰ (۱۹۰۰ کرگندم)
رسکرہ	۷	۴۴	۲۰۰۰	۲۰۰۰	۷۰۰۰۰ (۱۸۰۰۰ کرگندم) (۶۰۰۰۰ درہم)
بدرالروز	۷	۸۶	۳۰۰۰	۵۵۰۰	۱۲۰۰۰۰ (۵۱۰۰ کر جو)
بندینجین	۵	۵۴	۶۰۰	۵۰۰	۱۰۰۰۰۰ (۳۵۰۰۰ درہم)
بادرا یا	۷	۲۰۷	۴۷۰۰	۵۰۰۰	۳۳۰۰۰۰
باکسا یا	۷	۲۰۷	۴۷۰۰	۵۰۰۰	۳۳۰۰۰۰

نام علاقہ تعدادہ قلعہ انبار گڑ گندم گڑ جو متعلقہ درہم کیفیت

کورۃ استان <sup>ع</sup> {  
شاذ فیروز + + + + ۱۸۰۰۰۰  
نہروانات :-

نہروان الاعلیٰ <sup>ع</sup> {  
۲۷۰۰ ۱۸۰۰ ۳۵۰۰۰  
نہروان الاوسط { ۲۱ ۳۸۰ ۱۰۰۰ ۵۰۰ ۱۰۰۰۰  
نہروان الاسفل { ۱۰۰۰ ۱۲۰۰ ۱۵۰۰۰

تباذ ابن فیروز نے اپنے ایام حکومت میں سواد سے (۱۵۰۰۰۰۰) درہم وصول کئے تھے  
حضرت عمر ابن خطاب نے (۱۲۰۰۰۰۰) درہم حضرت عمر ابن عبدالعزیز نے (۱۳۳۰۰۰۰) درہم  
اور ابن جہشیر نے (۱۰۰۰۰۰۰) درہم خراج وصول کیا۔ حجاج ابن یوسف نے (۱۸۰۰۰۰۰۰)  
درہم وصول کیے۔ اس تعداد میں (۱۰۰۰۰۰۰۰) درہم شامل نہیں جواسے ظلم سے جمع کیے تھے  
اہل سواد نے گاؤں کو بالکل ممنوع قرار دیا تھا تاکہ زراعت میں ترقی ہو سکے چنانچہ ایک  
شاعر کہتا ہے

شکو نا لیکہ خراب السواد  
فخر جھلا لحو م البقر

۱۲ھ میں ابو العباس عبداللہ بن طاہر کو خراسان سے حسب ذیل خراج وصول  
ہوا۔ (۳۳۸۴۶۰۰۰) درہم نقد سواری کے جانور (۱۳) عدد۔ (۳۰۰۰) بکریاں۔ (۲۰۰۰)  
قیدی جنگی قیمت (۶۰۰۰۰۰) درہم تسی۔ (۱۱۸۷) عدد کپڑے (۱۳۰۰) عدد لوہے کے صندوق  
اور چادرین۔

۱۷ھ ابن خرداذبہ ص ۱۳۱ ۱۷ھ ابن خرداذبہ ص ۳۰۰ تفصیل کے لیے دیکھو ابن خرداذبہ ص ۳۳۱ ۳۳۰

ابن حوقل نے واسطہ کے شہر کا خراج بکوالہ دیوان الخراج ۳۵۰ درہم (۶۰۰۰۰۰) درہم بیان کیا ہے۔ اور گوند کا (۳۰۰۰۰۰۰) درہم، کرمان کے محاصل کی مقدار ۳۵۰ درہم (۵۰۰۰۰۰) درہم تھی۔ حمص کا خراج (۲۳۰۰۰۰۰) درہم تھا۔  
آخر میں ہم تمام سلطنت کے خراج صوبہ وار درج کرتے ہیں۔ اس سے اس نانے کے متول اور خوشحالی کا اندازہ بخوبی ہو سکتا ہے۔

سواد	(۱۳۰۲۰۰۰۰۰) درہم
اھواز	(۲۳۰۰۰۰۰۰) درہم
فارس	(۲۳۰۰۰۰۰۰) درہم
کرمان	(۶۰۰۰۰۰۰) درہم
مکران	(۱۰۰۰۰۰۰) درہم
اصبہان	(۱۰۵۰۰۰۰۰) درہم
سجستان	(۱۰۰۰۰۰۰) درہم
خراسان	(۳۷۰۰۰۰۰۰) درہم
حلوان	(۹۰۰۰۰۰۰۰) درہم
ماہ الکوفہ	(۵۰۰۰۰۰۰) درہم
ماہ البصرہ	(۴۸۰۰۰۰۰) درہم
ہمدان	(۱۷۰۰۰۰۰) درہم
ماسبہان	(۱۲۰۰۰۰۰) درہم

۱۶ ص ۱۶۲ + ۱۷ ص ۲۲۶ - ۳ کتاب الخراج ص ۲۲۹

مصر جان قذق	(۱۱۰۰۰۰) درهم
الایغارین	(۳۸۰۰۰۰) درهم
قُم و قاسان	(۳۰۰۰۰۰) درهم
آذربایجان	(۳۵۰۰۰۰) درهم
رے و دماوند	(۲۰۰۸۰۰۰) درهم
قزوین زنجان و...	(۱۸۲۸۰۰۰) درهم
قُوس	(۱۱۵۰۰۰) درهم
جرجان	(۴۰۰۰۰۰) درهم
طبرستان	(۴۲۸۰۰۰) درهم
تکلیت و طیرها و سن و البوزیج	(۹۰۰۰۰) درهم
شهر درو و صامنا	(۲۷۵۰۰۰) درهم
الموصل	(۶۳۰۰۰۰) درهم
قدی و بَربَدی	(۳۲۰۰۰۰) درهم
دیار دَرَبِیْعَة	(۹۶۳۵۰۰) درهم
ارزن مِیّا فارقین	(۴۲۰۰۰۰) درهم
طُرُون	(۱۰۰۰۰۰) درهم
آرمینیه	(۴۰۰۰۰۰) درهم
امد	(۲۰۰۰۰۰) درهم

دیارمضر	(۶۰۰۰۰۰) درہم
اعمال طریق الفرات	(۲۹۰۰۰۰) درہم
تفسیریں والعوام	(۳۶۰۰۰۰) درہم
جنس	(۲۱۸۰۰۰) درہم
دمشق	(۱۱۰۰۰۰) درہم
اردن	(۱۰۹۰۰۰) درہم
فلسطین	(۲۵۹۰۰۰) درہم
مصر والاسکندریہ	(۲۵۰۰۰۰) درہم
الحرمین	(۱۰۰۰۰۰) درہم
الین	(۶۰۰۰۰۰) درہم
الیمامۃ والبحرین	(۵۱۰۰۰۰) درہم
عمان	(۳۰۰۰۰۰) درہم

مدینۃ السلام بغداد کے ذیوں کا جزئیہ جسکی مقدار (۲۰۰۰۰۰) درہم تھی عراق کے  
خراج میں شامل تھا۔ کہتے ہیں کہ کسر اے ابرو دیز نے اپنی حکومت کے اٹھا دین سال  
تمام سلطنت کے خراج کو شمار کیا۔ اسکی مقدار (۷۲۰۰۰۰) مثقال سونا (۹) اور (۶۰۰۰۰۰۰۰) درہم تھی۔

# دین فطرت

یا

# دین حنیف

(از مولانا عبدالسلام ندوی)

آج جو لوگ مادیت کے نقشے میں چورہین، ان میں بعض نے دوسرے سے مذہبی عقاید و اعمال کا انکار کر دیا ہے، اور بعض نے آیات قرآنیہ کو کہنچ تان کر جدید سائنس و فلسفہ کے مطابق کیتیکی کوشش کی ہے، اور معقول و منقول کی اس تطبیق سے جو مذہب پیدا ہوا ہے اس کا نام فطری مذہب رکھا ہے، لیکن کیا درحقیقت اسی کا نام فطری مذہب ہے؟ اگر اسلام یا اور کوئی مذہب سائنس اور فلسفہ کے مخالف نہیں ہے، تو کیا صرف اس تطبیق توفیق کی بنا پر اسکو فطری مذہب کا لقب دیا جاسکتا ہے؟ یا مذہب کی فطرت سائنس کی فطرت سے مختلف ہے، اور اس اختلاف کی بنا پر ایک مذہب کو فطری یا غیر فطری کہا جاسکتا ہے؟

اس سے تو کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ مذہب اور سائنس دونوں کا دائرہ الگ الگ ہے مذہب صرف انسان کے عقاید و اعمال کی اصلاح کرنا چاہتا ہے، اور سائنس کو کسی کے عقاید و اعمال سے بحث نہیں ہوتی بلکہ وہ صرف اشیاء کی حقیقت اور ان کے افعال و خواص سے بحث کرتا ہے، اسکو اس سے غرض نہیں کہ اس سے دنیا کو کیا نفع و نقصان پہنچے گا، لیکن کوئی مذہب انسان کے نفع و ضرر کو نظر انداز نہیں کر سکتا، اسلئے مذہب کی فطرت سائنس کے قانون قدرت سے بالکل مختلف ہے، اسلئے مذہب کے دائرے میں رہ کر

مادیت اور روحانیت میں جو جنگ ہو سکتی ہے وہ سائنس اور مذہب کی جنگ سے بالکل مختلف ہوگی، سائنس اور مذہب میں اگر باہم مصالحت ہو جائے، اور سائنس کے تمام تازہ ترین انکشافات کے اصول قرآن مجید سے ڈھونڈ ڈھونڈ کے نکال لئے جائیں تو جو لوگ مادیت کے نشہ میں چو رہو کہ فطری مذہب کی تلاش میں سرگرم ہیں، ان کو اپنی کہوٹی ہوئی دولت لمبا نیکی، لیکن درحقیقت یہ فطری مذہب نہیں ہے، بلکہ فطری مذہب وہ ہے جس کا خاکہ حکماء جدید نے ان الفاظ میں کہینچا ہے،

”ثواب آخرت کے یہ معنی ہیں کہ انسان قانون کا پابند ہو، لیکن یہ قانون کیا ہے؟ اپنی ذات کی حفاظت، ان خصائص کو ترقی دینا جو انسان کی فطرت میں مضمر ہیں، بنی نوع کی محبت اور خدمت، خدا کی عبادت، لیکن خدا کی عبادت کے کیا معنی ہیں؟ اپنے ذاتوں کا ادا کرنا، اچھے کام کرنا، وطن کی محبت، عمل اور اخلاص ہی فطری مذہب ہوا یہی فطری عبادت ہے یہ تو فطری مذہب کے اعمال ہیں، عقاید یہ ہیں ایک قادر مطلق کا یقین جو ہر چیز پر قادر ہے جس کو کوئی شے بدل نہیں سکتی، اور جس کے تمام کام اصول اور ترتیب پر مبنی ہیں۔“

موجودہ مادہ پرستی کے دور میں اگرچہ اس فطری مذہب کے خاکے میں بھی روحانیت کی رنگ آمیزیان نظر آتی ہیں، لیکن دنیا پر فریب دہ روحانیت کا ایک دور الیابھی گزر رہا ہے جس میں یہ مذہب خالص مادی مذہب سمجھا جاتا تھا، لیکن خدا نے اسی روحانیت آمیز مادیت کا نام فطرت رکھا۔ اور پیغمبر اسلام کو حکم دیا۔

فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا فِطْرَةَ اللَّهِ  
الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللَّهِ  
اپنا منہ ہر طرف سے موڑ کر دین کی طرف کر دے  
خدا کی وہ فطرت ہے جس پر تمام دنیا کو پیدا کیا ہے



ذلك الدين القيم ولكن اكثر الناس  
لا يعلمون،  
خدا کی خلقت میں تبدیلی نہیں ہو سکتی یہ سیدھا  
دین ہے، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے،

جو لوگ مذہبی تاریخ سے ناواقف ہیں وہ اس فطرت کو قانون قدرت کا مرادف  
سمجھتے ہیں، اور اسی غلط فہمی کی بنا پر تطبیق معقول و منقول کو اپنا مذہبی فرض سمجھتے ہیں لیکن  
درحقیقت وہ کسی قانون، کسی اصطلاح، اور کسی فلسفہ کی مرادف نہیں ہے، بلکہ صابی مذہب  
کی حریف اور اسکی مد مقابل ہے، جس کی بنیاد کسب پر قائم ہے، یعنی یہ کہ انسان صرف  
مجاہدہ، مراقبہ اور ریاضت شاقہ کے ذریعہ سے وہ روحانی کمالات حاصل کر سکتا ہے جو اسکو  
خدا تک پہنچا سکتے ہیں، لیکن دینِ قیم نے اسکا ذریعہ صرف تکمیل فطرت کو قرار دیا ہے، چنانچہ  
علامہ عبدلکریم شہرستانی مل دخل میں لکھتے ہیں:

وانما مدار مذہبهم على التعصب لا الحائز  
لما ان مدار مذہب الخفاء هو تعصب  
للشجر الجمائين والصائبة تدعى  
ان مذہبنا هو الاکتساب الخفاء تدعى  
ان مذہبنا هو الفطرة فدعوة الصائبة  
الى الاکتساب دعوة الخفاء الى الفطرة  
صائبین کے مذہب کا دار و مدار روحانیت کی  
حمایت پر ہے، جیسا کہ حقائق کے مذہب کا دار و مدار جسمانی  
آدمیوں کی حمایت پر ہے، صائبیت کا دعویٰ ہے کہ  
ہمارا مذہب کسب ہے، اور خفاء دعویٰ کرتے ہیں کہ  
ہمارا مذہب فطرت ہے، پس صائبیت کی دعوت  
اکتساب کی طرف ہے اور خفاء کی دعوت فطرت کی طرف،

صابی مذہب نے اکتساب کی جو دعوت دی ہے وہ اس روحانی اصول پر مبنی ہے کہ

(۱) خدا چونکہ بالکل مجرد عن المادہ ہے، اسلئے انسان اس مادیت کے ساتھ اس تک  
رسائی نہیں حاصل کر سکتا، جو لوگ نبوت کے مدعی ہیں، وہ بھی مادی حیثیت سے عام انسانوں

مل دخل جلد دوم صفحہ ۹۵،

بالا ترہین ہین، سب لوگ جو کہاتے ہین وہ بھی کہاتے ہین، سب لوگ جو پیتے ہین وہی وہ بھی پیتے ہین، جیسی شکل و صورت تمام دنیا کی ہوتی ہے ویسی ہی انکی بھی ہوتی ہے، غرض وہ کسی طریقہ سے انسان اور خدا کے درمیان واسطہ ہین بن سکتے،

(۲) البتہ خدا اور انسان کے درمیان روحانیت کا ایک ایسا سلسلہ قائم ہے جسکو اگر واسطہ بنایا جائے تو خدا تک رسائی ہو سکتی ہے،

(۳) لیکن جب تک سخت سے سخت ریاضتیں نہ کی جائیں، متصل روزے نہ رکھے جائیں، قریبیاں نہ کی جائیں، عود و عذیر نہ لگائے جائیں، رعبانیت نہ اختیار کی جائے، مرغوبات و لذات سے ہاتھ نہ اٹھایا جائے ہم میں وہ روحانی استعداد ہین پیدا ہو سکتی جسکے ذریعہ ہم ان روحانیت سے مناسبت پیدا کر سکیں جو ہمارے اور خدا کے درمیان واسطہ کا کام دے سکتے ہین، لیکن یہ کتنی عجیب بات ہے کہ نتائج کے لحاظ سے یہ روحانی مذہب خالص مادی قالب میں ڈھل گیا، صابین نے غیر مجرم روحانیت کا جو عقیدہ قائم کیا اسکا نتیجہ ہوا کہ انھوں نے فطری روحانیت یعنی نبوت کا کلیتہً انکار کر دیا،

حضرت نوح ہی کے زمانہ سے ہمارے کانون میں کفار کی جویہ آواز آتی ہے کہ ہم اپنے ہی جیسے آدمی کا اتباع ہین کرتے، وہ بھی صابیت ہی کی آواز ہے، لیکن اسی کے ساتھ انھوں نے جن روحانیت کو خدا تک پہنچنے کا وسیلہ بنایا تھا، مادیات کو ان کا منظر قرار دیا اسلئے بت پرستی کا ایک عام سلسلہ قائم ہو گیا، جو حضرت نوح علیہ السلام کے زمانہ سے لیکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ تک قائم رہا، صابی مذہب کی سب سے زیادہ گرم بازاری حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ میں تھی، اور وہی زمانہ بت پرستی کے عروج کا زمانہ بھی تھا لیکن دین قیم اور دین فطرت نے صرف تکمیل فطرت پر اپنی بنیاد رکھی جو

اگرچہ مادیت سے ممزوج مٹی لیکن اُسکا روحانی نتیجہ نکلا کہ

(۱) روحانیت کا جو واسطہ لازمی طور پر پست پرستی کی طرف منجر ہوتا تھا بالکل اڑ گیا، اور دینِ قیم خالص موصدا نہ مذہب بن گیا،

(۳) تکمیلِ فطرت کے مدارج کے لحاظ سے انسانوں کے مختلف طبقے قرار پائے اور ان میں جو طبقہ سب سے بلند تر تھا اسکو نبوت کا شرف حاصل ہوا، اور وہ خدا اور عالم انسانوں کے درمیان واسطہ قرار پایا،

(۴) علی طور پر صابی مذہب نے کسبِ روحانیت کے جو طریقے مقرر کئے تھے، وہ نہایت سخت تھے، اسلئے ہر شخص اس سے عہدہ براہین ہو سکتا تھا، لیکن یہ فطرتِ جمپر دینِ حنیف دینِ قیم، اور دینِ ابراہیمی کی بنیاد قائم ہے، نہایت آسان چیز ہے، اسلئے خدا نے اس فطری مذہب کو دینِ قیم یعنی سید ہا ساد ہا دین کہا ہے، صابین کو خدا تک پہنچنے کے لئے سخت مجاہدہ، مراقبہ اور ریاضتِ شاقہ کی ضرورت ہوتی تھی، لیکن دینِ حنیف نے جس فطرت کو اسکا ذریعہ بنایا، وہ صرف چند اخلاقی، مذہبی اور تمدنی اصول سے مرکب ہے، جو شاہِ دلی اللہ صاحب کے بیان کے مطابق حسبِ ذیل ہیں،

(۱) طہارت و نفاست، یہی وجہ ہے کہ جو دس طہارتیں حدیث شریف میں مذکور ہیں، یعنی مسواک کرنا، ناک میں پانی ڈالنا، ناخن تراشنا وغیرہ، انکو خصالِ فطرت کہا جاتا ہے، اور وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف منسوب ہیں، جو دینِ فطرت یعنی دینِ حنیف کے بانی ہیں،

(۲) اخبات، یعنی خدا کی صفات کاملہ کا تصور کر کے اُسکے سامنے عجز و الحاح کرنا، (۳) ساحت یعنی نفس میں ایک ایسی کیفیت کا پیدا ہو جانا جو انسان کو قوائے شہوانیہ کی

اطاعت سے روک دے،

(۴) عدالت، یعنی نفس میں ایک ایسے ملک کا پیدا ہو جانا جس سے انسان ایسے کام کر سکے جو تمدن کے لئے مفید ہوں،

چنانچہ ان اصول کے ذکر کرنے کے بعد شاہ صاحب لکھتے ہیں،

والحالۃ الملکۃ مہمختصۃ بالقطرۃؑ ان سے جو حالت مرکب ہوتی ہے اسکا نام فطرت ہے

اسلام اسی فطرت کی تکمیل کے لئے دنیا میں آیا تھا، اسلئے اس نے اپنے آپکو فطری اور

صابی مذہب کو جو بت پرستی کی صورت میں ہر جگہ موجود تھا غیر فطری مذہب کا خطاب دیا،

اسلام کا مقابلہ دنیا کے تمام مذاہب کے ساتھ تھا، فلسفہ اور سائنس کے ساتھ نہ تھا اسلئے

یہ غلطی ہے کہ سائنس و فلسفہ کی مطابقت و عدم مطابقت کی بنا پر اسکو فطری یا غیر فطری

مذہب قرار دیا جائے سائنس اور مذہب دونوں کی دنیا الگ الگ ہے، اسلئے دونوں کی فطرت

بھی مختلف ہے، سائنس کی فطرت دنیا کے ذرے ذرے میں موجود ہے، لیکن مذہب کی فطرت کا

مظهر نفس انسانی کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا،

## تلخیص و تبصرہ

### بہاء اللہ

(از مسٹر پیٹم سنگھ ایم، اے)

اس بہائی تحریک میں جسکا بانی باب تھا، مرکز ہی شخصیت بہاء اللہ کی ہے، بہاء اللہ کا اصلی نام مرزا حسین علی تھا، اسکے والدین ایران کے دار السلطنت طهران کے متمول باشندے تھے، اور والد وزیر حکومت تھے، بہاء اللہ کا سال پیدائش ۱۸۱۷ء تاہیج عالم میں ایک یادگار سنہ رہیگا، بہاء اللہ کو مرزا علی محمد باب، بانی مذہب بابیہ کے اولین متبعین میں ہونے کا شرف حاصل ہے، افسوس ہے کہ اسکی ابتدائی زندگی کے حالات موجود نہیں، سب سے پہلے ان کا نام بحیثیت بابی ہونے کے منظر عام پر اسوقت آتا ہے، جب ۱۸۴۷ء میں ایک بابی بمقام تبریز باب کی شہادت کے انتقام میں شاہ ناصر الدین والی ایران کے اقدام قتل کا مرتکب ہوا تھا اس جرم کے پاؤش میں بایوں کو شدید مصائب برداشت کرنے پڑے، اور اگرچہ بہاء اللہ کے متعلق یہ ثابت ہو گیا کہ ان کا اس سازش سے کوئی تعلق نہ تھا، اور چار مہینہ کی اسیری کے بعد انہیں رہائی بھی حاصل ہو گئی تھی، تاہم مصالحہ ملی کے لحاظ سے انہیں بعد ازاں وطن ہونا پڑا اسوقت انکی عمر ۳۷ سال کی تھی، یہاں ان کا قیام دو سال تک رہا، اس مدت میں وہ برابر کلام حق کی تبلیغ کرتے رہے، اور اسکے بعد علاقہ کردستان کے کوہ سلیمانہ کے غاروں میں خلوت گزین ہو گئے، اس زمانہ عزلت کے متعلق بعد کو وہ اپنی، ایک عرینہ کو ان الفاظ میں تحریر کرتے ہیں :-

”میں نے اپنی صحبت صرف جنگی پرندوں اور صحرائی درندوں کے ساتھ رکھی، اور اس مادی دنیا سے مثل ایک برقِ روحانی کے گزر گیا، اسکے بعد کم و بیش دو سال تک میں ہر وقت یادِ الہی میں مشغول رہا، اور اس واسطے آنکھیں بند کر کہیں“

۱۸۵۷ء میں احبابِ داعیہ کے اصرار سے وہ بغداد کو واپس آئے، انگریزی حکومت نے انکو دعوتِ دی کہ وہ ہندوستان میں بطور انگریزی رعایا کے رہ سکتے ہیں، لیکن بہار اللہ نے اس دعوت کو قبول نہ کیا، اور اپنی بود و باش کے لئے ترکی علاقوں کو ترجیح دی،

علمائے شیعہ جس طرح باب کے دشمن تھے، اسی طرح بہار اللہ کے بھی دشمن ہو گئے اور انھوں نے انکی تحریک کے برخلاف بغداد میں ایک شورش برپا کر دی، ترکی حکومت کے سامنے بہار اللہ کا روزِ افزون اقتدار ایک خطرناک شکل میں پیش کیا گیا، اور نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۸۶۳ء میں بہار اللہ کو قسطنطنیہ میں طلب کیا گیا، اسوقت انکی عمر ۴۸ سال کی تھی، اور بغداد میں گیارہ سال تک قیام رہ چکا تھا،

قسطنطنیہ میں حکومتِ ترکی کے همان کی حیثیت سے بہار اللہ کا قیام چار مہینہ تک رہا، اس اثنا میں بعض ذی اثر حکام کی سازشوں سے جدید حکم یہ صادر کیا گیا کہ بہار اللہ کو اڈریانوپل منتقل کیا جائے، چنانچہ اسی ۱۸۶۳ء میں بہار اللہ کو مع اپنے رفقاء کے اڈریانوپل منتقل ہونا پڑا، یہیں اگر انھوں نے اول اول اپنے پیاماتِ ربانی کی باضابطہ اشاعت شروع کی، جیسے ”اس“ کے ظہور کی خبر تھی، جسکی بشارت باب کے بیان میں آچکی تھی، گویا بابِ مسیحِ بہائیت کے لئے بمنزلہ یوحنا حواری کے تھے، اسی وقت سے بہار اللہ اور صبحِ ازل کے درمیان اختلاف کی بنیاد پڑی جو باب کا سوتیلا بہائی اور اکثر دن کے نزدیک مسکا صبحِ خلیفہ تھا، ترکی حکومت نے اس تعیض کا فیصلہ یوں کیا کہ فریقین کو ایک دوسرے سے

علحدہ کر دیا، اور بہار اللہ کو عکہ اور صبح ازل کو قبرس میں جلا وطن کر دیا، اور چونکہ اس حکم کا مقصد جماعت میں انتشار پیدا کرنا تھا، اسلئے متبعین کے ایک حصہ کو سوداؤں اور ایک کو خرطوم جلا وطن ہونا پڑا، بہتوں نے اپنے ہاتھ سے خودکشی کر لی، بہتوں کو قتل کر دیا گیا اور بایون پر ظلم و تعدی کی کوئی انتہا نہ رہی، (ان مظالم کی تفصیل مرزا جوادی کی تاریخ میں ملے گی جس کا انگریزی ترجمہ پروفیسر براؤن نے اپنی جدید تصنیف ”بابی ریلیجن“ میں شامل کیا ہے)

بہار اللہ کی عمر ۲۲ سال کی تھی، جب انہیں عکہ کے قید خانہ میں قید کیا گیا، اور اس وقت کے بیکر ۱۸۶۲ء تک یعنی پورے ۲۲ سال کی مدت قید خانہ ہی میں گزری، اور اسی قید خانہ ہی سے وہ پیام ربانی کی تبلیغ کرتے رہے، سلاطین و دایان ملک کے نام خطوط و مکاتیب جمیں انہیں حق شناسی پر توجہ دلائی گئی ہے، یہیں سے لکھے گئے تھے، بہار اللہ کے مجموعہ تصانیف کا نام ”کتاب الافدس“ ہے، جو بہائی مذہب کے حسب اعتقاد الہامی کتاب ہے، اور جس میں بہائیوں کیلئے واجب العمل احکام و رجہن، ذیل میں چند اقتباسات درج کئے جاتے ہیں، جن سے اس اعلیٰ تعلیم کا اندازہ ہوگا جو بہار اللہ نے متلاشی حق دنیا کے سامنے پیش کی ہے، بہائیت کی الہیات پر گفتگو کرنا سروسرست میرا مقصود نہیں، تاہم میرا یقین ہے کہ اس زمانہ میں بہار اللہ کا فلسفہ منجملہ بہترین فلسفوں کے ہے، اور ایسا فلسفہ جو سب سے زیادہ معقول اور سب سے زیادہ قابل عمل ہے، اقوال ذیل ملاحظہ ہوں،

(۱) ہر مذہب و ملت کے اشخاص کے ساتھ جس سلوک پیش آؤ،

(۲) تم سب ایک ہی درخت کے پھل، اور ایک ہی شاخ کی پتیان ہو، اپنے محبوب و وطن ہونے پر غرور کی کوئی بات نہیں، البتہ محب عالم ہونے پر ہے،

(۳) اے باشندگان ارض! خدا کے مذہب کو منافرت کا جیلہ نہ بناؤ، خدا کی قسم خدا کا

- دین و مذہب ارتہاد و اتحاد کے لئے آیا ہے نہ کہ لفاق و اختلاف کے لئے،
- (۴) مارپیٹ، جنگ و جدل، قتل و غارت، جنگلی درندوں کے افعال میں جو ظلم و جہالت کے غاروں میں رہتے ہیں، خدا کے برگزیدہ بندے ان چیزوں سے پاک اور ارفع ہوتے ہیں،
- (۵) مذہب کی تقویت اعمال سے ہوتی ہے، اور فضایل اس کے معین ہوتے ہیں، اسے بہاؤ پر ایمان لانے والی، فضیلت (نیکی) پر مضبوطی سے قائم رہو،
- (۶) انسان کی فضیلت یہ ہے کہ وہ خدمتِ خلق و تزکیہ نفس میں مشغول رہے نہ کہ عیش و عشرت اور زرو مال میں۔
- (۷) اپنی نظروں کو پاکباز، اپنے ہاتھوں کو باامانت، اپنی زبان کو صداقت شعار، اور اپنے قلب کو ایمان دار رکھو،
- (۸) اگر کوئی متلاشی، سلطان ازل کے راستہ کو قطع کرنا، اور اس کی تلاش و تحقیق کرنا چاہتا ہے، تو اسے چاہیے کہ پہلے اپنے قلب کو صاف و طاہر کرے، کہ اسی تخت پر مشرقِ حقیقی جلوہ آرا ہوتا ہے،
- (۹) اسے خدا پر ایمان لانے والو خدا کا کلام مثل درخت کے ہے، اس کی تخم ریزی قلوب انسانی کے تختہ پر ہونا چاہیے، اور اس کی آبپاری ذکر و فکر کے دریا سے ہونا چاہیے تاکہ اس کی جڑیں مضبوط ہو جائیں اور اس کی شاخیں آسمان تک پہنچ جائیں،
- (۱۰) میرے تمام اعضا اس حقیقت کی شہادت دے رہے ہیں کہ وعدہ لاشریک موجو اور جن پر اس نے انکشاف حق کر دیا ہے، اور جنہیں اس نے ہدایت خلق کے لئے بھیجا ہے، وہ اس کے مظاہر اور عالم مخلوقات میں اس کی وحی کے حامل ہیں،
- (۱۱) اسے باشندگان ارض: خدا کے مذہب کو اپس میں اختلاف کا آلہ نہ بناؤ، الحق ا مذہب دنیا کو متحد کرنے کے لئے آیا ہے،



علحدہ کر دیا، اور بہار اللہ کو عکہ اور صبح ازل کو قبرس میں جلا وطن کر دیا، اور چونکہ اس حکم کا مقصد جماعت میں انتشار پیدا کرنا تھا، اسلئے متبعین کے ایک حصہ کو سودان اور ایک کو خرطوم جلا وطن ہونا پڑا، بہنوں نے اپنے ہاتھ سے خود کشتی کر لی، بہنوں کو قتل کر دیا گیا اور بایون پر ظلم و تعدی کی کوئی انتہا نہ رہی، ان مظالم کی تفصیل مرزا جواد کی تاریخ میں ملے گی جبکہ انگریزی ترجمہ پروفیسر براؤن نے اپنی جدید تصنیف ”بابی رجیمن“ میں شامل کیا ہے۔

بہار اللہ کی عمر ۲۵ سال کی تھی، جب انہیں عکہ کے قید خانہ میں قید کیا گیا، اور اس وقت لیکر ۱۸۵۹ء تک یعنی پورے ۲۴ سال کی مدت قید خانہ ہی میں گزری، اور اسی قید خانہ ہی سے وہ پیام ربانی کی تبلیغ کرتے رہے، سلاطین و دایان ملک کے نام خطوط و مکاتیب جنہیں انہیں حق شناسی پر توجہ دلائی گئی ہے، یہیں سے لکھے گئے تھے، بہار اللہ کے مجموعہ تصانیف کا نام ”کتاب الاقدس“ ہے، جو بہائی مذہب کے حسب اعتقاد الہامی کتاب ہے، اور جس میں بہائیوں کیلئے واجب العمل احکام و روح ہون، ذیل میں چند اقتباسات درج کئے جاتے ہیں، جن سے اس اعلیٰ تعلیم کا اندازہ ہوگا جو بہار اللہ نے متلاشی حق دنیا کے سامنے پیش کی ہے، بہائیت کی اہمیت پر گفتگو کرنا سروسرست میرا مقصود نہیں، تاہم میرا یقین ہے کہ اس زمانہ میں بہار اللہ کا فلسفہ منجملہ بہترین فلسفوں کے ہے، اور ایسا فلسفہ جو سب سے زیادہ محفول اور سب سے زیادہ قابل عمل ہے، اقوال ذیل ملاحظہ ہوں،

(۱) ہر مذہب و ملت کے اشخاص کے ساتھ بہ حسن سلوک پیش آؤ،

(۲) تم سب ایک ہی درخت کے پھل، اور ایک ہی شاخ کی پتیان ہو، اپنے محبوب وطن ہونے پر غرور کی کوئی بات نہیں، البتہ محب عالم ہونے پر ہے،

(۳) اے باشندگان ارض! خدا کے مذہب کو منافرت کا جیلہ نہ بناؤ، خدا کی تم، خدا کا

## فرقہ یزیدیہ

پائیر کا مخصوص مراسلہ نگار عراق عرب سے ایک فرقہ کا حال لکھتا ہے جو شیطان کی پرستش کرتا ہے، مضمون نگار کی روایت ہے کہ اس فرقہ کا نام یزیدی ہے، اور یہ عربوں اور کردوں کی مخلوط نسل سے مرکب ہے، انکی تعداد ۶۰ ہزار ہے، اور ان میں سے اکثر کا مسکن جبل سحر ہے، جو دجلہ کے پورب موصل کے مقابل واقع ہے، انکی کچھ تعداد حلب، دیار بکر، طلس، دھران میں بھی موجود ہے، انکی زبان کردی زبان کی ایک شاخ ہے، بلحاظ عادات و خصائل، یہ لوگ بڑے جفاکش، باہمت، پاکباز و دھماں نواز ہیں، لیکن ساتھ ہی باسکل جاہل بھی ہیں، اور اسکی وجہ یہ ہے کہ تعلیم ان کے مذہب میں قطعاً ممنوع ہے، حکومت کے جبر و تعدی سے انکی جماعت روز بروز گھٹتی جاتی ہے، چنانچہ ۱۹۹۱ء میں یہ کئی ہزار کی تعداد میں قتل ہو چکے ہیں،

ان کا مذہب دراصل قدیم طرز کی عجوبہ پرستی کا مظہر ہے، جہیں مسیحیت، یہودیت، و اسلام تینوں کے عناصر شامل ہیں، انکا عقیدہ یہ ہے کہ سب سے بڑی قوتیں دو ہیں، ملک طاؤس، اور ملک عیسیٰ، جن میں سے اول الذکر ابہرمن (شیطان) اور آخر الذکر یزدان (خدا) کے مرادف ہے، ان میں سے ہر قوت کی مدت حکومت دس ہزار سال تک رہتی ہے لیکن آجکل چونکہ شیطان کا دور حکومت ہے، لہذا اسی کی عبادت واجب ہے،

شیطان کی مدت حکومت کے چار ہزار سال گزر چکے ہیں، اور چھ ہزار سال باقی رہ گئے ہیں، اس مدت کے اختتام پر عیسیٰ کا ظہور ہوگا، جو شیطان کو جہنم میں بھیجیں گے،

اور وہ دہان پہنچ کر اس قدر گرہ دہکا کر بیگا کہ آتش دوزخ اسکے آنسوؤں سے سرد ہو جائیگی اس وقت اسکی خطا معاف ہوگی اور اس وقت وہ از سر نو معلم الملکوت کے مرتبہ پر سرفراز ہوگا،

آج کل جو مسیح کا درجہ بلند ترین نہیں، اسکی وجہ یہ ہے کہ اس وقت ان کا عمل حکومت نہیں اور چونکہ وہ نہایت حلیم، رحیم، کریم و خطا پوش ہیں اسلئے ان سے ڈرنے اور خوف کرنیکی کوئی ضرورت نہیں،

دعوتوں اور ضیافتوں کے موقع پر یہ لوگ ایک بھیر کی مسیح کے نام پر قربانی کرتے ہیں اور سات بھیروں کی شیطان کے نام پر اسلئے کہ شیطان بڑا ہی سخت گیر و غضبناک معبود ہے، یہ لوگ مسیح کے حلول پر اعتقاد رکھتے ہیں، لیکن صلیب پر انکے وفات پانے کو نہیں مانتے، مسیح کے ظہور اول کو یہ لوگ ناکام قرار دیتے ہیں، اسلئے کہ اس وقت وہ قوت عصیان کو شکست نہ کر سکے، یہ لوگ صلیب کا احترام کرتے ہیں، آفتاب و ماہتاب کو مقدس مانتے ہیں، اور جس مقام پر آفتاب کی شعا میں سب سے پہلے پڑتی ہیں، اسکو روز چوتھے ہیں، ان کا اعتقاد ذات باری پر مبنی ہے، لیکن چونکہ ان کے حسب اعتقاد اس کا تعلق صرف آسمان سے ہے، اور دنیا اور مافی الدنیا سے اسے کوئی سروکار نہیں، اسلئے اسکی

عبادت ضروری نہیں سمجھتے، حضرت محمد کو پیغمبر برحق تسلیم کرتے ہیں اور مکہ کو مقام مقدس مانتے ہیں، سانپوں کی پرستش تو شاید یہ لوگ نہیں کرتے تاہم ان کے معابد میں بڑے بڑے سیاہ سانپوں کی تصویریں بنی ہوئی رہتی ہیں، اور آگ میں تھوکنے انکے ہاں معصیت کبیرہ ہے اس عمارت کے سامنے جبکہ اندر شیطان کی مورتیں رہتی ہیں، ہمیشہ چراغ روشن رکھے جاتی ہیں

ان کے حسب اعتقاد، انسان کی خلقت آدم و حوا سے ہوئی ہے، لیکن آدم و حوا اب تک ایک ایک نہیں بلکہ اکثر اکثر کی تعداد میں پیدا ہو چکے ہیں، اور ان میں سے ہر

ہوتے ہیں، اور وہ کمزور دن کی برابر ادا کرتے رہتے ہیں،

ہماری طرح وہ بھی خاندان میں منقسم اور مختلف مشاغل میں مصروف رہتے ہیں، البتہ ان کے گھرانوں میں صرف بالغ افراد ہوتے ہیں، بچہ نہیں ہوتے، اسلئے کہ بخلاف ہماری دنیا کے ان کے عالم میں سلسلہ توالد و تناسل نہیں، افراد خاندان میں اضافہ یوں ہوتا رہتا ہے کہ جہاں کسی جن کو اسکی خواہش پیدا ہوئی، معاً ایک بالغ جن وجود میں آجاتا ہے اسی طرح جہاں انہیں خواہش تغذیہ پیدا ہوئی، معاً غذا مل جاتی ہے، لیکن یہ واضح رہے کہ انکی غذا بھی نہایت لطیف ہوتی ہے، اغذیہ ناسوتی کی طرح کثیف نہیں ہوتی، انکی جسمانی خواہشوں کی تعمیل فی الغیر ہوتی ہے، اور ہر خواہش پیدا ہوئی اور اور دہر پوری ہو گئی، عالم خاکی طرح انہیں قیام و بقا سے حیات کے لئے کسی طرح کی جدوجہد نہیں کرنا پڑتی، ہر جن کی (خواہ وہ ذکور میں سے ہو یا اناث سے) عمر طبعی تین کردر ساٹھ لاکھ سال کی ہوتی ہے، اور یہ ساری مدت عشر و راحت کے ساتھ کٹی ہے، اور اگر اس عمر میں قوانین کی پوری طرح پابندی کی جاتی رہی تو اس مدت کے خاتمہ پر رفتہ رفتہ مختلف قابلوں سے گذر کر ہر جن بالآخر برہم لوک (عالم لہوت) تک پہنچ جاتا ہے، جو دیولوک (عالم ملکوت) سے کہیں برتر و ارفع ہے اور ارتقائے وجود کی انتہائی منزل ہے،

چونکہ جنات مختلف مراتب و مدارج کے ہوتے ہیں، اسلئے ان کے مذاہب بھی مختلف ہوتے ہیں، بالکل اسی طرح کہ جیسے انسانوں میں بہ کثرت مذاہب و ادیان ہیں البتہ چونکہ ان کا مرتبہ عقل و روحانیت ہم سے بدرجہا برتر ہے، اسلئے ان میں ہماری طرح مناقشہ و مکابرہ برپا نہیں رہتا، ہر فرد اپنے اپنے عقیدہ کا پابند رہتا ہے، اور آپس میں پوری رواداری و موداری ملحوظ رہتی ہے، اور صرف عقاید ہی نہیں بلکہ اعمال حسنہ میں بھی ان کا قدم

علماء کو دیا، اور بہار اللہ کو عکہ اور صبح ازل کو قبرس میں جلا وطن کر دیا، اور چونکہ اس حکم کا مقصد جماعت میں انتشار پیدا کرنا تھا، اسلئے متبعین کے ایک حصہ کو سودان اور ایک کو خرطوم جلا وطن ہونا پڑا، بہتوں نے اپنے ہاتھ سے خودکشی کر لی، بہتوں کو قتل کر دیا گیا اور باقیوں پر ظلم و تعدی کی کوئی انتہا نہ رہی، (ان مظالم کی تفصیل مرزا جواد کی تاریخ میں ملے گی جس کا انگریزی ترجمہ پروفیسر براؤن نے اپنی جدید تصنیف ”بابی ریجن“ میں شامل کیا ہے)

بہار اللہ کی عمر ۲۷ سال کی تھی، جب انہیں عکہ کے قید خانہ میں قید کیا گیا، اور اس وقت لیکچر ۱۸۹۲ء تک یعنی پورے ۲۴ سال کی مدت قید خانہ ہی میں گزری، اور اسی قید خانہ ہی سے وہ پیام ربانی کی تبلیغ کرتے رہے، سلاطین و دایان ملک کے نام خطوط و مکتوباتیں جنہیں انہیں حق شناسی پر توجہ دلائی گئی ہے، یہیں سے لکھے گئے تھے، بہار اللہ کے مجموعہ تصانیف کا نام ”کتاب الاقدس“ ہے، جو بہائی مذہب کے حسب اعتقاد الہامی کتاب ہے، اور جس میں بہائیوں کیلئے واجب العمل احکام و روح ہون، ذیل میں چند اقتباسات درج کئے جاتے ہیں جن سے اس اعلیٰ تعلیم کا اندازہ ہوگا جو بہار اللہ نے تلاشی حق و دنیا کے سامنے پیش کی ہے، بہائیت کی اہمیت پر گفتگو کرنا سروسر میرا مقصود نہیں، تاہم میرا یقین ہے کہ اس نمائندہ بہار اللہ کا فلسفہ منجملہ بہترین فلسفوں کے ہے، اور ایسا فلسفہ جو سب سے زیادہ مقبول اور سب سے زیادہ قابل عمل ہے، اقوال ذیل ملاحظہ ہوں،

(۱) ہر مذہب و ملت کے اشخاص کے ساتھ جس سلوک پیش آو،

(۲) تم سب ایک ہی درخت کے پھل، اور ایک ہی شاخ کی پتیان ہو، اپنے محب وطن

ہونے پر غور کی کوئی بات نہیں، البتہ محب عالم ہونے پر ہے،

(۳) اے باشندگان ارض! خدا کے مذہب کو مسافرت کا جیلہ نہ بناؤ، خدا کی قوم خدا کا

اختیار میں نہیں ہوتا تاہم اسکی وہ کوشش برابر کرتا رہتا ہے کہ جہاں تک ممکن ہو اپنے ذریعہ نگرانی  
 انسان کو گمراہیوں اور بدکاریوں سے بچاتا رہے اور نہ صرف افراد کے لئے بلکہ ہر خاندان،  
 ہر قبیلہ، ہر جماعت، ہر قوم پر بھی اسی طرح کا ایک جن منصرف رہتا ہے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر  
 حیوانات، نباتات و جمادات تک میں سے کوئی ایسی ہستی نہیں جسکی ہدایت عمل کے لئے ایک ایک  
 جن نہ مقرر ہو، ان جنات کا کام یہ ہوتا ہے کہ بارگاہ الہی سے جو احکام صادر ہوں انکی تعمیل کرتے اور کرتے رہیں اور  
 یہی مفہوم کارکنان قضا و قدر کا ہے،

## الحساب علیہ

حوادث جنگ کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا ہے کہ انگریزی کتابوں کی قیمتیں جرمنی واسطوں  
میں اس حد تک بڑھ گئی ہیں کہ یقین نہیں آتا، ٹائمز کے تعلیمی ضمیمہ کا بیان ہے کہ انگلستان  
میں برطانیہ کی بھیجی ہوئی جس کتاب کی قیمت، انگلنگ ہے، وہ جرمنی میں ۱۸۰ شلنگ  
(نو پونڈ) کو ملتی ہے، اور اسٹریا میں ۶۰۰ شلنگ (۳۰ پونڈ) کو!! اس صورت حال سے  
قدرۃ جرمن واسطوی تعلیم کا ہون اور کتب خانوں میں انگریزی کتابوں کا قحط ہو گیا ہے۔ بلکہ  
خود انگریزوں کو اب رحم آگیا ہے، اور ایک انگریزی دامن کی انجمن اس غرض سے قائم  
ہوئی ہے کہ انگریزی کی جو نہایت ضروری کتابیں ہیں، انہیں مناسب قیمت پر جرمن واسطوی  
یونیورسٹیوں کو حیا کرے،

ایک فریج شخص نے فولوگرانی کا ایک ایسا آلہ ایجاد کیا ہے، جس سے خود بخود پوری  
تصویر چار منٹ میں کھینچ کر تیار ہو جاتی ہے، جس شخص کو تصویر کھینچنا منظور ہوتا ہے، وہ اس  
کیمروہ کے سامنے بیٹھ کر اسکے اندر کچھ نقد ڈالتا ہے، معاً ایک گھنٹی بجاتی ہے، اور کیمروہ کے  
ادپر یہ الفاظ مندرج ملتے ہیں، ”تیار ہو کر بیٹھے، اپنا چہرہ دہنی طرف رکھیے، نگاہ اُدپر والے  
آئینہ پر پڑے، اور چہرہ مسکراتا ہوا رکھیے۔“ اسکے بعد ہی ایک چھوٹا سا لمپ مشین کے ادپر  
روشن نظر آتا ہے اور تختی ان الفاظ کے ساتھ نمودار ہوتی ہے، ”اپنے جسم کو ساکن و بے حرکت رکھیے“  
چند سکند میں کیمروہ کے اندر سے کہٹ کی آواز آتی ہے، اور روشنی گل ہو جاتی ہے، اُسکے بعد

تیسری سختی یہ اطلاع دیتی ہے کہ کام ختم ہو چکا، اب آپ اٹھ سکتے ہیں، اتنی دیر میں تصویر بہمہ وجہ مکمل ہو کر کیمرو کے پینڈے میں آجاتی ہے، اور یہ ساری کاروائی چارمنٹ کے عرصہ میں ختم ہو جاتی ہے،

امریکہ کے ایک ڈاکٹر ولیم بیٹس، جو فن جراحی میں خاص شہرت رکھتے تھے، کچھ عرصہ ہوا ایک ملاح پر اپریشن کر نیکے لئے ایک جہاز پر جو بندرگاہ میں لنگر انداز تھا، گئے، لیکن اسکے بعد غائب ہو گئے، یہاں تک کہ ان کے اعزہ و احباب کو مبینہ طور تک انکے وجود کی خبر نہ سکی، ایک مدت کے بعد ڈاکٹر موصوف نے اپنے تئیں پیرس میں پایا، جہاں وہ زمانہ طالب علمی میں رہ چکے تھے وہاں تک وہ کیونکر پہنچے؟ اس درمیان میں کتنا عرصہ گزرا؟ اس اثنا میں ان پر کیا کیا حوادث و واقعات پیش آئے؟ ان میں سے ایک شے بھی انکے حافظہ میں نہ تھی! اس سے بھی بڑھ کر کہ وہ اپنی تمام پچھلی زندگی، حتیٰ کہ اپنا نام بھی بھول چکے تھے! اتفاقاً ایک روز انکی نگاہ ایک لفافہ پر پڑی، جسپر بیٹس لکھا ہوا تھا، یہ دیکھ کر انہیں مٹا اپنا نام یاد پڑ گیا، اور اس طرح فترت رفتہ ان کا حافظہ عود کر آیا،

اس سلسلہ میں ایک انگریزی اخبار نے ذہول مطلق و نسیان کامل کی دو ایک معتبر مثالیں اور بھی درج کی ہیں، ستمبر ۱۸۷۷ء میں ایک صاحب انگلستان کے ایک ساحل پر غفلت کرنے لگے، اسکے بعد انکے کپڑے تو زمین پر رہ گئے، مگر خود ان کا یا انکی کنش کا کچھ پتہ نہ چلا، پورے دو برس کے بعد وہ پھر اپنے وطن کو واپس آئے، اور معلوم ہوا کہ اس روز نہاتے ہوئے ایک تیز دھارے میں وہ بہ گئے تھے، مگر دو مہینے کے بعد ایک جہاز کی نظر ان پر پڑ گئی!





وسط شہر میں ایک مرکزی اسٹیشن ہے، وہیں سے ان تمام گھڑیوں کو ایک ساتھ کوک دیا جاتا ہے۔

نیگور کی تصانیف کے ترجمے تو مغرب کی ہر با وقعت زبان میں عرصہ سے موجود تھے، لیکن اب اسکے ڈراموں کو یورپ میں ایکٹ بھی کیا جانے لگا ہے، چنانچہ حال میں اسکے قلم سے نکلے ہوئے متعدد تماشے لندن کے تھیٹرون میں کھیلے گئے، اور ان میں سے بعض میں شاہیر امرا انگلستان بھی شریک ہوئے، نیگور موجودہ زمانہ کا سب سے پہلا مشرقی ہے جسکے کلام کو مغرب میں اس قدر حسن قبول حاصل ہوا ہے،

کلمتہ کا انگریزی تعلیمی رسالہ کا یحییٰ لکھتا ہے کہ مسلمانوں کو فخر و مسرت سے بغیر منہا چاہیو کہ ان کے اسلاف کی علی عظمت کا اعتراف مستشرقین یورپ کرنے لگے ہیں، چنانچہ ابن خلدون (۱۳۳۲ تا ۱۴۰۶ء) کا فلسفہ تاسیخ کا بانی ہونا اب مسلم ہو گیا ہے، اسکے مقدمہ تاسیخ کا ترجمہ فریخ زبان میں بڑی آب و تاب سے شائع ہوا ہے، اور انگریزی زبان میں پروفیسر فلنٹ نے اپنی تالیف ”فریخ فلسفہ تاسیخ کی تاسیخ“ میں اسکے نظام فلسفہ تاسیخ کی تھخیص کی ہے،

ایک طبی رسالہ لکھتا ہے کہ مرض النوم کی ایک خاص شکل جبین مریض پر مزمن خواب مثل نشہ کے طاری ہو جاتا ہے، آجکل یورپ و امریکہ میں مختلف مقامات پر شائع ہو رہی ہے چنانچہ لندن ہاسپٹل میں اس وقت اسکے سات مریض زیر علاج ہیں، اور فرانس کے متعدد حصوں میں اسکا وجود پایا جاتا ہے، اسکا مریض ہفتوں بلکہ مہینوں برابر سوتا رہتا ہے، اور کسی وقت بھی ہوشیار نہیں ہوتا، مگر نیویارک (امریکہ) میں تجربہ سے یہ ثابت ہو رہا ہے کہ مریض اس مرض کا

علاج ہے، بیان ایک جوان عمر عورت کو جب کا سن ۲۹ سال کا تھا، یہ مرض لاحق ہوا، اور پورے ۱۰۲ دن گزر گئے کہ وہ ایک لمحہ کے لئے بھی بیدار نہیں ہوئی، آخر میں ایک مغنی بلایا گیا، جس نے ساز کی مدد سے اُسکے سر ہانے بیٹھکر گانا شروع کیا، اسکو چند ہی منٹ ہوئے کہ روضہ نے جنبش سر کے ساتھ آنکھیں کھول دیں، اور آدھ گھنٹہ میں پوری طرح بیدار ہو گئی۔

ڈاکٹر لوی سمین نے رایل کالونیل انسٹیٹیوٹ کے سامنے حال میں ایک طبی لکچر دیا، اور اس میں بیان کیا کہ دفعیہ طاعون کے لئے چوہوں کی بربادی کی کوشش قطعاً بیسو د ہے کیونکہ جقدر زیادہ تعداد میں چوہے ہلاک کئے جاتے ہیں، اسقدر باقی ماندہ چوہوں کے لئے عیش و فراغت کے سامان زیادہ چل ہوتے جاتے ہیں، اور اسقدر انکی نسل تیزی سے بڑھتی جاتی ہے، البتہ اگر طاعون کی علت چوہوں ہی کو قہر دیا جائے تو ان کے شر سے محفوظ رہنے کی بہتر صورت یہ ہو سکتی ہے کہ مکانات اس قسم کے تعمیر کئے جائیں جن میں چوہوں کا گذر ہی نہ ہو سکے، اور ان میں اپنے لئے سوراخ بنانے کے مواقع ہی نہ ملیں، سرپرک مینس جو جالبہ کے صدر تھے، انھوں نے اپنی افتتاحی تقریر میں لکچرار کی ذہانت و دقت نظر کی داد دی، لیکن ان کے آراء و نظریات کو ناقابل قبول بتایا،

سنہ میں لندن میں انٹرنیشنل کانگریس آف فلاسفی منعقد ہونے والی تھی، جس میں یورپ عالمیکہ کے تمام مشاہیر علماء فلسفہ شریک ہوتے، اور فلسفہ کی ہر شاخ پر بکثرت عالمانہ مضامین زیر بحث آتے، اس کانگریس کا پورا پروردگارم (نظام عمل) مرتب ہو چکا تھا، مضامین مقالات کے عنوانات طے پا چکے تھے، خطوط دعوت جاری ہو چکے تھے، اور یوم انعقاد کے دو برس پیشتر سے

ان نظامات کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا، لیکن آگست ۱۹۷۱ء میں جو عالمگیر جنگ چھڑی اُس نے صد ہا دیگر علمی توقعات کی طرح اس آرزو کا بھی خون کر دیا اور اسکے متعلق سارے منصوبے کا لود ہو گئے

لیکن اب یہ تجویز نسبتاً محدود بیانہ پر پھر زندہ ہوئی ہے، اب کی کانگریس آف فلاسفی کا انعقاد بمقام آکسفورڈ ۲ تا ۶ دسمبر ۱۹۷۱ء قرار پایا ہے اس میں مجالس ذیل کے ارکان کو شرکت کی دعوت دی گئی ہے:-

(۱) برٹش سائیکولوجیکل سوسائٹی (لندن)

(۲) اسٹائیلین سوسائٹی "

(۳) مائینڈ ایسوسی ایشن "

(۴) آکسفورڈ یونیورسٹی فلاسوفیکل سوسائٹی (آکسفورڈ)

(۵) امریکن فلاسوفیکل ایسوسی ایشن (امریکہ)

(۶) فرنچ فلاسوفیکل سوسائٹی (فرانس)

فلسفہ و متعلقات فلسفہ کا ہر مضمون، الہیات، نفسیات، اخلاقیات، اجتماعیات، دوا ما و غیرہ موضوع جلسہ میں داخل ہو سکتا ہے، صدر نشین انگلستان کے مشہور فلسفی لارڈ ڈالہین ہونگے اور افتتاحی خطبہ یورپ کے حکیم غلم اور فرانس کے مایہ ناز فرزندِ پردیس ہنری برگسن ارشاد فرمائیں گے، ان اصحاب کی فہرست میں جو جلسہ کی کاروائیوں میں حصہ لین گے، اکثر شاہی علماء و فن کے نام نظر آتے ہیں، مثلاً ہرٹزینڈرسل، ڈاکٹر شلر، میو بوٹروڈ، پرنسپل جیکسن، سرفیڈرک پولک، میرن دان ہیوگل، ڈاکٹر لندسے، پردیسر گلبرٹ مرے وغیرہ،

ناظرین معارف کو یاد ہو گا کہ گذشتہ ستمبر میں یورپ کی متعدد مجالس مشرقیہ کا مشترک اجلاس لندن میں منعقد ہوا تھا جس کا ذکر اکتوبر و نومبر کے معارف میں ملے گا، اب کی سال اسی قسم کا مشترک جلسہ منتشر قہن پیرس میں اسی ماہ جولائی میں منعقد ہوا ہو گا، اجلاس کی تاریخیں ۶ تا ۱۰ جولائی مقرر ہیں، اور دعوت نامے مجالس ذیل کے ارکان کی خدمت میں بھیجے گئے تھے،

(۱) سوسائٹی ایشیاٹک (پیرس)

(۲) رائل ایشیاٹک سوسائٹی (لندن)

(۳) اسکولا اورینٹل (اٹلی)

(۴) امریکن اورینٹل سوسائٹی (امریکہ)

ایک انگلستانی اخبار لکھتا ہے کہ اس سال انگلستان میں تقریباً تین ہزار خواتین طبی امتحانات کی سند لے رہی ہیں، اور توقع ہے کہ چند سال کے عرصہ میں بقایا عورتوں کے مرد ڈاکٹروں کا کام بالکل سرور ڈھرائے،

برٹش میڈیکل ایسوسی ایشن اور برٹش سائنس گلاڈ کی مشترکہ مجلس نے تجویز شائع کی ہے کہ طبی ایجادات و اکتشافات سے متعلق بھی حکومت کو انعام و صلہ کا معقول سلسلہ قائم کرنا چاہیئے یہ تحریک وزیر اعظم کے خدمت میں پیش ہو گی، اور اس محضر پر کمیونج کے نامور معلم سر کلرڈ البٹ، سر روناڈ راس، پروفیسر ہالڈین وغیرہ مشاہیر فن کے دستخط ثبت میں اسپین طبی ایجادات، اختراعات و اکتشافات کی اہمیت پر زور دیکر یہ دہایا گیا ہے کہ جب سائنس کے دوسرے صیغوں میں کام کرنے والوں کے لئے حوصلہ افزائی و ترغیب کے کثیر ذرائع موجود ہیں

تو کوئی وجہ نہیں کہ صیغہ طب جو ان سے کہیں زیادہ اہم ہے ان ذرائع سے محروم رہے،  
آخر میں سفارش یہ پیش کی گئی ہے کہ جن انخاص کے کارنامے اس صنف میں ممتاز سمجھے جائیں  
انہیں پانچ ہزار سے لیکر دس ہزار پونڈ سالانہ تک منشن ملنی چاہیئے،

پروفیسر ای، جی، براؤن کی ”تاریخ ادبیات ایران زیر حکومت تاتاریہ“ جس کا اعلان  
معارف کی پہلی جلد میں ہو چکا ہے، چند ہفتہ ہوئے کیمبرج یونیورسٹی پریس سے چھپکر شائع  
ہو گئی، یہ پروفیسر موصوف کی مشہور ”علمی تاریخ ایران“ کا گویا تیسرا حصہ ہے جس کا پہلا حصہ  
۱۹۳۵ء میں اور دوسرا حصہ ۱۹۳۷ء میں شائع ہو چکا ہے، اس حصہ میں ایران کی ادبی تاریخ  
۱۲۶۵ء سے ۱۲۷۵ء تک بیان ہوئی ہے، چوتھی اور آخری جلد کا عنوان ”تاریخ ادبیات ایران  
در عصر حاضرہ“ (مہسری آف پرشین لٹریچر ان ماڈرن ٹائمس) ہوگا۔

پروفیسر جے، اس، میکنزی، جو اس وقت انگلستان میں فلسفہ اخلاق کے مستند عالم ہیں،  
اور جو اصول اخلاق پر بلند پایہ تصانیف کے مصنف ہیں، مدراس یونیورسٹی نے انہیں اپنے  
ہان کا کچھ مقرر کیا ہے، اور امید ہے کہ فاضل موصوف عنقریب ہندوستان آکر چند ماہ  
تک مدراس میں مقیم رہیں۔

# امی شینا

## افادات اکبر

یہ عمر کتبک و فا کر گی زمانہ کتبک جفا کر گیا

مجھے قیامت کی مین امیدیں جو کچھ کر گیا خدا کر گیا

فلک جو بر باد بھی کر گیا، بلند ارادے سے زمین گئے

جو خاک ہو گئے خاک سے بھی سدا بگولا اسٹا کر گیا

خدا کی پائی پکا رہا ہوں ہوا کرے ناخوشی بتوں کو

میری غرض کچھ نہیں کسی سے تو پھر واکوئی کیا کر گیا

جہاں فانی کا عشق ہی کو خیال کر مستقل نتیجہ

بیان تو پیہم ہی تردد، یہی تغیر ہوا کر گیا

اگرچہ ہے درد و غم سے مضطرب ہی درد و زبان اکبر

یہ درد جس نے ویسا ہے ہلک و ہی ہماری دوا کر گیا

۷۷ پر و فیروز اب علی ایم اسے، جہنم حال میں الہ آباد جا کر کلام اکبر سے مستفید ہو گیا  
موقع ملا، ارشاد فرماتے ہیں :-

بہم غم اور حکمت کے دریا قلب اکبر میں

تعلی نور فان کی جو پیدا قلب اکبر میں

الہ آباد میں اک اور بھی سنگم نظر آیا

دلہا روشن اکبر جو آئینہ حقیقت کا

کس طرح کہتا کہ جو چاہوں وہ ہونا چاہیے      کچھ سمجھ ہی میں نہ آیا چاہنا کیا چاہیے  
کہہ دیا میں نے کہ ہوں اور یہ نہیں بھلا کہ کیا      اس خودی کا حشر کیا ہوتا ہے دیکھ چاہیے  
یہ تو سچ ہے جی لگا کر چاہیے پڑھنا نماز      یہ بھی سن لوجی لگا کر سانس لینا چاہیے

حب دنیا سے نہیں ہر صاحبِ عزت بڑی      خاتما ہیں اور میں اور دل کا کونہ اور ہے  
مدحتِ گفتار کو سمجھو نہ اخلاقی سند      خوب کہنا اور ہر اور خوب ہونا اور ہے

شکلِ لطیفانِ کم اس عالمِ فانی میں ہے      کامیابی بھی جہانِ ہر اک پریشانی میں ہے  
دولتِ دنیا کی کیا لذت ہے اہلِ جور کو      ساری قوت صرف اُن کی نگہبانی میں ہے

مذہب کی پناہ ستر کو ملی اور کھر کی زد سے بچ نکلے

ہر دم ہی یہی اب اپنی دعا اللہ کا ہونا سچ نکلے

مجلسِ نساوانِ مین دیکھو عزتِ تعلیم کو  
پردہ اٹھا چاہتا ہے علم کی تعلیم کو



# مطبوعات علی گڑھ

سوانح مدحت پاشا، یہ مشہور ترکی قوم پرست ابوالاعلیٰ مدحت پاشا کی سوانحی ہے  
 جمین خاص طور پر ان اصلاحات کا تذکرہ کیا گیا ہے، جو انھوں نے سلطنت عثمانیہ کے  
 مختلف نظامات میں کی تھیں، مرتبہ مرزا اسحاق بیگ، قیمت ۱۰، پتہ: پبلک پریس مراد آباد  
 گلدستہ نظم، پنجاب سنٹرل ٹریڈنگ بک سیلز لاہور نے اس نام سے خلاقی،  
 ادبی، اور قومی نظموں کا ایک مجموعہ شائع کیا ہے، جمین بعض مشاہیر اور بعض غیر مشاہیر مثلاً  
 مرزا غالب، حالی، اکبر، حسرت، شوق، شفق، امیر بدایونی، مولوی اسماعیل میرٹھی اور مولوی  
 ظفر علی خان وغیرہ کی عمدہ نظمیں انتخاب کر کے جمع کی گئی ہیں، اگرچہ یہ تمام نظمیں ایک درجہ کی نہیں  
 کتاب کی قیمت ۶ روپے، اور مذکورہ بالا پتہ سے مل سکتی ہے،

خیالستان: لاہور سے یہ ایک ماہوار علمی رسالہ جاری ہوا ہے اس میں نائب ایڈیٹر نے  
 شکسپیر کی سوانحی لکھی ہے، اور چودھری غلام حیدر خان نے مہری کی سرگذشت کے عنوان سے  
 ایک مضمون طبع کرایا ہے جو انکی مترجمہ کتاب ”ترکی حرم“ کا ایک حصہ ہے، یہ ترجمہ نہایت  
 دلچسپ ہے، اخیر میں ایڈیٹر صاحب نے ایشیا کی گذشتہ عظمت پر ماڈرن ریویو سے ایک  
 مضمون کا اقتباس کیا ہے، جو اگرچہ نہایت سطحی ہے تاہم اس سے بعض مفید معلومات بھی  
 حاصل ہوتے ہیں، رسالہ مصور ہے، چنانچہ اس نمبر میں شکسپیر کی تصویر شامل کی گئی ہے، قیمت  
 سالانہ لکھ روپے ۶، پتہ: دفتر خیالستان لاہور،

روزانہ خلافت، مسئلہ خلافت کو اسلام میں جو اہمیت حاصل ہے اسکا اقتضار

یہ تاکہ ایک خاص اخبار جاری کیا جائے، جس سے جمہور اہل اسلام کو خلافت کے متعلق یکجا طور پر معلومات حاصل ہوں، اس روزنامہ نے اسی ضرورت کو پورا کیا ہے، جو اصحاب خلافت ٹریڈر پر وسیع نظر رکھنا چاہتے ہیں ان کے لئے اسکا مطالعہ بہت مفید ہوگا قیمت ص ۱۰ سالانہ،

روزنامہ رعیت، یہ اخبار خواجہ حسن نظامی کی ایڈیٹری میں دہلی سے نکلتا شروع ہوا ہے، اسکا پہلا نمبر ہمارے سامنے ہے، جس میں ایک مضمون ”رعیت کا پیام محبت“ ہے جو مسٹر عبدالمجید بی، اسے کے زور قلم کا نتیجہ ہے، اس میں بتلایا گیا ہے کہ رعیت کے احوال کیا مقاصد میں، اور ان مقاصد کے لحاظ سے رعیت اور دوسرے اخبارات میں کیا فرق ہے؟ مضامین کی ترتیب عمدہ، اور اقتباسات دلچسپ ہیں، قیمت سالانہ ص ۱۰ فی پرچہ، پتہ: رعیت دہلی،

روزنامہ زمانہ، اس نام کا ایک اخبار مولوی محمد اکرم خان صاحب کی ایڈیٹری میں کلکتہ سے جاری ہوا ہے جو ایک کہنہ مشق اخبار نویس ہیں، اور ان کے زیر ادارت اخبار قومی مسائل پر نہایت پرجوش مضامین لکھتا ہے، لیکن باین ہر زبان کی ناہمواری افسوسناک ہے، بعض جگہ طرز بیان اسقدر بلند اختیار کیا جاتا ہے، گویا سامنے اہلال مرحوم کا نال کہلا ہوا ہے، اور بعض جگہ انتہائی پستی پیدا ہو جاتی ہے، اس ضروری اصلاح کے بعد امید ہے کہ یہ اخبار قوم و ملک کے لئے ہر طرح مفید ثابت ہو، کلکتہ سے اردو روزانہ کی سخت ضرورت تھی، یہ اخبار اسی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے نکلا ہے، اسکی قیمت ہر فی پرچہ ۲۹ اور نمبر ۲۹ پر سرکلر روڈ کلکتہ سے مل سکتا ہے،

مجلد ششم	ماہ ذیقعدہ ۱۳۸۰ مطابق اگست ۲۰	عدد دوم
<b>مضامین</b>		
شذرات	۸۵ - ۸۲	
حقیقتِ علم (نمبر ۱)	۱۰۵ - ۸۶	مولانا محمد یونس فرنگی محلی
مصریوں کی مذہبی حالت (نمبر ۱)	۱۱۲ - ۱۰۶	مولوی عبدالرزاق ندوی
خلافت کے لئے اتحادِ مسلمانین اسلامیت	۱۲۴ - ۱۱۳	مولانا عبدالسلام ندوی
فارسی بین یا بے بھول	۱۳۱ - ۱۲۵	سیدناظر الحسن ہوش بلگرامی
یورپ اور تمدنِ اسلام	۱۴۲ - ۱۳۳	سر سہری جانشین مولانا سید بلال شاہ بخاری
غالب	۱۴۶ - ۱۴۳	پینڈت منوہر لال زنتشی، ایم، اے
اخبارِ علیہ	۱۵۶ - ۱۴۸	
ادبیات	۱۵۸ - ۱۵۷	اکبر
مطبوعاتِ جدیدہ	۱۶۰ - ۱۵۹	
<b>جدید مطبوعات</b>		
<p>روح الاجتماع، یعنی ڈاکٹر لی بان کی کتاب "جماعتِ انسانی کے اصولِ فنیہ کا ترجمہ، از مولانا محمد یونس فرنگی محلی، قیمت غار۔</p>		
"مینجر"		

## مشکلات

جنگ کے اثرات نے یورپ میں شوہروں کا قحط پیدا کر دیا ہے، فرانس میں اس وقت تقریباً بیس لاکھ لڑکیاں قابل ازدواج عمر کی ہیں، جنہیں شوہر دستیاب نہیں ہوتے، اور کل یورپ میں اس قسم کی غیر منکوح خواتین کی تعداد بمقابلہ مردوں کے ڈیڑھ کروڑ زیادہ ہے! مردوں اور عورتوں کی آبادی کے اس عظیم الشان عدم تناسب کی صورت میں ایک مشرقی دماغ کو وہی راستہ کہلے ہوئے نظر آسکتے ہیں، یعنی یا تو تعدد ازواج کو رد میں لے لیا جائے، اور یا یورپین خواتین کو باہر والوں کے قبائل عقہ میں دیا جانے لگے، لیکن ہندو مت میں، اردش خیالِ جدت طراز مغربی دماغوں کے لئے یہ دونوں صورتیں قطعاً ناقابل قبول ہیں، مغرب کی خودواری و علور نفس کے لئے یہ کیونکر ممکن ہے کہ وہ اپنے ہاں کی کسی ”شمع بزم“ کو دوسروں کے ہاں بطور چراغ خانہ کے دیکھ سکے، علیٰ ہذا اسکی تہذیب دشائستگی، تعدد ازواج کی جاہلانہ دوحشیانہ رسم کا نام سننے کے لئے ایک لمحہ کی بھی روادار نہیں ہو سکتی۔

ڈاکٹر کارلوائیک فریچ منحنی ہیں، انھوں نے پیرس کے ایک طبی رسالہ میں اس دشواری کا علاج اپنے ملک کے لئے یہ تجویز کیا ہے کہ سرے سے رسم نکاح کو اڑا دیا جائے، اس لئے کہ فریضہٴ امومت ادا کرنے کے لئے ہر طرح کے قیود و رسوم سے بالکل باز رکھ دیا جائے، اس لئے کہ

عورت کا مقدم ترین فرض افزائش نسل ہے، جسکو مراسم نکاح سے مقید کرنا بے معنی ہے، اور ان غیر منکوح ماؤں سے جو اولاد میں پیدا ہوں، انکی پرورش و پرورش و خست کی ذمہ داری حکومت کے سر ہو، اور ان کا انتساب ابوت بجائے افراد کے قوم و سلطنت کی جانب کیا جائے۔

جو قوانین نکاح کو محض ایک رسم اور اتحاد مادی و جسمانی سمجھتی ہیں، ان کا اس نتیجہ تک پہنچنا بالکل قدرتی ہے، لیکن جن ممالک میں یہ رٹم وصال حقیقی کا پر تو، اور اتحاد روحانی کا عکس بھی گئی ہے، وہاں کے باشندے قبل اسکے کہ جادہ تہذیب پر تیز گامی شروع کریں، بہتر ہوگا کہ بہر دور ہزن کے فرق کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیں۔

لندن میں ریشلسٹ ایسوسی ایشن (انجمن عقلیوں) کے نام سے آزاد خیالوں کی ایک نامور انجمن سالہ ۱۸۹۹ء سے قائم ہے، جسکا مقصد یہ ہے کہ معتقدات مذہبی کو مشاکر عقل پرستی کی ترویج کیجائے، اسکا ماہوار رسالہ (الٹرنیٹی گانڈم) دلچسپ معلومات، اور عام فہم علمی مضامین کا خزانہ ہوتا ہے، اور اسکی بیشتر سالانہ مطبوعات، مستند و بلند پایہ، سلیس و عام فہم ہونے کے ساتھ قیمت میں بھی غیر معمولی طور پر ارزان ہوتی ہیں، اسکی شاخیں دنیا کے ہر ملک میں قائم ہیں، اور اسکا سالانہ چندہ رکنیت بھی بہت قلیل ہے، ان حالات کے ساتھ اسکی گزشتہ سالانہ رپورٹ دیکھ کر حیرت ہوگی کہ اب تک اسکے ارکان کی مجموعی تعداد ۷۷۸۹ ہے، جہیں سے برطانوی ارکان کا شمار کل ۱۷۰۰ ہے! برطانیہ کی آبادی تقریباً ۵۰ کروڑ ہے، جسکا بیشتر حصہ تعلیم یافتہ ہے، اور سیمیت کی جانب سے جو عام بے انتہائی ہے، وہ بھی ظاہر ہے، بائیں ہمہ سبت سالہ کوششوں کے بعد بھی اتنی وسیع آبادی میں اتنی قلیل تعداد کا شریعت عقل پر ایمان لانا اس امر کی واضح دلیل ہے کہ اگرچہ ملایورپ میں مذہب الحاد ہی کا دور دورہ ہے، تاہم کسی ایسی تحریک کو

مقبولیت وہاں مشکل ہی سے حاصل ہو سکتی ہے، جمین الحاد کو علم و سفیدگی کی روشنی میں پیش کر دینا کوشش کی جائے، سچ یہ ہے کہ جن لوگوں نے مال و دولت، جاہ و منصب، عیش و عشرت کو اپنا معبود بنا لیا ہے، ان سے علم و حکمت کی پرستش ہونا بھی ناممکن ہے، ان کے لئے جس طرح موسیٰ و عیسیٰ کے الہامات ناقابل التفات ہیں، اسی طرح مل و اسپنسر کے مقالات، اور ہیکلے و ٹنڈل کے خطبات بھی بے اثر ہیں،

اخبارات میں یہ خبر کئی ہینہ ہوئے شائع ہوئی تھی کہ مملکت آصفیہ میں قدیم و نادر الوجود کتابوں کی تصحیح، تہذیب و اشاعت کے ایک جدید محکمہ کے قیام، اور اسکے مصارف کے لئے ایک لاکھ سالانہ کی رقم کی منظوری صادر ہوئی ہے، پچھلے ہینہ دفتر معارف میں جو سرکاری اطلاع موصول ہوئی، اس سے معلوم ہوا کہ اس سررشتہ کا انتظام ایک کمیٹی کے سپرد کیا گیا ہے جس کے صدر نواب عماد الملک بہادر (مولوی سید حسین بلگرامی) ہیں جن کا علم و فضل محتاج تعارف نہیں، اور جن سے موزوں تر انتخاب اس خدمت کے لئے ناممکن تھا، دائرۃ المعارف جو تیس سال کی مدت سے عربی کتابوں کی خدمت نیم سرکاری حیثیت سے کر رہا تھا، اب سرکاری صیغہ کی حیثیت سے اسی جدید سررشتہ میں ضم کر دیا گیا ہے، بہتر ہوگا، اگر اس سررشتہ کا دائرہ عمل کتب عربی تک محدود نہ رہے، بلکہ اردو کی قدیم و نادر تالیفات کی تہذیب و اشاعت بھی یہ اپنے ذمہ رکھے، امید ہے کہ صدر الصدور مذہبی دولت آصفیہ مولانا مولوی حبیب الرحمن خان شروانی کے فضل و کمال سے بھی یہ شعبہ پورا فائدہ اٹھائیگا۔

مولانا سید سلیمان ندوی اپنے تازہ عنایت نامہ میں تحریر فرماتے ہیں: "چند روز ہوئے

”شکسپیر ہٹ“ میں جہاں ہندی طلبہ کا مسکن ہے، پیامبر امن ٹیگور کی زیارت ہوئی، طلبہ نے ان کے اعزاز میں جلسہ کیا تھا، جو وقت وہ جلسہ میں آئے تو میرے سامنے عمر خیام کی صورت کھینچ گئی، دراز قد، لمبی داڑھی، بڑا زرد کرتہ، تڑپیدہ مو، ایک سیاہ گول بڑی ٹوپی، پورے جلسہ بھر فرش پر سر پیچے کئے بیٹھے رہے، آخر میں لوگوں نے تقریر پر اصرار کیا، تو نہایت متانت کے لہجہ میں آنکھیں پیچے کئے چند منٹ تک بیٹھے بیٹھے باتیں کیں جہیں یہ اظہار تھا کہ میں شہرت کو جو بد نصیبی سے مجھے چھل ہو گئی ہے، اپنا دشمن جانتا ہوں، میں ایک زادیہ پسند عورت نشین آدمی تھا، عورت کی جگہوں سے بہا گتا ہوں، شور و غل کو نا پسند کرتا ہوں۔“

مولانا نے اسکے آگے یہ نہ لکھا کہ فضاے مغرب کے شور و محشر میں اس نغمہ سکون و راحت کے چند اصوات کا کیا اثر ہوا۔

مولانا ایک دوسرے عنایت نامہ میں فرماتے ہیں: ”کل ایک کتب فروش کی دوکان میں گیا تھا، اسکی وسعت کو دیکھ کر حیران ہو گیا، یہ برٹش میوزیم کے محلہ میں واقع ہے، ہر موضوع، ہر بحث کی کتابوں کا الگ حصہ اور الگ عملہ تھا، مشرقی زبانوں اور کتابوں کا الگ، نقوشوں کا الگ، تاریخ کا الگ، غرض ایک ایک علم و فن کا الگ۔“

انگریزی لٹریچر کی وسعت و ترقی کا ایک بڑا سبب اسکے ناشرین اور کتب فروشوں کی حوصلہ مندی ہے، اردو زبان کے ناشرین (پبلشرز) و کتب فروش جب تک اسی اہتمام، باقاعدگی، خوش سلیقگی و جامعیت سے کام لینا نہ سیکھیں گے، تنہا مصنفین و وٹیفین کی کوششیں قیامت تک بار و رہین ہو سکتی ہیں۔

# مقالات

## حقیقت علم (نمبر ۵)

لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان فلاسفہ نے نفس انسانی کی اس خاصیت کو نظر انداز کر دیا ہے کہ جب ایک قسم کی چند مثالیں انسان کی نگاہ کے سامنے گذرتی ہیں تو وہ انکی جزئی شخصیت کو حذف کر کے ان سے ایک مفہوم کلی پیدا کر لیتا ہے جسکو ہم کلیت سے تعبیر کرتے ہیں اسطرح نفس انسانی کی یہ دوسری خاصیت بھی فلاسفہ نظر انداز کر گئے ہیں کہ جب ایک قسم کے واقعات بار بار انسان کی نگاہ کے سامنے سے گذرتے ہیں تو بار بار ان واقعات کے گزرنے سے اسکے ذہن میں عالمگیر نظام عالم کا تصور پیدا ہوتا ہے جو اسکے ذہن میں یہ خیال پیدا کرتا ہے کہ اس قسم کا واقعہ آئندہ بھی اسی طرح ظہور پذیر ہوگا اسی کو ہم وجوب سے تعبیر کرتے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ فلاسفہ نے وجوب و کلیت کے متعلق اپنا یہ خیال قائم کرتے وقت نفس انسانی کی چند دقیق اصول کو نظر انداز کر دیا ہے لیکن چونکہ کلیت و وجوب کے ان ادراکات سے بحث کرنا ہمارے موضوع کی حد سے خارج ہے اور ان مباحث کی اصل جگہ ہتھورا کی حقیقت اور ادراکی نفسانی اہمیت کے بیانات ہیں اسلئے ہم یہاں مفصل بحث سے گریز کرتے ہیں۔ غرض مذکورہ بالا مثالوں سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ جتنے عام تر کلیات ایسے ہیں جو بظاہر حیات سے بے نیاز نظر آتے ہیں اگر تحلیل کی جائیں



تو نظر آئیگا کہ انکی انتہا بھی حیات پر ہوتی ہے اور بغیر ان احساسات کے یہ کلیے کسی طرح قائم نہیں ہو سکتے تھے اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ دنیا کا کوئی علم بھی بلا حیات کی وساطت کے حاصل نہیں ہو سکتا ہے،

(۲) لیکن اس دلیل کے علاوہ ہمارے پاس اپنے دعویٰ کی دوسری دلیل یہ ہے کہ جب قوت ہمارے حواس میں سے کسی حواس میں کوئی نقص پیدا ہوتا ہے تو اس حواس کی قوت میں کمزوری پیدا ہو جانے کے باعث انسان ان تمام ادراکات سے بھی محروم ہو جاتا ہے جو اس حواس سے پیدا ہوتے ہیں ایک اندھے کو دیکھو کہ اسکو ادن چیز دیکھا اور اک نہیں ہوتا جو حواسہ بصر سے ادراک کیجاتی ہیں اور اسی لیے کبھی اسکے ذہن میں ادن چیزوں کے تصور کا بھی گذر نہیں ہوتا خنکی بصارت سے وہ محروم رہا ہے۔ اگر بطلمیوس اور کوپرنیکس حواس ظاہری سے محروم ہوتے، تو مجسطی اور پتسپیا کی تحقیقات سے کبھی دوڑ کر کو باخبر نہ کر سکتے، اور انکے ذہن میں کبھی اجرام فلکیہ کا تصور نہ پیدا ہوتا۔ افلاطون نے اپنی کتاب ریپبلک (جمہوریت) کے چھٹے باب میں تعلیم و تربیت کے اثرات کی توضیح کی غرض سے یہ ایک فرضی مثال ذکر کی ہے کہ اگر کچھ لوگ زمین کے آخری طبقہ کے کسی حصہ میں اپنی پیدائش کے وقت سے بند کر دیے جائیں تو انکو دنیا کی کسی بات کا علم نہ ہوگا اللہ اگر وہ ایک مدت کے بعد زمین پر لائے جائیں تو وہ دنیا کی ہر چیز کو تعجب کی نگاہ سے دیکھیں گے، ہر چیز سے مبہوت ہوں گے، اور آفتاب کو روشنی اور حیات کا منبع پا کر یہ خیال کرنے لگیں گے کہ آفتاب ہی عالم کا خالق ہے، گو افلاطون نے اس خیال کا اظہار ایک فرضی مثال کی بناء پر کیا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ جو لوگ عزالت گزینی اختیار کرتے ہیں انکے خیالات نہایت تنگ اور انکا دماغ نہایت چھوٹا ہوتا ہے انکے خیالات

و تصورات میں وسعت نہیں ہوتی اور چونکہ انکی روحانہ زندگی میں انکو بہت سی چیزوں کا تجربہ حسی نہیں ہوتا اسلئے وہ ان چیزوں کے تصورات سے بھی خالی الذہن ہوتے ہیں غرض یہ ایک عام کلیہ ہے کہ حواس کی کمزوری اور نقص یا حیات کے محدود ہونے کے باعث انسان کے تصورات میں یہی وسعت نہیں پیدا ہوتی۔ پھر یہ کلیہ محسوسات ہی کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ محسوسات کی طرح جذبات کا بھی یہی حال ہے کہ جس شخص کو اپنی روزمرہ زندگی میں کسی خاص جذبہ کا تجربہ حسی نہیں ہوتا وہ اس جذبہ کے تصور سے بھی عاری ہوتا ہے مثلاً ایک وہ شخص جسکی ساری زندگی خود غرضی پر عمل کرنے میں بسر ہوئی ہے وہ ہرگز اپنے ذہن میں اس بات کا تصور نہیں کر سکتا ہے کہ ایثار کے ساتھ کسی طرح زندگی بسر کی جاتی ہے۔ اسی طرح ایک حلیم شخص کبھی غصہ کی اس حالت کا اندازہ نہیں کر سکتا جو انسان کو دیا نہ بنا دیتی ہے غرض زندگی کے یہ تمام تجربے ہمکو اس بات کا یقین دلاتے ہیں کہ انسان کو جن باتوں کا تجربہ حسی اپنی زندگی میں نہیں ہوتا ان کا تصور بھی اسکے ذہن میں نہیں پیدا ہو سکتا ہے۔

(۱۳) ان دلائل کے علاوہ اپنے دعویٰ کی تیسری دلیل ہمارے پاس یہ ہے کہ حیات کی ترقی سے معلومات انسانی میں نمایاں اضافہ ہوتا ہے شیرخوار بچے چونکہ تمام حیات سے محروم ہوتے ہیں اسلئے وہ تمام معلومات سے بھی محروم ہوتے ہیں لیکن جون جون انکے حیات میں مقننات عمر سے ترقی ہوتی جاتی ہے انکے معلومات میں بھی اضافہ ہوتا جاتا ہے مرکب تصورات کی پیدائش بچوں کے ذہن میں نہیں ہوتی کیونکہ ابھی انکے ذہن میں مرکب احساسات کا گز نہیں ہوتا اسی وجہ سے کہ جو حیات انسان کے ذہن میں ابتداً عمر میں پیدا ہو جاتے ہیں انکے تصورات بھی اسکے ذہن میں اقتدر رسوخ حاصل کر لیتے ہیں کہ ان تصورات کا

اسکے ذہن سے نکالنا سخت مشکل ہوتا ہے پس انسان کے دماغ کو تعصب سے محفوظ رکھنے اور اس کو صحیح طور پر فکر کا عادی بنانے کی ترکیب اس سے بہتر کوئی نہیں ہے کہ خارجی محسوسات کے ذریعہ سے اسکے خیالات و ادراکات میں وسعت پیدا کی جائے اور ابتدا سے اسکے ذہن پر ان مرکب تصورات کا بار نہ ڈالا جائے جنکا تجربہ حسی اور سکواپنی روزانہ زندگی میں اب تک نہیں ہوا ہے لیکن اگر کبھی بچہ کا ذہن ان مرکب اور پیچیدہ تصورات کے بار سے دبا دیا جاتا ہے تو اس کے دماغ کے ان حصوں میں جو مرکز تصور ہیں اختلال پیدا ہو جاتا ہے غلط اور صحیح فکر کی تمیز جاتی رہتی ہے اور حیات سے تصور کے اخذ کرنے کی فطری قوت معدوم ہو جاتی ہے اب اسکے پاس اس قسم کا کوئی ذریعہ نہیں رہتا جس سے وہ اپنے تصورات کی صحت و غلطی کا اندازہ کر سکے کیونکہ تصورات کی صحت کا مداحیات پر تھا لیکن اب اسکا تصور اس کے حواس کے قبضہ سے نکل کر مطلق العنان ہو گیا اور جو تصورات جس کے راستہ سے نہیں آتے ہیں انکی صحت و غلطی بھی جس کے ذریعہ سے نہیں جانچی جاسکتی ہے غرض حیات کے اضافہ سے معلومات کے اضافہ کا یہ بدیہی تجربہ ہی اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ تصورات کی پیدائش کا ذریعہ محض حیات ہیں،

۴) لیکن ان سب دلائل سے بڑھکر اس بات کا قطعی ثبوت کہ انسان کے ذہن میں کوئی تصور اس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتا تا وقتیکہ اسکا تجربہ حسی انسان کو اپنی روزانہ زندگی میں نہ ہو گیا ہو خود انسان کے ضمیر و ادراک کے باطن کی شہادت ہے اور نفسانی مباحث میں خود نفس کی اپنی شہادت سے زیادہ اور کوئی شہادت قطعی اور مسلم الثبوت نہیں ہو سکتی، میں خود اپنی ذاتی تجربہ کے بناء پر کہتا ہوں کہ میرا ذہن ان اشیاء کا تصور کرنے سے قاصر ہے جنکا خود یا انکی نظیر کا تجربہ حسی اپنی روزانہ زندگی میں مجھے نہیں ہوا میں اسکا

انکار نہیں کرتا کہ دنیا میں اس قسم کے لوگ نہیں پائے جاتے لیکن میں اپنی ذہنی تجربہ کی بناء پر کہتا ہوں کہ مجھے اسکے خلاف کبھی تجربہ نہیں ہوا ہے اور اپنے اس دعویٰ پر جتنے دلائل میں نے اوپر پیش کیے ہیں ان کے متعلق میں اپنے ذاتی تجربہ سے قطع نظر کر کے دوسرے لوگوں سے یہ فتویٰ طلب کرتا ہوں کہ ان دلائل کی صحت کے متعلق دوسرے لوگ انسانی تجربہ کس بات کی شہادت دیتا ہے۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ دنیا میں ان لوگوں کی مثالیں بکثرت موجود ہیں جو قوت بصارت سے محروم تھے لیکن جنکا کمال علمی زمانہ کے نزدیک مسلم تھا ہو مگر کو دیکھ کر وہ پیدا کنشی نابینا تھا مگر اسکی البیڈ اور اڈیسی میں بکثرت ایسے واقعات مذکور ہیں جنکے تصور تک کسی نابینا و دشمنو کی بھی رسائی نہیں ہوئی اور فساد نگاری کے کمالات کے علاوہ اسنے ان نظموں میں فطرت انسانی کا وہ مکمل مرقع کھینچا ہے جسکے تصور سے نابینا و دشمنو لوگوں کی عقلیں قاصر ہیں اسی طرح مسلمانوں میں ایک فلسفی ابو العلاء معری نامی ہوا ہے جو اپنے وقت کا نہایت مشہور و معروف حکیم تھا اسنے اپنی نظموں میں مسائل فلسفہ جس خوبی سے حل کیے ہیں کیا کوئی دوسری کتاب اسکی نظیر پیش کر سکتی ہے؟ لیکن باینہ فضل و کمال وہ پیدا کنشی نابینا تھا اور اسی نابینائی کی حالت میں وہ انکبیات اور طبعیات وغیرہ تمام علوم میں بہرہ فرا رکھتا تھا اسکی منظوم کتابیں مثلاً سقط الزند رسالۃ الغفران، لزوم مالا یلزم وغیرہ ایک بلند خیال نابینا فلسفی کے خیالات کی ترجمانی کرتی ہیں حاصل یہ کہ دنیا میں بکثرت مثالیں ان لوگوں کی موجود ہیں جو فقدان حواس کے باوجود علم و فضل میں مشہور و معروف ہوئے ہیں بے شبہ یہ خیال ایک حد تک صحیح ہے لیکن جسمانی اور انسانی حقائق کے متعلق کوئی کلیہ قائم کرتے وقت یہ خیال کرنا چاہیے کہ دنیا میں کوئی قانون ایسا نہیں پایا جاتا جو ہر یک مستثنیات نہ رکھتا ہو کار خائہ قدرت باوجودیکہ نہایت منتظم اور کامل ہے مگر باوجود اس کے

جتنے فطری واقعات روزانہ پیش آتے رہتے ہیں انکی بنا پر کوئی شخص کبھی یقین کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتا کہ ہم نے جو اصول مقرر کیا ہے اسکے خلاف کبھی کوئی واقعہ نہ پیش آئیگا پس اس بنا پر ہم ان مستثنیات کی وجہ سے جنکا شمار انگلیوں پر ہو سکتا ہے اپنے اس غلبی کلیہ میں کبھی ترمیم نہیں کر سکتے ہیں کہ انسان کے تصورات اسکے حیات پر موقوف رہتے ہیں اور کسی ایسی چیز کا تصور ذہن انسانی میں نہیں پیدا ہو سکتا جو انسان کے تجربہ جسی میں کبھی نہ آئی ہو۔ یہ ایک نفسانی حقیقت ہے جو ہماری نزدیک مسلم ہے اور اسکے خلاف جتنی شہادتیں ہیں انکو ہم مستثنیات میں شمار کرتے ہیں،

(۳۰) علوم فطریہ اولیہ کی حقیقت | پس اب اگر انسان کے کسی خیال یا انسان کے کسی قائم کردہ کلیہ کی بنا دریافت کرنا ہو یا اسکی صحت و غلطی کے متعلق فیصلہ کرنا ہو تو پہلے یہ بات دریافت کرنا چاہیے کہ یہ خیال انسان کو ذہن میں کس حس کی بنا پر پیدا ہوا ہے، اور صحت و غلطی کے اعتبار سے اس حس کا کیا نتیجہ اگر اس حس کے متعلق یہ باتیں دریافت کر لیں تو اس تصور کی حقیقت ہی باسانی ہم دریافت کر لیں گی کہ یہ صحت و غلطی جانچنے کا عام اصول ہے جو ہماری بیانات سابقہ سے مستنبط ہوتا ہے لیکن فلاسفہ کا ایک گروہ ایسا ہی ہے جو یہ کہتا ہے کہ انسان کے بہت سے خیالات و تصورات ایسے ہوتے ہیں جو کسی سابق احساس پر مبنی نہیں ہوتے بلکہ ذہن میں انکا حصول الہام فطری کے ذریعہ سے ہوتا ہے ان علوم کو علوم فطریہ کہتے ہیں ان فلاسفہ کا خیال ہے کہ احساس کو انسان کے ہر خیال اور ہر تصور کی بنا قرار دینا سچی لا حاصل ہے لیکن جب ہم ان فلاسفہ سے یہ سہ تصور کے حدود کے متعلق دیکھو اسپنسر کی کتاب ”اصول اولیہ“ کا چوتھا باب اور ادنیٰ دوسری کتاب ”اصول علم نفس“ نیز اس موضوع پر کانٹ نے اپنی کتاب ”نقد النظر“ میں اور سر ولیم ہملٹن نے اپنے مضمون (فلسفہ مطلق اٹمی) میں نہایت دلچسپ بحث کی ہے،

دریافت کرتے ہیں کہ وہ کون سے علوم ہیں جو اپنی پیدائش میں سابق احساس کے نہیں بلکہ الہام فطرت کے محتاج ہوتے ہیں تو وہ یہ جواب دیتے ہیں کہ مثلاً خیال علت ہی ایک فطری تصور ہے جو کسی سابق احساس سے نہیں بلکہ الہام فطرت کی بنا پر پیدا ہوا ہے اسی طرح مثلاً عقیدہ کے علوم متعارفہ ہیں کہ انکی پیدائش سابق احساس سے نہیں بلکہ محض الہام فطرت کی بنا پر ہوئی ہے پھر سب سے آخر میں خدا کی ذات و صفات کے عقیدہ کو دیکھو خدا کی ذات و صفات محسوس نہیں ہوتے اور اس لیے اس عقیدہ کی پیدائش کسی سابق احساس سے نہیں ہو سکتی ؟ غرض خدا کا عقیدہ الہام فطری کی ایک تین مثال ہے جس سے کوئی دیکھ کر نہیں کر سکتا اسی طرح اور بہت سے عقائد عامہ ہیں جو نوع انسان میں مشترک ہیں اور انکی صحت پر کبھی احساس سابق سے استدلال نہیں کیا جاسکتا،

لیکن پھر اگر ہم ان فلاسفہ سے یہ پوچھتے ہیں کہ علوم فطریہ کی علامت کیا ہے اور تم علوم فطریہ کو علوم غیر فطری سے کس طرح ممتاز کر سکتے ہو تو وہ اس سوال کا جواب یہ دیتے ہیں کہ علوم فطریہ کی دو علامتیں ہیں کلیت اور وجوب یعنی یہ کہ انسان کے جتنے تصورات کلیت اور وجوب پر مشتمل ہوتے ہیں وہ سب کے سب فطری ہوتے ہیں اور انکی پیدائش میں احساسات سابقہ کو دخل نہیں ہوتا،

ہم الہام فطری کے منکر نہیں اگر کسی تصور کے متعلق یہ ثابت ہو جائے کہ اس کی پیدائش احساس سابق سے نہیں بلکہ الہام فطری سے ہوئی ہے تو ہم ان لنگے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہر دراصل اس طول طویل فہرست کے جزئیات سے اختلاف ہے جو فلاسفہ نے مرتب کی ہے ہم بیان اس مسئلہ سے مفصل بحث کرنا نہیں چاہتے ہم نے اس بحث کو کسی تفصیل کے ساتھ اپنے دوسرے مضمون ”وحدت و تنوید“ میں تحریر کیا ہے

البتہ ہم یہاں صرف یہ سوال کرنے کا استحقاق رکھتے ہیں کہ علوم فطری سے کیا مراد ہے لیکن یہ ایک ایسا مشکل ترین سوال ہے کہ اسکا ٹھیک جواب فلاسفہ کی جانب سے اب تک کوئی نہیں دیا گیا حالانکہ دراصل اسی سوال کے حل پر ساری بحث کا دار مدار ہے۔ ہیوم نے اس بحث کا جو فیصلہ کیا ہے وہ ایک حد تک ہکو نہایت پسند ہے ہکو اختصار کا پہلو جو مد نظر ہے اس کے لحاظ سے ہم ہیوم کے فیصلہ کو نقل کرنا کافی سمجھتے ہیں۔ ہیوم کہتا ہے کہ۔

جن لوگوں نے علوم اولیہ فطریہ کا اکار کیا ہے انکا مطلب اس انکار سے بجز اس کے کچھ نہیں ہے کہ انسان کے تمام تصورات کی پیدائش کسی دہ کسی سابق احساس سے ہوتی ہے اور اس بنا پر وہ علوم فطریہ کی صنف کو بے معنی سمجھتے ہیں اس بحث کے متعلق دو حقیقت فیصلہ کن سوال یہ ہے کہ علوم فطریہ سے مراد کیا ہے؟ اگر علوم فطریہ سے یہ مراد ہے کہ جو فطرت کے جانب سے ودیعت کیے گئے ہیں تو ظاہر ہے کہ یہ معنی بہت وسیع ہیں اور اس معنی میں فطری کا لفظ کبھی مصنوعی کے مقابل میں استعمال کیا جاتا ہے اور کبھی خرق عادت کے مقابل میں لیکن بہر صورت اس معنی کے لحاظ سے تصورات کے علاوہ دیگر کوائف نفسانی یعنی حیات جذبات اور ارادہ وغیرہ کو بھی فطری قرار دینا پڑیگا اور اگر فطری سے مراد یہ ہے کہ وہ علوم جنکی پیدائش ولادت کے وقت بلکہ اس سے ہی پیشتر ہوئی ہے تو اس معنی کے لحاظ سے گویا اس بحث کا حاصل یہ ہوگا کہ انسان کی کیفیات نفسیہ کی پیدائش کے وقت کی تحقیق کجایں اور یہ ظاہر ہے کہ یہ بحث کیسے قدر فضول ہو پھر اسکے علاوہ بڑی مشکل یہ ہے کہ لاگ وغیرہ کی تحریرات میں لفظ تصور مختلف مواقع کے لیے ہستمال کیا گیا ہے لاگ نے تصور کا اطلاق ایک موقع پر حیات پر کیا ہے دوسری جگہ جذبات پر اور تیسری جگہ خیالات و تصورات پر، پس اگر ان مختلف

استعارات کو ملاحظہ رکھا جائے تو اس صورت میں مرث تخیلات کے ساتھ علوم فطریہ کی تخصیص کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی اور اس صورت میں تصورات کی طرح جذبات وغیرہ کے متعلق ہی فطری ہونے کا دعویٰ کیا جاسکتا ہے، لیکن اگر ان معنوں سے قطع نظر کر کے لفظ فطری کی تشریح اس طرح کی جائے کہ علوم فطریہ وہ علوم ہیں جو کسی سابق احساس سے نہ پیدا ہوئے ہوں تو اسی معنی کے لحاظ سے اس بحث کے متعلق ہمارا فیصلہ یہ ہے کہ احساسات بتیک الہام فطرت سے پیدا ہوتے ہیں یعنی یہ کہ انکی پیدائش سابق احساسات سے نہیں ہوتی لیکن تصورات سب کے سب غیر فطری ہیں یعنی تصورات کی پیدائش الہام فطرت سے نہیں بلکہ سابق احساسات سے ہوتی ہے،

یہ ہیوم کا فیصلہ ہے اور اسی فیصلہ کو ہم یہاں اس بحث کے لیے کافی سمجھتے ہیں گو اس عمومیت کے ساتھ ہم علوم اولیہ کے انکار میں ہیوم کے مؤید نہیں ہیں، اعلیٰ تصور کی تحدید [۳۱] لیکن جب یہ ثابت ہو گیا کہ تصور اپنی زبردست طاقت کے باوجود حیات کے حدود میں مقید رہتا ہے، اور کوئی تصور حیات کے دائرہ سے باہر نہیں جاسکتا تو اب یہاں پر ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر تصور کی وسعت حدود کے کیا معنی ہیں اور اگر تصور محض حیات کی حد کے اندر محدود ہے تو پھر ہمارے ذہن میں وہ تصورات کیوں پیدا ہوتے ہیں جنکا وجود خارج میں نہیں ہوتا یہ کہنا صحیح ہے کہ ایسے تصورات ہمارے ذہن میں پیدا نہیں ہوتے کیونکہ تصور کی یہی زبردست طاقت ہے جو لٹریچر میں تشبیہات اور استعارات کا مواد فراہم کرتی ہے آتش سیال کا مشاہدہ خارج میں کسے کیا ہے؟ غنقا کو دنیا میں کس نے دیکھا ہے؟ سنہرے پہاڑ کا حال دنیا میں اب تک کس کو معلوم ہوا ہے؟



اب حیات کی جستجو اور تلاش میں کون کامیاب ہوا ہے؟ غرض ہر زبان کا لٹریچر ایسے الفاظ سے پُر ہے جنکے مصداقات خارج میں موجود نہیں ہوتے ہیں لیکن انکا تصور ذہن میں ہو سکتا ہے اور حقیقت میں یہ تصور ہی کی کرشمہ سازی ہے جو استعارہ طرازی، تمثیل بیانی، اور تشبیہ کے پر دون میں ظاہر ہو کر انسان کے خیالات میں وسعت اور زبان میں مختلف اسالیب بیان پیدا کرتی ہے،

اس سوال کا جواب دینے کی غرض سے ہمیں تصور کی اس تعریف کی جانب رجوع کرنا چاہیے جو ہم نے اوپر بیان کی ہے ہماری تعریف کا ماحصل یہ تھا کہ تصور وہ دماغی قوت ہے جو ان غیر مرئی اشیاء کو ہمارے پیش نظر کر دیتی ہے جنکا حس ہمیں حواس کے ذریعہ سے پہلے ہو چکا ہے اس تعریف سے یہ بات صاف واضح ہوتی ہے کہ گو تصور کے ذریعہ غیر مرئی اشیاء ہماری نگاہ کے سامنے محسوس ہو کر آتی ہیں لیکن ان غیر مرئی اشیاء کا مواد سبقت احساسات سے فراہم ہوتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ تصور کی تعریف سے احساسات سابقہ کی قید نکال ڈالنا تصور کی طاقت کا بیجا اور مبالغہ آمیز خیال قائم کرنا ہے تصور کی طاقت اس معنی میں بیشک وسیع ہے کہ انسان کے حواس سے اسکو خدمت لینے کی حاجت نہیں ہوتی لیکن اسکے یہ معنی نہیں ہیں کہ تصور نئی چیزوں کو پیدا کر سکتا ہے حقیقت یہ ہے کہ تصور کی حالت ایک صناعت کی ایسی ہے جس طرح ایک صناعت ایک میز تیار کرتے وقت ان چیزوں کے میز کا مصالحہ فراہم کرتا ہے جو قدرتا میز بنانے کے کام آسکتی ہیں اسی طرح تصور بھی ایک نئی چیز پیدا کرتے وقت انہی احساسات سے کام لیتا ہے جو پہلے سے اس کام میں آنے کی قابلیت رکھتے ہیں اور جس طرح صناعت کی قدرت سے یہ باہر ہے کہ وہ لکڑی اور لوہے اور دیگر چیزوں کو سب سے خود پیدا کرے بلکہ اسکا کام صرف اسقدر ہوتا ہے

کہ وہ لگائی اور لوہے وغیرہ چیزوں کو جو قدرت کی جانب سے بنی بنائی موجود ہیں فراہم کرے اور ان کو ایک مناسب وضع قطع میں ترتیب دیکر ایک میز تیار کرے بعینہ اسی طرح تصور کی طاقت سے یہ باہر ہے کہ وہ کسی ایسی چیز کا ادراک کرے جس کا حس اب تک انسان کو نہیں ہو سکا ہے ہاں البتہ تصور یہ کر سکتا ہے کہ جو مواد ہائے حواس نے فراہم کیا ہے انکو ملا کر اسے کسی نئی چیز کو ترتیب دے یا انہیں سے بعض احساسات کو الگ کر کے نئی چیز پیدا کرے یا بعض خاص احساسات میں کسی دوسرے قسم کے احساس کا اضافہ کر کے ایک نیا مرکب تیار کرے حاصل یہ کہ تصور کا کام ایک صنایع کی طرح صرف اس قدر ہے کہ وہ حواس کے جمع کردہ فطری مواد کو اکٹھا کر کے اسے نئی نئی چیز میں پیدا کرتا رہے،

لیکن اگر اس سے زیادہ تصور کی وضاحت درکار ہو تو دوسرے طریقہ پر تصور کی حالت کو یوں سمجھو کہ جس طرح ایک کیمیا دان کبھی بعض مرکب چیزوں کو لیکر انہیں سے مفرد عناصر کو الگ کرتا ہے کبھی وہ بعض متجانس عناصر کو لیکر انکو باہم ترتیب دیتا اور ان سے ایک نیا مرکب پیدا کر لیتا ہے اور کبھی بعض مخالف عناصر کو جمع کر کے انکا مزاج قائم کرتا اور مزاج قائم کرنے کے بعد ایک مناسب شکل میں انکو ترتیب دیتا ہے بعینہ اسی طرح تصور کا کام صرف اس قدر ہے کہ کبھی وہ بعض مرکب احساسات کو جمع کر کے انکی تحلیل کرتا ہے کبھی وہ متجانس احساسات کو فراہم کر کے اسے ایک نیا مرکب پیدا کرتا ہے کبھی وہ بعض مخالف احساسات کی تلاش کر کے انکے درمیان ایک فرضی رابطہ پیدا کرتا اور اسکے بعد انکو ایک نئی شکل میں ترتیب دیتا ہے اور کبھی وہ کیمیا دان کی طرح چند مفرد عناصر کو لیکر انکی روح کو ایک مفہوم کلی کی صورت میں یکجہاں لیتا ہے غرض ایک عمل کیمیادی کی طرح تصور کے اعمال بھی چار قسم کے ہوتے ہیں،

(۱) تحلیل یعنی مرکب محسوسات یا احساسات کو فراہم کر کے اسے مفرد احساسات کو الگ کرنا  
(۲) ترکیب، یعنی متخالف احساسات یا محسوسات کو جمع کر کے ان سے ایک نیا مرکب  
پیدا کرنا،

(۳) تخلیط، یعنی متخالف احساسات یا محسوسات کو فراہم کر کے ان کے درمیان ایک فرضی  
رابطہ پیدا کرنا اور اسکے بعد انکو ایک نئی شکل میں ترتیب دینا،

(۴) تجربہ، یعنی بسیط احساسات یا محسوسات فراہم کر کے اسے ایک مہم کلی اخذ کرنا،  
اعمال تصور کے ان چاروں اقسام کی مثالیں واضح ہیں البتہ عمل تخلیط کی حقیقت  
کسی قدر غیر واضح ہے اس لیے ہم اسکی حقیقت کو ذیل کی مثالوں سے واضح کرتے ہیں،  
عمل تخلیط کی ایک سادہ مثال یہ ہے کہ مثلاً ہم نے مختلف اقسام کے جانور اڈنٹ، بکری  
گائے، بھیر، وغیرہ کا الگ الگ مشاہدہ کیا ان سب کے جسموں کے الگ الگ حصے تھے انکا  
بھی مشاہدہ کیا لیکن اب مشاہدہ کرنے کے بعد فرض کرو کہ ہم نے ان جانور دن کی اصل صورت کو  
نظر انداز کر دیا اور ایک ایک جانور کے جسم کے ایک ایک حصہ کا ملا کر تصور شروع کیا اڈنٹ  
کی گردن ملی، بکری کے پاؤں اور اسطرح جتنے جانور دن کا مشاہدہ ہم کر چکے ہیں ان کے جسم کا  
ایک ایک حصہ لے لیا اور ان سب کو ترتیب دیکر ذہن میں ایک نئی چیز کا تصور پیدا کر لیا  
تو اگرچہ اس صورت میں ایک نئی چیز رہا ہے تصویر میں پیدا ہو گئی ہے لیکن درحقیقت یہ نئی  
نہیں ہے بلکہ قبل کمال احساسات کا نتیجہ ہے اسی طرح فرض کرو کہ ہم اس وقت سونے کے پہاڑ کا  
تصور کر رہے ہیں ظاہر ہے کہ ہم نے سونے کا پہاڑ کبھی نہیں دیکھا ہے کیا کسی نے نہ دیکھا ہوگا  
مگر اسکا تصور رہا ہے ذہن میں پیدا اسطرح ہوا کہ سونے کا مشاہدہ ہم کر چکے تھے اور پہاڑ بھی  
ہم نے دیکھا تھا اب ہم نے یہ کیا کہ اپنے ذہن میں ان دو احساسات کو جو علیحدہ علیحدہ تھے اور

مختلف اوقات میں ہلکوا حاصل ہوئے تھے کچا کوکے لئے ایک نیا تصور ایک نئی چیز کا  
پیدا کر لیا جو اپنی موجودہ حالت میں غیر مرئی اور غیر مشاہد ہے لیکن اس مرکب تصور کے  
مفردات ہمارے مشاہدہ میں آچکے تھے۔ پس عمل تخلیط کے متعلق یہ یاد رکھنا چاہیے کہ عمل  
تخلیط کی بنا ہمیشہ اس خاص رابطہ پر ہوا کرتی ہے جو دو متخالف چیزوں کے درمیان ذہن پیدا  
کر لیتا ہے اور عموماً یہ رابطہ مصنوعی اور فرضی ہوا کرتا ہے مساوات اور مماثلت کے تصورات  
کو بھی ترکیب اور تخلیط ہی کے نتائج عمل سمجھنا چاہیے لیکن مساوات و مماثلت حقیقی اور مساوات  
و مماثلت غیر حقیقی کے درمیان فرق صرف اس قدر ہوتا ہے کہ اگر وہ رابطہ مساوات و مماثلت  
یعنی اور واقعی ہے تو اس کو ہم استقرار تام کی بنا قرار دیکتے ہیں لیکن اگر وہ مصنوعی اور  
غیر واقعی ہے تو وہ مثیل تشبیہ اور استعارہ کے کام آتا ہے وہ لوگ جنکی قوت عقلی کمزور ہوتی  
ہے عموماً اس قسم کا فرضی رابطہ اپنے ذہن میں جلد پیدا کر لیتے ہیں غرض یہی چار اعمال  
تصور ہیں جو انسان کے تمام دراکات و تصورات کی بنا ہیں تجرید و تحلیل سے نئے نئے  
بسیط تصورات حاصل کیے جاتے ہیں اور ترکیب و تخلیط سے مرکب علوم و تصورات۔  
ہشیار کی مانتوں کا دریافت کرنا اور ان کے اختلافات کی تحقیق کرنا تمام مرکب علوم انسانی  
کا حاصل ہے استقرار، قیاس، تمثیل، جو فکر و نظر کی مختلف صورتیں ہیں وہ انہی دو مختلف  
اعمال تصور ترکیب و تخلیط سے اپنا مواد فراہم کرتی ہیں لیکن چونکہ ان چاروں اعمال میں  
عمل تجرید کو بسیط علوم کے ساتھ ایک خاص تعلق ہے اور عمل تجرید کی حقیقت کی نادانیت  
اکثر فلسفیانہ غلط فہمیوں کی باعث ہوئی ہے اس لیے ہم کیفیت تصور کی تشریح کے بعد اپنے  
دعوہ کے مطابق تجرید ذہنی سے بھی بحث کریں گے البتہ عمل ترکیب و عمل تخلیط سے بحث کرنا  
ہمارے فرض میں داخل نہیں ہے کیونکہ وہ ان سے مرکب تصورات و دراکات کی سرحد

شرع ہوتی ہے حالانکہ ہم اس مضمون میں صرف علم بسیط کی حقیقت سے بحث کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں ہاں البتہ تصور کی ترکیب و ارتقار کے قوانین نفسی بتائے دیتے ہیں جسکے مطابق تصورات کی ترقی و ترکیب عمل میں آتی ہے لیکن ہم ان قوانین سے بھی اسی حد تک بحث کریں گے جس حد تک کہ انکا تعلق علم بسیط اور کیفیت تصور کی فصاحت و شریح کے ساتھ وابستہ رہے،

(۳۲) تصور کی ترکیب | اتنی بات ہر شخص جانتا ہے اور اس بات کا تجربہ ہر شخص کو اپنی وارتقار کے قوانین نفسی زندگی میں ہوتا ہے کہ انسان کے ذہن میں اسکی زندگی کے اکثر لمحوں میں تصورات کا ایک لگاتار سلسلہ جاری رہتا ہے حالت خواب میں جب تو اپنے دماغی پر اسفل مراکز عصبی کا غلبہ ہوتا ہے اسوقت اس سلسلہ میں اور ترقی ہو جاتی ہے نیز اس کے ساتھ ہر شخص کا یہ بھی تجربہ ہے کہ یہ لانتنا ہی تصورات بلا کسی خاص تعلق کے نہیں پیدا ہوتے ہیں بلکہ ان تصورات میں باہم کسی کسی قسم کا علاقہ ضرور ہوتا ہے جسکے باعث ذہن انسانی میں بسیط تصورات سے لیکر مرکب اور مرکب در مرکب تصورات کی پیدائش برابر ہو ا کرتی ہے بلکہ مرکب تصورات کے علاوہ ہم ان تصورات میں ہی باہم کوئی نہ کوئی علاقہ ضرور پاتے ہیں جو بظاہر ایک دوسرے سے بالکل بے تعلق نظر آتے ہیں بیداری کے عالم کے علاوہ حالت خواب میں بھی ہم سب جن تصورات کا استیلاء ہوتا ہے وہ بھی گونپا ہر باہم بے تعلق نظر آتے ہیں لیکن درحقیقت ان میں ہی باہم کوئی نہ کوئی دقیق ربط و علاقہ ضرور ہوتا ہے اسطرح یہ بھی عجیب بات ہے کہ بعض اوقات دو مختلف زبانوں کے بعض اہم معانی الفاظ میں ایک خاص مشابہت پائی جاتی ہے جو اس بات پر دلیل ہے کہ مختلف تصورات میں باہم کوئی نہ کوئی علاقہ ضرور ہوتا ہے جسکی بنا پر ایک تصور کے

پیدا ہوتے ہی دوسرا تصور بھی ذہن میں پیدا ہو جاتا ہے نفس ذہنی کا یہی قانون ہے جسکو اصطلاح میں قانون ایتلاف ذہنی کہتے ہیں، اس قانون کا منشا یہ ہے کہ بعض دویا زائد تصورات میں باہم ایک ایسا گہرا تخصیصی تعلق ہوتا ہے کہ جب انہیں سے ایک تصور ذہن میں پیدا ہوتا ہے تو دوسرا تصور بھی ضرور پیدا ہو جاتا ہے یہی قانون ہے جو ذہن میں تصورات کی ترکیب و ارتقار کا باعث ہوتا ہے،

لیکن سوال یہ ہے کہ اس قسم کے تخصیصی تعلقات کی تحدید کیا ہے؟ یعنی یہ کہ وہ کون سے تعلقات ہوتے ہیں جسکی بنا پر قانون ایتلاف ذہنی تصورات انسانی پر عامل ہوتا ہے؟ بالفاظ دیگر اس قانون کی فعلیت کی کتنی صورتیں ہیں؟

مقدمین فلاسفہ حال میں سے ہیوم نے اس قانون کی فعلیت کی تین صورتیں بتائی ہیں جو اسیکے اوراق سے حسب ذیل ہیں،

(۱) علاقہ علیت - یعنی جو دو چیزیں باہم علت و معلول ہوتی ہیں انہیں سے ایک کا تصور ذہن میں جب پیدا ہوتا ہے تو فوراً دوسری چیز کا تصور بھی پیدا ہو جاتا ہے مثلاً اگر ہم کسی دقت زخم کا تصور کرتے ہیں تو فوراً ہمارے ذہن میں اس تکلیف اور اذیت کا تصور بھی پیدا ہوتا ہے جو اس زخم کی وجہ سے انسان کو لاحق ہوا تھا،

(۲) علاقہ تقارنت زمانی یا مکانی - یعنی جب دو یا زائد چیزیں ہم مکان یا ہم زمان ہوتی ہیں تو ہمارے ذہن میں جب انہیں سے کسی ایک کا تصور پیدا ہوتا ہے تو فوراً دوسری چیز کا تصور بھی پیدا ہو جاتا ہے مثلاً اگر ہم کسی عمارت کے ایک حصہ کا صرن تصور کریں تو خواہ مخواہ ہمارے ذہن میں اس عمارت کے دوسرے حصوں کا بھی تصور پیدا ہو جائیگا،

(۳) علاقہ مماثلت - یعنی جب دو یا زائد چیزیں ذہن میں باہم مماثلت ہوتی ہے تو مثل لمکے

فصو کے ہمارے ذہن میں پیدا ہوتے ہی مثل کا تصور خواہ مخواہ پیدا ہو جاتا ہے مثلاً اگر ہم کسی شے کی تصویر یا فوٹو کا تصور اپنے ذہن میں کریں تو فوٹو کے تصور سے خواہ مخواہ ہمارے ذہن میں اسکی اصل کا ہی تصور پیدا ہو جائیگا۔

یہ ہیوم کی تحدید ہے جو اسے بتائی ہے لیکن یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ تحدید ناقص ہے کیونکہ قانون ایٹلاف ذہنی کی فعلیت کی ایک صورت علاقہ تضاد ہی ہے جسکو ہیوم نے مذکورہ بالا صورتوں میں سے کسی صورت میں داخل نہیں کیا ہے، ہیوم نے خود اس شبہ کا ازالہ کیا ہے وہ کہتا ہے،

”ان تین صورتوں کے علاوہ اس قانون کی فعلیت کی ایک صورت علاقہ تضاد ہے لیکن علاقہ تضاد درحقیقت علاقہ علیت اور علاقہ مماثلت کے مجموعہ کا نام ہے یہ ظاہر ہے کہ جب دو چیزوں میں تضاد ہوتا ہے تو ان میں سے ایک چیز دوسری چیز کی فنا اور زوال کا باعث ہوتی ہے اور یہی علیت کی شان ہے پھر اس کے فنا کے تصور سے ذہن میں اس کے سابق وجود کا تصور پیدا ہوتا ہے اور یہ علاقہ مماثلت کی شان ہے پس درحقیقت علاقہ تضاد کوئی نیا علاقہ نہیں بلکہ علاقہ علیت اور علاقہ مماثلت کے مجموعہ کا نام ہے“

لیکن ہیوم کی تحدید اب بھی ہمارے نزدیک ناقص ہے علاقہ تضاد کو جس بنا پر اسے علاقہ علیت اور علاقہ مماثلت دونوں کا مجموعہ فرض کیا ہے وہ ہمارے نزدیک بڑی اصل بات ہے جب دو چیزوں میں علاقہ تضاد پایا جائیگا تو دونوں میں مثلیت کہاں سے آئیگی دو چیزوں میں مثلیت کے باوجود تضاد کا پایا جانا صریحی تناقض نہیں تو اور کیا ہے ؟

علاوہ برین اگر علاقہ تضاد کو علاقہ علیت اور علاقہ مائت کا مجموعہ فرض کیا جاسکتا ہے تو کم از کم علاقہ مقارنت زمانی کو تو علاقہ علیت میں شمار کرنا زیادہ مناسب ہو گا کیونکہ ہیوم سے تو تعجب ہے کہ اسے علاقہ تضاد کو علاقہ علیت اور علاقہ مائت کا مجموعہ فرض کیا لیکن علاقہ علیت کو علاقہ مقارنت میں شمار نہیں کیا حالانکہ علت کے متعلق تو خود ہیوم کا یہ خیال ہے کہ علت و معلول میں کوئی ذاتی علاقہ باعث نہیں ہوتا بلکہ محض دو چیزوں کی باہمی زمانی مقارنت کو دیکھ کر ہم عادتاً دونوں کے درمیان ایک خاص علاقہ پیدا کر لیا کرتے ہیں جسکو ہیوم علاقہ عادی کہتا ہے پس ہیوم کے اس خیال کی بناء پر علت و معلول میں باہم درحقیقت علاقہ مقارنت کے علاوہ کوئی دوسرا علاقہ ہی نہیں ہوتا اور اسی لیے ہیوم نے علت کی تعریف میں مقارنت زمانی کے علاوہ اور کسی قید کا لحاظ ہی نہیں کیا ہے حاصل یہ کہ ہیوم نے علت کی جو تہوری بتائی ہے اسکی بناء پر علاقہ علیت کا علاقہ مقارنت میں شمار کرنا زیادہ مناسب ہے اور واقعہ بھی یہی ہے کہ علیت علاقہ مقارنت ہی کی ایک شکل کا نام ہے البتہ بعض لوگوں کے نزدیک علاقہ مقارنت اور علاقہ علیت میں فرق صرف اسقدر ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک علت و معلول میں متعلق زمانی کے علاوہ ایک بات اور پائی جاتی ہے اور وہ یہ کہ علت میں ایک ایسی قوت ہوتی ہے جسکی بناء پر معلول کا صدور علت سے ہوتا ہے لیکن کبھی ایسا ہوتا ہے کہ علت سے معلول کا صدور گونہیں ہوتا اگر دونوں باہم لازم مزدوم ہوا کرتے ہیں اور مقارنت زمانی اسوقت بھی دونوں میں پائی جاتی ہے پس درحقیقت لزوم اور تعلیل یہ دونوں علاقے بھی علاقہ مقارنت کے اندر شامل ہیں اور اس لیے ہمارے نزدیک علاقہ تضاد کو علاقہ مائت اور علاقہ علیت کا مجموعہ فرض کرنے کے بجائے اسکو ایک مستقل علاقہ



قرار دینا چاہیے اور علیت اور لزوم کو علاقہ مقارنت زمانی میں شمار کرنا چاہیے پس اس اصول کی بناء پر ہمارے نزدیک قانون ایٹلاف ذہنی کی تین صورتیں ہیں جو ہیوم کی بیان کردہ صورتوں سے تھوڑا سا مختلف ہیں،

(۱) علاقہ مقارنت۔ یعنی جب دو یا زائد چیزوں میں مکانی یا زمانی حیثیت سے نفس ذہن قرب یا اتصال محسوس کرتا ہے تو جب انہیں سے کسی ایک چیز کا تصور ذہن میں پیدا ہوتا ہے تو دوسری مقارن شے کا تصور بھی خواہ مخواہ اس کے ساتھ پیدا ہو جاتا ہے مثلاً جب ہم دھوین کا تصور کرتے ہیں تو دھوین کے ساتھ ساتھ آگ کا تصور بھی ہلکے فوراً ہوتا ہے کیونکہ آگ اور دھواں ہمارے ذہن میں مقارنت کے سبب اس طرح باہم لازم ملزوم ہو گئے ہیں کہ نفس دھوین اور آگ کے تصور میں انفصال کو قبول نہیں کرتا اور چار و ناچار ایک تصور کے ساتھ دوسرا تصور بھی پیدا ہو جاتا ہے یا اسی طرح مثلاً اگر ہم کسی عمارت کے ایک حصہ کا صرف تصور کریں تو اس عمارت کے دوسرے حصوں کا تصور بھی ہمارے ذہن میں ضرور پیدا ہوتا ہے۔ لیکن علاقہ مقارنت کی تین صورتیں ہیں (۱) وہ دو چیزیں جو ساتھ ساتھ پائی جا رہی ہیں باہم علت و معلول ہوں یعنی یا یہ کہ انہیں سے ایک چیز کا وجود دوسری چیز کی وجہ سے ہوا ہو اور یا یہ کہ ان دو چیزوں کے درمیان بار بار کے تجربہ کی بناء پر خود نفس ذہنی نے ایک عادی رابطہ علیت و معلولیت کا پیدا کر لیا ہو تو جب ان دو چیزوں میں سے کسی ایک چیز کا تصور ہم کرتے ہیں تو دوسری چیز کا تصور بھی ہمارے ذہن میں ضرور پیدا ہو جاتا ہے۔ مثلاً اگر ہم کسی زخم یا پوٹے کا تصور کرتے ہیں تو ہمیں ساتھ ساتھ اس اذیت اور تکلیف کا بھی تصور ہوتا ہے جو اس زخم سے ہلکے محسوس ہوتی تھی۔ یا مثلاً جب ہم کسی مصنوع چیز کا تصور کرتے ہیں تو اس کے

صانع کی جانب بھی ہمارا خیال ضرور جاتا ہے،

(۲) وہ دو چیزیں جو ساتھ ساتھ پائی جاتی ہیں باہم علت و معلول تو نہیں لیکن انہیں رابطہ لازم پایا جاتا ہو اس صورت میں بھی لازم کے تصور سے لازم اور لازم کے تصور سے لازم کا تصور ہوتا ہے،

(۳) وہ دو چیزیں جو ساتھ ساتھ پائی جاتی ہیں انہیں باہم نہ رابطہ علیت ہو اور نہ علاقہ لازم بلکہ محض ایسی مقارنت ہو جیسی دن اور رات میں پائی جاتی ہے مثلاً جب ہم کسی خاص شخص کا تصور کرتے ہیں تو اس کے ان تمام تشخصات خارجی کا بھی تصور ہوتا ہے کہ اس کی دائرہ طویل اور گہنی ہے اور اس کا سر منڈا ہوا ہے وغیرہ وغیرہ،

پھر کبھی ایسا ہوتا ہے کہ جو واقعات اتفاقیہ ساتھ ساتھ وقوع پذیر ہوتے ہیں انکی یہ اتفاقی مقارنت زمانی نفس میں کچھ اس طرح منتقل اور مرسم ہو جاتی ہے کہ اب ایک بار کی مقارنت ہمیشہ کے لیے ذہنی ایملات کی باعث ہو جایا کرتی ہے مثلاً اگر کبھی کھانا کھاتے وقت ہمارے مرہ میں کمی گر پڑی اور ہمیں اس مرہ سے نفرت پیدا ہوئی تو اب ان دونوں واقعوں کی مقارنت زمانی ہمارے ذہن میں کچھ ایسی مرسم ہو جاتی ہے کہ مرہ کا تصور کرتے ہی ہمارے ذہن میں کمی کے گرنے کا تصور ہی پیدا ہو جاتا ہے اور ساتھ ہی محض اس تصور کی بنا پر ہماری طبیعت مالش بھی کرنے لگتی ہے،

(۲) علاقہ مماثلت، یعنی جب دو یا زائد چیزیں باہم مشابہ ہوتی ہیں تو جب انہیں سے ایک چیز کا تصور ہمارے ذہن میں پیدا ہوتا ہے تو دوسری چیز کا تصور بھی ذہن میں فوراً پیدا ہو جاتا ہے مثلاً کسی شے کی تصویر یا اسکے فوٹو کا جب ہم تصور کرتے ہیں تو فوراً اسکی اصل کا خیال بھی ہمارے ذہن میں ضرور ہوتا ہے،

(۳) علاقہ تضاد، یعنی جب دو یا زائد چیزوں میں تضاد ہوتا ہے تو ان میں سے کسی ایک چیز کے ہمارے ذہن میں آتے ہی دوسری چیز کا تصور بھی مٹا ہمارے ذہن میں پیدا ہو جاتا ہے مثلاً یہ ہم جانتے ہیں کہ دن اور رات میں تضاد ہے اب جب کبھی ہم دن کا تصور کرتے ہیں تو رات کا خیال بھی ساتھ ساتھ ہمارے ذہن میں آتا ہے۔

---

## مصریوں کی مذہبی حالت

(۱)

(از مولوی عبد الرزاق ندوی)

جس طرح ہر ملک اور قوم کے افراد میں تین طبقے ہوتے ہیں، اعلیٰ، متوسط، اور ادنیٰ اور ان میں سے ہر ایک اپنے اخلاق و عادات، رسم و رواج، طرز معاشرت اور معتقدات و اعمال مذہبی میں ایک حد تک نمایان فرق و امتیاز رکھتا ہے، اسی طرح مصر میں بھی یہ تینوں طبقے مع اپنی خصوصیات اور جداگانہ حیثیت کے موجود ہیں، اور چونکہ اس ملک میں قومیت اور خاندانی شرافت کو چندان اہمیت حاصل نہیں ہے، اور معیشت کے گران ہونگی وجہ سے اچھی زندگی بسر کرنے کے لئے کثیر مصارف کی ضرورت ہوتی ہے، اسلئے دہان خاندانی تقسیم و تحدید دولت و ثروت کے اعتبار سے کیجاتی ہے چنانچہ دولت مند لوگ شرفا، یا اعلیٰ طبقہ میں سمجھے جاتے ہیں، اور غریب و نادار ادنیٰ میں، اور متوسط الحال طبقہ متوسطہ میں۔

مصر کے اعلیٰ و ادنیٰ طبقوں کو تو جانے ہی دو، کیونکہ ان دونوں کی حالت از حد بلوں سے ہے نہ ان کے اخلاق و عادات ہی درست ہیں، اور نہ ان میں بمعنی صحیح انسانیت ہی پائی جاتی ہے، ادنیٰ طبقہ جمالت کے دیوتا پر بنیٹ چڑھ گیا ہے، اور اعلیٰ اشرہوات نفسانی اور تمدن مغربی کا شکار ہو گیا ہے، راہ متوسط طبقہ تو وہ غیر الامور و اساطما کے مطابق ان دونوں سے بہتر حالت میں ہے، اور اس میں کچھ روحانیت اور مذہبی زندگی پائی جاتی ہے، مجھے ایک مرتبہ ایک روشن خیال مصری نے سوال کیا کہ مسلمانان ہند اور مسلمانان مصر میں مذہبی اور اخلاقی حیثیت سے کیا فرق ہے، اسکا جواب میں نے یہ دیا تھا کہ نمایان فرق صرف ادنیٰ طبقہ میں ہے، ہندوستان

میں جو مسلمان اپنی قومیت کے لحاظ سے ادنیٰ درجہ میں شمار کئے جاتے ہیں، وہ مصری مسلمانوں سے کہیں بہتر حالت میں ہیں بلکہ بعض حیثیتوں سے تو انہیں کو اول درجہ کے مسلمان تصور کرنا چاہیئے رہے اعلیٰ اور متوسط درجہ کے مسلمان تو انکی حالت دونوں ملکوں میں تقریباً یکساں ہے، اگرچہ متوسط درجہ کے ہندوستانی مسلمان مصریوں سے بہتر ہیں۔

ہندوستانیوں اور مصریوں کے مذہبی نقطہ نظر میں بڑا فرق ہے (اگرچہ وہ تہذیب و تمدن کے لحاظ سے) ہندوستان کے مسلمان اسلام کو اتنا ہی صرف ایک مذہب اور روحانی ہدایت کی حیثیت سے دیکھتے اور جو کچھ کرتے ہیں، اسی خیال کی بنا پر کرتے ہیں، برخلاف انکے مصری اُسے زیادہ تر سیاسی اہمیت دیتے ہیں، اور اُسکے لئے اسی وقت جوش و خروش اور ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں، جب سیاسی نقطہ نظر سے اسکی ضرورت محسوس کرتے ہیں، چنانچہ ہم اپنے اس خیال کی تائید میں بکثرت واقعات پیش کر سکتے ہیں، ہندوستان میں ایک مسجد ڈھا دی جاتی ہے، تعزیر یا قربانی روک دی جاتی ہے، یا اسلامی پیشواؤں کی نسبت توہین آمیز کلمات استعمال کئے جاتے ہیں، کیا ہوتا ہے؟ پشاور سے سیلون تک اور کلکتہ سے بمبئی تک تمام اسلامی آبادی میں ایک بھینی پھیل جاتی ہے، اور جوش و خروش کے دریا موجیں مارتے نظر آتے ہیں، لیکن یہ سچی حمیت سیاسی موقعوں پر ظاہر نہیں ہوتی، (اگرچہ اب بہت کچھ تغیر ہو رہا ہے) برعکس اسکے مصر میں مسجد بن علی الاعلان ڈھا دی جاتی ہیں، (جیسے جامع متبولی وغیرہ) یا ان میں انگریزی مسیحی فوجیں رہتی، محراب کو سندس بناتی اور دالانوں میں سوزن بچ کرتی ہیں، (مثلاً جامع الملک الظاہر) ان سب واقعات کی تفصیل سفرنامہ میں مذکور ہے) مگر مصریوں کے کان پر جوں تک نہیں رنگتی اور غیرت اسلامی میں کوئی جنبش نہیں پیدا ہوتی، لیکن اگر کوئی اسلامی سیاسی حادثہ واقع ہو جاتا ہو تو پھر ان کے جوش کی کوئی حد نہیں رہتی، خوب شور و غل کرتے اور دل بھول کر مالی مدد کے لئے

تیار ہو جاتے ہیں، جیسا کہ واقعہ دانشواں، جنگ طرابلس، جنگ بلقان، گذشتہ جنگ عظیم،  
التو اسے جنگ کے بعد آزادی کی جدوجہد، اور جامع الزہرین انگریزی فوجوں کے داخلہ کے  
موقع پر ظاہر ہو چکا ہے،

پس ایسی حالت میں یہ بالکل بچا ہے کہ ہم مصریوں کو تقدس و تقویٰ کے لباس میں  
تاکم اللیل و صائم النهار، کم کو، کم خوراک، اور صحابہ کے رنگ میں رنگا ہوا دیکھنے کی خواہش  
کریں، بلکہ جتنی بھی روحانیت اور مذہبیت اُسے ظاہر ہو، اسی کو قیمت سمجھا اور اُس پر خدا کا شکر  
بجالانا چاہیے، کیونکہ اول تو ان کا مذہبی نقطہ نظر ہم سے جدا ہے، جیسا کہ مذکور ہوا، اور دوسرے  
وہ ایک ایسے مرکز پر واقع ہوئے ہیں جہاں کمزور مشرق اور زبردست مغرب کا سنگم ہوتا ہے  
جہاں ہمہ وقت مختلف خیالات اور متضاد واقعات کا ظہور ہوتا رہتا ہے، اور جہاں عرصہ دراز سے  
قدیم و جدید خیالات میں محاربہ عظیم برپا ہے، جہیں اب تک کسی نے اپنی شکست تسلیم نہیں کی ہے،  
پس ایسی صورت میں کسی قوم کا اپنی قدیم روایات اور معتقدات کا بجنسہ برقرار رکھنا اگر ناممکن  
ہو تو سخت دشوار ضرور ہے، مصری پھر بھی قابل ستائش ہیں کہ باوجود ان تمام مشکلات کے  
اب تک انھوں نے بہت کچھ اپنی مذہبیت کی محافظت کی ہے، اور اب بھی ان میں جذبہ اسلامی کی  
وہ چنگاری موجود ہے، جسے اگر ہوادیر بجائے تو جلد انگارہ بن سکتی، اور پھر آتش سوزان کی شکل  
اختیار کر سکتی ہے، چنانچہ اگر مسجد دن کو جا کر دیکھئے کہ جنگی قعدہ اذفاہرہ میں بہت ہی ذوہ نمازیوں سے  
بھری پُری نظر آئیگی، جنہیں صرف جبہ و دستار ہی نہیں بلکہ کوٹ تپلون بھی دکھائی دیئے، ہندوستان  
کی طرح ہنہیں کہ جس نے انگریزی پانچامہ ٹانگوں پر چڑھا لیا اسکے لئے مسجد میں داخل ہونا یا نماز پڑھنا  
باعث ننگ و عار ہو گیا!

مصری اپنی ناز و نین صرف مگرین ہی نہیں لگاتے بلکہ ایک حد تک خضوع و مشغوع

بھی رکھتے ہیں، جو ہم ہندوستان کی نازدن میں عموماً مفقود ہوتا ہے، جسکی وجہ میرے نزدیک یہ ہے کہ عربی انکی مادری زبان ہے، جو اگرچہ غیر فصیح ہے، تاہم وہ قرآن مجید اور اپنی مٹا جانوں کو بہت کچھ سمجھتے اور ان سے متاثر ہوتے ہیں، انکا تاثر اسوقت قابل دید ہوتا ہے، جب امام خطبہ جمعہ میں مسلمانوں کے موجودہ تنزل و انحطاط، جہنم کے مصائب و آلام اور مجرموں پر اللہ تعالیٰ کے قہر و عتاب کا تذکرہ کرتا ہے، بہتوں کی آنکھیں اشکبار ہوتی ہیں، اور بہتیرے قہر خفرائی ہوئی و بی آواز ہیں (اللہ اللہ! اللہم! احفظنا! اللہم! احفظنا!) کہتے ہوئے سنائی دیتے ہیں، خصوصاً اسوقت انکی حالت اور عجیب ہوتی ہے جب خطیب اپنے نزالے انداز اور عربی لہجہ میں یہ دعا شروع کرتا ہے: اللہم! نصر من نصرہ! و اذل من اذلہ! اللہم! نصر عبدک و اذل عبدک! الخاضع لمرجلک! محمد! من ایدتہ بغنا یتک! و حفظنہ بعین رعایتک! میرا المؤمنین سلطاننا سلطانا! علیہ السلاطین! وحید الدین محمد! سادس! اعز اللہ! اللہم! نصر! کو، تو اس حال کے ہر ہند پر آمین! آمین! اس کے شریک جو گنج مٹتی ہو اور بازگشت کی آوازیں درود و لار سے نکل کر عجیب بیست اور عجیب شان پیدا کر دیتی ہیں! اسی بنا پر میں مصریوں کے مذہبی مستقبل سے یابوس نہیں ہوں، کیونکہ ایمان و اتفاق کی پہلی شرط یعنی "تائثر" ان میں بدرجہ اتم موجود ہے، قلب قبول اصلاح کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں، اور باشندے ہر مفید صدا پر لبیک کہنے کو آمادہ معلوم ہوتے ہیں، لیکن اسے برا حال مسلمانان! کوئی بندہ خدا ہو بھی تو جو لغو و خن بلند کرے! علماء و ورثہ الانبیاء! کو حلوے مانڈے سے کمان فرصت کہ وہ اپنے اس فرض کی جانب متوجہ ہوں! اللہم! ارحم! اللہم! ارحم! علماء ہند! علماء مصر کی حالت پر متاسف ہوں، کیونکہ انکی بھی یہی حالت ہے، مسئلہ خلافت میں انکی سرگرمی ضرور قابل تعریف ہے، بشرطیکہ وہ دنیاوی آلائشوں سے پاک ہو، اور دائمی صورت اختیار کرے، لیکن مجھے شبہ ہے کہ اس مقدس جماعت میں بڑی تعداد انہک ایسے حضرات کی ہے جو مصلحت وقت کو اکثر پس پشت ڈال کر پیشتر ذاتی مصلحتوں کو

دیکھتی، اور کالفرنسون مین جا کر سب سے پہلے اسکی نظر باور چھاننا، پر پڑتی ہے، خدا کرے کہ میرا یہ شبہ غلط ہو!

مصریوں مین ایک بڑی صفت مذہبی بے نصیبی کی ہے، یہ دیکھ کر از حد مسرت ہوتی ہے کہ ایک ہی مسجد اور ایک ہی امام کے اقتدار مین حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی سب ہی بے تکلف ناز ادا کرتے ہیں، کوئی زیر ناف ہاتھ باندھے ہوئے ہے، کوئی سینہ پر، اور کوئی بائبل چھوڑے کھڑا ہے، مالکی، کوئی آئین، باداز بلند کرتا ہے، اور کوئی آہستہ سے، مگر کسی کو کسی پر کوئی اعتراض نہیں ہوتا، اور نہ ہندوستان کی طرح جوتون مین دال بننے لگتی ہے، مصر مین اگرچہ چاروں ائمہ کے پیرو موجود ہیں، لیکن کوئی بھی اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد علاحدہ قائم نہیں کرتا، بیشک بڑی مسجدوں مین چاروں مصلے موجود ہیں، جن مین یکے بعد دیگرے پنج وقتہ نمازین بھی ہوتی ہیں، مگر یہ کبھی نہیں دیکھا گیا کہ کسی نے دوسرے فرقہ کے امام کی اقتدار مین ناز پڑھنے سے گریز کیا ہو، بلکہ جسے جو جماعت ملجاتی ہے وہ اس مین بلا پیش و پیش شریک ہو جاتا ہے، کیا ہم ہندوستان مین بھی ایسی ہی روداد دیکھنے کے متمنی ہو سکتے ہیں؟ کم از کم نصف صدی تک تو نہیں!

افسوس ہے کہ مسلمانان مصر زکوٰۃ کی جانب سے عموماً بے توجہی برتتے ہیں، صرف بغیر مذہبی ہی نہیں بلکہ متدین اور پر مہر گار بھی، جسکی ذمہ داری میرے خیال مین سراسر علماء اذہب کے سر ہے جنہوں نے انکو یہ نلکہ تبا کر گمراہ کر دیا ہے، کہ حوالان حول ہونے سے پیشتر ہی مال کو کسی ایک نام منتقل کر دو، اور جب اس شخص پر زکوٰۃ واجب ہونے لگے تو پھر مال کو اپنے نام واپس کر لو، اسی طرح کبھی ملوکہ مال پر پورا سال نہ گزر بیجا، اور نہ زکوٰۃ دینا پڑیگی،

چنانچہ لوگوں کا اسی پر غلط رائہ ہے، شوہر کبھی بیوی کو زبانی بہہ "کر دیتا ہے" اور کبھی بیوی شوہر کو، لیکن برخلاف زکوٰۃ کے سہری حج کرنے بکثرت جاتے ہیں، ہندوستان مین کی طرح



کاسے گدائی ہانتہ میں لئے ہوئے ہمیں بلکہ اطمینان و فراغت کے ساتھ،

## بدعات

مصریوں کی مذہبی حالت پر جب ایک خالص عقیدہ رکھنے والا مسلمان نظر ڈالتا ہے تو یہ دیکھ کر اسکا کلیجہ خشق ہو جاتا ہے کہ انھوں نے بدعات و خرافات کو جزو اسلام بنا رکھا ہے، حتیٰ کہ ان کے تقریباً تمام مذہبی اعمال میں انکی آمیزش ہے، میرے نزدیک انکی اس افسوسناک حالت کے ذمہ دار سلاطین و دولت فاطمیہ ہیں، جنکی سیاست کا اقتضار یہی تھا کہ مسلمانوں کے عقاید بگڑ جائیں، پھر انکے بعد ذمہ داری ان علماء پر عاید ہوتی ہے، جنھوں نے محض اپنے ذاتی فوائد اور دنیا سے دون کی خاطر ان بدعات کو قائم رکھا، بلکہ انہیں اور تقویت دی، ذیل کے بیان سے اس اندوہناک حالت کا اندازہ ہو سکیگا،

اذان، جو شعار اسلام میں نہایت اہمیت رکھتی ہے وہ بھی بدعت کی دست اندازی سے نہ بچ سکی، فجر کے وقت موزن میناروں پر چڑھ کر اذان سے پہلے ”قصیدہ بردہ“ کے بہت سے اشعار خوش الحانی اور بلند آہنگی سے پڑھتے اور پھر اذان شروع کرتے ہیں، دیگر اوقات میں یہ گانا تو ہمیں ہوتا، لیکن اذان کے قبل اور بعد حمد و نعت کا پڑھا جانا ضروری خیال کیا جاتا ہے، افسوس ہے کہ یہ بدعت مصر سے نکل کر حجاز بھی جا پہنچی ہے، اور خود مسجد کعبہ میں برتی جاتی ہے، شکر ہے کہ ہندوستان اب تک اس سے محفوظ ہے۔

قبر پرستی، مصریوں میں قبیح ترین بدعت (جو درحقیقت ”شُرک“ ہے) قبر پرستی یا دلی پرستی بھی نہایت عام ہے، وہ بزرگان دین اور اولیائے کرام میں ہر قسم کی توثیق اور اختیارات تسلیم کرتے، اور انہیں کارخانہ قدرت کے جملہ امور میں ذخیل تصور کرتے ہیں، چنانچہ انکی قبروں کی انتہائی تعظیم و تکریم کی جاتی، ان سے ہر قسم کی منتیں اور مرادیں طلب کی جاتیں، اور وہ کہ درود، شادی

غنی متوجہ نہ ہو، معاملہ میں ان سے رجوع کیا جاتا ہے، انکے راضی رکھنے کے لئے انکے نام پر ساندے چھوڑے جاتے، قربانیان کیجاتیں، سر کے بال بڑھائے جاتے، اور روزے رکھے جاتے ہیں، لوگ ہر وقت اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے انکے اسماء کو اسی طرح در زبان رکھتے جس طرح ایک مومن اسماء الہی کو، چنانچہ جب دیکھو انکی زبانوں پر یہی الفاظ ہوتے ہیں، یا سیدۃ زینب! یا سیدنا حسین! اللہ وایا سید بدوی اور کنی! ... دلایزہ کردن اللہ الا قیلا!

بدبختوں نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کی ہے بلکہ انکی عبادت کو اللہ واحد کی عبادت کے ساتھ شامل کر دیا گیا ہے، کہ جب اسکی جناب میں جہین نیاز زمین بوس ہو، انکی سرکار میں بھی حاضری ہو جائے، چنانچہ اس بدترین مقصد کے لئے انکے مزار مسجدوں سے ملحق کر دیئے گئے ہیں، بلکہ بہت سی قبریں تو وسط مسجد میں موجود ہیں، قافروں بلکہ غالباً تمام ملک میں ایک مسجد بھی ایسی نہیں ہے جہیں کسی نہ کسی بزرگ کا مزار موجود نہ ہو، بلکہ مسجد اس جگہ تعمیر ہی نہیں کی جاتی جہاں پیشتر سے کوئی قبر موجود نہ ہو، جسے بالفاظ دیگر یوں کہہ سکتے ہیں کہ مسجدین خدا کے لئے نہیں بلکہ ان بزرگوں کے واسطے بنائی جاتی ہیں، تاکہ انکے زائرین ”بیک کرشمہ دوکار“ کے مطابق آسانی عمل کر سکیں، اسی لئے مساجد عموماً اپنے بانیوں کے نام سے نہیں بلکہ ان بزرگوں کے نام سے مشہور ہیں، جنکی قبریں ان میں واقع ہیں، چنانچہ جامع سیدنا حسین، جامع سیدۃ زینب، جامع امام شافعی، اور جامع شترانی وغیرہ سب کا یہی حال ہے، مصریوں کو یہ معلوم کر کے سخت تعجب ہوتا تھا کہ ہندوستان میں قبروں پر مسجد بنانے کا مطلق رواج نہیں ہے، وہ حیرت سے سوال کیا کرتے تھے کہ کیا ہندوستان میں سب دہلی آباد ہیں!!

## مسئلہ خلافت کے متعلق ایک قدیم جدوجہد

اور

### دوسلمان بادشاہوں کا مذہبی اتحاد

(از مولانا عبدالسلام ندوی)

یہ ایک عجیب بات ہے کہ دنیا میں برائی، بھلائی سے زیادہ شہرت چل کرتی ہے، اور بدی کا پلہ ہمیشہ نیکی سے بہا رہتا ہے، چنگیز کی اولاد میں ہلاکو خان اور برک خان بالکل متضاد اوصاف کے شخص پیدا ہوئے، ہلاکو خان بخت ظالم، سفاک، خونریز اور دشمن اسلام تھا اور بدی اوصاف اسکی قومیت کا جزو لا یتفک تھے، اسکے بخلاف برک خان نہایت خوش اخلاق، عادل، حلیم اور متعل تھا، خونریزی اور سفاکی سے اسکو سخت نفرت تھی، مسلمانوں کی طرف اسکا خاص میلان تھا، اور علماء و صلحاء کے ساتھ نہایت عقیدہ مندانہ برتاؤ کرتا تھا، لیکن با این ہمہ آج ہلاکو خان کا نام بچہ بچہ کی زبان پر ہے، اور غریب برک خان کو کوئی جانتا بھی نہیں، لیکن تاریخی روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ دنیا کی بعض ہستیوں کو خاص خاص تاریخی زمانہ کے ساتھ تعلق رہا ہے، اور جب وہ زمانہ آیا ہے تو وہ گمنامی کے گوشہ سے نکل کر منظر عام پر آگئی ہیں، اگر یہ سچ ہے تو غالباً اب وہ زمانہ آگیا ہے جہیں برک خان کے کارنامائے زرین بے نقاب کئے جاسکتے ہیں، ہلاکو خان کا سب سے بڑا کارنامہ جس نے اسکے گلے میں ہمیشہ کے لئے لعنت کا طوق ڈال دیا ہے یہ ہے کہ اس نے دارالاسلام بغداد کو برباد کر کے خلافت اسلامیہ کے اقتدار کو مٹا دیا، لیکن

لے ماخوذ از تلیق الاخبار،

چنگیز خان کی اولاد میں برک خان پہلا شخص ہے، جس نے سب سے پہلے اسلام قبول کیا، اور اسلام قبول کرنے کے بعد ہلاکو خان سے خلیفہ مستعصم کے خون کا انتقام لیا، اتحاد اسلامی کی بنیاد ڈالی، اور دوبارہ شعائر اسلام کو قائم کیا، اس زمانہ میں جبکہ ایک طرف خلافت اسلامیہ کا رہنما اقتدار بھی زایل کیا جا رہا ہے، اور دوسری طرف دنیا سے اسلام میں تحفظ خلافت کیلئے ایک عام اتحاد قائم ہو رہا ہے، غالباً برک خان کے ان مساعی حسنہ کی تفصیل کیسے قدر دلچسپی کے ساتھ سنی جائیگی، لیکن اس داستان کے چھیڑنے سے پہلے یہ بتادینا چاہیے کہ اس خاندان میں جس کا سب سے بڑا نمایاں ممبر ہلاکو خان تھا برک خان جیسا شخص کیونکر پیدا ہوا؟

جہاں تک فطری اوصاف کا تعلق ہے وہ خود خدا کے گہر سے امتدار اسلام کے قائم کرنے کے لئے آیا تھا، لیکن خارجی اسباب کے لحاظ سے اگرچہ برک خان نے جس ماحول میں نشو و نما پائی تھی، اسکی آب و ہوا میں کفر و عناد کا اثر سرایت کر گیا تھا تاہم اس عالم ظلمات میں بھی ایمان کی روشنی قائم تھی، اور جا بجا اسکے جلوے نظر آتے تھے، ایک طرف تو ہلاکو خان تمام دنیا سے اسلام کو بلے چراغ کر رہا تھا، دوسری طرف شیخ نجم الدین کبریٰ اسلام کی روشنی پھیلانے میں مصروف تھے اور اپنے مریدین کو مختلف شہروں میں اشاعت اسلام کے لئے پھیلا دیا تھا، سعد الدین حموی خراسان میں مصروف ہدایت و ارشاد تھے، کمال الدین شریانی نے ترکستان کو اپنا مرکز قرار دیا تھا، نظام الدین جندی نے قفقز کو منع انوار بنا رکھا تھا، لیکن شیخ نجم الدین کے ان مریدین و تلامذہ میں سب سے زیادہ بلند پایہ شیخ سیف الدین باخرزی تھے، جنکے فیوض برکات کا مرکز بخارا تھا، اور وہ یہیں سے تمام قلوب صالحہ پر اپنا معجزانہ اثر ڈالتے تھے، برک خان جیسا کہ اوپر گزر چکا فطرۃً اس اثر کے قبول کرنے کے لئے آمادہ تھا، اسلئے شیخ سیف الدین باخرزی کی منگاہ خصوصیت کے ساتھ اس جوہر قابل پر پڑی اور انھوں نے اپنے ایک ممتاز شاگرد کے

فریور سے اسکو دعوت اسلام دی جسکو اس نے خود نہایت فراخ دلی کے ساتھ قبول کیا، اور اسکے ساتھ اسکے اہوان و انصار اور اعزہ و اقارب بھی اس سعادت میں شریک ہوئے، اسلام لانے کے بعد برک خان نے اس احسان کے صلے میں شیخ سیف الدین کے ساتھ کچھ سلوک بھی کرنا چاہا، لیکن شیخ نے نہایت استغفار کے ساتھ اس فیاضی کے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ قاصد نے برک خان کو اکی خبر دی تو وہ خود شیخ کی زیارت کے لئے روانہ ہوا، بخارا میں پہنچا تو تین دن تک متصل شیخ کے دروازہ پر کھڑا رہا، لیکن اندر آئیگی اجازت نہیں ملی، بالآخر شیخ کے بعض تلامذہ نے سفارش کی، اور کہا کہ یہ بہت بڑا بادشاہ ہے، دُور سے آیا ہے اور حضور کی خدمت سے برکت اندوز ہونا چاہتا ہے، اب اسکو اندر آئیگی اجازت ملی، وہ اندر آیا تو سلام کیا، اور شیخ کے ہاتھ پر دوبارہ تجدید اسلام کر کے واپس ہوا، واپس ہونے کے بعد اس نے خدمات اسلامیہ کی طرف نہایت مستعدی کے ساتھ توجہ کی، تمام شعا ئر اسلامی کو دوبارہ قائم کیا، علماء اور فقہاء کے ساتھ نہایت فیاضانہ سلوک کئے، تمام ممالک محروسہ میں مدارس قائم کئے اور مسجدیں بنوائیں، اپنے تمام خاندان کو اسلام کی دعوت دی، اور خلیفہ مستحکم بالحدیث عقیدہ مند انہ تعلقات قائم کئے، اور اسکے ساتھ خط و کتابت کا سلسلہ قائم کیا، شہر سرسے کو آباد کر کے اپنا دارالسلطنت قرار دیا، اور اس میں دُور دُور سے علماء و فضلاء کو عطایا و صلوات دیکر بلایا کہ لوگوں کو شعا ئر اسلام کی تعلیم دیں،

اس سلسلہ میں اس نے سب سے بڑی جو اسلامی خدمت انجام دی وہ یہ تھی کہ ہلاکو خان محب بنداد اور قاتل خلیفہ مستحکم باللہ کے ظالمانہ دستبرد سے خلافت اسلامیہ کا جو اقتدار سنگیاب تھا اسکو دوبارہ قائم کرنا چاہا، اور اسکے لئے ہلاکو خان کے ساتھ ایک سلسلہ جنگ قائم کیا جسکو غلی کا مورخین نے ایک سیاسی جنگ قرار دیا ہے اور اسکا سبب یہ بتایا ہے کہ چنگیز خان کی اولاد کا

یہ دستور تھا کہ انکو جو فتوحات حاصل ہوتی ہیں انکا ایک حصہ باتو خان کے خاندان کو تقسیم کر دیتے تھے، لیکن باتو خان کے انتقال کے بعد برکہ خان تخت نشین ہوا تو ہلاکو خان نے اس قدیم خاندانی رسم کو موقوف کر دیا، جس پر برکہ خان نے برہم ہو کر جنگجو یا نہ طریقہ اختیار کیا، بعض مورخین کا خیال ہے کہ چنگیز خان کی تقسیم کے رد سے تبریز اور مراغہ باتو خان کے خاندان کے حصہ میں واقع ہوئے تھے، اس بنا پر ان لوگوں نے ہلاکو خان سے اسکا مطالبہ کیا، اور اسی مطالبہ کے رد کرنے سے باہم جنگ چھڑ گئی، مورخین نے انکے علاوہ اور اسباب بھی بتائے ہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ جنگ جو ہلاکو خان اور برکہ خان کے درمیان قائم ہوئی، کوئی ملکی اور سیاسی جنگ نہ تھی، بلکہ یہ دینی جہاد تھا جو صرف خلافت اسلامیہ کے اقتدار کے قائم کرنے کے لئے کیا گیا تھا، کیونکہ برکہ خان اور خلیفہ مستہم باللہ میں ابتداء ہی سے عقیدہ تندرہ تعلقات قائم ہو گئے تھے، اور باہم حدود کتابت رہتی تھی، اسلام لایا تو یہ عقیدہ تندرہ تعلقات اور مستحکم ہو گئے، اسپر مسترد یہ ہوا کہ اس نے شیخ سیف الدین باخرزی کے ہاتھ پر تجدید اسلام کی تو انھوں نے خصوصیت کے ساتھ اسکے دل میں خلیفہ کے ساتھ عقیدہ تندی کی وصیت کی،

لیکن ہلاکو خان کی حالت اسکے بالکل برعکس تھی، وہ ابتداء ہی سے خلیفہ کے ساتھ بغض رکھتا تھا، اور خود باتو خان کے زمانہ میں خلافت کے اقتدار کا خاتمہ کر دینا چاہتا تھا، چنانچہ اس نے اپنے بہائی منکوقاآن کی اجازت سے جو باتو خان کی طرف سے گورنری کے عہدے پر ممتاز تھا، خلیفہ بغداد کے ملوکہ حاکم پر حملہ کرنا چاہا، لیکن برکہ خان نے اپنے بہائی باتو خان کے تالیف سے اسکو اس حملہ سے روک دیا، اور وہ دو برس تک رکا رہا، باتو خان کے انتقال کے بعد برکہ خان تخت نشین ہوا، تو ہلاکو خان کے دل میں جو آگ اندر ہی اندر تلگ رہی تھی، وہ دفعۃً بہترک آگئی، اور اس نے منکوقاآن کی اجازت سے ایک عام حملہ کر کے خلافت اسلامیہ کا

فائدہ کر دیا، اب برکہ خان کی رگ حمیت میں حرکت پیدا ہوئی، اور اس نے خلیفہ کے گران قیمت خون کا انتقام لینا چاہا، لیکن اسوقت برکہ خان کی فوج کا اکثر حصہ کافر تھا، اور جو لوگ مسلمان ہو گئے تھے، اُن کے دل میں بھی ابھی تک قدیم خیالات جاگزیں تھے، اور ان خیالات کی بنا پر اُن کے نزدیک خلیفہ کی شہادت اور ممالک اسلامیہ پر تسلط کوئی ایسا اہم واقعہ نہ تھا جسکو ایک عام جنگ کا محرک قرار دیا جاسکتا، سب سے بڑی رکاوٹ یہ تھی کہ منکو قان جو اسوقت چنگیز خان کی تمام اولاد پر خود مختارانہ حکومت کر رہا تھا، اور ان میں وہی حیثیت حاصل کر لی تھی جو مسلمانوں کے خلیفہ کو حاصل تھی، ہلاکو خان کا بہائی تھا، اور ہلاکو خان کے ذریعہ سے ممالک اسلامیہ پر جو تباہی و بربادی آئی تھی وہ اسی کے مشورہ سے آئی تھی، اسلئے ہلاکو خان سے لڑنا گویا منکو قان بلکہ تمام چنگیز خانی اولاد سے لڑنا تھا، اس بنا پر برکہ خان نے نہایت دیر اندیشی کے ساتھ اس مذہبی جنگ کے قائم کرنے کے لئے سیاسی حیلے تلاش کرنا شروع کئے، اور ہلاکو خان سے مراغہ اور تبریز کا مطالبہ کیا، غنائم و فتوحات میں ہلاکو خان کے خاندان کے متعینہ حصے کا دعویٰ کیا، جسکا مقصد یہ تھا کہ ان مطالبات کے ذریعہ سے ہلاکو خان کو آمادہ جنگ کیا جائے تاکہ تمام قوم اسکو ظالم اور برکہ خان کو مظلوم خیال کرے اور اسکی اعانت و امداد پر آمادہ ہو۔

برکہ خان ان حیل سیاسیہ سے فائدہ اٹھانے کی کوششوں میں مصروف تھا کہ جنگ کا ایک قدرتی سبب یہ پیدا ہو گیا کہ منکو قان جو اپنے بہائی قبلائی کے ساتھ بعض ترک خطاکے ساتھ مصروف پیکار تھا، اور اس ہم پر اپنے چھوٹے بہائی ارتق بوکا کو اپنا جانفین کر کے روانہ ہوا تھا، اسی سفر میں انتقال کر گیا، اور اب تمام افسران فوج نے قبلائے بوکا کو ارتق بوکا سے بڑا تھا منکو قان کا جانشین کرنا چاہا، لیکن برکہ خان نے اس موقع کو مغتتم سمجھ کر فید و بن ناشین بن اودک اسے بن چنگیز خان کو ایک دستہ فوج کے ساتھ ارتق بوکا کے پاس روانہ کیا اور کہا کہ

اس منصب کے مستحق رقم ہو، کیونکہ منکوتاقآن نے خود تمکو اپنا جانشین کیا تھا، تم قبائے کی لطاعت نہ کرو، میں نے فیدوبن قاضین کے ساتھ جو فوج روانہ کی ہے، وہ تمہاری مدد کریگی، اور اگر در فوج کی ضرورت ہوگی تو میں اسکا یہی سامان کر دوں گا، ارنق بوکا نے برکہ خان کی شہ پائی تو مستقل جانشینی کا مدعی ہو گیا، اور اسمین اور قبائے میں معرکہ آرائی شروع ہو گئی، اور مدتوں سلسلہ جنگ قائم رہا، ہلاکو خان اسوقت شام کو پاہل کر رہا تھا، اور اسکی پامالی کے بعد مصر کی طرف بڑھنا چاہتا تھا، اسی حالت میں اسکو منکوتاقآن کی موت، اور برکہ خان کی دراندازی، اور اس خانہ جنگی کا حال معلوم ہوا تو اسکی نگاہ میں دنیا اندھیری ہو گئی، اور اس نے مصر کے حملے کا خیال بالکل چھوڑ دیا، اور اس ہزار فوج کے ساتھ شام میں ایک گورنر مقرر کر کے اپنے اصل مرکز کی طرف روانہ ہو گیا، اور اس موقع سے فائدہ اٹھا کر سلطان مصر نے اس مختصر سی فوج کو بالکل کچل دیا، چنانچہ اسلام پر برکہ خان کا ایک عظیم الشان احسان یہ بھی ہے کہ اس نے بعض اپنے حسن تدبیر سے مصر کو ہلاکو خان کے حملے سے محفوظ رکھا، ورنہ بغداد کی طرح اسلام کا یہ مرکز بھی برباد ہو جاتا۔

بہر حال اسوقت ہلاکو خان قدرتی طور پر پخت پریشانیوں میں مبتلا تھا، ایک طرف تو وہ مصریوں سے انتقام لینا چاہتا تھا، دوسری طرف اس خانہ جنگی کی فکر میں مصروف تھا، برکہ خان نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر ۶۷۱ھ میں ہلاکو خان کے پاس دو قاصد روانہ کئے اور انکے ذریعہ سے اپنے قدیم خاندانی حقوق کا مطالبہ کیا، لیکن ہلاکو خان نے ان قاصدوں کو قتل کر دیا، اور اب برکہ خان کو اسکے ساتھ جنگ کا موقع ملا، اور تابعدار یزدی نے اسکو اس جنگ میں کامیاب کیا، اور ہلاکو خان نے شکست فاش کھائی، اسلام کا یہ کتنا عجیب و غریب معجزہ، اور حق کی طاقت کا یہ کیسا شاندار ظہور ہے کہ ایسی حالت میں جبکہ خلافت اسلامیہ کا اقتدار کلیۃً زایل ہو چکا تھا، تمام ممالک اسلامیہ پر کفار نے تسلط کر لیا تھا، اسلام بالکل یتیم، بکس، بیچارہ



ہو رہا تھا، خدا نے خود اسی قوم سے جس نے اسلام کو ان مصائب گونا گوں میں مبتلا کر دیا تھا، ایک شخص کو کھڑا کر دیا، جس نے اپنے قدیم خاندانی روایات کی کچھ پروا نہ کی جس نے اپنے اعزہ و اقارب کے خون کو بالکل بیچ بھجا، اور خلافت اسلامیہ کے اقتدار پر ان تمام چیزوں کو قربان کر دیا، وہی ذلک عبرۃ عظیمۃ للمعتبرین و ذکر عظیمۃ للمستبصرین،

لیکن اسلام پر برکہ خان کا صرف یہی احسان نہیں ہے، کہ اس نے اس مذہبی عزت کو دوبارہ قائم کیا، جو خلافت کے اقتدار کو مٹا کر تمام مسلمانوں سے چین لگائی تھی، بلکہ اس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے اس جنگ کے سلسلہ میں ایک عام اسلامی اتحاد قائم کیا، اور اس اتحاد کے ذریعہ سے ایشیائی بادشاہوں کے دامن اخلاق کے ایک نہایت بڑا دلع کو مٹا دیا،

ایشیائی تاریخوں میں سلاطین کی حریفانہ کشمکش کے متعلق بہ کثرت روایتیں مل سکتی ہیں، لیکن باہمی توافق، تعاون، اور ایٹلاف و اتحاد کے متعلق بہ شکل چند سطر میں نظر سے گذرتی ہیں، ایٹلاف و اتحاد کا اصطلاحی لفظ موجودہ یورپین سیاست نے پیدا کیا ہی، قدیم زمانہ کے مدبرین سلطنت اس سے بہت کم آشنا تھے، لیکن یہ صرف اسلام کی برکت، خلافت کی عظمت، اور خلیفہ اسلام کی محبت کا نتیجہ تھا کہ تمام ایشیائی روایات کے برخلاف برکہ خان نے ایک عام اتحاد اسلامی کی بنیاد ڈالی، اسلامی بادشاہوں کو جو ہلاکو خان کے خوف سے لرز رہے تھے، ہر قسم کی فوجی مدد دیکر طاقتور بنایا، اور انکو ہلاکو خان سے جنگ کرینکی ترغیب دی، چنانچہ اس نے شاہ شیراز، اور شاہ لور کو ہلاکو کے شکست کی خبر دی، اور انکو اسکے ساتھ جنگ کرنے پر آمادہ کیا، اس وقت بغداد کے بعد اسلام کا دوسرا مرکز صرف مصر تھا، لیکن جب ہلاکو خان نے خلیفہ بغداد کو تہذیب کو رکے بغداد اور واصل پر قبضہ کر لیا، تو سلطان ظاہر میریس شاہ مصر سخت

خائف ہوا، لیکن برکہ خان نے اسکو تسکین دی اور اسکے پاس اپنے اسلام کی خبر پہنچائی، سلطان ظاہر کو یہ تسکین بخش خبر معلوم ہوئی تو اس نے برکہ خان کی ذات کو نہایت منقسم سمجھا اور دونوں میں باہم ایک عام اتحاد قائم ہو گیا جسکی ابتدا اعلیٰ طور پر اس طرح ہوئی کہ منکو قاآن نے اسلحہ بین اہل ہمدان کی درخواست پر ہلاکو خان کو جس فوج کے ساتھ ایک مہم پر روانہ کیا تھا وہ برکہ خان کی سلطنت کے ابتدائی زمانہ تک ہلاکو خان کے پاس موجود رہی، ہلاکو خان نے ابتدا پر حملہ کیا تو برکہ خان اگرچہ اسکو سخت ناپسند کرتا تھا، تاہم وہ بعض مجبور یوں کی وجہ سے اس فوج کو اسکے پاس سے واپس نہ بلا سکا، لیکن جب خود برکہ خان اور ہلاکو خان کے درمیان سلسلہ جنگ قائم ہوا تو برکہ خان نے اس فوج کے پاس پیغام بھیجا کہ وہ اسکے پاس واپس چلی آئے، اور اگر یہ ممکن ہو تو مہر و شام میں جا کر ہلاکو خان کے خلاف سلطان ظاہر کی مدد کرے، چنانچہ یہ فوج سلطان ظاہر کی فوج سے جا کر مل گئی، اور سلطان ظاہر نے نہایت گرمجوشی سے اسکا استقبال کیا چنانچہ ۴۰۰ ذیحجہ ۶۸۷ء کو یہ فوج قاہرہ میں داخل ہوئی تو سلطان نے نہایت شان و شوکت سے اسکا استقبال کیا، ایک عمارت میں جو خاص طور پر اسی فوج کے لئے تیار کرالی گئی تھی اسکو مہمان آہارا، نہایت وسیع پیمانہ پر اسکی دعوت کی، اسکو خلعت گھوڑے، اور انعامات تقسیم کئے اور آئینے ساتھ گیند کھیلا، تاتاریوں کو اس عزت و احترام کی خبر پہنچی تو جو جوق آکر مہر میں داخل ہوئے اور سلطان نے سب پر اپنا اعتماد ظاہر کیا، اور ان سب نے نہایت خوشی کے ساتھ اسلام قبول کیا۔

اس فوج کے پہنچنے سے پیشتر سلطان ظاہر برکہ خان کے نام ایک خط روانہ کر چکا تھا، جس میں اسکو ہلاکو خان کی مخالفت پر نہایت پر زور الفاظ میں آمادہ کیا تھا، اور لکھا تھا کہ تاتار تو رے سے آپ کے اسلام کی خبر میں پہنچ چکی ہیں، اسلئے آپ پر کفار کے ساتھ گودہ آپ کے

قبیلہ اور خاندان ہی کے ہوں، جہاد فرض ہے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے اعزہ و اقارب، اور خود اپنے قبیلہ قریش کے ساتھ جہاد کیا تھا، اور حکم دیا تھا کہ جنگ لوگ کلمہ توحید کا اقرار نہ کر لیں، ان کے ساتھ جنگ کی جائے، اسلام صرف زبانی اقرار کا نام نہیں ہے بلکہ جہاد اس کا ایک رکن اعظم ہے، متواتر خبروں سے معلوم ہو چکا ہے کہ ہلاکو خان کی بی بی ایک عیسائی عورت ہے، اور اس نے اس کی خاطر سے عیسائی مذہب کو آپکے دین اسلام پر مقدم رکھا ہے، اور پادریوں کو خلفاء کا قائم مقام کیا ہے، اسکے بعد تاتاری فوج مصر میں داخل ہوئی، اور اس سے برکہ خان کے مزید حالات معلوم ہوئے، تو اس نے برکہ خان کے نام دوسرا خط لکھا جس میں اس کو جہاد کی ترغیب دی، اور اپنی فوج کی تعداد اس کی جنسیت، اس کی نوعیت، اور ساز و سامان کی پوری تفصیل کی، اسکے علاوہ اور بھی مختلف طریقوں سے اس کو ہلاکو خان کی مخالفت پر آمادہ کیا، خط کے روانہ کرنے کا وقت آیا تو سلطان نے ایوان شاہی میں تمام ارکان دولت کو جمع کر کے اس خط کو سنایا، اور ان سے مشورہ طلب کیا، سب نے اس کی رائے کی تائید کی، اور اسکے اس طرز عمل سے اتفاق ظاہر کیا، جب اس خط کے روانہ کرنے پر اتفاق عام ہو گیا تو سلطان نے ۶۶۱ھ کو ایک دربار عام کیا، جس میں تمام رعایا متاتاری فوج، سفراء، اور امیر المومنین خلیفہ حاکم بامر اللہ ابی العباس شریک ہوئے، اور سلطان نے تمام شرکا، دربار کے ساتھ خلیفہ کے ہاتھ پر بیعت کی، اسکے بعد خط کے روانہ کرنے کے متعلق بحث ہوئی، تو خلیفہ نے اس سے اتفاق کیا، پھر دوبارہ لوگوں کو خط سن کر ہر سبک کیا گیا، اسکے بعد دوسرا جمعہ آیا تو خلیفہ نے خطبہ پڑھا، اور ناز جمعہ پڑھائی، اور سلطان ظاہر اور تمام مسلمانوں کے حق میں دعا کی، نماز و دعا ختم ہوئی تو سفراء خلیفہ اور سلطان کی خدمت میں حاضر ہوئے، تو سلطان نے ان سے زبانی طور پر برکہ خان کے ساتھ اپنی دوستی کا اظہار کیا، اور کہا کہ میں اس کے فتح و ظفر کے لئے دعا کرتا ہوں، اور جس چیز میں دنیا کی

بہتری ہو اسپر اسکے ساتھ متفق ہوں، اس زبانی وصیت کے بعد سفر اکو نادر راہ دیگر کشتی میں سوار کرایا، اور وہ عزم سلطنت میں روانہ ہوئے، اور لشکر میں شاہ قسطنطنیہ کے پاس سے ہمارے گدھے، برک خان نے سلطان ظاہر کے پاس اسکے پہلے خط کا جواب جن سفر اسکے ذریعہ سے بھیجا تھا، وہ بھی اسی بادشاہ کے بیان متقیم تھے، اور اس طرح دونوں بادشاہوں کے سفر ارمین من الغافی سے ملاقات ہو گئی،

بہر حال برک خان کے قاصد جب مصر میں خط لیکر پہنچے، تو گورنر مصر نے سلطان ظاہر کو اسکی اطلاع دی، اور سلطان نے قلعہ میں تمام رعایا اور ارکان دولت کو جمع کیا، جنکے سامنے برک خان کا خط پڑھا گیا، جمہین سلطان کا شکریہ ادا کیا گیا تھا، ہلاکو خان کے خلاف مدد مانگی گئی تھی، اور یہ یقین دلایا گیا تھا کہ میں چنگیز خانی رسوم و قواعد کا بالکل مخالف ہوں، اور ہلاکو خان جو خونریزیان کی بین دہ بالکل باغیانہ ہیں، ہم اور ہمارے چاروں بہائی اسلئے خطرے ہوئے ہیں کہ اسلام اور مراکز اسلام کو اپنی اصلی حالت پر لانے، اذان، قرأت، اور نماز کے قائم کر سنے، اور ائمہ اور آست کے جو بہا لینے کے لئے ہلاکو خان سے چاروں طرف سے جنگ کریں، خط میں یہ بھی درخواست کی گئی تھی کہ فرات کی جانب سے ایک دستہ فوج بھیجا جائے تاکہ وہ ہلاکو خان کا راستہ بند کر دے، خط منانے کے بعد دربار ختم ہوا، اور سلطان نے سفر اکو نادر راہ سے مالا مال کر دیا، نہایت عظیم الشان پیمانے پر انکی دعوت کی، اور ۱۸ شعبان یوم جمعہ کو خلیفہ نے ان سفر اکو کے سامنے ایک خطبہ دیا، جمہین سلطان ظاہر اور برک خان کے لئے دعا کی، نماز پڑھائی، اور سلطان اور سفر اکو سے ہمت اسلام کے متعلق گفتگو کی، دوسری رات کو سفر اکو قلعہ میں آئے، اور خلیفہ نے خود انکو خلعت پہنایا، سلطان ظاہر نے مکہ، مدینہ اور بیت المقدس میں خزانہ بھیجا کہ خطبہ میں اسکے بعد برک خان کے لئے بھی دعا کی جائے،

سلطان ظاہر نے برک خان کے سفراء کا جس گرجوخی سے غیر مقدم کیا تھا برک خان نے بھی سلطان ظاہر کے سفراء کے غیر مقدم میں اسی جوش اسلامی کا اظہار کیا، چنانچہ وہ سلطان ظاہر کے سفراء کی اتفاقی ملاقات کے بعد قسطنطنیہ سے روانہ ہو کر برک خان کی خدمت میں پہنچے تو مقام اردوین وزیر شرف الدین قزوینی نے ان کا استقبال کیا، اور نہایت اہتمام کے ساتھ انکی مہمان نوازی کی، صبح کے وقت قریب کی ایک اقامت گاہ میں برک خان نے وزیر شرف الدین قزوینی کی معیت میں انکو شرف ملاقات بخشا، پہلے ہی سے دربار کے تمام اداہب ان سفراء کو بتا دیئے گئے تھے، اور انہوں نے ان تمام اداہب کی پابندی کے ساتھ بادشاہ کے ہاتھ میں خط دیا، اور بادشاہ نے نہایت خوشی کے ساتھ اسکو پڑھو کر سنا، اور نہایت فیاضانہ طریقے پر انکی مہمان نوازی کی، اور جب تک وہ مقیم رہے انہیں ہر ممکنہ مختلف حالات پوچھا رہا۔

یہ سفراء ۲۶ دن تک برک خان کے یہاں مقیم رہے، اسکے بعد انکو فلعیت و انعام کے ساتھ خط کا جواب دیکر واپس کیا، اور انکے ساتھ خود بھی اپنے سفراء روانہ کئے، یہ سفراء مصر میں پہنچے تو یہ فوجی جائزہ لینے کا زمانہ تھا، انھوں نے فوج کی تعداد اور انکے ساز و سامان دیکھے تو ششدر ہو کر رہ گئے، اور سلطان ظاہر سے پوچھا کہ کیا یہ صرف مصر اور شام کی فوج ہے، اس نے کہا نہیں، یہ صرف شہر کی فوج ہے، سرحدوں پر جو فوجیں متین ہیں وہ اسکے علاوہ ہیں،

یہ سفراء جو خلائے تھے، اس میں پہلے خلاص و محبت کا یقین دلایا گیا تھا، اور سلطان کی خواہش کے مطابق ہلاکو خان کے خلاف اسکو مدد دینے کا وعدہ کیا گیا تھا، تاہم یونین جو لوگ اسلام لائے تھے انکے نام اور قبائل وغیرہ کی تفصیل درج تھی، اور لکھا تھا کہ ہمارے تمام چھوٹے بڑے بہائی مع اپنی آل و اولاد کے مسلمان ہو گئے ہیں، اور فرائض، سنن، زکوٰۃ، اور جہاد کے پورے طور پر پابند ہیں، سلطان ظاہر کو معلوم ہونا چاہیے کہ میں نے ہلاکو سے جو میرے گوشت و خون کا

ایک جزو متناصرف اعلاء کلمۃ اللہ اور عصیت اسلامی کی بنا پر جنگ کی ہے، کیونکہ وہ باغی ہے اور باغی خدا کا منکر ہوتا ہے، میں نے اپنے سفراء کے ساتھ ابن شہاب الدین غازی کو بھی اسلئے روانہ کیا ہے کہ انھوں نے اس جنگ کے جو مناظر اپنی آنکھ سے دیکھے ہیں سلطان کے سامنے ان کا حال بیان کریں، سلطان نے اپنی سادات مندی سے آل عباس میں سے حاکم بامر اللہ کو جو مسلمانوں کا خلیفہ مقرر کیا ہے، میں اسکا نہایت شکر گزار ہوں، بالخصوص جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ سلطان اپنی فوج کے ساتھ لہذا کی طرف بڑھنا چاہتا ہے کہ اسے کفا کے غاصبانہ قبضہ سے بچائے تو میرے یہ شکر گزارانہ جذبات اور بھی ترنی کر گئے،

تاریخوں میں صرف اسی خط و کتابت کا تفصیلی حال درج ہے، لیکن اس خط و کتابت کے علاوہ دونوں بادشاہوں میں اور بھی متعدد مراسلتیں ہوئیں، اور ان کا سلسلہ تادم مرگ قائم رہا، بہر حال اس پائدار اتحاد نے ہلاکو خان کی تمام کوششوں کو ناکامیاب کر دیا، اخیر میں اگرچہ اس نے ایک بار انتقام لینے کی اور بھی کوشش کی، لیکن اس میں بھی ناکامیاب رہا، اور بالآخر انہی نزو دات و افکار میں مبتلا رہ کر یہ مرض صبح ربيع الاول ۶۳۲ھ میں انتقال کر گیا، اسکے بعد اسکا بیٹا ایٹا خان تخت نشین ہوا، اور اس نے بھی برکہ خان سے باپ کا انتقام لینا چاہا، لیکن اس نے بھی شکست کھائی۔

خلافت کی بنا پر یہ اتحاد قائم ہوا تھا، اور اس نے اخیر تک اسلام کو کامیاب رکھا، آج بھی اسی سلسلہ خلافت کے ذریعہ سے تمام دنیا سے اسلام میں ایک عام اتحاد قائم ہو رہا ہے اور خدا کی ذات سے توقع ہے کہ وہ اسکو نہایت یرامن طریقہ سے کامیاب کرے گا، اور خلافت کا اقتدار دوبارہ قائم ہو کر رہے گا۔

## فارسی میں یای معروف و مجهول

از سینا ناصر الحسن ہوش بگلرامی

یای معروف وہ ہے جسکے ماقبل کاکسرو اشباع کے ساتھ یعنی کہ پیکر پڑا جائے، جیسے تیرا، پنچیر، خوشی، کشتی وغیرہ، اور مجهول وہ ہے جسکے ماقبل کاکسرو کہ پیکر نہ پڑا جائے، جیسے دیر، میرا، بلے، کاکھکے وغیرہ،

(ی) معروف ہو یا مجهول کسی لفظ میں اہلی ہوگی یا زاید، اصل جیسے تیرا اور پنچیر دو تیر و تیر میں اور زاید وہ ہے جو کسی فائدہ کی غرض سے لفظ کے آخر میں پڑا ہو، جسکے بیان آگے آئیں گے۔ اہلی (ی) کسی لفظ میں ہر جگہ آتی ہے جیسے دیدار، خریدار، زنجیر، پیر، نشیب، شکیب وغیرہ میں، یا آخر میں ہوگی جیسے آشتی، گشتی، آرسے، بلے وغیرہ میں، اور اول میں جب آتی ہے تو متحرک ہی ہوتی ہے، ساکن نہیں ہوتی، کیونکہ ابتدا بسکون محال ہے، اور بحالت حرکت مجهول یا معروف کے ساتھ اسکی تعبیر نہیں کی جاتی ہے،

اب معلوم کرنا چاہیے کہ جو اصل (ی) کسی لفظ کے درمیان حرف روی سے پہلے آتی ہے تو ہمیں معروف و مجهول کی رعایت مستحسن ہے یعنی یاے معروف کا قافیہ یاے مجهول کے ساتھ نہ کرنا بہتر ہے، حضرت جامی ایسے قافیوں کو غلط سمجھتے ہیں، چنانچہ اپنے رسالہ قافیہ میں حرف ردف کی بحث میں حکیم سنائی کے اس شعر پر دیر اور پذیر کے اجتماع کے متعلق اعتراض کیا ہے،

باد جو دش از دل پذیر آمد      نیک آمد ولیک دیر آمد

لیکن زمانہ حال کے اہل زبان اس قسم کے توانی بے تکلف استعمال کرتے اور جائز سمجھتے ہیں،

ان کے نزدیک گویا بے مہول کا وجود ہی نہیں ہے، ان کا تتبع کر کے ارد کے قدیم شوالے میں اس قسم کے قافیے کئے ہیں، سو د

ہو ادیکہ حیران صغیر و کبیر جب آگے سے اُٹھ جائے غالبین کبیر

لیکن اب اردو میں اس قسم کے قافیے نہیں کرتے، انکو قطعاً غلط سمجھتے ہیں، اور متاخرین اہل فارس میں بھی جو محقق ہیں وہ ایسے قافیوں سے احتراز واجب سمجھتے ہیں، چنانچہ محمد تقی سپہر مولف ناسخ التواریخ کتاب "براہین المعجم" میں لکھتے ہیں:-

"شوالے متقدم حییاً رعایت نمودند، و مہول یا معروف نیا در دند"

پھر ایک جگہ اسی کتاب میں لکھتے ہیں:-

"متقدمین مہول یا معروف را با ہم قافیہ ندادند، پتہ کس در بین اخلانے بود"

اصلی (ی)، اگر کسی لفظ کے آخر میں آتی ہے، اسوقت بھی معروف و مہول کی رعایت ضروری مثلاً لفظ علی کا قافیہ بے نہیں کر سکتے، چنانچہ محقق طوسی علیہ الرحمۃ نے معیار الاشعار میں عیوب قافیہ فارسی کے بیان میں حرف روی کے اختلاف کے ذکر میں لکھا ہے کہ میرے بیائے مہول کا قافیہ لفظ علی کے ساتھ نہ کیا جائے (مرے بیائے مہول کے معنی زر کامل عیار میں کوخیدن و برابر کر دین لکھے ہیں) اور محمد تقی سپہر نے بھی فرمایا ہے بلکہ انھوں نے تہذیب المعجم میں یائے معروف و مہول کے الفاظ کی ایک فہرست بھی لکھ دی ہے،

زاید (ی) دو قسم کی ہے، معروف و مہول، قسم اول کے متعلق کتب قواعد سے معلوم ہوتا ہے کہ دو قسم کی (ی)، اہل زبان کے نزدیک معروف ہے، اول یائے نسبت جیسے ہندی، رومی، ملی، مدنی، ہاشمی، قریشی وغیرہ،

اے مدنی برقع وکی نقاب پردہ نشین چند بود آفتاب



دیگر: شاہ ترشی و ہاضمی خسیل زلفین تو ہر دو لام و الیل

(۲) یاے ضمیر مخاطب واحد جو فعل کے آخر میں آتی ہے جیسے گنتی، گوئی وغیرہ

(۳) یاے خطاب جو اسم کے آخر میں یعنی ہستی آتی ہے جیسے مروی یہ معنی مرد ہستی اور سردی

یہ معنی سرد ہستی ۵

باد و خوردن و ہشیار نشستن بہل ہست گر بدولت بری مست نگر دی مروی

دیگر: ماہی را ہد فلک چون کمان ابر و بود سروی از سرد ہی را عزیزن کیسو بود

(۴) یاے مصدری جو کسی اسم یا اسم مشتق یا صفت کے آخر میں آنے سے مصدری

معنی پیدا ہوتے ہیں جیسے ۵

قلت کی راحت خوشی شری بدی ملک شہی سودی سری جدت نوی کفہ پری ربت گمان

دیگر: گوشہ گیری عزیزان ہزار بے برگی ہست مرغ ہم میل پریدن کند تا پر نیست

(۵) یاے لیاقت جو مصدر فارسی کے آخر میں آنے سے لیاقت و قابلیت کے معنی پیدا

کرتی ہے جیسے کشتی، سوختنی وغیرہ

شمع گر باؤ کند و عوی نازک بدنی کشتی سوختنی باشد و گردن بدنی

(۶) یاے مبالغہ جیسے علامی، فہامی، یعنی بڑا عالم اور بڑا فہیم، یہ عربی اسماء صفات و

مبالغہ کے آخر میں آتی ہے، اسی طرح یاے تکلم جیسے شفق، محبی وغیرہ

زاید (ی) کی دوسری قسم یعنی مہول کے متعلق کتب قواعد سے نوٹیں پائی جاتی ہیں،

(۷) یاے وحدت بمعنی یک، اس میں یاے تخصیص، تنکیر، نظم و تنقیہ یہ چاروں قسمیں داخل ہیں

جیسا کہ ذیل کے اشارے ظاہر ہے

غیر خالی است ز خفاں مگر کرد مرے غریب یرون آید و کارے کند

مردے یعنی ایک مرد یا کوئی مرد ۵

پری رنے بشکر خندہ قتل مردم کرد

چو گفتش کہ مرا ہم بکشن تبسم کرد

پری رنے یعنی ایک خاص پری رخ جسکو شاعر جانتا ہے ۵

یار دارو سر صید دل حافظ یاران

شاہبازے بشکار گسے می آید

شاہبازے یعنی ایک بڑا با عظمت شاہباز، گسے یعنی ایک حقیر و ناچیز گس،

(۲) یاے موصولہ اسکے بعد کاف صلب بھی آتا ہے، اسکو یاے صفت بھی کہتے ہیں، اسکے معنی جو جس نے

یا "بسا ہوتے ہیں، ۵

پادشاہ ہے کہ طح ظلم انگند

پاے دیوار ملک خویش بکند

پادشاہ ہے یعنی جس بادشاہ نے ۵ دیگر

گداے کہ بر شیر زین ہند

الوزیر اسب و فرزین ہند

گداے یعنی ایسا فقیر

(۳) یاے استمراری جو ماضی مطلق کے آخر میں اگر معنی استمراری پیدا کرتی ہے،

نخوردے کہ خاطر بیاسایدش

نداوے کہ فردا بکار آیدش

نخوردے و نداوے یعنی نمی خورد و نمی داد،

(۴) یاے تمنایہ بھی ماضی مطلق کے آخر میں آتی ہے اور امید و آرزو کے معنی پیدا کرتی ہے،

چہ بودے کہ پایم دین کار گل

بگنجے فرورفتے از کام دل

بگنجے فرورفتے یعنی میری آرزو یہ تھی کہ خزانہ پر میرا پاؤں پڑتا، دیگر

مراے کا شکے مادر زادے

دگر زادے مرا شیرے نداوے

شیرے نداوے یعنی اسے کاش شیر نمی داد،

(۵) یاے اضافت یعنی جن اسم کے آخر میں الف یا داؤ ہو جب اسکو کسی اسم کی طرف مضاف کریں تو کسرۃ اضافت کے بدلے (ی) لاتے ہیں، جیسے عصاے موسیٰ اور بوائے گل ۵  
 تاتماشاے دہانت کردھیران غنچہ را      شاخ گل سستے است در زیر خندان غنچہ را  
 دیگر ۵ روئے تو ہر کردید مصحف شبیہ گفت      ہر کس شنید ذالک لاریب فیہ گفت  
 (۶) یاے مقدار جبکہ اسم کے آخر میں آنے سے مقدار کے معنی پیدا ہوتے ہیں،  
 اگر گنجے کنی بروامیان بخش      رسد مرہر گداے را بر بنجے  
 یعنی بمقدار برج۔

(۷) یاے تعجب کسی اسم کے آخر میں آنے سے معنی تعجب پیدا ہوتے ہیں ۵  
 چشم بد دور عالے داریم      من و محسنون و دامن صحر  
 عالے یعنی عجب عالم،  
 (۸) یاے استغراق بمعنی پیچ، یعنی کسی اسم کے آخر میں آنے سے کسی چیز کی نفی میں مبالغہ اور استغراق ہوتا ہے ۵  
 مسلمانان مسلمانش مخوانید      قتییل کا فرمایا نے ندارد  
 یعنی پیچ ایمان ندارد،

(۹) یاے زاید یعنی محض تخرمین کلام کے لئے آخر میں زیادہ ہوتی ہے، ۵  
 جاے حضور گشتن امن است این سراے      زین در لبتا و دانی و عیش و طرب سراے  
 یاے زاید معروف بھی ہوتی ہے جیسے نظامی ع فرد شندہ را با فضولی چہ کارا ظہوری  
 ع انتظاری نگشتہ تکیہ گشت، اور مجہول بھی ہوتی ہے جیسے جاتی،  
 الہی غنچہ امید بکشاے      گلے از روضہ جاوید نبائے

اصلی خواہ جہول ہو یا معروف کسی لفظ میں ہر جگہ آتی ہے مگر زاید سوائے آخر لفظ کے اور کہیں نہیں آتی۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ ان اقسام کے معلوم کرنے کے بعد یہ بات جاننے کے قابل ہے کہ متاخرین اہل فارس کے نزدیک معدودے چند کے سوا یاے معروف و جہول میں کوئی فرق نہیں ہے، وہ یاے زاید کی پہلی قسم کی تمام یاؤں کو دوسری قسم کی تمام یاؤں کے ساتھ بے تکلف قافیہ میں جمع کر دیتے ہیں اور تھقذین میں بھی خواجہ نصیر الدین طوسی کے قول سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے زمانہ میں بھی دو گروہ تھے، ایک گروہ تو معروف و جہول کے فرق کو تسلیم کرتا تھا، جہاں خود خواجہ موصوف بھی داخل ہیں، چنانچہ معیار الاشعار "میں قافیہ کی بحث میں نہ یاے جہول کو (ی) ہی نہیں کہتے بلکہ شیعہ یا کہتے ہیں، اور دوسرا گروہ وہ تھا جو یاے معروف و جہول کے فرق کو تسلیم نہیں کرتا تھا، چنانچہ خواجہ موصوف کتاب کے آخر میں مجری کی بحث میں اس گروہ کی طرف اشارہ کر کے اس طرح فرماتے ہیں:-

"اختلاف مجری و فتح آن پوشیدہ ماند مگر کہ اختلاف وصل باشد و حرف مقارب چنانچہ پسری در خطاب و خبرے در نکرہ پس کسرہ را مختلف است و شاید کہ بر بعض مردم ملتبس گردد۔"

اس میں محقق علیہ الرحمۃ نے پسری کی یاے خطاب کو اور خبرے کی یاے نکرہ کو ملحدہ اور حرف قریباً الخارج شمار کیا ہے، اور یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ان کے زمانہ میں بعض ایسے لوگ بھی تھے جنکی نظر میں یاے معروف و جہول ایک چیز تھی جیسی تو محقق نے فرمایا ہے کہ:-

"شاید بر بعض مردم ملتبس گردد۔"

اب اسکا نتیجہ یہ نکلا کہ یاے معروف و جہول کا اجتماع قدام کے زمانہ میں کمتر اور اس

زمانہ میں بیشتر بلکہ تمام تر عارضہ ہے، لیکن ہم ہندی چونکہ قدام کے کلام کے پیرو ہیں اسلئے  
 حتی المقدور اس قسم کے اجتماع سے پرہیز کرنا ہمارے لئے مستحسن بلکہ لازم ہے اور متاخرین  
 اہل فارس میں محمد تقی پھر نے بھی براہین العجم میں یہی ہدایت کی ہے، ایک فاضل اہل  
 زبان کے قول کے مقابل عوام کی پیروی خلاف احتیاط ہے، لیکن غلط العام صحیح کہنے والوں کے  
 تعرض بھی نہیں کیا جاسکتا، ایک بات یاد آگئی اسکو بھی لکھ دیتا ہوں، عربی میں یہی مجہول  
 ہوتی ہی نہیں ہے، سوائے امالہ کے جیسے حساب سے حسیب۔

## تَلخیصِ تَبصُّر

### یورپ اور تمدن اسلام

سرسبزی جانش انگلستان میں اسوقت ایک نامور شخصیت رکھتے ہیں، جنھوں نے برعظم افریقہ کے دور و دراز اقطاع میں عرصہ تک سیاحی کی ہے، اور جبکہ مضامین سیاسیات و جغرافیہ سے متعلق انگریزی رسائل میں اکثر شائع ہوتے رہتے ہیں، کچھ روز ہوئے انھوں نے لندن کے مشہور مہفتہ وار نیو اسٹینٹین میں تمدن اسلام سے متعلق ایک شدید مخالفانہ مضمون شائع کیا تھا، جسکا لخص ترجمہ درج ذیل کیا جاتا ہے :-

### اسلامی تہذیب و تمدن

”اسوقت افریقہ و ایشیا میں یورپ کے خلاف جو شعلہ مخالفت بہرک رہا ہے، اس میں اسلام کی مخالفت قطعاً قابلِ توجہ و التفات ہے، اسلئے کہ اسلام فطرۃً ایک جنگجو اور غیر ردا دار مذہب ہے، اور یورپ میں تمدن کے دشمنوں میں مسلمان ہی سب سے قوی ہیں اور اپنی اقوام میں وہی سب سے زیادہ جوش و خروش کے ساتھ ترقی و تہذیب کی مخالفت پر کمر بستہ رہتے ہیں، باوصف ان قابلِ تعریف ارشادات کے جسکا انتساب بانی اسلام مدبر و مہمبہ کی جانب کیا جاتا ہے، اس سے انکار ناممکن ہے، کہ ملک گیری و لشکر کشی شروع ہی سے اسلام کا جزو رہی ہے، اور بد قسمتی سے اسلامی دماغ اپنا محور و مرکز قرآن کی جاد تعلیمات کو سمجھتا ہے جسکی روش موجودہ اصول تعلیم و تربیت، علوم و فنون، تمدن و معاشرت، غرض ہر اس پیر کے جو ترقی اور فلاح دہیود کی طرف لی جانے والی ہے سخت مخالف ہے،

بیشک اسلام کے روشن پہلو کے متعلق ہی کچھ کہا جاسکتا ہے، رومی شہنشاہی کے شانے میں سب سے زیادہ عربوں، ایرانیوں، بربریوں، ترکوں اور تاتاریوں نے حصہ لیا جو سب کے سب اسلام کے رشتہ اتحاد میں منسلک تھے، گوہتوں، جرمون، نامون، سلاویوں اور سیکیارون کے خروج کا اثر صرف اتنا ہوا تھا کہ رومی شہنشاہی کی صورت تبدیل ہو گئی تھی اور رومہ دیونان کا اثر قومی ترہو گیا تھا، لیکن اسلام نے جبکی علمبردار ایشیائی و افریقی اقوام تھیں ایشیا کو چمک، شام، مصر، شمالی افریقہ، قسطنطنیہ، اور کچھ روز کے لئے یرنگال و اسپین سے بھی یورپین اثر کا بالکل استیصال کر دیا، اسلام کا حملہ یونانی و رومی سلطنت پر ایسے زمانہ میں ہوا جبکہ مسیح کی مسیحیت کے بجائے آبا و اجداد کی شریعت قائم تھی، اور یہ شریعت تلاش و تحقیق، تمدن و شائستگی، علم و فن سے دیسی ہی جاہلانہ دشمنی رکھتی تھی، جیسی آج اسلام رکھتا ہے، آٹھویں صدی عیسوی اور اس سے برعکس دسویں اور بارہویں صدی کے درمیان اسلام روشن خیالی کا حامی رہا۔ اس نے سائنس سے متعلق بعض ان یونانی تصانیف کو شائع کیا، جنہیں مسیحی تعصب نے فنا کر دیا تھا، فنِ تعمیر، ادب، موسیقی، باغبانی، فکا و غیرہ سے متعلق اس نے بہت سی باتوں میں تجدید کی، اس نے وسطی افریقہ و مدغاسکر سے لیکر جنوبی امریکا و چین تک دور و دراز و جمہول الحال ممالک میں سیاح بھیجے، اور مجاہدات صلیبی کے دوران میں اسکا یورپ پر یہ لازمی اثر پڑا کہ وہاں علوم، فنون، و صنایع کا از سر نو احیا ہونے لگا۔

لیکن سولہویں صدی میں جب سے ترکی اقتدار بڑھا، اسی وقت سے اسلام کی روشنیابی کو زوال ہونے لگا، سلطنتِ ترکی یا ترکوں و تاتاریوں کے متفرق قبائل کے اثر سے برابر، شمالی افریقہ، مصر، ایران، یونان، شام، ایشیا کے کچھ، عرب و عراق، سب کا تمدن دیکھتے دیکھتے مٹ گیا، لیکن اسلام نے باضابطہ طور پر ترکوں کی مرز نشینی میں آج تک ایک حرف نہیں

کہا ہے، اور اگر کسی عرب، یا بربری، یا شامی، یا ایرانی کی زبان سے کوئی لفظ نکلتا ہے تو فوراً اس کی زبان بند کر دیا جاتی ہے۔

بارہویں صدی سے لیکر انیسویں صدی عیسوی تک اسلام نے ہندوستان پر شدید فوڑلی دھماکے کی بارش رکھی، اور اس ملک کی آبادی بہت کچھ گہٹا دی، سات سو برس تک یہی مذہب اس ملک میں ملک گیری، خون ریزی، قتل و غارت، جو روتھادی کاوندہ دار رہا، تا آنکہ بالآخر ایک یورپین طاقت نے یہاں امن و امان اور سربلجام قائم کیا، افریقہ میں رسم غلامی کو پیدا اور قائم رکھنے والا یہی مذہب تھا، تا آنکہ اٹلی نے طرابلس اور فرانس نے مراکو پر قابض ہو کر اس کی پکائی کی۔

میری نظریں اللہ کی پرستش اور محمد کی پیروی میں سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ یہ مذہب ماضی سے باطل بے تعلقی کی تعلیم دیتا ہے، یہودیت لعنتِ سیح سے سو برس قبل مسیح میں محلول ہو چکی تھی، اور یہ موجودہ یہودیوں کی محض ایک احمقانہ ضد ہے جو انہیں اپنے تئیں علانیہ بتبعینِ مسیح قرار دینے سے روکتی ہے، رومیوں کی قائم کردہ سبھی شریعت نے بھی ایک زمانہ میں اس کی تعلیم دینا چاہی تھی، کہ قدیم یونانیوں، رومیوں کے علمی کارناموں سے یکسر قطع نظر کر لی جائے، لیکن نشاۃِ جدیدہ نے اس کو شش کو باطل کر دیا، اور فلاطون و ارسطو، اقلیدس و بلیٹاس وغیرہ کی تصانیف کے تراجم نے جہالت کی پرستش کا سد باب کر دیا، چنانچہ اہل انگلستان و فرانس، اٹلی و پرتگال، سب نے اپنے کافر و بیہودہ سلاف کے علمی کارناموں پر فخر کرنا شروع کر دیا، یہاں تک کہ دس لاکھ سال کی مسلسل و غیر منقطع تاریخ انسانی کا تمیل، یورپ و امریکہ کی مسیحی سلطنتوں اور جاپان کی تقریباً مسیحی سلطنت کے عقائد کا جو دو بگلیا ہے، اور تو اور چین تک جو ایک متعصب و جامد مذہب کی غلامی سے آزار دہ ہے



بدنسبت اسلامی ممالک کے، آج ترقی تمدن سے قریب تر ہے،

اسلام کے خلاف میرے تمام الزامات کی بہترین نظیر مصر کی موجودہ تاریخ نہیں مل سکتی ہے  
اسلام کے نزدیک مصر کی تاریخ کی ابتداء حملہ عمرو بن العاص کے زمانہ سے جسکا سال وقوع  
۶۴۱ء ہے، ہوتی ہے، مسلمانوں نے مصر کی تاریخ قدیم پر کبھی بھی توجہ کی ہے؟ جامعہ ازہر میں  
مصر قدیم کے حیرت انگیز نظام تمدن، علوم و فنون، ادب و عقلات، عقاید و صنایع وغیرہ سے  
متعلق ایک حرف کی بھی تعلیم ہوتی ہے؟ ان چیزوں پر یا تو جہالت کا پردہ پڑا ہوا ہے، اور یا  
انہیں بالقصہ تعصب سے چھپایا جاتا ہے، آج تک کسی مسلمان بادشاہ یا عالم نے تہرلین،  
ایشیائے کوچک، شام، ایران، ایشیاء وسطی، یا افریقہ شمالی کے محققین آثار قدیمہ کے لئے کچھ بھی  
صرف کیا ہے؟ آج عربی، ترکی، فارسی، یا اردو زبان میں علم حجرات ارضیہ، انسان قبل التاریخ،  
سائنسک جغرافیہ، علم ہیئت (نجوم نہیں) تاریخ ممالک غیر اسلامی، معدنیات، زراعت،  
حیوانیات، نباتیات، یا کیمیائیات (کیمیاء نہیں) پر کوئی رسالہ موجود ہے؟

موجودہ تمدن کی طرف سے اسلام پر اعلیٰ الزام ہی عاید ہوتا ہے، اور تا وقتیکہ اسلام اپنی تین  
قرآن کی بیڑیوں سے آزاد نہ کریگا، اور دوسری اقوام اور گزشتہ تاریخ سے اپنی گستاخانہ  
بے تعلقی سے تائب نہ ہوگا۔ فطرت کا قطعی فتویٰ یہ ہے کہ وہ حکومت کے ناقابل ریہگا، نہ صرف  
اپنے ہم قوموں پر بلکہ ان اقوام پر بھی جنکا مذہب اس سے کمتر تنگ خیالی پر مبنی ہے، جو  
آج سے تیر سو برس پہلے کی پیمبر عرب کی دی ہوئی تعلیم میں موجود ہے

سٹر مارٹین لوک پہتال نے جو اس وقت انگلستان کے ایک ممتاز اہل فہم ہیں، اور خواجہ  
کمال الدین صاحب کو فیض صحبت سے حلقہ اسلام میں داخل ہو چکے ہیں، مضمون بالا کا

حسب ذیل جواب شائع کرایا:

مسرہنری جاسٹن آپکے پرچہ مورفہ ۱۷- اپریل میں دنیاے اسلام کی موجود غرضبانی کو اس امر پر محمول کرتے ہیں کہ یورپ ”تقسیم حقوق کر رہا ہے“ تاہم ان کے نزدیک ”اسلام کی مخالفت مستحق توجہ ہے۔“ نہ اسلئے کہ اسلام کو جائز مشکلات ہیں، بلکہ

”اسلئے کہ اسلام بالطبع ایک جنگجو و غیر روادار مذہب ہے، اور مسلمان یورپ میں تمدن کے

دشمنوں میں سب سے زیادہ قوی دست ہیں۔“

ان کے خیال میں اسلام کی روش،

”موجودہ اصول تعلیم و تربیت، علوم و فنون، تمدن و معاشرت، غرض ہر اس چیز کے

جو ترقی اور فلاح و بہبود کی طرف لیجانے والی ہے، سخت مخالف ہے۔“

نہ اسلئے کہ موجودہ مسلمان، اسلام کی حقیقی تعلیم سے ہٹ گئے ہیں (جیسا کہ اصل واقعہ ہے) بلکہ اسلئے کہ اسلامی دماغ کا محور و مرکز قرآن کی جامد تعلیمات ہیں۔“

لیکن قرآن میں آیات ذیل میری نظر سے گزری ہیں:-

ان الذین آمنوا والذین ہادوا والنصری والصائبین من آمن باللہ والیوم

الآخر وعلی صالحتہم اجرهم عند ربهم ولا خوف علیہم ولا هم یحزنون (سورہ بقرہ رک ۸۰)

جسکے صاف معنی یہ ہیں کہ نجات کسی ایک قوم کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ ہر قوم و ملت کے شخص کو ایمان و حسن عمل کے ساتھ حاصل ہو سکتی ہے،

دوسری آیت، وقاوالن یدخل الجنة الا من کان ہوذا والنصری تلک اما نہم قتلہا

بہا لکم ان کنتم صادقیں۔ بلای من سلم وجہہ للہ وہو محسن فله اجر عند ربہ ولا خوف علیہم لام یحزنون

(بقرہ رک ۱۷)

اس سے زیادہ وسیع المشربلی کی اور کیا تعلیم ہو سکتی ہے؟

تیسری آیت، وقت اتلوا فی سبیل اللہ الذین یقاتلونکم ولا تعمدوا  
(اللہ لا یحب المعتدین (بن، رکوع ۲۴)

درحقیقت قرآن کی تعلیم جنگجوئی و عدم رواداری کے باکل مٹانی ہے، بیشک قرآن نے  
جنگ کے ضوابط بھی بیان کئے ہیں، لیکن یہ ضوابط ایسے ہیں کہ اگر موجودہ یورپ انہیں اختیار  
کر لے تو نوع انسان کے حق میں بہتر ہو، مسلم کے معنی قرآن و احادیث بنوی میں متبع محمدؐ کے نہیں  
بلکہ محض من اسلم و وجہ اللہ و محسوس، کے ہیں، یعنی اس شخص کے جو اپنے تئیں خدا کے حوالہ  
کردیتا ہے، اور اعمال حسنہ کرتا رہتا ہے،

رہا یہ الزام کہ اسلام کے احکام ترقی تعلیم وغیرہ میں مارج ہوتے ہیں، اس حدیث بنوی  
میں صاف ارشاد موجود ہے (اطلبوا العلم ولو کان فی النحین) یعنی علم حاصل کرنا چاہیے خواہ وہ  
کافر قوم سے اور سخت شہادید کے ساتھ ہو، آزاد خیالی، فکر و تدبیر اور تعلیم ہر مسلم مرد و عورت پر  
واجب ہے، مسلمانوں کے اغلاط کا اصلی باعث صرف یہ تھا کہ ہنگامی طور پر ان میں فکر و اجتہاد کا  
قطع اور تقلید کا زور ہو گیا تھا، اسی طرح جیسے کہ یورپ کی موجودہ ترقی کا راز ان کی عقل آرائی و  
ردش خیالی میں مضمر ہے، لیکن حقیقتہً آزاد خیالی تعلیم اسلام کا ایک لازمی جزو ہے، درانحالیکہ  
جہاں تک مجھے علم ہے اس قسم کا کوئی حکم مسیحیت میں موجود نہیں، مسلمانوں کو اپنے اس نردال پر  
متنبہ ہوا، اور اپنی پستی پر انہیں سخت غیرت معلوم ہوئی، اس سے ان میں ترقی کی جدید تحریک  
پیدا ہوئی، اور منقولات و تقلید کی چار دیواری سے نکل کر انھوں نے براہ راست قرآن سے استفادہ  
شروع کیا، اس وقت انہیں نظر آیا کہ ان کی زندگی میں کتنے غیر اسلامی عناصر شامل ہو گئے تھے،  
نیز یہ کہ جن امور کو یورپ اپنی آزاد خیالی سے منسوب کرتا ہے، وہ کس حد تک قرآن سے  
ماخوذ ہیں، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہونا تھا کہ استبداد مطلق العنانی کا خاتمہ ہو، مذہبی رواداری

پوری طرح قائم ہو، تعلیم جدید اصول پر مبنی ہو، اور غلامی کا رہا سہا دستور معدوم ہو چنانچہ یہ سب کچھ ہوا، لیکن اس تحریک اصلاح کا مرکز نہ قاہرہ تھا، جہاں کی تعلیم طرز کی یونیورسٹی (ازہر) سر جانشین کی آنکھوں میں اس قدر کہنک رہی ہے، نہ مکہ تھا جسکی سرزمین ابتداء اسلام کی مظلومیت کی یادگار ہے، اور پھر نہ بغداد و دمشق، بلکہ اسکا مرکز قسطنطنیہ تھا، یہی وہ مقام تھا جہاں اسلام اور مسیحیت کا اتصال ہوا، اور یہیں مسلمانوں کو یہ اُمید پیدا ہوئی کہ مسیحیت سے جو مصالحت انکے پیغمبر نے کرنا چاہی تھی پوری ہو کر رہیگی۔

یہ تحریک ابتداءً بالکل یورپ و دست تھی، اسکو امداد کی ضرورت تھی، اور اس نے مغربی یورپ کے سامنے دست اعانت پھیلا یا، لیکن مغربی یورپ نے اسکے جواب میں کیا کیا؟ یہ کیا کہ اسے ہر طرح پامال کر ڈالنا چاہا، یہ کیوں؟ اسلئے نہیں کہ یہ تحریک ”موجودہ ترقی تعلیم کے منافی“ تھی، بلکہ اسلئے کہ اس تحریک کا رجحان اسلامی ہونے کی بنا پر اشتراکیت کی جانب تھا، اسلئے کہ یہ سود خوری کے مخالف تھی، اسلئے کہ یہ محکوم قوموں کی حامی تھی، جس سے حکمرانوں کی خود غرضیوں کو صدمہ پہنچنے کا اندیشہ تھا، ہاں اسلئے کہ اسکی بنیاد حالات و اسباب پر تھی جو امن عام کی جانب موڑ دی تھے۔

تو کون کے ساتھ ہمارے طرز عمل کے خلاف ایشیا و افریقہ میں جو شعلہ فساد و زنا فروز قوت کے ساتھ بھڑکنے لگا ہے، اسکا اصلی سبب صرف یہ ہے کہ ہم نے اپنے طرز عمل سے دنیا کو یقین دلادیا ہے کہ ہم مسلمانوں کو میدان ترقی میں بڑھنے کا جائز موقع بھی نہیں دینا چاہتے، اور ہم نے اپنی جگہ پر تہیہ کر لیا ہے کہ اسلام کو ابھرنے نہ دیں گے، لیکن اسلام ابھر گیا اور ہمارے علی الرغم ابھر گیا، البتہ ہم نے اپنے ایک ہونے والے دوست کو خواہ مخواہ اپنا دشمن بنا لیا ہے۔“

ایک اور انگریز مسٹر آرتھر دی لیس نے اسی بحث پر حسب ذیل انہما خیال کیا ہے،  
 ”سرہنری جانشن نے اپنے مضمون میں اسلام پر یہ الزام لگایا ہے کہ وہ علم کا دشمن  
 اور غیر اسلامی تاریخ سے نا آشنا ہے، تحریر مضمون کا محرک بیشک خواہش اتحاد عالم عقلی جو قابل  
 تحسین ہے، اور یہ اتحاد صرف اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے، جب قوم و عقیدہ کے اختلافات  
 مٹ جائیں گے لیکن اس مقصد کے حصول کی یہ صورت نہیں کہ مسیحیت کے سامنے دوسرے  
 مذاہب مٹ جائیں یا اسی میں ضم ہو جائیں، اسکے حصول کی ممکن صورت صرف یہ ہے کہ جملہ  
 مذاہب و اقوام اپنے مشترک و متحد خصوصیات پر زور دین، اور ضد و خود بینی کے جذبات کو  
 بالائے طاق رکھ دیں، میرے نزدیک سرہنری جانشن کے الفاظ ذیل یقیناً تنگ نظری  
 و تعصب کے نتائج ہیں کہ

”بعثت مسیح سے سو برس قبل یہودیت مسیحیت میں محلول ہو چکی تھی اور یہ یہودیوں کی

محض احمقانہ ضد ہے کہ آج وہ اپنے تین علانیہ مسیحی قرار نہیں دیتے۔“

اس لب و لہجہ کے اختیار کرنے کے بعد سرہنری جانشن کو یہ کسی طرح زیب نہیں دیتا کہ  
 وہ مسلمانوں پر تاریخی تسلسل سے بخیری یا غیر اسلامی دنیا سے بے تعلق کا الزام لگائیں، سر  
 ہنری جانشن کی مسیحیت تنگ نظری و تعصب میں کسی دوسرے مذہب سے کم نہیں،

اسی سلسلہ میں مولانا سید سلیمان ندوی نے بھی ایک مختصر مضمون لکھ کر بھجوا جو ایسی

کے پرچہ نیو اسٹیٹسٹین میں شائع ہوا ہے جسکا ملخص ترجمہ مندرج ہے۔

”سرہنری جانشن اسلام کی رواداری و آزاد خیالی میں شک کرتے ہیں، اور رپورٹ

ہارڈوک ناظرین کو رسیان کے کچر اسلام و علم کے مطالعہ کا مشورہ دیتے ہیں لیکن اجازت ہو تو عرض کروں کہ

اس سلسلہ میں ریتان کی "حیات مسیح" کا مطالعہ بھی خالی از لطف نہ ہوگا، اور اگر ریشنسٹ سوسائٹی پریس کے مطبوعات کے ہم پہنچے ہیں کچھ وقت ہو تو میں ڈریسپر کی "معاذ مذہب و سائنس" کے ملاحظہ کی سفارش کر دوں گا، اسکے بعد بھی اگر اسلام کی آزاد خیالی میں کچھ شک و شبہ باقی رہ جائے تو ڈاکٹر آرنلڈ کی "دعوت اسلام" سے مدد لینا چاہیئے،

مسلمانوں کی چارہ صد سالہ زندگی میں اسکی کوئی نظیر نہیں ملتی کہ کسی عالم کو اسکی علمی تحقیقات کی بنا پر قتل کر دیا گیا ہو، یا زندہ آگ میں جلا دیا گیا ہو، خلفاء و سلاطین اسلام کے دربار یہودی و مسیحی فضلا سے لبریز رہا کرتے ہیں، اور گستاخی و مناف، یہ بھی واضح رہے کہ آج اس بیسویں صدی میں "متمدن" و روشن خیال "یورپین حکومتوں کے تحت میں کسی غیر یورپین کے اس مرتبہ و منصب تک پہنچنے کی کوئی مثال نہیں ملتی، چیر مسلمانون کے عہد حکومت میں ہمیشہ غیر مسلم پہنچے رہے ہیں یہ

پروفیسر ریتان فرانس کا مشہور ٹیٹل و محقق جسکی کتاب (Life of Jesus) (حیات مسیح) عیسائیوں کے عام معتقدات کے بالکل مخالف ہے،

پروفیسر ریشنسٹ سوسائٹی (انجمن عقلمندان) ایک ریل صدی سے لندن میں قائم ہے، جسکا مقصد دنیا میں بجائے نقل و روایت و تقلید کے عقل و آزاد خیالی کی ترویج ہے، اسکا پریس اب تک صد ہا کتابیں شائع کر چکا ہے، جن میں سے بیشتر ایسی ہیں جن میں مسیحی تعصب و تنگ خیالی کی بوضاحت پردہ دردی کی گئی ہے اس پریس نے ریتان کی مذکورہ کتاب بھی شائع کیا ہے، اس کے ڈاکٹر ڈریسپر کی کتاب (Conflict between Religion & Science) جسکا اردو ترجمہ "معاذ مذہب و سائنس" کے نام سے شائع ہو چکا ہے، اور جس میں تفصیل دکھایا گیا ہے کہ بیعت نے قدم قدم پر علمی تحقیقات کی کیسی شدید مخالفت کی ہے۔

ڈاکٹر ڈیلائی آرنلڈ کی کتاب (The preaching of Islam) جسکا اردو ترجمہ "معاذ اسلام" کے نام سے شائع ہو چکا ہے اور جس میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ اسلام کی اشاعت بزرگوں نے بلکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اشاعت کے ساتھ ہوئی ہے۔

واقعہ اسلام کی رواداری کی دلیل ہے یا تعصب کی، کہ جو مالک صد ہا سال سے اسلام کے زیر نگین میں، ان میں آج بھی مسیحوں اور یہودیوں کی قدیم آبادیاں موجود ہیں جو صلح و امن کے ساتھ بے کھٹے زندگی بسر کر رہی ہیں، درآنحالیکہ اسپین و سسلی میں جہاں ایک زمانہ بین مسلمانوں کی کثیر آبادی تھی، آج ایک بھی مسلمان نظر نہیں آتا؟ کیا تاریخ اس حقیقت سے ناواقف ہے کہ کس ظالمانہ طریق پر مسلمانان اسپین جلا وطن اور فنا کئے گئے، اور اسکا انجام یہ ہوا کہ اسپین میں وہ اقتصادي قحط اور علمی انحطاط پیدا ہو گیا، جسکے اثرات آج تک دوہنہن ہو سکے ہیں؟ مسلمانان روس کے ساتھ اس دور روشن خیالی میں جو شقاوت برتی گئی ہے اسکا حال تلغیق الاخبار کے مطالعہ سے معلوم ہو سکتا ہے جسکے دو مجلدات قازان میں شائع ہوئے ہیں، پھر مسیحی یورپ میں یہودیوں کے ساتھ جو برتاؤ ہوتا رہا ہے کیا اسکا حال کسی سے مخفی ہے؟ لیکن اسکے مقابلہ میں ان کے ساتھ مصر، اسپین، شام، اور خود ترکی میں کیا برتاؤ رہا ہے؟ یہی وہ طرز سلوک ہے جس میں اسلام کی رواداری و فراخ دلی کی بہترین مثال ملتی ہے، جو حضرات اسکے مدعی ہیں کہ انکی ہمدردیاں نوع انسانی کے حدود تک وسیع ہیں، براہ کرم وہ ان مظالم و شدید پر بھی ایک نظر کریں جو مسلمانوں کو کریٹ، یونان، مقدونیہ و سربوہ میں پیش آتے رہے ہیں اور آج بھی پیش آرہے ہیں، پھر تاریخ عالم میں جو واقعات محاربات صلیبی کے نام سے موسوم ہیں یہ کس قوم کی رواداری کے نتائج تھے؟

جو اصحاب راستی و دیانت کے ساتھ اسلام کی علمی و تمدنی کارناموں کی بابت واقفیت حاصل کرنا چاہتے ہیں انکی خدمت میں گستاخی بان کی تمدن عرب کے مطالعہ کی سفارش کرونگا۔ مسلمان عموماً دو بڑے طبقوں میں منقسم ہیں، عرب و غیر عرب، غیر عرب کے تحت میں ایرانی، ہندوستانی، ترک، و مغول وغیرہ سب شامل ہیں، اور ان قوموں میں فضلاء و فلاسفہ مسیہین کی

تقداد میں بہنیں، بلکہ صد ہا پیدا ہو چکے ہیں، یہ سچ ہے کہ خاص عرب کی سرزمین سے اہنک کوئی ایسا فلسفی نہیں پیدا ہوا ہے جسکی عظمت تمام دنیا میں مسلم ہوتی، تاہم حوالی عرب یعنی مین کے علاقہ میں دو ایک شخص اس پایہ کے پیدا ہوئے ہیں اور خاص عرب جو اہنک اس وصف سے محروم رہا، اسکا سبب صرف یہ ہے کہ عرب کے تمام ارباب علم نے اپنی توجہ مخصوص علم دین اسرار شریعت پر مبذول رکھی، لیکن یہی لوگ جب اپنے وطن سے باہر نکل کر شام، مصر، تونس، الجزائر، مراکش و اسپین میں قدم رکھتے تھے تو انہیں مین سے نامور حکماء و فلاسفہ پیدا ہونے لگتے تھے، ان شاہرہ عرب کی شہرت قیامت تک قائم رہیگی کہ دنیا کے موجودہ ذخیرہ علم و حکمت کے اہل فہم انہیں کے کارنامے ہیں، جو لوگ اسکے ثبوت کے متلاشی ہیں انہیں چاہیے کہ ابن خلدون، ابن اصبغ، ابن سعید و ابن ندیم کی درق گردانی کریں، اگر ان کتابوں کی مدد سے صحیح واقفیت پیدا کیجائے تو اسلام کی تنگ خیالی و تعصب پر کبھی زبان نہ کھل سکے،

پہلے اسلامی تحریک کا وجود ان دماغوں سے باہر کہیں نہیں ہے، چہر زرد خطہ "یاہ خطہ" "سرخ خطہ" یا "سفید خطہ" کا عفریت سوار رہتا ہے، میرے نزدیک تو پہلے اسلام مزہم کے دہی خطہ سے جسکا وجود صرف مسیحی ادہام پرستوں کے دماغوں تک محدود ہے، بدرجہا زاید امن عالم کے لئے خطرناک یورپ کی ہوس ملک گیری و جوع الارض ہے، اور اس امر کا فیصلہ میں آپ کے ان ناظرین کے جنھوں نے مشرقی ممالک کی سیاسی کمی ہے، انصاف پر چھوڑتا ہوں کہ نوع انسانی کے لئے اپنے مذہب کے ساتھ جوش محبت رکھنا زیادہ خطرناک ہے یا یورپ کا جوش قومیت ؟ -



## غالب

دیوان غالب اردو کے جدید ایڈیشن (نظامی پریس بدایون) پر ہندو تعلیم یافتہ گروہ کے ایک ممتاز رکن پنڈت منوہر لال زلشی، ایم، اے، فیلو آلہ آباد یونیورسٹی و انسپکٹر مدارس آلہ آباد نے ایک انگریزی پرچہ میں ریویو تحریر کیا ہے جس سے یہ اندازہ ہوگا کہ ہندو اصحاب کے علمی طبقہ میں اردو شاعری خصوصاً غالب کی شاعری سے متعلق کیا خیالات ہیں،

پنڈت صاحب موصوف لکھتے ہیں کہ سالہا سال سے ہمارے ہم وطنوں کے انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ میں اردو شاعری بدنام رہی ہے، اور اس بدنامی کے اسباب واضح ہیں مثلاً خود فن شاعری میں انخطاط تعلیم یافتہ گروہ کی جاہلانہ رعوت، اور زمانہ کی خشک مزاجی وغیرہ، اس میں بھی شبہ نہیں کہ انیسویں صدی کا رُبع آخر خاص طور پر انخطاط کا زمانہ تھا، اور یہ کہنا ایک امر واقع کو بیان کرنا ہے، کہ اس دور میں مرزا داغ کو مستثنیٰ کرنے کے بعد، جبکہ کلام باوجود شہوانی مضامین کے صیح شاعری کا نمونہ ہے، ایک بھی اعلیٰ پایہ کا شاعر نہیں پیدا ہوا، یہ زمانہ وہ تھا کہ اساتذہ قدیم وفات پا چکے تھے، اور ان کے بجائے ہزاروں نظم نویس جو نکل پڑے تھے، انہیں سے بہترین افراد کا انتہائے کمال یہ تھا کہ رعایت لفظی کی پابندی اور حسن تناسب کے ساتھ قدیم مضامین کو از سر نو موزون کر دین، اور جو بدترین تھے ان کی شاعری تو ماتر فحاشی اور نفرت انگیز ابتذال کا مجموعہ تھی، انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ کو یہ نمونہ دیکھ کر نفس اردو شاعری سے متعلق یہ بدگمانی ہو گئی کہ یہ محض عیاش درنگین طبع اشخاص کے سامان ضیافت کے مراد ہے، حالی اور ان کے پیروں نے اس عام بد مذاقی کی راہ سے الگ ہو کر اردو شاعری کی اصلاح اور اسے فطرت (نیچر) کے مطابق بنانے کی کوشش کی، حالی بحیثیت مصلح کامیاب اور بحیثیت

شاعر ناکام رہے، انکی ناکامی کا اصلی راز یہ ہے کہ انھوں نے شاعری میں بجائے جذبات کے خشک واقعات، اور بجائے تخیل کے عقل سے کام لینا چاہا، اور انہیں کامیابی اس حیثیت سے ہوئی کہ ان کا اصلاح مذاق کا منتر کارگر ہو گیا، اردو شاعری سے فحاشی و انتہال کا عنصر دور ہو گیا، لوگوں کا مذاق سخن درست ہو چلا، اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ زمانہ حال کے بہترین شعراء اقبال، جلیست، وحسرت موہانی کا کلام اپنے پیشروؤں سے مضامین میں پاکیزہ تر، طرز و ادب میں لطیف تر اور ادبی حیثیت سے صحیح تر ہے،

اس اصلاح کا ایک مفید نتیجہ یہ بھی ہوا کہ اساتذہ اردو کے کلام کو از سر نو مقبولیت حاصل ہونے لگی، اور انگریزی تعلیم یافتہ طبقوں میں ان، مستیوں کی جانب التفات پیدا ہونے لگا، جنکے امتیاز کو نہ زمانہ مٹا سکتا ہے، اور نہ جنکے مذاق سخن پر کبھی کسی کو حرف گیری کی گنجائش ہو سکتی ہے، ان اساتذہ میں غالب کا مرتبہ سب سے بلند ہے، اسلئے ہم سب کو نظامی پیرس بدایوں کا ممنون ہونا چاہیئے کہ اس نے پچھلے چند سال کے اندر دیوان غالب کے تین نہایت عمدہ ایڈیشن شائع کر دیئے ہیں، مضمون دزبان، عمق خیال، حسن ادا، مضمون آفرینی و شیریں بیانی، معنویت و دلکشی، ہر حیثیت سے غالب اسوقت تمام دوسرے شعراء سے زیادہ جدید طبقہ میں مقبول و محبوب ہے، اور اگر یہ صحیح ہے کہ شاعری نام ہے الہامات فطری و موسیقیت کے ازدواج کا، علو خیال و حسن بیان کے اجتماع کا، تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ غالب کا یہ امتیاز ہمیشہ

اسے فاضل مضمون نگار کی اس رائے سے اتفاق کرنا دشوار ہے کہ عالی کو شاعری کی حیثیت سے ناکامی ہوئی، حالی کا قدیم عاشقانہ کلام کسی طرح موسمی، شیفہ، و آتش سے فروز نہیں، بلکہ انکی بعض غزلیں تو اس پایہ کی ہیں کہ انہیں بلا تکلف دیوان غالب میں جگہ دیا جاسکتی ہے، یہی کلام کی عام مقبولیت سوسمہدس ہو لیکن دوسری نظموں، بیوہ کی مناجات، شکوہ حالی سے بڑھ کر اردو میں شاید ہی کسی اور کا کلام مقبول ہوا ہو۔ (معارف)

قائم رہیگا، یہ بالکل صحیح ہے کہ غالب اپنی زندگی و شاعری کسی شے میں رسوم و تقیید کا پابند نہ تھا، ایک امر کی مصنف نے خوب کہا ہے کہ اگر انسان کو بڑا ہونا ہے تو اسے مجتہد ہونا چاہیئے، اور غالب اپنی زندگی کے ہر شعبہ میں قیود و رسوم سے آزاد تھا، مذہب کے جو معنی عموماً لئے جاتے ہیں، اس معنی میں وہ ایک غیر مذہبی شخص تھا، اپنی نظم و نشر میں کہیں بھی وہ مصطلح مفہوم میں خدا وغیرہ پر اپنا اعتماد ظاہر نہیں کرتا، البتہ اسکے ہر شعر میں ایک عمیق روحانیت جھلکتی ہوئی نظر آتی ہے، اسکا کلام گویا ویدانت کا تصوف منظوم لباس میں ہے، اور غالب اپنے ایک ایک لفظ سے اپنے صوفی ہونے کا ثبوت دیتا ہے، اشعار ذیل ملاحظہ ہوں

اصل شہود و شاہد و شہود ایک ہیں      حیران ہوں پھر شاہدہ کی حساب میں

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن      دل کے خوش رکھنے کو غالب خیال چاہے

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ تھا تو خدا ہوتا      ڈلو یا جھکھو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

یہی نہیں کہ غالب کا ہر شعر بجائے خود ایک داستان غم ہے، تلاش حقیقت کے لئے ایک نالہ مضطرب ہے، طلسم کشائی و ہر کے لئے ایک صدائے درد ہے، بلکہ اسکے کلام میں تاثیر کا کمال یہ ہے کہ وہ پڑھنے والے کو بھی اپنا ہم رنگ بنا لیتا ہے، اور اسکے قلب میں اپنی ہی سی روح جذبات پیدا کر دیتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ براؤنگنگ کی طرح غالب مشکل پسند ہے، اور بے شبہہ اسکے کلام کے بعض حصوں کے متعلق یہ خیال بالکل صحیح ہے، لیکن دوسری طرف اسکا ایسا کلام بھی موجود ہے جو اپنی صفائی و سادگی کے لحاظ سے بے نظیر ہے، اور جہین حسن احواد لطف بیان کے ساتھ ساتھ

سوز و گداز بھی کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے، مثلاً

کوئی اُمید برہنیں آتی	کوئی صورت نظر بہنیں آتی
آگے آتی تھی حال دل پہ ہنسی	اب کسی بات پر بہنیں آتی
ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپٹاں	ورنہ کیا بات کر بہنیں آتی
ہم وہاں ہیں جہاں سے ہلکو بھی	کچھ ہماری خبر بہنیں آتی
مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی	موت آتی ہے پر بہنیں آتی
کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالب	شرم نملو مگر بہنیں آتی

لیکن غالب پرستی کے لئے یہ ضروری بہنیں کہ دوسرے معبودانِ ادب کی خداوندی سے انکار کر دیا جائے، میر کے متعلق کچھ کہنا تحصیلِ حاصل ہے، سو برس سے اسکی جو عظمت قائم ہے اس میں اب بھی فرق پڑنے کی کوئی وجہ بہنیں، اور عظمت بھی کیسی جب کا فیاضانہ اعتراف خود غالب کو ہے، اے

غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقولِ ناسخ

آپ بے بہرہ ہے جو مستقرِ میر بہنیں

آتش کا موضوع سخن محدود ہے، پھر بھی اپنی اس محدود و مختصر قلمرو میں اسکی فرمانروائی  
سلم ہے، اے

بندشِ الفاظ بڑنے سے نگین کے کم بہنیں

شاعری بھی کامِ آتشِ مرصع ساز کا

انیس نے اپنے تئیں صرف مرثیہ کے حدود کا پابند رکھا

عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں      پانچویں لپٹ ہی شبیر کی مداحی میں

لیکن اس میدان میں اُن کا کوئی حریف نہیں، اور اُنکی بعض رباعیات تفصاحت کے دارالضرب میں سب سے زیادہ کہری ثابت ہوئی ہیں،

ہر جمل سائنس کا دور دورہ ہے، زمانہ مادی علوم کی جانب متوجہ ہے، طلبہ کے لئے نل کی ساخت کے اصول جاننا زیادہ قابل قدر سمجھا جاتا ہے، بمقابلہ اسکے کہ کالیڈاس کے شکستہ یا در دس درتہ کے بٹن ایسے کے لطائف ادبی پرانگی نظر ہو، ایسی حالت میں اسکی بہت سخت ضرورت ہے کہ ہمارے جذبات عالیہ و احساسات لطیفہ، مادی علوم کی تحقیقات، تجارتی ہنگامہ آرائیوں، کاروباری چیخ بیکار، اور سیاسی شور و غلب کے روز افزوں بار سے پامال ہونے سے کچھ تو محفوظ رہ سکیں۔

## احسان علیہ

ماہ گذشتہ میں ایک شخص مسی ٹامس میرس نے امریکہ میں وفات پائی، جسکی بابت خیال ہے کہ وہ دنیا کا معمر ترین شخص تھا، وفات کے وقت اسکی عمر ۱۲۶ سال کی تھی، اُس کے گھر میں انجیل کا ایک نسخہ تھا، جسپر اسکی تاریخ ولادت ۱۵ جنوری ۱۶۹۲ء درج تھی، اسکا مولد نارتمہ ویلز (انگلستان) تھا، اُسکو پنولین کے زمانہ کی لڑائیاں خصوصاً جنگ وائٹلرلو بطور چشمیدہ واقعات کے اچھی طرح یاد تھیں، پچاس برس سے اسکی سکونت امریکہ میں تھی، اُسکی عمر ۲۶ سال کی تھی جب اسکی معشوقہ کا انتقال ہو گیا، اسوقت سے وہ برابر عورت کی صحبت سے محترز رہا،

امریکہ میں یونیورسٹیاں دو قسم کی ہیں، ایک سرکاری، دوسرے پرائیوٹ، دونوں کی مجموعی تعداد ۶۰۰ ہے، ریاستہائے متحدہ کی تقریباً ہر ریاست اپنی ایک علیحدہ یونیورسٹی رکھتی ہے اور متعدد پرائیوٹ یونیورسٹیاں، لیکن شہرت، ناموری، اور علمی کارناموں کے لحاظ سے عموماً پرائیوٹ یونیورسٹیاں سرکاری یونیورسٹیوں پر ہر طرح تفوق رکھتی ہیں، چنانچہ ٹیل، ہارورڈ، کولمبیا، پرنش و شکاگو کی مشہور عالم یونیورسٹیاں غیر سرکاری ہیں، ہر یونیورسٹی کے عموماً پانچ شعبے ہوتے ہیں، شعبہ علوم، شعبہ فنون، شعبہ زراعت، شعبہ طب، اور شعبہ قانون،

کالجن میں یہ تمام مضامین صرف دو عنوانات کے تحت میں آجاتے ہیں، شعبہ علوم، و شعبہ فنون، اکثر یونیورسٹیوں میں پانچ پانچ کالج ہوتے ہیں :-

(۱) کالج برائے علوم و فنون،

(۲) کالج برائے انجینئرنگ،

(۳) کالج برائے زراعت،

(۴) کالج برائے طب،

(۵) کالج برائے قانون،

بعض یونیورسٹیوں میں انکے علاوہ تجارتی کاروبار کے لئے بھی کالج ہوتے ہیں، چند یونیورسٹیوں میں صحافت یا فن اخبار نویسی کی بھی باقاعدہ تعلیم دی جاتی ہے، کچھ یونیورسٹیاں ایسی بھی ہیں جو بذریعہ مراسلت تعلیم دیتی ہیں، طلبہ اپنی مشکلات اساتذہ کی خدمت میں بذریعہ ڈاک بھیجتے ہیں، اور وہ ڈاک ہی سے ان کے جوابات بھی ارسال کر دیتے ہیں، ہزار ہا طلبہ جو باضابطہ مدارس میں داخل ہو کر تعلیم پانے کا وقت نہیں نکال سکتے، اسی ذریعہ سے استفادہ کرتے ہیں۔

عموماً امریکی یونیورسٹیاں حسب ذیل ڈگریاں عطا کرتی ہیں :-

(۱) اے، بی، (یہ ہمارے ہاں کے بی، اے کے مرادف ہے، یعنی ”بالغ العلوم“)

(۲) بی، ایس، (یہ ہمارے ہاں کے بی، اے کے مرادف ہے، یعنی ”بالغ الفنون“)

(۳) ای، ای، (قانونی گریجویٹ کی ڈگری)

(۴) اے، ایم، (یہ ہمارے ہاں کے ایم، اے کے مرادف ہے، یعنی ”کمال العلوم“)

(۵) ایم، اے، (یہ ہمارے ہاں کے ایم، اے کے مرادف ہے، یعنی ”کمال الفنون“)

(۶) پی، ایچ، ڈی، (ڈاکٹر آف فلاسفی، فلسفہ کی اعلیٰ ترین سند)

(۷) ایم، ڈی، (ڈاکٹر آف میڈیسن، طب کی اعلیٰ ترین سند)

(۸) ڈی، ڈی، اس، (ڈاکٹر آف ڈیٹیل سرجری۔ امراض دندان کے متعلق اعلیٰ ترین سند)  
بعض یونیورسٹیوں میں انکے علاوہ کچھ اور ڈگریاں بھی ہوتی ہیں، مثلاً ہٹل یونیورسٹی ایک  
خاص ڈگری، پی، ایچ، بی۔ (ہیچلر آف فلاسفی) کی دیتی ہے،

صنف نسوان کے لئے امریکہ میں عموماً جگہ گاہ کالج ہیں، اسی طرح طب، زراعت، تجارت  
انجینئرنگ، وغیرہ مخصوص صنایع و فنون کے لئے، نیز طبقہ شمال کے لئے علاوہ کالج ہیں جو  
یونیورسٹیوں کی نگرانی سے آزاد ہیں، بڑے بڑے کارخانہ داروں کے قائم کردہ کالج ان کے  
علاوہ ہوتے ہیں جنہیں انکے اہل حرفہ کے بچے تعلیم پاتے ہیں،

نیویارک (امریکہ) کے ایک نو تعمیر ہوٹل میں جسکا نام ایمپیسڈر ہوٹل ہے، ایک عجیب  
وغریب صنعت یہ رہی گئی ہے کہ اسکی چودہویں منزل پر جو سطح زمین سے تقریباً دو سو فٹ بلند ہے  
ایک چین لگایا گیا ہے جو شاداب گھاس اور خوشنما پھولوں کا مجموعہ ہے، اسن جن کا عرض بارہ  
فٹ اور طول دو سو فٹ ہے، اسکے گرد ایک نہایت نفیس اور مضبوط کھڑہ بھی لگادیا گیا ہے  
تاکہ تماشا لہی بے خوف و خطر اسکی سیر کر سکیں،

ایک قدیم مصری تاجدار قوت الخ امر کا سنگین مجسمہ حال میں لودر کے عجائب خانہ نے  
دس ہزار پونڈ کی قیمت دیکر خرید کیا ہے، ۱۸۶۱ء سے یہ مجسمہ ایک فرنیچر شہزادہ کے قبضہ میں چلا  
آتا تھا، اور بہت کچھ شکستہ حالت میں ہے، روایت ہے کہ ولادت مسیح سے ہزار ہا سال قبل  
اس بادشاہ کے طریق حکومت سے برہم ہو کر اسکی رعایا نے اسکے مجسمہ کو فارت کیٹکی کو شش کی مٹی



اگر ایک شخص یہ بیان کرے کہ پانی لوہے کو گلا دیتا ہے تو کوئی بھی اسپر لقیں نہ کریگا، لیکن ایک سائنس دان لکھتا ہے، کہ اگرچہ خالص ولے آمیز پانی برق آفرین نہیں، لیکن اگر ہمیں کچھ بھی تیزابیت پیدا ہو جائے تو وہ فوراً موصل امواج برق بن جاتا ہے، اب اگر کسی تیزاب آمیز پانی کے ذخیرہ سے برقی رو کو گذاریں تو وہ پانی اپنے دو اجزاء ترکیبی آکسیجن و ہائیڈروجن میں تقسیم ہو جائیگا، جنہیں باسانی مشینہ کے مرتبازوں میں محفوظ کیا جاسکتا ہے، آکسیجن ہائیڈروجن کے اس مرکب کو اگر ذرا سی بھی آگ دکھا دیں تو دفعۃً اس قدر تیز و شدید شعلہ آتش پیدا ہوگا جو چند منٹ میں لوہے کی دیر چادر کو بھی پگھلا دیگا،

امریکہ کی مشہور کولمبیا یونیورسٹی نے اپنے ہان ایک جدید قاعدہ یہ نافذ کیا ہے کہ اسکے طلبہ کو اپنے آخری دو برسوں میں دنیا کی مشہور ترین کتب میں سے کم دہیش پچاس کی تعداد میں ضرور مطالعہ کرنا چاہیئے، چنانچہ اس نے بیالیس مصنفین کے نام بھی از خود پیش کئے ہیں، جنکی تصانیف کا مطالعہ، اسکے نزدیک دنیا کے بہترین لٹریچر کا مطالعہ ہے، ان مصنفین کے اسمائے گرامی مع آنکی قومیت یا زبان تصنیف کے حسب ذیل ہیں :-

(۱)	ہومر	(شاعر)
(۲)	ہیروڈوٹس	(مورخ)
(۳)	تیوسی ڈائیڈس	متذکرہ نویس
(۴)	عسقلیس	(شاعر و ڈراما نویس)
(۵)	پلوریپڈیس	( " )

(شاعر و ڈراما نویس)	ارسطو فینیز	(۶)	یونانی
(فلسفی)	فلاطون	(۷)	
( " )	ارسطو	(۸)	
(شاعر و فلسفی)	اُکریٹیس	(۹)	
(شاعر و ڈراما نویس)	موقولیز	(۱۰)	
(شاعر)	درجل	(۱)	رومی
( " )	ہورس	(۲)	
(تذکرہ نویس)	پلوٹارک	(۳)	
(حکیم اخلاق)	مارکس آرلیس	(۴)	
(متکلم و واعظ)	سینٹ اگسٹائن	(۱)	
( " )	نابیل انکن لائڈ	(۲)	المسیحیت اور قدون وسطی
(شاعر)	ردلنڈ	(۳)	
(متکلم)	ٹامس اکویناس	(۴)	
(شاعر)	دینتے	(۱)	
	پیٹرارک	(۲)	
(شاعر و ڈراما نویس)	شکسپیر	(۱)	اطالوی
(شاعر)	ملٹن	(۲)	
(فلسفی)	سبکن	(۳)	
( " )	ہیوم	(۴)	
			انگریز

(اقتصادی)	ایڈم اسمتھ	(۵)	انگریز
(ادیب)	مکالے	(۶)	
(سائنسٹ)	ٹواردن	(۷)	
( // )	لائل	(۸)	
(شاعر و حکیم)	بِنگ	(۱)	جرمنی
( // )	گیٹے	(۲)	
( // )	شلر	(۳)	
(فلسفی)	کینٹ	(۴)	
( // )	ہیگل	۵	
(مورخ و فلسفی)	نیٹش	(۶)	فرینچ
(افسانہ نویس)	مولیار	(۱)	
(ادیب)	مانٹسکو	(۲)	
( // )	دالیئر	(۳)	
( // )	رد شو	(۴)	
( // )	مانٹین	(۵)	
(افسانہ نویس)	ہیوگو	(۶)	
(حکیم و افسانہ نویس)	مالٹائے	(۱)	روسی ۳
(افسانہ نویس)	سر وینٹس	(۱)	ایتلی ۳

دنیا کا سب سے بڑا ہوٹل شکاگو (امریکہ) میں تعمیر ہونا تجویز ہوا ہے، انجینیئروں نے اسکا جو نقشہ بنایا ہے، اس میں چار ہزار کمرے رکھے ہیں! ہوٹل سے متعلق چار سو علیحدہ باؤر چھپا ہونگے، ایک تھیٹر ہال ہوگا جس میں ڈہائی ہزار آدمی بیٹھ سکیں گے، اور ایک عمارت سولہ منزلوں کی ہوگی!! ہوٹل کے مجموعی مصارف کا تخمینہ ڈیڑھ کروڑ ڈالر قرار پایا ہے،

سر آر تھو جیٹ نے ریل جیوگرافیکل سوسائٹی کی خدمت میں دنیا کا ایک نقشہ پیش کیا ہے جو دو نصف دائروں کی شکل میں ہے، اور جو بالینڈ میں سترہویں صدی کے وسط میں تیار ہوا تھا اسکی ایک نقل برٹش میوزیم کے کتب خانہ میں بھی ہے، مگر وہ بعض حیثیات سے ناقص ہے، بخلاف اسکے یہ کافی طرح سے مکمل ہے۔

سیڈیرونی نے فرینچ اکاڈمی آف سائنس کے سامنے آفتاب کی عمر سے متعلق اپنا یہ خیال ظاہر کیا کہ اسکو جو دین آئے ہوئے بیس لاکھ سال سے بیکر ساٹھ لاکھ سال تک کی مدت ہوئی ہے،

رائل کالج آف سرجنس (لندن) کے سامنے پروفیسر کیتھ نے ایک لکچر کے دوران میں بعض ایسے آلات اور اعضا سے جسم، حجم وغیرہ پیش کئے جن سے اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ ولادت مسیح سے پانچ ہزار سال قبل بھی جراحی اعمال بالبدن کے وہ طریقے رائج تھے جنہیں عصر جدید کا پیداوار سمجھا جاتا ہے، اس زمانہ کے ایک روزنامہ میں ان شراپین دادوہ کے نام تفصیل کے ساتھ ملے ہیں، جنکی دریافت کو زمانہ حال کے فن تیسرے کے ساتھ مخصوص سمجھا جاتا تھا

امریکن فارسٹری میگزین لکھتا ہے کہ برٹش کولمبیا (جنوبی امریکہ میں بعض درخت ایسے دریافت ہوئے ہیں جنہیں شکر پیدا ہوتی ہے، یہ شکر نیم رقیق و نیم جامد مادہ کی شکل میں درخت کی چال سے رستی رہتی ہے، اور تھوڑی دیر میں معمولی شکر کی طرح جم کر خشک اور ٹھوس ہو جاتی ہے یہ شکر ذائقہ میں نہایت شیرین ہوتی ہے، اور اسکی ہر ڈلی ۱۲ انچ سے لیکر ۲۰ انچ تک قطر میں ہوتی ہے، اچھولنے میں ذرا سخت ہوتی ہے، لیکن منہ میں ڈالتے ہی لعاب دہن کے اثر سے اگل جاتی ہے، اور کمانے میں چپکٹی مطلق نہیں، برٹش کولمبیا کے دیسی باشندوں کو اس کا حال ہمیشہ سے معلوم تھا، اور وہ برابر اس سے شیرین کام ہوتے رہے، حکمران طبقہ کو البتہ اب اسکا حال معلوم ہوا ہے،

دنیا میں سب سے زیادہ جسامت کی بڑی تین گھڑیاں (کلاک) امریکہ میں ہیں، ان تینوں میں سب سے بڑی گھڑی جرسی کے گھنٹہ گھر میں نصب ہے، اسکا قطر ۸ فٹ ۸ انچ ہے، اور اسکی بڑی سوئی ۲۰ فٹ طویل ہے، اسکی چھوٹی سوئی کا وزن کئی من ہے، اور اسے روزانہ آدھ میل سے زیادہ کا چکر کاٹنا پڑتا ہے،

شمالی افریقہ کے مارخوار (سانپ کھانے والے) افراد ہر سال اپنی ایک کانفرنس منعقد کرتے رہتے ہیں، اور ہر پانچ سال سے اسکا انعقاد ملتوی تھا، مگر اب چند روز ہوئے اسکا اجلاس ہوا، ابھین سترہ ماہرین فن ٹولس، الجیریا، وغیرہ در دراز مقامات سے آکر شریک ہوئے، جنہیں سے اکثر افراد فریج سپاہ میں سپاہیوں کی حیثیت سے فرانس کی سرزمین پر لڑ چکے تھے، اچھوٹے بڑے چار سو زندہ سانپوں سے زاید فراہم کئے گئے، اور ہر شخص اس امر کا امتحان

دینے بڑا کہ وہ زیادہ سے زیادہ سانپ جلد سے جلد نکل سکتا ہے، امتحان کا طریقہ یہ تھا کہ ہر شخص ایک سانپ کو پکڑ کر اس کے منہ کی طرف سے اپنے منہ میں رکھتا تھا، اور جو نبی اس کی دم غائب ہوتی تھی فوراً اسے باہر کھینچ کر پینکدیتا تھا، اور معاً دوسرا سانپ منہ میں رکھتا تھا، آخر میں جس شخص نے کم سے کم مدت میں چوبیس<sup>(۲۲)</sup> سانپ نکلے، وہ متقی العام قرار پایا، اور اسے بطور تمغہ کے ایک گولہ جبین پتیل کی کیلین اور زنجیرین لگی ہوئی بہتین العام ملا۔

مشہور ماہر طبیعیات سر الیور لاج نے ادہرامریکہ میں متحدہ لکچر دیئے، ان سب کا خلاصہ یہ تھا کہ موت کو انسانی ہستی کے خاتمہ کا مرادف قرار دینا قطعاً غلط ہے، موت کے وقت انسان اپنے جسم خالی کو بے شبہ چھوڑ دیتا ہے، لیکن اس کا جوہر اصلی کسی دوسرے قالب یا شکل میں یقیناً باقی رہتا ہے۔

# اکیس افادات اکبر

درد تو موجود ہے دل میں دوا ہو یا نہ ہو  
 جہوتی ہے شاخ گل کہلتے ہیں غنچے و بدم  
 وجد میں لاتے ہیں جھک بلبلون کے نہ مرنے  
 کر دیا ہو زندگی نے بزم ہستی میں شریک  
 کیوں سول سرج کا آنا روکنا ہی ہم نشین  
 مولوی صاحب نہ چھوڑینگے خدا کو بخش دے  
 ممبری سے آپ پر تو دانش ہو جائیگی  
 معترض کیوں ہو اگر سچے تہیں صیاد دل  
 بندگی حالت سے ظاہر ہی خدا ہو یا نہ ہو  
 بانثر گلشن میں تحریک صبا ہو یا نہ ہو  
 آپ کے نزدیک بامعنی خدا ہو یا نہ ہو  
 اسکا کچھ مقصود کوئی مدعا ہو یا نہ ہو  
 اس میں ہر اک بات آنرز کی شفا ہو یا نہ ہو  
 گھبر ہی لہن کے پولس والے سزا ہو یا نہ ہو  
 تو م کی حالت میں کچھ اس سے جلا ہو یا نہ ہو  
 ایسے گیسو ہوں تو شبہ دام کا ہو یا نہ ہو

حادثے اپنے طریق سے گذرتے ہی ہے  
 صفہ ہستی پر آخر کس قلم کی ہے کشش  
 کھنڈ ہوا البسیا یہ ہم تحقیق کرتے ہی ہے  
 نقش مٹتے ہی ہے لیکن اُبھرتے ہی ہے  
 چشم بددور آپ اپنے گھر سوزتے ہی ہے  
 انتظار آخر اجل سے کر گیا یا نہ ہکنا ر

یہ بات تو کھری ہی ہرگز نہیں ہو کھوٹی  
 لیکن جناب لیڈر یہ شعر سن کے بولے  
 عربی میں نظم ملت ابی اے میر جرنی وٹی  
 بندھو اینگے یہ حضرت اس تو م کو لنگوٹی

اس بات کو خدا ہی لیں خوب جانتا ہے      کسی نظر ہے غائر کسی نظر ہے موتی

جو پوچھا دل سے اس جیسے کا کیا مقصود آنرہی      شکم بولا کہ اسکی بحث کیا بندہ تو حاضر ہے  
شکم کی پیٹھ ٹھونکی نفس تارہ نے خوش ہو کر      صدای باطنی اٹھی کہ یہ کجخت کا فر ہے

اس سے تو اس صدی میں نہیں ہلکے کچھ غرض      سقراط بولے کیا اور ارسطو نے کیا کہا  
بہر خدا جناب یہ دین ہلکوا اطلاع      صاحب کا کیا جواب تھا بابو نے کیا کہا

دین خدا ہے حق کی تجلی کے واسطے      دنیا اٹھی ہے اپنی تعلی کے واسطے  
عارف جو ہیں مہین گے وہ اللہ ہی کے ساتھ      اللہ ہی ہے انکی تسلی کے واسطے

یہ مہمبری کی دہن میں مذہب سے منحرف ہیں  
مسجد میں متحد تھے و دلوں میں مختلف ہیں

گائے کا تو کچھ ٹھکانا بہائی گانہ ہی نے کیا      شیخ جی کا اونٹ کن کن بیٹھتا ہی دیکھئے



## مطبوعات عالیہ

تالیف نچہسرام، ہسرام صوبہ بہار کا نہایت قدیم شہر ہے، جسکو شیر شاہ کے مولد و منشا ہونے کا شرف حاصل ہے، مولوی ابو محمد صاحب مصلح نے اسکی ایک تالیف لکھی ہے جس میں ہسرام کی قدامت، اسکے حکمران خاندان، اسکے آثار قدیمہ، عمارات، مساجد، مقابر اور اوقاف وغیرہ کا تذکرہ کیا ہے، پھر چتیسویں فصل میں ہسرام کے مشائخ، اولیاء اور اسکے بعد اہل قلم، اہل سیف، اور دیگر مشاہیر کے حالات لکھے ہیں، اُنٹالیسویں فصل میں ہسرام کے مناظر طبعیہ کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے، اور بیسویں پر کتاب کی جلد اول ختم ہو گئی ہے اسکے بعد دوسری جلد شروع ہوئی ہے جسکی دو فصلیں اس جلد میں بھی شامل کی گئی ہیں، کتاب کی ترتیب میں مولوی صاحب موصوف نے نہایت محنت، دقت، اور عزت ریزی سے کام لیا ہے، اور تالیف کی مختلف کتابوں کے علاوہ مختلف یادداشتوں، شجروں، نسب ناموں، اور کتبوں سے بھی مدد لی ہے، جس سے کتاب مفصل ہونے کے ساتھ دلچسپ بھی ہو گئی ہے، بہر حال یہ مولوی صاحب موصوف کی پہلی کوشش ہے جسکے لئے وہ داد کے مستحق ہیں، کتاب کی قیمت عمر ہے، اور محمد عبدالرحمن خان محلہ عالم گنج ہسرام (ضلع آگرہ) سے مل سکتی ہے،

شباب اردو - وطن بلندنگ لاہور سے اس نام کا ایک ادبی رسالہ جاری ہوا ہے جسکے ایڈیٹر خان احمد حسین خان بی، اے، آنریری ایڈیٹر خان بہادر شیخ عبدالقادر بی، اے سابق ایڈیٹر مخزن، جوائنٹ ایڈیٹرز خان صاحب شیخ عبدالعزیز بی، اے اور خواجہ دل محمد ایم، اے ہیں اور یہ اسکی ایک ایسی خصوصیت ہے جس میں انبک ہماری زبان کے صرف دو تین

رسالے اسکے شریک ہو سکے ہیں، مضامین کے لحاظ سے پرچہ دلچسپ ہے، اور ظہین بھی عمدہ ہیں، اس میں کبھی کبھی مشاہیر کی تصویریں بھی شامل کی جاتی ہیں، چنانچہ اس پرچہ میں لسان العصر اکبر الہ آبادی کی تصویر شامل کی گئی ہے، قیمت ص ۱۰ سالانہ ہے، اور مذکورہ بالا پتہ سے مل سکتا ہے۔

ادیب، ممالک متوسط کے دارالسلطنت ناگپور سے یہ ایک علمی رسالہ جاری ہوا ہے، جسکے ایڈیٹر مولوی عبدالغنی صاحب الیم، اے (علیگ) ہیں، ہمارے پیش نظر اسکا دوسرا نمبر ہے جو مضامین کے لحاظ سے قابلِ داد ہے، نظم کا حصہ بھی اچھا ہے، چنانچہ اس نمبر میں علامہ شبلی مرحوم کی ایک غزل شائع کی گئی ہے، زبان کے لحاظ سے البتہ کسب قدر صلاح کی ضرورت ہے، جو نہایت آسانی کے ساتھ کیجا سکتی ہے، رسالہ کی قیمت ص ۳ سالانہ ہے جو اسکی ضخامت اور ظاہری محاسن کے لحاظ سے مناسب ہے، پتہ: ادیب، ناگپور۔

تاج، یہ ایک ہفتہ وار اخبار ہے جو جبل پور سے تاج الدین صاحب کی ایڈیٹری میں دوبارہ جاری ہوا ہے، تاج الدین صاحب مذہبی اور قومی تحریکات کے سلسلہ میں عام طور پر شناس ہو چکے ہیں، اسلئے انکا نام لینے کے بعد یہ بتانے کی ضرورت باقی نہیں رہتی کہ یہ پرچہ کس نوعیت اور کس مرتبہ کا ہوگا، اخبار پر قیمت درج نہیں ہے، مذکورہ بالا پتہ سے ملے گا۔

عدد و سوم

ماہ ذیحجہ ۱۳۸۸ مطابق ستمبر ۲۰۰۷ء

جلد ششم

## مضامین

۱۴۹-۱۴۲	شذرات
۱۸۷-۱۷۰	حقیقت علم (نمبر ۶)
۱۹۳-۱۸۸	مصریوں کی مذہبی حالت (نمبر ۲)
۲۱۱-۱۹۴	قرامطہ یمن
۲۱۵-۲۱۲	بگڑا ہوا اسلام
۲۲۴-۲۱۶	عورت اور اسلام
۲۲۷-۲۲۴	روحانیت اور اصول تعلیم
۲۳۶-۲۲۸	اجبار علیہ
۲۳۸-۲۳۷	ادبیات
۲۴۰-۲۳۹	مطبوعات جدیدہ

## جدید مطبوعات

روح الاجتماع، یعنی ڈاکٹر لی بان کی کتاب "جامعات انسانیت" کے اصول نفسیہ کا ترجمہ از مولانا محمد یونس فرنگی محلی، قیمت عا

”پنجر“

## نشتہ

ہندوستان کے لیے ماہ گذشتہ کا اہم ترین حادثہ مسٹر ملک کا انتقال تھا، اپنی سیاسی حیثیت سے قطع نظر کے مسٹر ملک کی علمی زندگی کے بھی ایک بہت بڑے عنصر تھے، وہ سنسکرت زبان کے ماہر اور ہندوؤں کے علوم قدیمہ کے ایک زبردست عالم تھے، قدامت وید کے متعلق انہوں نے جو فاضلانہ مقالہ پہلی اور نیل کانفرنس کے سامنے پیش کیا تھا، اسے مستشرقین کے حلقہ میں خاص وقعت کے ساتھ دیکھا گیا۔ اس کے بعد سے مسٹر ملک نے وہ وگیتا کے متعلق متعدد بلند پایہ تصانیف و مضامین سنسکرت اور انگریزی میں شائع کئے، اور ماہرین فن انکی وسعت نظر و سیر علمی کا ہمیشہ اعتراف کرتے رہے ہندوستان اپنی بزم علمی کے اس مرن رکین کے اٹھ جانے پر جس قدر ہی تاسف کو بجا ہے،

اس پرچہ میں اخبار علیہ کے زیر عنوان داستے کی شش صد سالہ برسی کے اہتمام کا نقشہ ناظرین کی نظر سے گزرے گا، داستے انگلستان کا نہیں، انڈی کا باشندہ تھا، اس کے احسانات انگریزی زبان پر نہیں بلکہ اپنی ملکی زبان پر ہیں، اس کے مذہبی معتقدات اہل انگلستان کے نہیں، اسکی سیاسی تعلیم انگریزی حکومت کی نہیں، اسے نسلی قرابت انگریزی قوم سے حاصل نہیں، لیکن یہ ایہمہ اختلافات آج انگلستان اسکی پرورش کر رہا ہے، اور انگریزی قوم بنایت

انہاںک واپتام اسکی چٹی صد سالہ برسی منانے میں مصروف ہے! اسکے مقابلہ میں فارسی واررد کو اپنی ادبی و قومی زبان ماننے والے براہ کرم یہ فرمائیں، کہ سعدی و حافظ، نظامی و جامی، میر و غالب کی روحوں کے ساتھ انکا کیا سلوک ہے؟ جو قوم اپنے اسلاف کے عقلی و ذہنی، روحانی و اخلاقی ترکہ کو اس درجہ حقیر و ناقابل التفات سمجھتی ہے، اگر فطرت کی عدالت اسکے استحقاق حکومت و امارت کے دعویٰ کو ناقابل التفات سمجھے، تو کون اس فیصلہ کو نامنصفانہ کہہ سکتا ہے؟

مسٹر بی، سی، ارے اسوقت ہندوستان کے سب بڑے ماہر کیا نیات ہیں۔ انہی سائینک عظمت، بیرون ہند کے معاصر علماء و فن کو مستلم ہے، کچھ روز ہوئے لوگوں نے ان سے اصرار کیا کہ وہ اپنے تئیں کونسل میں انتخاب کے اُمیدوار کی حیثیت سے پیش کریں، اس تحریک کے جواب میں پروفیسر موصوف نے الفاظ ذیل ارشاد فرمائے،

”میں سیاسی مسائل سے کافی دلچسپی رکھتا ہوں، لیکن جو وقت تک ملک میں کم از کم تیس ماہرین کیلئے پیدا ہو جائیں، میں میدان سیاست میں قدم نہیں رکھ سکتا۔

ملک میں اسوقت اہل سیاست کا قحط نہیں، بلکہ انکی تعداد ضرورت سے بہت زیادہ ہے، ملک کو اب ضرورت ارباب سیاست کی نہیں، بلکہ سائنس دانوں اور محققین کیلئے ہے۔ اور انہیں کا اسوقت قحط ہے۔ جو وقت تک اس جماعت کی تعداد میں معقول اضافہ نہ ہو لیگا، ہمارے درد کی دوا نہیں ہو سکتی۔ سیاسیات میں بھی کرنے کے بیسوں کام ہیں، لیکن میں اس میں جقدر وقت دوں گا، اسی قدر اپنی مخصوص خدمت علم و فن سے قاصر رہوں گا۔“

میتے ہیں کہ کسی زمانہ میں مسلمان بھی بڑے بڑے مناصب ملکی کو استغناء علم و فن کی قربان گاہ پر نذر چڑھاتے تھے،

جشنیوں کا شمار دنیا کی "خائستہ" و "ستمن" اقوام میں نہیں، اور صدی ڈیڑھ صدی اُدھر تو حیوانات کی طرح علانیہ انکی تجارت ہوتی تھی، اور انکا مقصد حیات صرف یہی ہوتا تھا، کہ مدۃ العمر سفید فام مخلوقات کی غلامی کرتے رہیں۔ اسوقت امریکہ میں انکی تعداد کچھ کم ایک کروڑ ہے، آج سے دس سال پیشتر اس جماعت کے پاس نشر خیالات کا کوئی آلہ نہ تھا، نومبر ۱۹۰۰ء میں اسکے ایک ممتاز رکن ڈاکٹر ڈیو برائیس نے اپنے قومی اغراض و حقوق کے تحفظ کے لیے ایک ماہوار رسالہ کرلیس (The Liberator) جاری کیا، پہلا نمبر ایک ہزار کی تعداد میں شائع ہوا، اور ہاتھوں ہاتھ بک گیا، اسکے بعد سے ہر نمبر کی تعداد اشاعت میں حیرت انگیز اضافہ ہوا، آتا آتا کہ ۱۹۰۰ء کے آخری اعداد کے بموجب اسکے خریداروں کا شمار ۹۰۰،۰۰۰ تک پہنچ چکا ہے! بہتر ہوتا کہ ۳۳ کروڑ آبادی کی "عام و مشترک زبان" میں بکھنے والے جملہ رسائل اپنی اپنی تعداد اشاعت کی مجموعی میزان سامنے لا کر اپنی قوم، اور اس نوخیز و قلیل التعداد قوم کی قدر شناسی صحافت کے درمیانی فاصلہ کی پیمائش کرتے،

مدرس کے نامور ریاضی دان رامانجم کی خبر وفات کسی پچھلے معارف میں درج ہو چکی ہے یورپ کے اعلیٰ علمی رسائل مدت تک انکے ماتم میں سوگوار رہے، اور متعدد ماہرین فن کے قلم نے اس حادثہ عظیم پر علم و فن کی جانب سے فریضہ تعزیت ادا کیا، کیسب درج یونیورسٹی کے مشہور پروفیسر جی، ایچ، ہارڈی نے سائٹلک ہفتہ وار نیچر میں جو تعزیتی

شائع کیا ہے، اس میں بار بار اس قسم کے فقرہ ملتے ہیں ”یہ بالکل یقینی ہے، کہ مرحوم کی مہند سائنس فیصلت اعلیٰ ترین پایہ کی تھی، اور وہ ایک بالکل استثنائی قوت فکر و اجتہاد کا شخص تھا“ اُس کے تقریباً بیس مقالات شائع ہوئے، جنہوں نے زمانہ جنگ ہی میں تمام دنیا سے ریاضیات کو اپنی جانب متوجہ کر لیا۔ اُس کے پیش نظر صرف وہ مسائل تھے، جن تک محدود ہے چند افراد کی رسائی ہو سکتی ہے۔“ ”اسکی قوت استنباط بالکل حیرت انگیز تھی، جبکی کوئی نظیر کسی یورپین ریاضی دان میں میری نظر سے آج تک نہیں گزری۔“ ”اس نوعمری میں وہ جتنے کارنامہ چھوڑ گیا، وہ عجیب و غریب ہیں، اور آج سے بیس سال کے بعد عجیب تر معلوم ہونگے۔“

لیکن مرنے والے کے کمالات فن سے کہیں زیادہ عجیب یہ واقعہ ہے، کہ ایک غریب ایشیائی کی وفات کے متعلق ”عالی دماغ“ و ”سمین“ یورپ کے اکابر فن کو اس قسم کے الفاظ استعمال کرنا پڑے! ع سوزندگی نثار ہوں اس ایک موت پر،

کلکتہ کے ایک انگریزی تعلیمی معاصر نے فرزند ان ہند کے اُن مضامین و مقالات کی فہرست شائع کی ہے، جو ادھر چار پانچ سال کے عرصہ میں انگلستان و امریکہ کے بلند ترین سائنٹفک رسائل فزیکل ریویو، فلاسوفیکل میگزین، وغیرہ میں مسایل طبیعیات کے متعلق شائع ہوئے ہیں۔ اس پایہ کے مجتہدانہ مقالات تعداد میں پندرہ ہیں، جبکہ مصنفین کلکتہ دلاہور، کھنڈو بھارس، کے ذوالالان وطن ہیں (جن میں بیشتر حصہ فرزند ان بنگال کا ہے) لیکن اس سلسلہ میں قابل ذکر بات صرف اتنی ہے، کہ مقالہ نگار ردن کی اس ساری جماعت میں ابوبھکان دھارابی، موسیٰ وجاہر، طوسی و قطب الدین رازی کے کسی ہم قوم کا نام نہیں،

مغرب کو مشرق سے جو بیگانگی و مغایرت قائم ہے، اس میں تنہا ”انہیں“ کا قصور نہیں، بلکہ ہماری خطا بھی شامل ہے، حکمران و فاتح اقوام سے یہ توقع رکھنا کہ وہ محکوم و مغلوب اقوام کی اصلی زندگی سے صحیح واقفیت پیدا کرینگے، سرشت انسانی کے متعلق ایک ناقابل عمل خوش فہمی قائم کر لے، دراصل یہ فرض ہمارا تھا، کہ ہم اپنے علوم و فنون، تہذیب و تمدن، افکار و خیالات، جذبات و معتقدات، کے ایک ایک جزئیہ سے انہیں آگاہ کرتے۔ اور جن آنکھوں پر سخت و رعوت، امارت و حکومت کے پردے پڑے ہوئے ہیں، ان کے یہ حجابات دور کرنے کی اپنے ہاتھوں سے بار بار کوشش کرتے، لیکن فہم سے ہے، کہ ارشاد و ہدایت، تبلیغ و دعوت کے اس مقدس فرض سے برابر غفلت برتی جاتی رہی، اور یہ اسی کا خیا زہ ہے، جو آج مختلف مصلاب کی شکل میں تمام عالم اسلامی پر نازل ہو رہا ہے۔ تاہم غنیمت ہے، کہ ہجوم مصائب مسلمانان ہند میں اس ضرورت کا کچھ احساس پیدا کر چلا ہے۔ چنانچہ کچھ عرصہ سے لندن سے جو ہفتہ وار پرچہ ”مسلم ووٹ لک“ نکلا شروع ہوا ہے، وہ اسی احساس کا اعلیٰ نتیجہ ہے، مسلمانوں کی جو ضروریات ہیں، انکے لحاظ سے اگرچہ یہ پرچہ بالکل ناکافی ہے، پھر بھی کچھ نہ ہونے سے اسکا ہونا بہر حال بہتر ہے، و فد خلافت کی کارگزاریاں، دشمنان خلافت کی سرگرمیاں، ترکی کے متعلق عام معلومات کا اندراج اور پرتبصرہ، اسکا خاص موضوع ہے، اور یہ مقصد اسوقت یہ کامیابی کے ساتھ پورا کر رہا ہے،

انصافی ہوگی اگر اس سلسلہ میں خواجہ کمال الدین صاحب کی خدمات کو نظر انداز کر دیا جائے۔ مواعظ و خطبات سے قطع نظر کر کے مخالفین کے مرکز میں سکونت اختیار



کر کے اپنے ماہوار رسالہ اسلامک ریویو کے ذریعہ سے جواہم وعظیم انشان خدمت وہ انجام  
 لے رہے ہیں، وہ دور حاضرہ میں اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل بے نظیر ہے، اس سالہ کا  
 مشن خالصہ مذہبی ہے جو دنیوی اغراض کے شائبہ سے بھی پاک ہے۔ اور اسکے بعض  
 معنائین اس پایہ کے ہوتے ہیں کہ بلا تکلف یورپ کے اعلیٰ علمی رسائل میں جگہ پا سکتے  
 ہیں، مسلمانان ہند کے لیے یہ امر اور زیادہ باعث مسرت ہے، کہ یہ سعادت بجا  
 باشندگان ممالک اسلامیہ کے، انہیں کے ایک ہموطن کے نصیب میں آئی،

”ترک موالات“ کی تحریک چند ماہ سے بڑی سرگرمی کے ساتھ ہو رہی ہے، اور  
 بعض حلقوں میں اسپر عمل ہی شروع ہو گیا ہے، اسکے سیاسی پہلوؤں پر گفتگو کرنا ہمارے  
 موضوع سے خارج ہے، لیکن اصولی حیثیت سے یہ عرض کر دینا ضروری ہے، کہ اب تک  
 اسکا جو پروگرام (نقشہ عمل) ملک کے سامنے پیش کیا گیا ہے، وہ بہت ہی سطحی اور سرسری  
 ہے۔ اصل یہ ہے کہ خالص مادی و سیاسی ذرائع سے ہمارے اصلاح حال کی جتنی کوششیں  
 ہونگی، بالآخر سب ناکام ثابت ہونگی حقیقی ضرورت اسکی ہر کہ نہ اصلاح بین روحانی و  
 اخلاقی اجزاء کی آمیزش کافی تعداد میں رکھی جائے، گاندھی صاحب کی مقدس شخصیت سے  
 توقع تھی کہ وہ اس اہم نکتہ کو ضرور ملحوظ رکھیں گے، لیکن حیرت و حسرت کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ  
 اس باب میں انکی ذات بھی مایوس کن ثابت ہوئی۔ خطابات کی دلپسی، اعزازات سے  
 دست برداری، ملازمت سے استعفاء وغیرہ مراتب مجوزہ سے سیاسی فوائد جو کچھ بھی حاصل  
 ہوں، لیکن ان میں سے کوئی شے ہمارے درد کا درمان نہیں ہو سکتی، تا وقتیکہ اس اندرونی

زندگی کی اصلاح نہ ہو، جو اب تک تمام مفاسد کی اصل و بنیاد رہی ہے۔ زخم کوا و پر سے خشک کرنے کی کوشش قطعاً بیہود رہے گی، جب تک اندر سے اسکا اند مال نہو، اور مادہ فاسد دفع ہو کر مزاج اپنی طبعی حالت پر نہ آجائے،

دست بردار ضرور ہونا چاہیے، مگر کس شے سے؟ جب جاہ اور خواہش نام و نمود سے، ترک یقیناً کرنا چاہیے؟ مگر کیا چیز؟ کذب و نارہتی، مکر و ریاکاری، استغفار قطعاً داخل کرنا چاہیے، مگر کس چیز سے؟ زر پرستی و طمع دنیوی سے، تاہم ضرور ہونا چاہیے، مگر کس شے سے؟ نفس پرستی اور جذبات کی غلامی سے، درحقیقت واپسی کے قابل محض کسی مخصوص قوم کی دی ہوئی مخصوص عزت نہیں، بلکہ نفس مغربی تمدن ہے اور اسکے پھیلانے ہوئے امراض اخلاقی و روحانی، مثلاً نخوت و رعوت، حرص و طمع، درپرستی و زن مری، نفاق اور ڈپلومیسی، اسراف و نمائش، شقاوت و بید روی، آوارگی و عصمت فروشی، مے نوشی و قمار بازی، اور خود غرضی و خود پرستی۔ حق پرستوں کی زبان پر یہ شکوہ نہ ہونا چاہیے، کہ ہمارے قبضہ سے فلان فلان ملک نکلا جا رہا ہے، بلکہ ماتم اسکا ہونا چاہیے کہ ہمارے اخلاق و عقاید ہماری عصمت و شرافت، ہماری خودداری و خدا ترسی، ہماری قناعت و دیانت، ہمارا صبر و استقلال، ہمارا خلوص و ایثار، اور ہماری لہیت و روحانیت، ہم سے رخصت ہوئی جا رہی ہے یہی وہ نکتہ ہے، جسے لسان العصر حضرت اکبر اپنی زبان میں یوں ادا کرتے ہیں۔

ثواب جب ہو کر ناخوش ہلوس بنا پاتم      دلون کو طاعت حق سہیہ دور کرتے ہیں  
نذیکہ عیش بن میری ہین یہ خلل انداز      ہین ضعیف سمجھ کر غرور کرتے ہیں

غلط فہمی نہ ہونا چاہیے۔ یہ جو کچھ کہا گیا، اس سے متحرک مہلات کے مجوزہ نقشہ و عمل کی مخالفت ہرگز مقصود نہیں، اور نہ ہمیں اس تجویز سے نفیاً یا اثباتاً کوئی سروکار ہے، البتہ اپنے ضمیر اور اپنی بصیرت کے مطابق جو صورت اصلاح قوم کے متعلق بہتر معلوم ہوئی اسکی جانب متوجہ کر دیا گیا زمانہ خود اسکا فیصلہ کر دے گا، کہ آخری فوز و فلاح کی بہترین صورت کیا ہو آ یا مادیت و ظاہر پرستی کی وہ راہ، جس پر یورپ دامر کیا اور انکی تقلید میں ایشیاء کے بھی مصلحین و رہبران قوم عموماً چل رہے ہیں، یا اصلاح باطن، تزکیہ نفس و صفائے روح کا وہ مسلک جس کی ہدایت جملہ انبیاء کرام، جملہ بانیان مذاہب، جملہ عارفان حق، اور جملہ ائمہ اخلاق شروع سے آج تک کرتے آئے ہیں،

# مقالات

## حقیقتِ علم

(۶)

(از مولانا محمد یونس فزنگی علی)

یہ تین صورتیں قانونِ ایتلافِ ذہنی کی ہیں، اور ان سب صورتوں میں مشترک یہ ہے کہ بعض مخصوص اشیاء یا مفاہیم کو دوسری بعض مخصوص اشیاء اور مفاہیم کے ساتھ ایک ایسا گہرہ تخصیصی تعلق ہوتا ہے کہ جب اول الذکر اشیاء یا مفاہیم کا تصور ہم کرتے ہیں تو ان کے ساتھ آخر الذکر اشیاء یا مفاہیم کا تصور بھی ہمارے ذہن میں ضرور پیدا ہوتا ہے، لیکن اب باقی رہی یہ بات کہ علاقہ مقارنت، علاقہ مماثلت، اور علاقہ تضاد کی خود حقیقت کیا ہے، اور ذہن میں یہ تصورات کس طرح اور کس بنا پر پیدا ہوتے ہیں، اس کے بیان کرنا کیا یہ محل نہیں، البتہ یہ ضرور ہے کہ مرکب تصورات کی پیدائش ذہن میں انہی اصولِ ثلثہ کی بنا پر ہوتی ہے، لیکن اگر ان قوانین کی مزید تفصیل اور شواہد درکار ہوں تو پروفیسر بین کی کتاب ”مطالعہ ذہن“ اور ہربرٹ اسپنسر کی کتاب ”اصول علم النفس“ کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

تصور کی غلطیاں اور ان کے اسباب (۳۳) (۱) تصور کی غلطی کا ایک بڑا سبب یہ ہوتا ہے کہ جس طرح ہم اپنے

احساس اور اس شے کے مابین فرق نہیں کرتے، جس نے یہ حس ہمارے ذہن میں پیدا کیا ہے، اسی طرح ہم اپنے ذہنی تصور میں اور اس شے میں بھی اکثر فرق نہیں کرتے ہیں، جس کا یہ تصور ہے، تصور کے متعلق یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ جس طرح احساس اور وہ شے جو احساس پیدا کرتی ہے

دو دنوں علاحدہ علیحدہ چیزیں ہیں، اسی طرح تصور ذہنی اور دہشتے جیسا کہ یہ تصور ذہنی ہے، یہ دونوں بھی الگ الگ چیزیں ہوتی ہیں، مین نے لکھنؤ میں اصف الدولہ کا امام باڑہ دیکھا تھا، اب جید آباد میں میٹکرمین لکھنؤ کے امام باڑہ کا تصور کر رہا ہوں تو وہ امام باڑہ جو میرے تصور میں ہے، اور وہ امام باڑہ جو خارج میں موجود ہے، یہ دونوں الگ چیزیں ہیں، جو امام باڑہ میرے ذہن میں ہے وہ ایک ذہنی کیفیت ہے اور جو خارج میں ہے وہ ایک موجود واقعی ہے، اسی طرح جو آوازیں نے کل سُنی تھی اگر مین آج اسکا تصور کر دوں تو اسکا مطلب یہ نہونا چاہیئے کہ آواز کا یہ تصور جو میرے ذہن میں ہے یہ دہی آواز ہے جو مین نے کل سُنی تھی، اکل والی آواز خارج میں فنا ہو گئی۔

حقیقت یہ ہے کہ جیسا کہ تصور کی تعریف سے معلوم ہو چکا ہے، تصور ایک ذہنی کیفیت ہے جو غیر مٹی اشیاء کو نفس کے سامنے مٹی صورت میں ظاہر کرتی ہے، لیکن وہ چیزیں جیسا کہ تصور کرتے ہیں کسی طرح کی ہوتی ہیں، بعض چیزیں وہ ہیں جو خارج میں بالفعل موجود ہیں خواہ وہ محسوس دمرئی ہوتی ہوں یا غیر محسوس وغیرہ مٹی ہوں، مثلاً آفتاب کہ وہ محسوس دمرئی ہوتا ہے اور بالفعل موجود بھی ہے، لیکن مثلاً خدا اور فرشتے وغیرہ کہ یہ خارج میں بالفعل موجود تو ہیں مگر محسوس دمرئی نہیں ہوتے ہیں، دوسری چیزیں وہ ہیں جو بالفعل غائب یعنی غیر موجود ہیں خواہ یہ چیزیں ایسی ہوں کہ اُن کا وجود نہ کبھی ہوا اور نہ ہو سکتا ہے، مثلاً ہوت پریت یا عنقا اور رنج وغیرہ یا ایسی ہوں کہ جنکا وجود ہو چکا ہو، اور اب غیر موجود ہوں مثلاً وہ آواز جو مین نے کل سُنی تھی یا وہ غذا جو کل مین نے کھائی تھی یا وہ لوگ جو مر گئے ہیں اور یا یہ چیزیں ایسی ہوں کہ جو آئندہ موجود نہ ہوں گی مثلاً وہ جنہیں جواب پیدا ہو گا یا وہ پھول جو آئندہ موسم باران میں کہلیگا، غرض یہی چار پانچ طرح کی چیزیں ہیں جنکا ہم تصور کرتے ہیں ان میں سے اول الذکر قسم کی چیزیں یعنی وہ جو موجود بالفعل ہیں محسوس دمرئی ہوتی ہوں یا غیر محسوس وغیرہ مٹی ہوں ظاہر ہے کہ انکا وہ تصور جو ہمارے ذہن میں ہوتا ہے اسکو ان چیزوں کے وجود ظاہری

کوئی نسبت نہیں ہوتی، ہمارے تصورات ہماری ذہنی کیفیتیں ہیں، اور یہ چیزیں خارج میں موجود ہوتی ہیں، اسی طرح وہ چیزیں جنکا وجود خارج میں اتناک نہ ہوا ہے اور نہ ہو سکتا ہے، ان کا تصور بھی خود ان چیزوں سے مختلف ہوتا ہے، اگرچہ یہ صحیح ہے کہ ان چیزوں کا وجود زیادہ تر خود ہمارے تصور پر مبنی ہو کرتا ہے، لیکن ہوت کا وہ تصور جو میرے ذہن میں ہے، اور وہ خیالی تصویر جو کسی کبھی مجھے نظر پڑتی ہے، دونوں چیزیں ایک نہیں ہو سکتیں، یہ تصور ایک نئی کیفیت ہے اور خارج میں جو تصویر مجھے نظر پڑتی ہے وہ ذہنی کیفیت نہیں بلکہ ذہن کی پیدا کردہ تصویر ہے اسی طرح وہ چیزیں جو موجود ہو چکی ہیں یا وہ جو آئندہ پائی جائیگی ان کے تصور بھی خود ان چیزوں سے مختلف ہوتے ہیں محال یہ کہ حتمی چیزیں ہیں یا خود تصور کی پیدائش کی باعث ہوتی ہیں یا خود تصور کی پیدا کردہ ہوتی ہیں مگر خود تصور نہیں ہوتا تصور کی تیوری میں یہ نکتہ گوبادی انظر میں اہم نہیں معلوم ہوتا لیکن اسی نکتہ کے فراموش کرنے کے باعث قدامائے اپنے فلسفہ کی یہ عجیب و غریب بنا قرار دی گئی کہ جو چیز تصور میں آسکتی ہے وہ خارج میں ضرور موجود ہے نیز یہ کہ جن دو چیزوں کا تصور متنازع صورت میں ہوتا ہے وہ وجود خارجی میں بھی اسی امتیاز کی شان کے ساتھ علیحدہ علیحدہ پائی جاتی ہیں، یہی دو اصول حقے جنکی باعث قداماء کا فلسفہ الفاظ اور تصور کے گورکھ دھڑے میں ہمیشہ ہنسار ہا، اور کبھی الفاظ اور ہمہ تصورات کی بھول بھلیان سے باہر نہ نکل سکا، غرض تصور کی تیوری میں یہ ایک نہایت اہم نکتہ ہے جسکو ملحوظ رکھنے سے ہم فلسفہ کے بیشمار مخالطات سے اپنے تئیں محفوظ رکھ سکتے ہیں

(۳۴) تصور کی غلطی کا دوسرا سبب | لیکن تصورات کی غلطی کا دوسرا بڑا سبب یہ ہوتا ہے کہ چونکہ ہمارے تصور کے حدود بے انتہا وسیع ہیں اسلئے ہمارے تصورات میں بڑا حصہ ان معلومات کا ہوتا ہے جو خود ہمارے ذہن کے پیدا کردہ ہوتے ہیں، پس حروف تصور مطلق العنان ہو جاتا ہے تو وہ ان اشیاء کو بھی مرئی صورت میں لاکر ہمارے سامنے پیش کرتا ہے جنکا وجود عادیہ محال ہے یا جنکا وجود قوانین فطرت کے خلاف ہے یا جنکا وجود ہمارے استقرائے تام کے خلاف ہے یا جنکا وجود قانون

علیت کے منافی ہے مثلاً یہ ایک قانون فطرت ہے کہ حیوانات (جہن انسان بھی شامل ہے) بلا غذا کے زندہ نہیں رہ سکتے، لیکن ہمارا ذہن ان افراد و اشخاص کا بھی تصور کر سکتا ہے جو بلا غذا زندہ رہتے ہوں یا مثلاً یہ ایک قانون فطرت یا استقرار نام ہے کہ کوئی مادی چیز ہوا میں معلق نہیں رہ سکتی، لیکن ہم ایک ایسے تابوت کا تصور کر سکتے ہیں جو ہوا میں معلق رہتا ہے یا مثلاً ایک ایسے جانور نظر نہیں پڑے جسکی ٹانگیں چار پالیوں کی سی اور چہرہ انسان کا سا ہو مگر ہم اس قسم کے جانور دن کا تصور کر سکتے ہیں، ہمارے تجربہ حسی میں کبھی ایسا درخت نہیں آیا جسکے پتے ہاتھی کے کان کے برابر ہوں، مگر ہمارا ذہن اس قسم کے درخت کا تصور کرنے میں مشاق ہے، لیکن کیا ہمارا تصور ان چیزوں کا وجود خارجی تسلیم کرنے میں حق بجانب ہے؟ اگر ہم اپنے دل سے یہ سوال کریں تو یقیناً ہم اسکا جواب نفی میں پائیں گے، لیکن اگر کوئی شخص ان تمام تصورات پر ایمان رکھتا ہے تو محض اس بنا پر کہ وہ یہ سمجھتا ہے کہ جس چیز کا تصور ہمارے ذہن میں پیدا ہوتا ہے ضرور ہے کہ اسکا وجود خارج میں بھی اسی طرح ہو، حالانکہ ہم اوپر بتا چکے ہیں کہ یہ کوئی ضروری نہیں کہ جس چیز کا تصور ہمارے ذہن میں پیدا ہو وہ اسی طرح خارج میں بھی موجود ہو، اعمال تصور کی تجدید کے بیان میں یہ معلوم ہو چکا ہے کہ عمل تخلیط سے جو تصورات پیدا ہوتے ہیں اسکا وجود خارج میں اس خلوط شکل میں نہیں ہوتا نیز یہ کہ جتنے تصورات ہمارے ذہن میں ان چیزوں کے پیدا ہوتے ہیں جو خارج میں موجود نہیں ہیں بلکہ جنکا خارج میں پایا جانا محال ہے، انکی پیدائش زیادہ تر عمل تخلیط کی بنا پر ہوتی ہے اور ان تصورات کا ہمارے اوپر بعض وقت ایسا استیلا ہو جاتا ہے کہ ہم انکو موجود واقعی سمجھنے لگتے ہیں پس ہمیشہ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ہر تصور واقعی نہیں ہوتا بلکہ جو تصور بقناداتہ خارجی کے مطابق ہوگا اسی قدر وہ زیادہ صحیح ہوگا، اس اصول کو ہم نے اوپر اس طرح بیان کیا تھا کہ جب کسی تصور کی واقعی حقیقت اور اہمیت دریافت کرنا ہو تو اسکو تحلیل کر کے احساس کے مرتبہ تک لانا چاہیے یعنی یہ دریافت

کرنا چاہیے کہ یہ تصور کس احساس کی بنا پر پیدا ہوا ہے، اور صحت و غلطی میں اس احساس کا کیا مرتبہ حاصل ہے کہ اکثر ہمارے تصورات میں غلطی کا باعث یہ ہوتا ہے کہ انکو محسوسات یا احساسات سے مطابق کر کے نہیں دیکھا جاتا، بلکہ محض تصور کی شہادت کو ایمان کی بناء قرار دیا جاتا ہے، لیکن اگر تصور کے ایک ایک زمینہ میں یہ بات اچھی طرح جانچ لی جائے کہ ہمارا تصور کس احساس کی بنا پر پیدا ہوا ہے اور اس احساس کا صحت و غلطی کے لحاظ سے کیا مرتبہ ہے تو ہمارے تصور میں کبھی غلطی واقع نہ ہو، یہ دوسرا اہم نکتہ ہے جسکو فراموش کرنے سے قدما و فلاسفہ نے اپنے قیاسات اور دلائل کو محض عقلی تخمینات کے درجہ تک پہنچا دیا اور فلسفہ کی وہ اساس اور بنا مضبوط ہو گئی جسکو مصطلح میں استدلال ذہنی یا سبکدوشیٹھ کہا جاتا ہے، فلسفہ کے اس اصول کی تشریح چونکہ بے موقع ہے

لہٰذا فلسفیانہ براہین و دلائل کے ہوتے ہیں، براہین ذہنی اور براہین واقعی یعنی سبکدوشیٹھ اور ایکٹیوٹیٹھ ان دونوں کی حقیقت کی تشریح امریکن فلسفی لوئیس نے جو مشہور تاریخ فلسفہ کا مصنف ہے نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کی ہے جو اسی کے ادراک سے درج ذیل ہے،

اشیاء خارجیہ اور انکے تصورات کے مابین مطابقت پیدا کرنا استدلال کی اصل غرض ہے لیکن استدلال کی شکل و طرح کی ہوتی ہے، اول یہ کہ استدلال کی ہر منزل میں تصورات ذہنی کو اشیاء خارجیہ کے قدم بقدم اس طرح ترتیب دینا کہ استدلال کی ہر منزل میں تصورات مطلق العنان نہ ہو سکیں، بلکہ اشیاء خارجیہ پر براہین مطبق ہوتے رہیں، دوسرا طرز یہ ہے کہ استدلال کے مقدمات کو اس طرح ترتیب دینا کہ بجائے اسکے کہ تصورات کا انطباق اشیاء خارجیہ پر ہوتا ہو خود تصورات پر مطبق ہوتے ہوں، بات یہ ہے کہ جن اشیاء کا احساس نفس کو ہوتا ہے انکے باہمی تعلقات کا تو احساس ہوتا نہیں بلکہ تعلقات کے اس فلا کو اپنے قیاس کے ذریعہ سے پرکرا ہوتا ہے، اسلئے فکر کرتے وقت دو حرکتیں نفس میں پیدا ہوتی ہیں ایک نقل سے قیاس تک اور دوسری قیاس سے تصدیق و اذعان تک، لیکن استدلال ذہنی میں نفس نقل سے قیاس تک جا کر رک جاتا ہے، بخلاف استدلال واقعی کے کہ اسکا براہین (بقیہ بر صفحہ آئینہ)



اسلئے ہم اس بحث کو زیادہ طول دینا نہیں چاہتے، اس جانب صرف اشارہ کر دیا ہے تاکہ دانفکار ناظرین حقیقت علم کے ضمن میں فلاسفہ مستقدمین کے مخالطات سے بھی واقف ہوتے جائیں۔

یہ تصور کی غلطیوں اور انکے اسباب کی اجمالی تشریح ہے، چونکہ ہر اس مضمون میں صرف علم کے بسیط اقسام سے بحث کرنا ہے اسلئے ہم تصور کی پیچیدہ غلطیوں اور انکے اسباب سے بیان پر بحث کرنا نہیں چاہتے، تصور کی غلطیوں کی بحث نفسیات میں نہایت معرکہ آرا اور طول طویل بحث ہے جبکہ تفصیل کے لئے دفتر کے دفتر درکار ہیں، اب ہم تصور کی حقیقت اسکی وسعت اسکے حدود اور اسکی غلطیوں سے بالاجمال بحث کر نیکے بعد علم کے تیسرے مرتبہ تجرید ذہنی سے بحث کرتے ہیں۔

(۳۵) تجرید ذہنی یا عقل کی غرض اور غرضت | ہم نے اوپر بیان کیا ہے کہ علم کے تین مدارج ہیں، احساس اور احساس تصور سے اس کا تعلق بسیط، تصور اور تجرید ذہنی یا عقل، یہاں ہماری مراد تجرید ذہنی سے

(بقیہ صفحہ گذشتہ) تصدیق و اذعان ہے، پس استدلال واقعی اس حرکت ذہنی پر جو استدلال ذہنی میں بھی پائی جاتی ہے، اسی طرح مشتمل ہوتا ہے جس طرح سائنس بالحد الطبیعیات کے اصول و مباحث پر سائنس دان اور فلسفی دونوں عقل اور قیاس سے برابر کام لیتے ہیں، لیکن سائنس دانوں کے دلائل چونکہ زیادہ نزواتات خارجی کے مطابق ہوا کرتے ہیں اسلئے وہ اپنے قیاسات کو واقعات خارجی پر منطبق کر کے استدلال کی ہر منزل میں تصدیق و اذعان کے پیداکوئی بھی کوشش کرتے ہیں، بخلاف ایک فلسفی کے کہ چونکہ اسکے استدلالات اسکے تصورات ذہنی پر مبنی ہوا کرتے ہیں، اسلئے وہ تصدیق و اذعان چھل کرنے کی اتنی پرواہ نہیں کرتا، چھل یہ کہ ان دونوں طرز استدلال میں فرق صرف اس قدر ہے کہ استدلال واقعی اشیا کی باہمی خارجی نسبتوں اور تعلقات پر مبنی ہوتا ہے، اور استدلال ذہنی کو اشیا کی خارجی نسبتوں سے بحث نہیں ہوتی بلکہ اسکی بناء تصورات کی ذہنی نسبتوں پر ہوتی ہے۔

وہ ذہنی عمل نہیں ہے جو عمل تخلیط و تحلیل کا مقابل اور قسیم ہے بلکہ بیان تجرید ذہنی سے علم کا ایک خاص درجہ مراد ہے جو ذہنی قوانین کی بنا پر احساس اور تصور کے حاصل کردہ معلومات میں اضافہ کرتا ہے، احساس و تصور کی متنازع خصوصیت یہ تھی کہ اُن کا تعلق زیادہ تر جزئیات سے تھا، بخلاف تجرید ذہنی یا تعقل کے کہ اس کا تعلق جزئیات سے نہیں بلکہ کلیات سے ہے، یعنی احساس و تصور سے صرف افراد جزئیہ مثلاً زید عمر و دیگر وغیرہ کا علم حاصل کیا جاتا تھا، لیکن تجرید ذہنی یا تعقل میں اگر اس سے آگے ترقی ہوتی ہے اور بیان وہ اعلیٰ معلومات حاصل کئے جاتے ہیں جن کا خارج میں کہیں نام و نشان نہیں ہوتا، احساس و تصور میں ہر کو خاص خاص موجودات خارجی کا علم ہوتا تھا، ہم جن چیزوں کو اپنے حواس سے محسوس کرتے تھے اُنکے متعلق نفس میں کیفیت حسی پیدا ہوتی تھی یا جو چیزیں اس وقت ہمارے حاسہ کے سامنے نہیں ہیں وہ مرئی صورت میں ہمارے ذہن کے سامنے پیش کیجاتی تھیں لیکن تعقل کے مرتبہ میں اگر اب احساس کی حد ختم ہوگئی، اب نفس ان محسوسات کو جمع کر کے اُنسے ایک حقیقت کلیہ اخذ کرتا ہے اب بیان اُسکو زید عمر و دیگر سے مطلب نہیں بلکہ اب وہ خود انسان کا علم حاصل کرتا ہے، اب اُسکو قانون جذب و کشش یا قانون حرکت یا قانون عدم فنا، مادہ سے بحث نہیں بلکہ اب وہ ایک عالمگیر نیچر، کل حقیقت کی جستجو کرتا ہے، غرض تعقل کو احساس و تصور کی طرح جزئیات سے کوئی بحث نہیں ہوتی بلکہ اس مرتبہ میں حاصل شدہ جزئیات سے کلیات کا علم حاصل کیا جاتا ہے، پس اس پوری تقریر سے معلوم ہوا کہ احساس اور تصور دونوں بیان میں سے کوئی ایک تعقل کا مواد فراہم کرتے ہیں۔

کلیات کے وجود کے متعلق مختلف (۳۶) لیکن قبل اسکے کہ ہم تعقل کی حقیقت کی تشریح کریں یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اجمالاً اس بات سے بھی آگاہ کردین کہ کلیات کے وجود کے

متعلق فلاسفہ نے کیا مذاہب اختیار کئے ہیں؟ یہ ظاہر ہے کہ ہماری زبان میں جتنے موضوع

الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں ان کا کوئی نہ کوئی مصداق خارج میں ضرور ہوتا ہے خواہ یہ مصداق کوئی ذات ہو مثلاً زید عمر و بکر، گھوڑا اور گاڑی وغیرہ یا کوئی صفت ہو مثلاً شجاعت، اتحاد وغیرہ یا کوئی عرض ہو مثلاً سیاہی پمیدی وغیرہ یا کوئی مقدار و وزن ہو جیسے چار پانچ وغیرہ یا کوئی لفظ انسانیہ ہوں، مثلاً احساس، تصور، محبت وغیرہ غرض جتنے الفاظ مستعمل ہوتے ہیں ان کا کوئی نہ کوئی مصداق ضرور ہوتا ہے لیکن یہ الفاظ دو طرح کے ہوتے ہیں، بعض الفاظ تو وہ ہیں جن کے مصداقات جزئیات خارجیہ ہیں مثلاً یہ گھوڑا وہ ہاتھی، زید، عمر و بکر وغیرہ، اور بعض الفاظ وہ ہیں جن کے مصداقیات ایک یا چند جزئیات خارجیہ نہیں ہیں بلکہ وہ خارج میں بہت سے جزئیات پر مصداق آتے ہیں، مثلاً نوع انسان وغیرہ، پہلی قسم کے الفاظ کو جن کا مصداق خارج میں مخصوص مخصوص جزئیات پر ہوتا ہے، الفاظ جزئیہ کہتے ہیں اور دوسرے قسم کے الفاظ کو کلیات تو اب سوال یہ ہے کہ جزئیات کے مصداقات تو ظاہر ہے کہ خارج میں موجود ہوتے ہیں لیکن آیا اسی طرح کلیات کے مصداقات بھی خارج میں یا ذہن میں موجود ہیں یا نہیں۔

یہ پہل بحث ہے جو تصورات کلیہ کے متعلق ماہ النزاع ہے، تصورات کے وجود کے متعلق

فلاسفہ کے مختلف خیالات ہیں،

(۳۷) ریلیزم یا غرضیت (۱)، قدامت اکسب سے پہلا خیال یہ تھا کہ ہر لفظ کا ایک مصداق خارج میں

ضرور ہوتا ہے جس طرح زید کا اطلاق اس ذات پر ہوتا ہے جو خارج میں موجود اور مشاہد و مرئی ہے اسی طرح انسان کا اطلاق بھی ایک خاص شے پر ہوتا ہے جو خارج میں موجود ہے اور انسان کے تمام افراد میں مشترک طور پر پائی جاتی ہے، البتہ فرق یہ ہے کہ زید کے مصداق کا علم ہم کو اس سے ہوتا ہے، لیکن انسان کے مصداق کا علم جو اس سے نہیں بلکہ عقل سے ہوتا ہے پھر اس قسم کے عقلی مصداقات صرف انہی الفاظ کے ساتھ خاص نہیں ہوتے جن کا اطلاق بالاشتراك بہت سے

افراد پر ہوتا ہے بلکہ اس قسم کے مصداقات عقلی ہر اس لفظ کے مقابل میں بھی ہوتے ہیں جبکہ اطلاق کسی ذات پر ہوتا ہو مثلاً جس طرح لفظ انسان ہے کہ اسکا ایک مصداق عقلی ہے، جبکہ عقل عقل کرتی ہے اسی طرح لفظ زید کے بھی دو مصداق ہیں، ایک مصداق تو وہی ذات ہے جو خارج میں شاہد ہوتی ہے اور دوسری وہ ذات ہے جسکا وجود عقلی ہے اور جسکا ادراک عقل کرتی ہے، غرض ہر لفظ کے دو مصداق ہوتے ہیں ایک ان میں سے شاہد و مرئی ہوتا ہے اور دوسرا غیر شاہد اور عقل سے ادراک کیا جاتا ہے اسی دوسری قسم کے عقلی مصداق کو کلیات کہتے ہیں یہ کلیات بھی خارج میں اُسی طرح موجود ہیں جطرح جزئیات لیکن کلیات جزئیات سے اشرف ہیں کیونکہ کلیات اصل اور جزئیات اسکے پر تو ہیں، نیز کلیات کا وجود بھی جزئیات کے وجود سے اشرف و اعلیٰ ہے، کیونکہ کلیات کا وجود عقلی اور جزئیات کا وجود حسی ہے، گویا ان لوگوں کے نزدیک وجود دو طرح کے ہوتے ہیں وجود حسی اور وجود عقلی، اور اسی لحاظ سے انکے نزدیک موجودات کی بھی دو قسمیں ہوں گی ہیں موجودات حسیہ اور موجودات عقلیہ، موجودات حسیہ وہ ہیں جسکا ادراک حواس سے ہوتا ہے اور موجودات عقلیہ وہ ہیں جسکا ادراک عقل کرتی ہے، یہ مسلک افلاطون اور سقراط کا ہے اور اصطلاح میں اس مذہب کو ریلیزم کہتے ہیں، افلاطون اس قسم کے کلیات کو اصطلاح میں آئیڈیا ز یعنی تصورات اور فارس یعنی مُثُل کہتا ہے اور یہی کلیات یا عالم عقلی ہے جو افلاطون کی اصطلاح میں عالم اشغال کہلاتا ہے۔

۱۷۸ افلاطون کے نظریۂ اشغال کے لئے دیکھو ریپبلک فیصد اور تیمائوس افلاطون کے بعد اسکے اس نظریہ کی تعبیر و تاویل کے بارہ میں سخت اختلاف ہو گیا ہے افلاطون کے نزدیک یہ اشغال زیادہ تر اوصاف نفسانیہ اور عوارض تک محدود ہیں لیکن فور فوروس نے اسکی تفسیح کرتے ہوئے جواہر و اعراض، کلیات و جزئیات سب اس نظریہ کو عادی کر دیا۔

پرا فلاطون اور سقراط کے علاوہ فیثاغورس اور دوسرے فلاسفہ اور فقہ جواسی قسم کے خیالات رکھتے تھے لیکن انکے اور افلاطون کے خیالات میں فرق تھا، ریاضیئین کا مذہب یہ تھا کہ شکل اور مہیئت اور تعلیمات اصل کائنات ہیں اور انکا وجود عقلی ہے، فیثاغورث کا مذہب یہ تھا کہ عدد اصل کائنات ہے اور اسکا وجود حقیقی اور عقلی ہے، لیکن افلاطون اور سقراط اس بات کے قائل تھے کہ یہ تصورات کلیہ اور مثل اصل کائنات اور موجود حقیقی ہیں، غرض یہ تین مذاہب تھے جو کم و بیش تھوڑے تھوڑے تغیر کے ساتھ کلیات کے وجود خارجی حقیقی پر ایمان رکھتے تھے اور ان سب مذاہب پر بریلیم کا اطلاق ہوتا ہے۔

کنسچولزم یا تصوریت <sup>(۳۸)</sup> (۲) لیکن اس مذہب کے مقابل میں دوسرا مذہب افلاطون کے بہت زمانہ کے بدیورپ میں جان لاک نامی ایک فلسفی نے ایجاد کیا، جان لاک کا مذہب یہ ہے کہ کلیات کا وجود خارج بین نہیں ہوتا بلکہ ان کا وجود صرف ذہن کے اندر ہوتا ہے یعنی یہ کہ جن جن اوصاف بین متعدد افراد جو یہ مشترک ہوتے ہیں انکے مصادیق کا ایک قدر مشترک تصور ذہن کے اندر پیدا ہوتا ہے جو اس کلی کا مصداق ہوتا ہے اور جسکو خود ہمارا ذہن پیدا کرتا ہے اور یہ تصور ذہنی موجودات خارجیہ ہی سے حاصل کیا جاتا ہے، یہ مذہب سابق الذکر مذہب کے بالکل عکس ہے سابق الذکر مذہب میں کلیات کو موجودات خارجیہ واقعی تسلیم کیا ہے، لیکن اس مذہب میں وہ موجودات ذہنی تسلیم کئے گئے ہیں، اسی طرح سابق الذکر مذہب میں کلیات موجودات واقعی اصلی اور مبدی کائنات فرض کئے گئے ہیں، لیکن اس مذہب میں انکو موجودات ظلی غیر واقعی فرض کیا گیا ہے غرض ہر طرح سے یہ مذہب سابق الذکر مذہب کا عکس ہے اس مذہب کو اصطلاح میں کنسچولزم یا تصوریت کہتے ہیں اس مذہب کو یورپ میں خواہ جان لاک نے ایجاد کیا ہو لیکن ابن رشد کی تصانیف میں اس مذہب کا پتہ چلتا ہے اور علمائے اسلام میں

اشاعرہ متکلمین نے وجود ذہنی کا انکار کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ علمائے اسلام میں بعض لوگ تصورات کے وجود ذہنی کے قائل تھے، حقیقت یہ ہے کہ علمائے اسلام کے علاوہ خود ارسطو نے جو مذہب اختیار کیا تھا وہ بھی فلسفہ تصوریت کے قریب قریب تھا،

(۳۹) معقولات ثانیہ (۳) افلاطون کے مذہب کا اصلی مدعا یہ تھا کہ مثلاً زید عمرو بکرو وغیرہ مختلف افراد انسانی مختلف الشخص اور متحد النوع پائے جاتے ہیں یعنی یہ کہ یہ سب گرواپنے تشخصات میں مختلف مگر انسانیت میں متحد ہیں ان میں قدر مشترک انسانیت جو ہے وہ خارج میں ایک موجود حقیقی ہے جبکہ وجود افراد کے وجود سے علاوہ ہے یہ افلاطون کے مذہب کا خلاصہ ہے، لیکن ارسطو نے اس مذہب میں اس قدر ترمیم کی کہ اس نے ان افراد کو جو حقیقت میں متحد مگر تشخص میں مختلف تھے ان افراد سے جو تشخص اور حقیقت دونوں میں مختلف تھے متماثل کیا پھر اس بنیاد کو اس قدر وسعت دی کہ ان چیزوں کو جو حقیقت اور تشخص دونوں میں متحد نہیں ان چیزوں سے جو نوعیت اور حقیقت میں متحد ہیں میسر کیا، یعنی دو سرے لفظوں میں اشخاص و انواع اور انواع و اجناس کی تفریق کر کے یہ بات ایجاد کی کہ مثلاً اشخاص کے اعتبار سے انکی اپنی ذہنی صورت یہ معقولات اولیٰ ہیں اور انواع مثلاً انسان کی صورت ذہنی اشخاص کی صورت ذہنی کے لحاظ سے معقولات ثانیہ ہیں مثلاً زید کے تصور ذہنی کے بعد اسکی انسانیت کا تصور یہ معقولات ثانیہ میں ہے اور اس طرح کلیات کا وجود خارج میں کہیں علاوہ نہیں ہے بلکہ ان کا وجود ذہن کے اندر ہے یعنی انکا تعقل ذہن میں ہوتا ہے، یہ تفریق ارسطو کی ایجاد ہے اور گویا کہ اسکا مذہب کنپچو لازم یا تصوریت کے قریب قریب مطابق ہے۔

(۴۰) نائینیلزم یا اہمیت دم تصورات کلیہ کے وجود کے متعلق چوتھا مذہب برکلی اور سٹیزلی کا ہے برکلی کے مذہب کو اصطلاح میں نائینیلزم یا فلسفہ اہمیت کہتے ہیں اس مذہب کا مطلب یہ کہ

کلیات ایسے اسماء موضوعہ ہیں جن سے کوئی شے خارج میں مراد نہیں بلکہ تصور کلی صرف چند افراد کے تصور سے عبارت ہے گویا کلی کا تصور کہتے ہی اسکو ہیں کہ ذہن میں چند جزئیات کا تصور مع انکے تشخصات کے ہو گیا، اگر یہ کہا جائے کہ ہم نے انسان کا تصور کیا تو اسکا مطلب یہ ہوگا کہ ہم نے زید، عمرو، بکر کا مع انکے تشخصات کے تصور کیا، لیکن یہ مد نظر رہے کہ ان افراد کے تشخصات اس نوع کی حقیقت میں داخل نہیں اور نوع کے تشخص نہیں بلکہ ان افراد کے تشخص ہیں تو اس مذہب کے مطابق الفاظ کلیہ کے مصداق نہ خارج میں موجود ہیں اور نہ ذہن کے اندر بلکہ الفاظ کلیہ محض اسماء ہیں جیسے ل کا مذہب (۴۱) پانچوان مذہب وجود کلیات کے متعلق جیسے ل کا ہے اور وہ یہ ہے کہ مختلف افراد جزئیہ جب جب بار بار ہماری نظر کے سامنے سے گزرتے ہیں تو نفس ان سب کو ملا کر ان سے ایک مفہوم کلی اخذ کرتا ہے جو ان سب افراد میں قدر مشترک کے طور پر پایا جاتا ہے اسی قدر مشترک وصف کلی کا نام کلی ہے پس گویا اس مذہب کے مطابق کلی کا وجود نہ ذہن میں ہے اور نہ خارج میں بلکہ کلی محض ایک انتزاعی شے ہے،

غرض تصورات کلیہ کے وجود کے متعلق یہ پانچ مذاہب ہیں جو فلاسفہ نے ایجاد کئے ہیں ہکوان مذاہب کی صحت و غلطی سے کوئی بحث نہیں، اب ہم ذیل میں یہ بتاتے ہیں کہ ذہن میں کلیات کا تعلق کیونکر ہوتا ہے؟ بالفاظ دیگر عمل تعلق کی حقیقت کیا ہے؟ جس سے یہ بھی ظاہر ہو جائیگا کہ ہمارے نزدیک ان پانچ مذاہب میں سے کونسا مذہب صحیح ہے،

عمل تعلق کی حقیقت کی تشریح (۴۲) ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ علم کا پہلا درجہ احساس ہے جسکا مطلب یہ ہے کہ ہمارے حاسہ کے سامنے جو شے آتی ہے اسکا علم ہکوان اپنے اعصاب حسی کے ذریعہ سے ہو جاتا ہے پھر درجہ تصور کا ہے جس میں یہ کوئی ضروری نہیں کہ وہ شے جسکا ہم تصور کر رہے ہیں ہمارے حاسہ کے سامنے اسوقت موجود بھی ہو بلکہ صرف یہ ضروری ہے کہ کسی وقت وہ ہمارے حاسہ کے

سامنے سے گزر چکی ہو اور اس کا ہم احساس کر چکے ہوں، فرض کر دو کہ ہم نے متعدد بار متعدد موقعوں پر گلاب کے پھول دیکھے تھے انکی خوشبو سونگھی تھی اور انکے رنگوں کو خوب غور سے دیکھا تھا، اب فرض کر دو کہ اس وقت ہمارے سامنے گلاب کا کوئی پھول موجود نہیں، لیکن ہم اپنے سابقہ تجارب کو بذریعہ قوانین تصور جمع کر رہے ہیں یہ ظاہر ہے کہ جو احساس عامہ باصرہ سے ہوتا ہے وہ دیگر احساس کے احساسات سے زیادہ واضح زیادہ ممتاز اور زیادہ یقینی ہوتا ہے تو اب اس لحاظ سے ان گلاب کے پھولوں میں انکی خوشبو کا احساس جو کم ہوا تھا اس سے زیادہ واضح انکے رنگوں کا احساس تھا تو گلاب کے پھول سے رنگ کا تصور بھی دیگر اوصاف کے تصورات سے زیادہ واضح ہوگا اسی اصول کے مطابق اب فرض کر دو کہ ہم اپنے ذہن میں گلاب کے پھول کے متعدد تصورات کا باہم مقابلہ کرتے ہیں اور مقابلہ کرینے بعد ہر کوئی یہ چنتا ہے کہ جتنے متعدد پھول ہم نے دیکھے انکے رنگ ایک ہی قسم کے تھے اور انکی خوشبو بھی ایک ہی طرح کی تھی، اب اس مقابلہ کے بعد ہمارے ذہن میں ایک مشترک رنگ اور ایک مشترک خوشبو کا خیال پیدا ہوتا ہے، اسی مشترک خیال کو جو مختلف افراد جزئیہ کے استقصاء اور انکے باہمی مقابلہ سے پیدا ہوتا ہے کلی کہتے ہیں، پس تقریر بالا سے معلوم ہوا کہ تعقل کلیات کے لئے چند باتیں ضروری ہیں،

(۱) احساس، یعنی متعدد افراد کا متعدد مواقع پر عامہ کے سامنے سے گزر جانا،

(۲) تصور، یعنی قبل کے احساس کو ذہن میں جمع کر کے انکو مرئی صورت میں نہج سامنے کرنا۔

(۳) مقابلہ، یعنی ان متعدد تصورات کا باہم مقابلہ کر کے اُن سے قدر مشترک نکالنا۔

یہ عمل تعقل کی نفسانی تشریح ہے، لیکن ایک بات بتادینا اور ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ تعقل

کلی کے لئے گواہی ضرورت نہیں ہوتی کہ پہلے سے کوئی خیال عینی ذہن میں موجود ہو، لیکن کبھی ایسا ہوتا ہے بلکہ ان کلیات کا تعقل کرتے وقت جو نہایت پیچیدہ ہوتے ہیں اکثر یہی ہوتا ہے کہ اگر ذہن میں



پہلے سے کوئی خیال موجود نہیں ہوتا تو نفس کلی کا انزعاج بھی نہیں کر سکتا ہے، لیکن یہ عام حالت نہیں ہے بلکہ عام حالت یہی ہے کہ خیال کلی متعدد تصورات کے باہمی مقابلہ سے پیدا ہوتا ہے نہ یہ کہ خیال کلی سے تصورات کا ذکر مشترک نکلتا ہو مثلاً اگر ہم نے کبھی سفید چیزیں نہیں دیکھی ہیں اور نہ کبھی ہمارے ذہن میں سپیدی کا خیال پیدا ہوا ہے تو ہم متعدد سپید چیزوں کو دیکھ کر ان کے تصورات کا باہمی مقابلہ کر سکتے ہیں اور اس ذریعہ سے سپیدی کا مفہوم کلی اخذ کر سکتے ہیں،

پس تقریر بالا سے معلوم ہوا کہ نقل کلیات بھی درحقیقت ایک قسم کا استقصاء اور استقرار ہے لیکن جب کوئی مفہوم کلی چھل ہو جاتا ہے تو وہ اسی طرح دوسرے کلیات کے اخذ کرنا معیار بن جاتا ہے جس طرح تصورات جزئیہ اسکے اخذ کرنے کا معیار تھے یعنی مثلاً فرض کر دو کہ ہم نے متعدد سپید اشیاء کے تصورات کا باہم مقابلہ کر کے سپید کا مفہوم کلی چھل کر لیا ہے، نیز یہ بھی فرض کر دو کہ ہمارے ذہن میں بجز سپید کے مفہوم کلی کے دیگر مفہومات کلیہ ابھی چھل نہیں ہوئے ہیں، اب فرض کر دو کہ ہماری نگاہ کے سامنے سے سرخ، سیاہ اور دیگر رنگوں کی اشیاء گزریں اور ان کے تصورات ہمارے ذہن میں مجتمع ہوئے، پس اب ہم اس صورت میں نہ صرف یہ کرینگے کہ ان جدید تصورات کا باہم مقابلہ کرینگے بلکہ اب ہم ان جدید تصورات کا آپس میں مقابلہ کرنے کے بعد اس مقابلہ سے جو مفہوم کلی چھل ہوگا اس کا مقابلہ سپید رنگ کے قدیم مفہوم کلی سے بھی کرینگے جو پہلے سے ہمارے ذہن میں پیدا ہو چکا ہے اور اگر ان رنگوں کو ہم سپید رنگ کے مثل نہ دیکھیں گے تو ایک دوسرا مفہوم ہمارے ذہن میں ایک دوسرے رنگ کا پیدا ہوگا۔

اسی طرح ایک دوسری صورت اور ہر درودہ یہ ہے کہ مثلاً ہمارے ذہن میں چند حیوانات کا باہمی مقابلہ کرنے سے حیوان کا ایک خاص مفہوم کلی چھل ہوا، اب فرض کر دو کہ جن حیوانات کے تصورات کو جمع کر کے یہ مفہوم کلی چھل کیا تھا، ان کے علاوہ اب کوئی دوسرا جانور بحوالہ نظر پڑا تو اب ہم یہ کرینگے کہ

اس جانور کے حالات کو ان دیگر جانوروں کے حالات سے تطبیق دینگے جو ہمارے ذہن میں پہلے پیدا ہو چکے ہیں  
 یہاں تک کہ حیوان کا مفہوم کلی جو پہلے ہمارے ذہن میں پیدا ہوا تھا اس میں اس جدید مثال سے ایک خاص اضافہ  
 ہو جائیگا مثلاً ہمارے ذہن میں حیوان کا مفہوم کلی یہ پیدا ہوا تھا کہ حیوان ان جانوروں کو کہتے ہیں جو کہاتے  
 پیتے چلتے پھرتے ہیں، اب فرض کرو کہ ہر ایک دوسرا جانور ایسا لفظ آیا جو نہ صرف کہاتا پیتا، چلتا  
 پھرتا ہے بلکہ وہ اور اک بھی کرتا ہے، پس اسی طرح جو مفہوم کلی حیوان کا پہلے ہمارے ذہن میں  
 پیدا ہو چکا ہے اس میں اور وسعت پیدا ہو گئی ہے اور اب ایک نیا مفہوم حیوان کا ہمارے ذہن  
 میں پیدا ہوا جو پہلے مفہوم سے مختلف ہے، پس اسی طرح جتنے مفہومات کلیہ ذہن میں پیدا ہوئے ہیں  
 وہ دیگر مفہومات کلیہ کے پیدا کرنے میں اعانت کرتے ہیں اور دیگر مفہومات کلیہ کے لئے معیار بناتے  
 ہیں اور یوں ہی برابر معلومات اور مفہومات کلیہ میں وسعت پیدا ہوتی چلی جاتی ہے،

الغرض تقریباً بالاسے خوب واضح ہو گیا کہ عمل نقل اصل میں مرکب ہوتا ہے تین قسم کے  
 افعال ذہنی سے کہ اگر ان میں سے ایک بھی فوت ہو گیا تو عمل نقل پورا نہ ہوگا اور وہ تین افعال  
 ذہنی یہ ہیں،

(۱) احساس یعنی کسی شے کا عاسہ کے سامنے آکر اعصاب کو متاثر کرنا اور اعصاب کے اس تاثر کو  
 نفس کا قبول کر لینا،

(۲) تصور یعنی تہل کے احساسات کو نفس کا اسوقت جمع کرنا جبکہ یہ چیزیں عاسہ کے سامنے موجود نہ ہوں  
 (۳) مقابلہ یعنی ان تصورات کا باہم مقابلہ کر کے اُن سے قدر مشترک نکالنا۔

عمل نقل کے متعلق ڈاکٹر دہویل کے اصول علم کے تینوں مراتب احساس، تصور، نقل کے تشکیلات کا  
 بیان ختم ہو گیا، لیکن نقل سے جو ایک مفہوم کلی حاصل ہوتا ہے، اسکی صحت کے معیار کے متعلق ڈاکٹر  
 دہویل نے دو اصول قائم کئے ہیں،

(۱) یہ کہ مختلف تصورات کا باہمی مقابلہ سے جو قدر مشترک اخذ کیا جاتا ہے اور وہ واقعی قدر مشترک ہو خیالی اور وہی ہنوشلا اگر فرض کر دو کہ یہی مقصود ہے کہ تمام حیوانات کی تقسیم ہم باعتبار ان کے رنگوں کے کریں اور اس غرض سے ہم نے مختلف تصورات کا مقابلہ کر کے پید جانور اور سیاہ جانور اس قسم کے تقسیمات بطور قدر مشترک پیدا کئے تو یہ مفہومات کلیہ اس لحاظ سے کہ یہی محض رنگوں کے اعتبار سے حیوانات کی تقسیم کرنا تھی اور دیگر اعتبارات سے ہم نے قطع نظر کر لیا نہاد واقعی ہونگے اور جو قدر مشترک اس صورت میں اخذ کیا جائیگا وہ صحیح ہوگا لیکن اسکے یہ معنی ہونگے کہ یہ مفہومات کلیہ اس وقت بھی صحیح تسلیم کئے جائیں جب ہم حیوانات کی تقسیم کسی دوسرے اعتبار سے کریں،

(۲) یہ کہ جو مفہوم کلی حاصل ہوا ہے وہ صاف اور واضح ہو معنی یہ کہ واقع میں نہایت محنت اور احتیاط کے ساتھ اشیاء کی باہم مائلتوں کو خوب جانچ لیا گیا ہو اور اس جانچ کے بعد یہ مفہوم کلی حاصل کیا گیا ہو عمل لتعل کی صحت کے ان دو اصول کو ڈاکٹر ہو بل نے قدیم فلسفہ سے مثالیں دے دیکر خوب سمجھایا ہے جسکو ہم بیان کرنا بیکار اور باعث تطویل سمجھتے ہیں،

غرض تقریر بالا سے خوب اچھی طرح واضح ہو گیا کہ کلیات کا لتعل اس وقت تک نہیں ہو سکتا تا وقتیکہ متعدد جزئیات حواس کے سامنے سے نہ گذریں، اس بنا پر مندرجہ بالا تقریر سے حسب ذیل نتائج اخذ ہوتے ہیں،

(۱) مفہومات کلیہ کا وجود نہ خارج ہیں ہے اور نہ ذہن کے اندر بلکہ ہمارے حواس کے سامنے سے جب متعدد مثالیں ایک ہی قسم اور ایک ہی طرح کی گذرتی ہیں تو ہمارا ذہن ان متعدد اشیاء سے جو قدر مشترک انتزاع کرتا ہے اسی کا نام کلی ہے،

(۲) قضایا سے کلیہ جو قائم کئے جاتے ہیں مثلاً یہ کہ اجتماع ضدین محال ہے یہ قضایا سے کلیہ بھی اسی قسم کے تجربات اور سابق علوم کی مدد سے بناے جاتے ہیں مثلاً اگر کوئی نہ معلوم ہوگا کہ

پید رنگ اور سیاہ رنگ دونوں ایک وقت میں ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتے ہیں اور اسی قسم کے دیگر مثالوں کا علم ہو نہ تو یہ تفسیر کلیہ ہم کسی طرح نہیں بنا سکتے تھے،

(۳) اگر جزئیات کا علم ہو تو کلیات کا علم بھی ہو نہ سکیگا، افلاطون اور قداما کے نزدیک کلیات کے علم سے جزئیات کا علم حاصل ہوتا ہے کیونکہ کلیات جزئیات سے اشرف ہیں کلیات لایزال اور قدیم اور جزئیات حادث ہیں، کلیات غیر فانی اور جزئیات فانی ہیں کلیات کا وجود عقلی اور جزئیات کا وجود حسی ہے، مگر ہمارے نزدیک ہمارے احساسات ہی خود عقل کے جاسوس ہیں جب ہم حسی دنیا سے آنکھ بند کر لیں گے تو کبھی ہم عقلی دنیا تک رسائی حاصل نہ کریں گے،

نتیجہ اور ختمہ مباحثہ (۴) غرض احساس، تصور، اور نقل، علم کے مراتب ہیں، ان تینوں مراتب میں سب سے زیادہ یقینی علم وہ ہے جو احساس سے حاصل ہوتا ہے، اور گو اس مرتبہ میں غلطیاں ہوتی ہیں لیکن یہ غلطیاں حاسہ کی نہیں ہوتیں بلکہ وہ غلطیاں یا

(۱) اسوجہ سے پیدا ہوتی ہیں کہ ہم احساس اور اس شے کے مابین جو احساس کی باعث ہے امتیاز نہیں کرتے ہیں یا

(۲) اس وجہ سے کہ ہم احساسات مرکبہ میں اپنے تمام حواس کی شہادتوں کو فراہم نہیں کرتے بلکہ ایک یا چند حواس کی شہادت کو تسلیم کر کے اپنی عقل کو دخیل کر دیتے ہیں، یا

(۳) اس وجہ سے کہ ہمارے احساسات میں بڑا حصہ ہماری اپنی فکر و نظر کا ہوتا ہے ہمارے اوپر قوت خیال اتنی مستولی ہے کہ جب ہم اپنے کسی احساس کو الفاظ میں ادا کرتے ہیں تو کچھ نہ کچھ بڑھا گھٹا ضرور دیتے ہیں اور وہ باتیں بھی اپنے حاسہ کے جانب منسوب کر دیتے ہیں جو اسکے جانب منسوب ہونے کے قابل نہیں اور یا پھر

(۴) اسوجہ سے کہ بعض وقت ہمارا احتمال دماغی حواس کی اطلاعوں میں غلطی پیدا کر دیتا ہے،

لیکن احساس کے بعد دوسرا مرتبہ صحت میں تصورات کا ہے، البتہ وہی تصور قابل اعتقاد ہو سکتا ہے جو احساس صادق سے حاصل ہوا ہو لیکن چونکہ تصور میں بڑا حصہ انتزاع عقلی کا بھی شامل ہوتا ہے اسلئے اکثر تصورات میں غلطی ہو جاتی ہے،

اسکے بعد آخری مرتبہ پھر صحت میں نقل کا ہے، لیکن اگر نقل میں اس بات کا لحاظ رکھا جائے کہ احساس اور تصور دونوں میں کوئی غلطی نہ ہو اور پھر تیسرے ذہنی عمل مقابلہ میں کسی قسم کا مستقیم نہ ہو تو اس صورت میں تصورات کلیہ ضرور صحیح ہونگے بلکہ استقراء تام کے ذریعہ ہونگے،

غرض ہمارے علم کی ابتدا ہمارے حواس سے ہوتی ہے اور ذریعہ علم صرف یہی حواس ہیں اگر انسان ان حواس سے محروم ہوتا تو اسکی حالت جماد محض کی سی ہوتی، لیکن نہ یہ صحیح ہے کہ علم اشیاء کا باشباہا ہوتا ہے اور نہ یہ صحیح ہے کہ علم اشیاء کا بانفہا ہوتا ہے، ذہن میں اشیاء کی نہ کوئی تصویر آتی ہے اور نہ خود وہ شے بلکہ اصل میں ہے یہ کہ ہمارے اعصاب میں تاثر کی قابلیت فطرت کے جانب سے ودیعت کی گئی ہے، اور چونکہ ہم جس طرح مادہ کی حقیقت سے واقف نہیں اسی طرح نفس ذہن کی حقیقت سے بھی ہم ناواقف محض ہیں، اسلئے ہمیں ان مباحث سے کوئی سروکار نہ رکھنا چاہیئے کہ علم اشیاء کا بانفہا ہوتا ہے یا باشباہا ہو جو کچھ نظر آتا ہے وہ صرف نفس عقلی کے ہمارے ذہنی ہیں، انہیں آثار کے تو انہیں اور اصول کا دریافت کرنا ہمارا فرض ہے،

یہ ہے تفصیل علم و تصور کی اس ہتھوری کی جو زمانہ حال میں صحیح تسلیم کجائی ہے، اور اسی پر یہ طویل صحبت ختم ہوتی ہے،

## مصریوں کی مذہبی حالت

انٹرویو عبدالرزاق ندوی

(مبدا)

یہ عام دستور ہے کہ جب لوگ نماز سے فارغ ہو جاتے ہیں تو دعا کے قبل ایک شخص باوازی بند صاحب قبر کا نام لیکر کہتا ہے، ”فاتحہ پڑھو سید فلان پر“ جسے سنتے ہی سب پرمیل واجب ہو جاتی ہے، کیونکہ اعتقاد یہ ہے کہ اس فرمائش کے بعد اگر کوئی شخص تساہل کرے تو اسپر دلی اللہ کا عتاب نازل ہوتا ہے، چنانچہ اس خوف سے تمام نمازی شروع و خضوع کے ساتھ پہلے فاتحہ خوانی اور پھر دعا کرتے ہیں اور جب چلنے لگتے ہیں تو جوش اور عقیدت کے ساتھ قبر کا کئی مرتبہ طواف کرتے، اسکے کٹہرہ کو ہر چہ طرف سے بوسہ دیتے، اور پھر نذر لطف و کرم کی التجا میں کرتے ہوئے رخصت ہوتے ہیں،

صرف یہی نہیں بلکہ حماقت اس درجہ پہنچ گئی ہے کہ مرادون اور منٹون کی تحریریں بزرگان دین کے نام بذریعہ ڈاک بھی آتی ہیں، جو قبر کے کٹہرہ میں ڈال دی جاتی ہیں، چنانچہ ایک مرتبہ میرے رفیق رفیق مولانا سید عثمان صاحب اس قسم کا ایک لفافہ امام شافعی کے مزار سے اٹھالا سقے، جو اسکندریہ سے بھیجا گیا تھا، اور جہین نقاب و آداب کے بعد مرقوم تھا،

یا امام، انی عشقت زینب بنت .... اے امام، میں زینب بنت .... پر عاشق ہو گیا

وارید التزویر، بما فامد دلی ید المعوہ ہون، اور اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں، اے آقا!

وسهل لی هذا امر یا سیدی .... دست افانت دراز کیے اور میری ہجم کو آسان -

حیرت ہے کہ جس طرح یونانیوں نے ہر چیز کے علحدہ علحدہ دیوتا بنا رکھے تھے، اسی طرح مصریوں

نے بھی بزرگان دین پر نظام کائنات کے کام قیام کر دیئے ہیں، چنانچہ سید بدوی اولاد دینیہ میں سیدہ زینب آنکھیں اچھی کرتی ہیں، شادیوں کا انتظام امام شافعی کے سپرد ہے، اور مخلوق کو سانپ سے بچانا سید رفاعمی کا فرض ہے... یہاں پر مجھے ایک دلچسپ حکایت یاد آگئی ہے، جسے ایک ازہری عالم نے جہالمین بیٹھکر بڑے جوش و خروش سے بیان کیا تھا، آپ نے فرمایا، گوگو! تم اولیائے کرام سے مراد ہیں تو مانگنے جاتے ہو، لیکن طلب صادق اور اعتقاد کامل نہایت مشکل وجہ سے اکثر نامراد واپس آتے ہو، حالانکہ اگر پورے اعتقاد اور پوری منت و بجا جت سے عرض کرو تو ناممکن ہے کہ فائز المرام نہ لوگو! کیا تم نے اس نابینا کا قصہ نہیں سنا جو ”سیدہ نفیسہ“ (محلہ ہے) میں رہتا، اور روزانہ سیدہ زینب سے اپنی بینائی کے لئے دعائیں کیا کرتا تھا، مگر وہاں سے کوئی جواب نہ ملتا تھا، آخر ایک روز رنگیتا ہوا مزار پر آیا اور کہنے لگا جب تک میری آنکھیں اچھی نہ ہو جائیں گی، اس وقت تک میں اس درسے نہ اٹھ سکے گا، نہ کھاد سکے گا، نہ پیو سکے گا اور نہ سو سکے گا، چنانچہ کئی روز گزر گئے، لیکن وہ برابر اپنی ہیٹ پر قائم رہا، آخر ایک شب کو جب سجد آویسوں سے غالی ہو گئی تو اس نے دیکھا کہ محلی فرش بچہ رہے ہیں، اور زمردین تخت اور زرنگار کریسان لگ رہی ہیں چنبر سراپا نفیست و تقدس بزرگ آکر ٹھکن ہو رہے ہیں بعض کے سروں پر سفید عمامے ہیں، اور بعضوں پر سیاہ و سبز، بعض لوگ نقاب پوش ہیں، اور بعض لمبی لمبی حجابیں زیب تن کئے ہوئے ہیں جب یہ سب اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھ جاتے ہیں تو سب کے آخر میں ایک پرہیزگیت و جلال ہستی نمودار ہوتی ہے، سب دست بستہ ایستادہ ہو جاتے ہیں، وہ عہد مجلس میں بعد عہد و وقار ایک بلند اور جہتدار تخت پر رونق افروز ہوتی ہے، سب آداب بجالاتے اور اشارہ پانے پر بیٹھ جاتے ہیں اور مجلس پر سکوت و خاموشی طاری ہو جاتی ہے،

گوگو! تم نے جانا بھی کہ یہ کسی محفل حق، یہ دربار نبوی تھا، جبین عمامہ پوش سیدنا حسین علیہ السلام

سید بدوی، امام شافعی، سید رفاعی اور دیگر اولیاء کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین تھے، اور نقاب پوش، سیدۃ زینب اور سیدۃ نفیسہ رضی اللہ عنہا وغیرہ تھیں، مختصر یہ کہ اس ہر سکوت کو صدر مجلس سے ایک آواز بلند ہو کر توڑتی ہے کہ ”یا بنتی زینب“، مجمع سے سیدۃ زینب برآمد ہوتی ہیں اور پایہ تخت کو بوسہ دیکر کھڑی ہو جاتی ہیں، ارشاد ہوتا ہے، ”کیون زینب! کیا تمہیں یہ مرتبہ اسی لئے دیا گیا تھا کہ میری امت کے ایک غریب اندھے کو جو تم پر قربان ہے اس طرح پریشان و ناشاد کرو، دیکھو تمہارے در پر پڑے پڑے اس کی کیا حالت ہو گئی ہے اور اب وہ لب گور ہو رہا ہے، سیدۃ زینب دست بستہ عرض کرتی ہیں، ”حضور والا خطا ہوئی، حضرت اقدس مطمئن رہیں، فوراً اس کی آنکھیں درست ہو جائیں گی، چنانچہ صبح ہونے سے پہلے ہی اس نابینا کی آنکھیں مینا ہو گئیں، اور آخر عمر تک دن میں بھی وہ تارے نکھار رہا، اس نابکار شخص کی یہ جاہلانہ تقریر یہیں تک پہنچی تھی کہ میرا جام صبر لبریز ہو گیا، لیکن ضبط کر کے مین نے کہا، کیون حضرت مولانا جب وہ اندھا تھا تو اس نے دربار کی یہ کیفیت کس طرح دیکھی اور بیان کی؟ اسپر تو حضرت مولانا اول بہت چراغ پا ہوئے اور پھر مقتدون (جو اعتراض کو سمجھ گئے تھے) کا رنگ بدلا ہوا دیکھ کر یہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے، ”میں بد عقیدہ دہابیوں سے منہ نہیں لگانا چاہتا۔“

دلی پرستی کا یہ عالم ہے کہ خدا کی قسم جھوٹی کہا لینا تو ممکن ہے، اگر دلی کی بہن چنانچہ استاذی الاکبر حضرت سید رشید رضا صاحب فرمایا کرتے تھے کہ میرے استاذ شیخ محمد عبدہ مفتی مصر مقتدا کا صبح فیصلہ کرنے میں مشغور تھے، جسکی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ گواہ کو پیشتر خدا کی قسم دیتے، اور جب اسکی شہادت میں کچھ شبہ معلوم ہوتا تو اسے کسی دلی اللہ کی قسم دلاتے جسپر اسکا رنگ فق ہو جاتا اور وہ ہنیک ہنیک حالات بیان کر دیتا، مصریوں کی عام عادت ہے کہ جب وہ کوئی پختہ عہد سچے دل سے کرتے ہیں تو دوسرے فرق کے ہاتھ میں ہاتھ دیکر عہد کو مضبوط کرنے کے لئے کسی



بزرگ کا نام بیکر فاتحہ پڑھتے ہیں، اُن کا اعتقاد ہے کہ اس طح وہ بزرگ شاہد ہو جاتا ہے اور  
سعادہ کی خلاف ورزی کرنے والے پر اپنا قہر نازل کرتا ہے، اب کوئی بتائے کہ یہ سب شرک  
ہیں تو اور کیا ہے؟ لاجول ولا قوۃ الا باللہ

مصری اولیاء اللہ میں سب سے زیادہ اہمیت ”سید بدوی“ کو دیکھائی ہے، جنگی قبر (جو  
شہر طنطا میں واقع ہے) مرجع خلائق بنی ہوئی ہے، اور جس پر ایک عظیم الشان مسجد بنی ہوئی ہے،  
جس میں جامع ازہر کی وضع کا ایک بڑا مدرسہ بھی ہے جس میں صد ہا طالب علم شنب دروڑ پڑھتے اور  
مذہبی تعلیم چاہل کرتے ہیں، ہندوستان میں جو مقبولیت حضرت شیخ عبدلنقاد جیلانی کو حاصل ہے  
اس سے کہیں زیادہ مصر میں سید بدوی کو ہے، چنانچہ ان کے نام پر سائڈ چھوڑے جاتے، سرسبز پال  
رکھے جاتے، اور جو شخص سات مرتبہ انکی زیارت کرتا ہے، اُسے حاجی کہنے لگتے ہیں کیونکہ ان کے  
خیال میں سید بدوی کی سات زیارتیں ایک حج کا ثواب رکھتی ہیں، یہ اعتقاد بھی ان میں عام  
ہو رہا ہے کہ کسی زمانہ میں حج کا راستہ بند ہو جائیگا، اس وقت مسلمانان مصر کا حج سید بدوی کے  
مزار پر ہو کر یگا، انا للہ وانا الیہ راجعون!

ہندوستانی تو سال میں ایک ہی مرتبہ شیخ صاحب موصوف کی گیارہویں پر اکٹھا کرتے  
ہیں، لیکن مصری اپنے سید کے سالانہ تین عرس بڑی دھوم دھام سے کرتے ہیں، جن میں شہر مملوق  
جج ہوتی اور خود مسجد کے اندر فرقہ و فخر کا وہ بازار گرم ہوتا ہے کہ خدا کی پناہ! انکو یہ سن کر سخت  
تعب ہوتا تھا کہ ہندوستانی مسلمان سید بدوی کے نام تک سے بھی واقف نہیں، اور اس سے بھی  
زیادہ حیرت انہیں یہ معلوم کر کے ہوتی تھی کہ مین نے باوجود اُسے واقف ہونے اور مصر میں عرصہ سے  
موجود ہونے کے اب تک انکی زیارت نہیں کی ہے، چنانچہ وہ نہایت ہی ہمدردانہ اور ترکانہ لہجہ میں  
اسے اسی طرح ہندوستانی تعب ہو گئے کہ ان کے ”پیران پیر“ سے ”مصری عموگانا“ آشنا ہیں۔

کہتے تھے کہ تم مہر اگر کیوں اس نعمت سے محروم رہے ہو، کم از کم ایک مرتبہ تو عذبات عالیہ کے دیدار سے مشرف ہو!

سید بدوی مغرب انصی (مراکش) کے باشندہ تھے، ۹۶۷ھ میں شہر فاس میں پیدا ہوئے مہر کی ہجرت کی اور شہر "طنطا" میں ربیع الاول ۱۰۷۷ھ میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے، آپ نہایت عابد و زاہد اور پرہیزگار تھے، چہرہ پر ہمیشہ نقاب پڑی رہتی تھی، اسی لئے "الملثم" یعنی نقاب پوش کے لقب سے مشہور ہو گئے، پورا نام مع سلسلہ نسب کے یہ ہے، ابو القتیان الملثم السید احمد البدوی بن علی بن ابراہیم بن محمد بن ابی بکر بن اسماعیل بن عمر بن علی بن عثمان بن عیین بن محمد بن موسیٰ بن کجی بن عیسیٰ بن علی المادی بن محمد الجواد بن حسن العسکری بن جعفر بن علی الرضا بن موسیٰ کاظم بن جعفر الصادق بن محمد الباقر بن علی زین العابدین بن الحسین ابن فاطمہ بنت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم،

سید بدوی کے علاوہ دیگر بزرگان دین کے بھی بکثرت عرس ہوا کرتے ہیں جنہیں ہندوستان کی مانند توالی اور نعمہ و سرور و عیاشی سمجھا جاتا ہے، بلکہ خوش الحان قاری قبروں پر تلاوت کرتے ہیں، جنکی تعداد ایام عرس میں بہت زیادہ ہو جاتی ہے، اور نہ عام طور سے محکمہ اوقاف کی جانب سے بڑے بڑے قرآن خوان مقرر رہتے ہیں جو روزانہ تلاوت میں مشغول رہتے ہیں، چنانچہ مزار حسینی پر تین سو قاری ہیں جنہیں سے ہر ایک کی تنخواہ ۱۵ روپے سے زائد ہے،

مسلمانوں کی حالت و حقیقت نہایت ہی قابل رحم ہے، اگر تسلیم بھی کر لیا جائے کہ مردوں کو نیاز فاتحہ سے ثواب ملتا ہے تو بھی یہ کمان کی عقلمندی ہے کہ زندون کو چھوڑ کر انکی ضرورت بچائے؟ پہلے اپنی بگڑی کو بناؤ، پھر دوسروں کی ضرورت لیں، انہیں دنیا میں جو کچھ کرنا تادمہ کر گئے، انکے اعمال کا دفتر بند ہو گیا، جو لوگ انہیں دی کاٹیں گے، اگر وہ جو لوگ انہیں توہماری کوششوں سے دہان نہیں

گہون بنین مل سکتے، خدائی فیصلہ سن لو، تلافی قتل خلت، لہا ما کسبت وکم ما کسبت ولا تشون  
 عا کا نوالیعلو مسلمانو اور اتوا نکہیں کہو، تمہیں تعلیم کی ضرورت ہے، تمہیں صنعت و حرفت کی ضرورت ہے  
 تمہیں تجارت کی ضرورت ہے، غرض کہ کون ایسی شے ہے جسکی تمہیں ضرورت نہیں ہے، خدا را اپنے  
 اوپر رحم کرو، اگر زیادہ نہیں تو کم از کم دس سال تک اس تمام رقم کو قومی ضرورتوں کے لئے وقف  
 کر دو، جو فائدہ خوانی، گیارہویں اور عرسوں وغیرہ میں صرف کرتے ہو، صرف اتنے ہی بین تم دیکھ لو گے  
 کہ کیا سے کیا ہو جاتے ہو، اللہم اھد قومی فانھم لا یعلمون !

مصریوں کی قبر پرستی کے سلسلہ میں ان کوششوں کا ذکر بھی ضروری ہے جو میرے استاذ  
 حضرت سید رشید رضا، ۲۷ سال سے اسکے باطل کرنے کے لئے کر رہے ہیں، انھوں نے اس آخر  
 زمانہ میں شاید سب سے اول اس بدعت کے برخلاف پُر اثر آواز بلند کی ہے، جسکی وجہ سے  
 اکثر لوگ انکے مخالف ہو گئے ہیں، علمائے ازہر خصوصیت کے ساتھ زہرا گلا کرتے، اور عوام الناس  
 کو اُن سے متنفر و بیزار کرنے میں سعی ملیع کیا کرتے ہیں، حتیٰ کہ انھوں نے ایک مرتبہ تو لوگوں کو انکے  
 قتل پر بھی آمادہ کر دیا تھا، اگر پولیس کی دست اندازی نہ ہوتی تو عالم اسلامی کو عرصہ دراز تک  
 اس مصلح عظیم کا ماتم کرنا پڑتا۔

نیز بڑی ناشکری ہوگی اگر شیخ بسکی کے بھی جہا عظیم کا تذکرہ نہ کیا جائے جسکا سلسلہ انھوں نے  
 عرصہ دراز جاری کر رکھا ہے شیخ بسکی ایک عالم باعمل ہیں، جو قریہ قریہ اور زہرہ مزمعہ مسلمانوں کو وعظ و نصیحت  
 کرنے اور اتباع سنت کی دعوت دیتے پھرتے ہیں، مقام مسرت ہے کہ انکی کوششیں بار آور ہوتی  
 نظر آتی ہیں، ہزار ہا کی تعداد میں مسلمان انکے ہاتھ پر توبہ کر چکے اور انکے سلسلہ میں داخل ہو چکے ہیں،  
 انکے مریدین میں جوش اسلامی بھی ہے اور ظاہری وضع و قطع میں بھی وہ مسنون طریقہ کو نہیں چھوڑتے،  
 شیخ صاحب موصوف کا اثر ملک میں برابر بڑھ رہا ہے اور کمی نہ ہوتی ہے کہ مسلمانان مصر کو اُسے بہت فائدہ پہنچے گا۔

## قرا مطہرین

(از پروفیسر جمیل الرحمن ایم اے، پتلیا، یونیورسٹی حیدرآباد)

مضمون ذیل کتاب السلوک فی طبقات العلماء والملوک مصنفہ قاضی ابی عبداللہ یوسف المعروف بہ بہاء الجندی سے ماخوذ ہے، الجندی کا نام ابو عبداللہ بہار الدین بن یوسف بن یعقوب ہے، مگر وہ جندی کے نام سے ہی زیادہ مشہور ہیں، جس سے شاید یہ مطلب ہو کہ انکا تعلق قبیلہ بنو محافر کی شاخ جند سے ہے، انکی کتاب کا نام جیسا کہ کشف الطغون میں مذکور ہے، ”کتاب السلوک فی طبقات العلماء والملوک“ ہے، اسکا ایک نقلی نسخہ پیرس کی لائبریری میں موجود ہے یہ کتاب یمن کے رہنے والے علماء کے حالات کے متعلق ہے، اور اسی لئے اس میں امام شافعی کا حال بھی ملتا ہے، کیونکہ انکے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ یمن میں پیدا ہوئے تھے، الجندی کا انتقال ۳۲۵ھ میں ہوا۔ (مترجم)

اسعد بن یعفر کے زمانہ میں قرا مطہر نے یمن میں خردج کیا، ان کا ایک سردار علی بن فضل ہے، جو یافع کے اضلاع میں ظاہر ہوا، اور دوسرا منصور بن حسن جو منصور الیمین کے نام سے مشہور ہے، یہاں ہم انکے کچھ حالات بیان کریں گے جو یمن کے مشہور و معروف فقیہ اور سنی عالم

سے بنو یعفر کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ تبع یمن کی اولاد میں سے تھے، انھوں نے جلد ہی صنعا میں ایک خود مختار سلطنت قائم کر لی تھی، یمن کے یعفر بن عبد الرحمن نے صنعا اور جندہ پر قبضہ کر لیا اس کے بعد انکے بیٹے محمد بن یعفر نے خلیفہ معتز کی اطاعت قبول کی اور یمن کے یعفر کی طرف اپنے علاقہ کا مال مقرر ہوا، اس کو انکے بیٹے ابراہیم نے ۳۵۸ھ میں قتل کر دیا اور خود بادشاہ ہوا اسکا بیٹا اسعد بن یعفر اسکا جانشین ہوا، اسی کے زمانہ میں قرا مطہر کا خردج ہوا۔ (مترجم)

ابو عبد اللہ محمد بن مالک ابن ابی القبايل نے بیان کئے ہیں، یہ شخص صلیبی کے وقت میں تراسطہ کے مذہب میں داخل ہو گیا تھا، مگر جب تحقیق سے اُسے انکے مذہب کی برائیاں معلوم ہوئیں تو اس نے اُنسے کنارہ کشی اختیار کی، اور ایک مشہور رسالہ لکھ کر لوگوں کو اُن کے فریب و دغا سے بچانے کی کوشش کی،

وہ کہتا ہے کہ علی بن فضل عرب کے قبیلہ لاحدون (یا لاجدون) سے تعلق رکھتا تھا، اور مذہباً اشاعری تھا، ایک دفعہ مکہ منظمہ سے حج کے بعد واپس آتے وقت وہ حضرت امام حسین کے مزار مبارک پر ٹہرا، اور رونائینا شروع کیا، اور کہا کہ یا ابن رسول اللہ کاش کہ میں بھی اسوقت آپ کے ساتھ ہوتا جبکہ فاجروں کی قوم نے آپکو نزعہ میں لے لیا تھا۔

ایک شخص سیمون نام اسوقت مزار کا مجاور تھا، اور اسکا بیٹا عبید اسکو کام میں مدد دیا کرتا تھا، جب ان دونوں نے ابن فضل کو دیکھا تو اسکو اپنا شکا بنانا چاہا، چنانچہ سیمون اسکو الگ لیگیا، اور اس سے کہا کہ یہ بات یقینی ہے کہ اسکا بیٹا عبید ایک سلطنت کا بانی ہوگا اور اسکی اولاد ایک مدت تک اسکی مالک رہیگی، مگر یہ کام یمن میں شروع ہونا چاہیئے، اور وہ بھی اسکے داعیوں کی معرفت علی بن فضل نے فوراً کہا کہ یمن میں بہت آسانی سے ہو سکتا ہے، کیونکہ وہاں کے لوگوں کو اس قسم کی باتوں میں خاص ملکہ چل ہے، یہ سن کر سیمون نے اسکو وہیں ٹہرنے کے لئے کہا تا کہ وہ اس معاملہ میں غور و فکر کر سکے،

سیمون مسلماً یہودی تھا، اسلام اور مسلمانوں کو ہمیشہ حد و رشک کی نگاہ سے دیکھا کرتا تھا اپنے مذہب کی حفاظت کے لئے اس نے ظاہر طور پر اسلام قبول کر لیا تھا، اور حضرت امام حسین کے مزار پر متکف ہو گیا تھا، یہ شخص شام کے ایک شہر سلمیۃ، اور اپنے آپکو حضرت علی کی اولاد سے کہتا تھا، اگرچہ تمام علویوں کو اس سے قطعی انکار ہے، (داعیہ عالم) مگر ابن مالک کا

خیال ہے کہ وہ نسلًا اور نذہبًا درجہل یہودی تھا۔

اسکے ساتھ مزار میں عقیل ابن ابی طالب کی اولاد کا ایک شخص منصور بن زوان بن حوشب بن الفرہ بن المبارک بھی رہتا تھا، اور دونوں میں بڑی گہری دوستی تھی، اسکا دادا زوان کو فہ کا رہنے والا اثنا عشری شیعہ تھا، جب میمون بیان آیا تو اس نے منصور کی بزرگی اور اسکے رعب سے فائدہ اٹھانے کے لئے اس سے دوستی بڑھائی، اور اسکی صحبت میں رہنے لگا، میمون نہایت ہی ذکی اور ذہین آدمی تھا، مگر اپنا ذہن محض اپنی بہلائی کے لئے خرچ کرنے کا عادی تھا، وہ علم نجوم کا بڑا ماہر تھا، جس سے کہ اسکو یہ معلوم ہو چکا تھا کہ منصور ضرور بادشاہ ہوگا اور اسکے بیٹوں کے داعیوں میں شامل ہوگا، علی بن فضل کے لہجے سے میمون یہ سمجھا کہ وہ اب اپنے ارادوں میں کامیاب ہو سکتا ہے، کیونکہ فضل یمنی تھا، اور وہاں کے لوگوں کی عادتوں اور خصلتوں سے پوری طرح واقف تھا۔

علی بن فضل کو چھوڑ کر میمون منصور کے پاس آیا اور اس سے کہا کہ اے ابوالقاسم، دین اور ہر قسم کے علم کی بنیاد یمن میں پڑی، جب تک ستارے قائم ہیں ایسا ہی ہوگا، میری رائے یہ ہے کہ تم اور ہمارا نیا ساتھی علی بن فضل یمن کی طرف جاؤ، اور میرے بیٹے کے لئے کوشش کرو جس سے تمہارے لئے کافی دولت اور قوت حاصل ہو سکتی ہے، منصور کو میمون کی تمام چالیں اور طریقے معلوم تھے، اس نے فوراً اسکی تجویز منظور کر لی اور جانے کے لئے تیار ہو گیا اب میمون نے علی اور منصور کا سامنا کرا دیا، اور انکے درمیان عہد و پیمان کرنے کے بعد چند ہدایتیں کیں، منصور نے ایسے ہیذہ کا قصہ اس طرح بیان کیا ہے،

وہ کہتا ہے کہ جب میمون نے یمن یمن بھیجے کا قصد کیا تو مجھے چند ہدایتیں کیں مگر میں نے بعض یہ ہیں کہ جب یمن یمن میں داخل ہوں تو اپنا ارادہ کسی پر ظاہر نہ کروں، کیونکہ میں بہت جلد

کامیاب ہونگا، اور دودھ اللہ اللہ کہنے کے بعد کہا کہ اپنے ساتھی علی بن فضل کا خیال رکھنا اور اس سے اچھا سلوک کرنا، کیونکہ اسکا عروج شروع ہونے ہی والا ہے، مگر ابھی اسکا وجود خطرہ سے خالی نہیں، پہر ابن فضل کی طرف مخاطب ہو کر کہا کہ اپنے ہمراہی کے حقوق کا خیال رکھنا، اور اسکی حکم عدولی سے محترز رہنا، کیونکہ بہر حال وہ تجھے زیادہ تجربہ کار اور جہاندیدہ ہے، اگر تو نے اسکا کہنا مانا تو کہیں کا نہ رہیگا، یہ کہہ کر اسی نے ہمیں رخصت کیا، اور ہم حاجیوں کے ساتھ مکہ کی طرف روانہ ہوئے، حج سے فارغ ہونے کے بعد ہم مین کے حاجیوں کے ساتھ ہوئے، اور غلافقہ کے مقام پر پہنچے، یہاں اس بات کا عہد و پیمان کرنے کے بعد ایک دوسرے کو نہ بولیں گے، اور اپنی نقل و حرکت سے ایک دوسرے کو باخبر رکھیں گے، جدا ہو گئے، مین دہان سے روانہ ہوا اور جند کے مقام پر آیا، اس زمانہ میں یہ شہر جعفری کے ہاتھ میں تھا، جسکو اس نے بنو لیفر سے فتح کیا تھا۔

مگر میمون نے مجھے سخت تاکید کر دی تھی کہ میں اپنا کام عدن لائقہ نام ایک مقام سے شروع کروں، کیونکہ دہان کامیابی کی زیادہ امید ہے، مگر مجھے معلوم نہ تھا کہ وہ کس طرف واقع ہے چنانچہ جند سے مین عدن آہیں پہنچا، دہان دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ عدن لائقہ حجاز کی سمت میں واقع ہے، اب میں اس فکر میں پڑا کہ دہان کے کچھ آدمی یہاں موجود ہیں یا نہیں، چنانچہ مجھے چند آدمیوں کا پتہ ملا جو تجارت کی غرض سے دہان آئے ہوئے تھے، میں ان سے جا کر ملا، اور بہت جلد ان سے مانوس ہو گیا، میں نے اپنی نسبت یہ ظاہر کیا کہ میں اہل علم میں سے ہوں اور انکے پہاڑی علاقہ کی میر کا خواہشمند ہوں، اور انکے ساتھ سفر کرنا چاہتا ہوں، انھوں نے اسے منظور کر لیا، اور چلتے وقت میں انکے ساتھ ہو گیا، راستہ میں احادیث ثنا کر میں نے اپنا وقت گزارا، اور راز پڑھنے کی انکو تاکید کی، چنانچہ ان لوگوں نے میرے دغظ و نصیحت پر

عمل کرنا بھی شروع کر دیا، لائقہ پنچکر مین نے صدر مقام کا پتہ دریافت کیا، اور جاے وقوع معلوم کر کے اسکی طرف روانہ ہوا، یہاں آکر مین نے اسکی چند مساجد کو اپنا جولا نگاہ بنایا، اور عبادت دریا ضمت میں مشغول ہو گیا، جسکی وجہ سے لوگوں کو مجھے عقیدت ہو گئی، جب مجھے یہ معلوم ہو کہ مین نے اُنکے دلوں میں خوب جگہ کر لی ہے، تو مین نے اُن سے کہا کہ میری بیان آنے سے غرض یہ ہے کہ تم سب کو اس ہمدی کے ظہور کی بشارت دوں جسکا ذکر انھنرت نے کیا ہے، چنانچہ بہتوں نے میرے ہاتھ پر بیعت کی اور زکوٰۃ میرے پاس جمع کرنے لگے جب بہت سا مال جمع ہو گیا تو مین نے کہا کہ میرے لئے کوئی ایسی جگہ ہونی چاہیئے کہ یہ تمام مال دولت محفوظ رہ سکے، اور مسلمانوں کے بیت المال کا کام دے، چنانچہ عین حرم کا قلعہ جو پہلے ایک قبیلہ بنو عدعہ کے قبضہ میں تھا، میرے لئے تیار کر آیا گیا، اور میں تمام مال متاع سمیت اس میں منتقل ہو گیا، راستہ میں وہ پانچ سو آدمی جھفون نے مجھے مدد دینے کا وعدہ کیا تھا، مع اہل عیال کے میرے ساتھ ہوئے، بیان پنچکر مین نے علائقہ عبید اللہ ابن میمون کے ہمدی ہونے کا وعظ شروع کیا اور لوگ جوق جوق میرے پیرو ہونے شروع ہو گئے۔“

اس واقعہ کے بعد منصور نے کوہ مسور پر قبضہ کر لیا اور طبل و رايات کا استعمال شروع کیا، اسکے ساتھ تیس طبلچی رہتے تھے، اور جہاں وہ جاتا تھا دُور سے طبلوں کا شور سُنا لی دیتا تھا اس نواح میں ابن لیفر کا ایک قلعہ تھا جس میں اُسکا والی مقیم تھا، منصور نے یہ قلعہ اس سے جہین لیا اور اب یہ جھکڑا کسکو پورا غلبہ حاصل ہو گیا ہے، اس نے تمام حالات سے میمون کو اطلاع دی، اور لکھا کہ وہ اپنے دشمنوں پر غالب آ گیا ہے، اس پیغام کے ساتھ اس نے میمون کے واسطے نہایت ہی بیش قیمت تحائف بھی روانہ کئے، یہ واقعات سننے میں پیش آئے جب میمون کے پاس یہ تحائف اور پیغام پہنچے، تو اس نے اپنے بیٹے عبید اللہ سے کہا کہ لے تیری سلطنت کا



آغاز ہو گیا ہے، مگر میں یہ چاہتا ہوں کہ وہ باقاعدہ طور پر مغرب سے شروع ہو، اس کام کیلئے اس نے ابو عبد اللہ المحمیں بن احمد بن محمد بن زکریا المعروف بے شعبی الصنعانی کو مغرب کی طرف روانہ کیا، اور حکم دیا کہ مصر میں داخل ہو کر لوگوں کو اسکے بیٹے کی اطاعت اور فرمان برداری پر مائل کرے، ابو عبد اللہ مغرب میں آیا، یہ شخص ایک جید عالم تھا، اور سیاسی قابلیت کی وجہ سے اسکا نام ہر ایک فرد بشر کی زبان پر تھا، مگر وہ ۲۹۶ھ سے پہلے اس کام کو نہ کر سکا، اسکے بعد اس نے ہمدی کو لکھا کہ تمام کام تیار ہے اور لوگ اسکی اطاعت کے لئے مستعد ہیں، بہتر ہے کہ اب وہ خود مصر کی طرف روانہ ہو جائے، چنانچہ عبید اللہ الملقب بے ہمدی فوراً روانہ ہو گیا جسوقت وہ افریقہ پہنچا تو تمام اختیارات شعی کے ہاتھ میں تھے، مگر اس نے سب کچھ ہمدی کے حوالہ کر دیا، اسکے بہائی نے اسے ملامت کی کہ تو نے برا کیا کہ تمام بنا بنایا کام دوسرے کے سپرد کر دیا، ملامت اور ندامت اسقدر بڑھی کہ آخر شعی نے ہمدی سے غدر کی ٹھان لی، مگر وہ خبردار ہو گیا، اور آخر درمیان جمادی اول ۲۹۸ھ میں اس نے ایک ہی وقت میں دونوں بہائیوں کو قتل کر دیا، یہی عبید اللہ الہمدی مغرب اور بعد میں مصر کے بادشاہوں کا بانی مانی ہوا، ابن خلکان عبید یون کے حسب و نسب کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ وہ عبید اللہ کی اولاد میں سے تھے، بعض لوگ انکے دعویٰ کے مطابق انہیں علوی کہتے ہیں، اور اسطرح انکے دعویٰ کی تصدیق کرتے ہیں، واللہ اعلم۔

۱۰ شجرہ نسب :-

حضرت علی

حضرت امام حسین

امام زین العابدین

محمد الباقر

جعفر الصادق

اسمعیل

محمد المکتوم

محمد المکتوم ہی کی اولاد اور جانشین ہونے کا

عبید اللہ الہمدی کو دعویٰ تھا۔ (مترجم)

مذکورہ بالا صفات میں میں نے قرامطہ کا حال جتنا کہ اسکا تعلق یمن سے تھا، اور منصور کے جو ایک نہایت ہی لائق اور مدبر بادشاہ تھا، اس کام میں مدد کرنے کا حال بیان کر دیا ہے، اب میں علی بن فضل کا کچھ حال بیان کر دینگا، جس سے اسکے حال اور واقعات کا پتہ لگے گا، اسکے نسب اور وطن کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں، مورخوں نے آئندہ کا حال اس طرح پر بیان کیا ہے کہ علاقہ یمن منصور سے الگ ہو جانے کے بعد وہ پہاڑوں کے راستہ سے جندہ پنجا اور دہان سے آئین آیا، اسوقت یہ شہر قبیلہ اصباح کے ایک شخص محمد بن ابی العلی کے ہاتھ میں تھا، وہاں سے چل کر وہ یافغ کے ایک مقام پر آیا، یہاں کے لوگ اس زمانہ میں ارذل ترین خلایق تھے، ان سے دور اُس نے جنگل میں عبادت و ریاضت شروع کی، لوگ اسکے واسطے کھانا لاتے مگر وہ ہتھوڑا کھاتا، آنے والوں کو اس امر سے تعجب ہوتا، یہ لوگ پہاڑ کی چوٹی پر رہتے تھے، انھوں نے اس سے درخواست کی کہ وہ بھی ان میں آ رہے، اول اول اُس نے انکار کیا مگر جب انھوں نے اصرار کیا تو کہا کہ وہ ان میں اس وجہ سے رہنا نہیں چاہتا کہ وہ شرابی فاسق اور فاجر ہیں، یہ معلوم کر کے انھوں نے اسکی اطاعت کا حلف اٹھایا، اور اس نے بھی اجر کا وعدہ کیا، اب یہ لوگ اپنی زکوٰۃ اسکے پاس جمع کرنے لگے، یہاں تک کہ اسکے پاس بہت سا مال و متاع جمع ہو گیا، اب اس نے آئین پر حملہ کر کے اسکے والی کو قتل کیا، اور اس علاقہ کے جان و مال کو اس کے پیروؤں کے لئے مباح قرار دیا، یہاں بھی اسکو بڑا مال ہاتھ لگا، اب اس نے مذبحہ کا قصد

لے۔ مذبحہ کا شہر جعفر بن ابراہیم المناخی نے آباد کیا، کوہِ ثومان پر آباد تھا، اور جو بوقت کہ علی بن فضل نے اسکے حرمین اسپر حملہ کیا ہے خود جعفر بن ابراہیم المناخی بادشاہ تھا، مگر ہمز علی بن فضل شکست کھا کر دہان سے یافغ واپس چلا گیا، جعفر ذوالفلس اور ذوالمنافخ حمیری قبائل سے تعلق رکھتا تھا، اور رفتہ رفتہ تمام مخالف جعفر کے علاقہ پر قابض ہو گیا تھا جو اسی کے نام سے مشہور تھا، پانچ مہینے بعد ۳۹۱ھ میں علی بن فضل (بقیہ صفحہ ۲۰۱)

کیا جو اس وقت جعفری بادشاہ کے ہاتھ میں تھا، اور کوہ ریتہ کے مشہور شہردن میں سے تھا، چند  
 لڑائیوں کے بعد جعفری قتل ہوا، اور اسکا ملک حسب دستور لوٹا گیا، اور عورتیں تید کر لی گئیں، ابن  
 مالک نے ان تمام واقعات کا اپنے رسالہ میں مفصل ذکر کیا ہے، اگر اس جگہ اسکا اعادہ فضول ہے  
 علی بن فضل کو ندیچہ کا شہر بہت پسند آیا، اور اسی کو اس نے اپنا دار السلطنت مقرر کیا، اب  
 اس نے نبوت کا دعویٰ کیا، اور اپنے پیروؤں کے لئے شراب، بیٹیان اور بہنیں حلال کر دیں،  
 رجب کی پہلی جمعات کو وہ جند واپس آیا، اور ممبر پر چڑھ کر وہ شہور ابیات پڑھیں جو ذیل میں ’جہن‘  
 خذ علی لد یا ہذہ والعی وغنی عن اریک الخ، توئی نبی بنی ہاشم و ہذا بنی بنی یسر ب  
 لکل بنی مضر شریعة۔ و ہذا شریعة ہذا النبی ۛ فقد حط عن ارض الصلوة و حط الصیاد تمب  
 اذا الناس صلوا فلا تخف من صلوا فکلوا اشربوا ۛ و اطلب السعی عند الصفا ولا ذودہ القبر فی یشرب  
 و اتمنی نفسک المعربین من لا قریبین مع الاجنبی ۛ فہم داخلت لہذا الغریب صوت محوۃ للاب  
 لیس لغراس لمن رہا ۛ و سقاؤ فی الزمن المجد ب ۛ و ما احملا لکاء السماء علی فقد است من مہذب  
 اسکے بعد اسکا زور بڑھتا گیا، اس نے مخالف جعفر اور جند کو فتح کیا، اور صنعا پر چڑھائی کرنے کا  
 ارادہ کیا، یہ شہر اس وقت اسعد بن ابراہیم بن محمد بن یعفر کے قبضہ میں تھا، راستہ میں وہ دمار کے پاس سے  
 گزرا اور ہران کا قلعہ فتح کیا، یہاں کے والی اور اکثر باشندوں نے اسکا مذہب قبول کیا، باقی  
 اسعد بن یعفر سے جا ملے، اگر جب اسکو اپنے دشمن کی طاقت کا حال معلوم ہوا تو وہ بھی صنعا سے

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) پھر حملہ آور ہوا، اور ندیچہ کو فتح کرنے میں کامیاب ہو گیا، جعفر دہان سے ہباگ کر تھاہ  
 چلا گیا اور دیرپا زبیر سکیمیلین پناہ لی، اس نوح کے بادشاہ نے اسکی قوج سے مدد کی، جسکی مدد سے دہوی نوح کے مقام پر  
 اس نے علی بن فضل سے ۲۹۲ء میں مقابلہ کیا، مگر وہ اور اسکا بیٹا ابو الفتح دونوں مارے گئے، جعفر بن  
 ابراہیم کا زمانہ سلطنت ۲۹۱ء سے ۲۹۲ء تک ہے، (مترجم)

بھاگ نکلا، اس طرح جمہرات کے دن تیسری رمضان کو علی بن فضل شہر میں داخل ہوا، اور جامع مسجد میں ٹہرا، اسکے آنے کے دن سخت بارش ہوئی، چنانچہ اس نے حکم دیا کہ شہر کی تمام موریان بند کر دیجائیئں، اور خود صنعا کی قیدی عورتوں کو بیکر مینا پر چڑھ گیا، جہاں سے اُس نے ٹنگا کر کے انہیں پانی میں بہینکنا شروع کیا، اور جھکو پسند کیا، انکی عصمت و ہن خراب کی، کہتے ہیں کہ اس ظالم کے پنجے میں بہت سی کنواری لڑکیاں بھی پس گئی تھیں،

جو پانی مسجد میں جمع ہو گیا تھا، وہیں چھوڑ دیا گیا، یہاں تک کہ وہ چہت تک پہنچ گیا، اسکے نشانات اب تک موجود ہیں، اس واقعہ کا ذکر قاضی سُرّسی نے کیا ہے، جنکا ذکر آئینہ کتاب میں آچکا۔

یہ کام کر کے علی بن فضل نے اپنا سر منڈایا، اسکی پیروی میں ایک لاکھ آدمیوں نے ایسا کیا، اسکے بعد اس نے ابن عتبہ کے مکان کو نہدم کرنے اور کہوونے کا حکم دیا، کیونکہ اسکا خیال تھا کہ اسہیں بہت سا سونا دفن ہے، مگر کہوونے سے صرف دس ہزار دینار وصول ہوئے، ابن عتبہ اور اعیان صنعا کی طرح اسعد کے ساتھ بھاگ گیا تھا، اسے جب اپنے مکان کی بربادی کا حال معلوم ہوا تو رنج کی وجہ سے بیمار ہو گیا، اور اسی عدے سے بالآخر جان دی،

منصور کو جب ابن فضل کے صنعا میں داخل ہونے کا حال معلوم ہوا تو وہ بہت خوش ہوا، اور اس سے ملنے کے لئے آیا، دونوں ایک دوسرے سے مل کر بہت خوش ہوئے، یہاں سے ابن فضل نے حراز اور ہجم کا محاصرہ کر کے اسکو فتح کر لیا، اسی طرح کدربھی فتح ہوا، اب اس نے زبیدہ کا قصد کیا، بغداد کی طرف سے اسکا حاکم ابو جیش اسحاق بن ابراہیم بن محمد تھا، کہتے ہیں کہ وہ شہر چھوڑ کر بھاگ گیا، اور ایک روایت یہ بھی ہے کہ لڑا، اور علی بن فضل کے ہاتھ سے مارا گیا، زبیدہ کا شہر حسب دستور لوٹا گیا، اور عورتیں قید کی گئیں، مؤرخین کا بیان ہے کہ اس موقع پر

علاوہ اور عورتوں کے چار ہزار صرف کنواری لڑکیاں اسکے ہاتھ آئیں، یہاں سے ابن فضل  
براہ میراد ندیخروہ کی طرف روانہ ہوا، میراد ندیخروہ کے مشرق میں ایک پہاڑ ہے، جب وہ مع اپنے  
لشکر کے مداحیص یا شاخیس نام ایک مقام پر پہنچا تو اس نے وہاں قیام کا حکم دیا، اور جب لشکر  
نے کمرین کہول دین تو اس نے سبکو جمع کیا اور کہا کہ تمکو معلوم ہے کہ تم جہاد فی سبیل اللہ کے لئے  
نکلے ہو، مگر حصیب کی مشیمار عورتیں تمہارے پاس قید ہیں، میں یہ نہیں چاہتا کہ وہ اپنے اثر سے  
تمہارے نیک ارادوں میں دخل انداز ہوں، اسلئے جسکے پاس جتنی عورتیں ہوں انکو قتل کر دے  
لوگوں نے فوراً اسکے کہنے پر عمل کیا، اور برسوں زمین ان مظلوموں کے خون سے سخی رہی، اسی  
وجہ سے اس مقام کا نام مداحیص یا شاخیس پڑ گیا، ندیخروہ پہنچا اس نے تمام راستوں اور خاصکر  
جج کے راستوں کو بند کر نیک حکم دیا، اور کہا کہ اگر جج کرنا ہی ہے تو حرف (جو ندیخروہ کے قریب ایک  
مقام ہے) کا حج کرو، اور اثنا فی میں عمر و کرد، اثنا فی حرف کے قریب ایک وادی ہے،

آخر کار جب اسے معلوم ہو گیا کہ اب یمن پر پورا تسلط اور قبضہ ہے تو اس نے عبید بن  
یمن کو جو کما کہ وہ اب تک اپنے آپکو داعی کہتا تھا، بالاسے طاق رکھا اور خود مختار ہو گیا، اسکی خبر  
اس نے منصور کو بھی دی، منصور نے جواب میں لکھا کہ تو کس طرح ایسے شخص کو چھوڑ سکتا ہے جو تیرے  
تمام عروج کا باعث ہے؟ کیا تجھے وہ تمام عہد و بیان یاد نہیں رہے جو تیرے اور اسکے درمیان  
ہوئے تھے، اور کیا تو وہ ہدایات بھول گیا کہ کیسے اُس نے ہمو اتفاق سے رہنے اور اتفاق سے  
بچنے کی ہدایت کی تھی، مگر ابن فضل نے اسکے کہنے کی کچھ پروا نہ کی بلکہ کہلا بھیجا کہ اگر تو میرے طاعت  
کے لئے تیار نہیں ہے تو جنگ کے لئے تیار ہو جا، میرا حال تو ابی سعید الجنبالی جیسا ہے، کیا اس نے

ابو سعید الجنبالی بحرین کے علاوہ کا بادشاہ تھا، جو اسکے زمانہ میں قرامطہ کے قبضہ میں تھا، اس نے لشکر عظیم  
انتقال کیا، اور تمام عمر عبید اللہ کا ملحق اور زمان برادر رہا، اسکے انخلاف کے شائق نہیں کہا جاسکتا (برصغیر دیگر

بڑا کیا کہ خود مختار ہو گیا، جب منصور کے پاس یہ خط پہنچا تو اسے اسکی بغاوت کا یقین ہو گیا، اور وہ فوراً کوہ سور کی قلعہ بندی پر متوجہ ہوا، اور کہا کہ ”میں نے ایکے اور اس جیسے اور باغی اور طاعنی لوگوں کے لئے اس پہاڑ کو قلعہ بند کیا ہے جب میں صفنا میں پہلی دفعہ اس سے ملا ہوں تب ہی شہزادے اسکے چہرے سے عیان تھی۔“ تنویر سے ہی عرصہ میں ابن فضل نے لڑائی کی تیاری کر دی، اور دس ہزار چیدہ فوج کے ساتھ مذبحہ سے روانہ ہوا، اور شبام میں داخل ہوا، اور اسکی اور منصور کی فوج کے درمیان مختلف جنگیں ہوئیں، جسکے بعد ابن فضل لائنہ کے مقام میں داخل ہو گیا اور کوہ جمیعہ پر چڑھ گیا، اس پہاڑ کا نام فالتس بھی ہے، اور کوہ سور کے پاس واقع ہے، اور اس زمانہ میں بنو فتاہ نام ایک قبیلہ کے قبضہ میں تھا، بیان آئندہ ماہ تک اس نے منصور کا محاصرہ کئے رکھا، مگر بے سود، اسقدر دیر اسپر شاق گزرنے لگی، اور منصور کو جب یہ معلوم ہوا تو اس نے صلح کے لئے سلسلہ جنبانی شروع کی، ابن فضل نے کہا کہ میں اسوقت اس سے صلح نہ کر دوں گا جب تک وہ اپنا ایک بیٹا میرے پاس نہ بھیج دے، جو میری اطاعت قبول کرے، اور مشہور نہ ہونے پائے کہ میں ناکامیاب واپس ہوا ہوں، بلکہ یہ کہ میں نے رحم کر کے منصور کی جان بخشی کر دی، منصور نے یہ شرط منظور کر لی، اور اپنے ایک بیٹے کو ساتھ لیکر آیا، جسکے گلے میں ابن فضل نے سونے کا طوق ڈال دیا۔

مذبحہ واپس آکر ابن فضل اسلام کے تمام محرمات کی تحلیل و اباحتہ میں منہمک ہو گیا، اس نے ایک بڑا مکان تیار کرایا، رات کے وقت وہ اس میں اپنے مذہب کے لوگوں (مرد و عورت) کا غالب حصہ جمع کرتا تھا، مکان قندیلوں وغیرہ سے روشن اور سجایا جاتا، وہاں کے لوگ خوش طبعی میں اربعہ ماضیہ گوشتہ کہ اس میں اصلیت کما تک ہو ایک میں اسکی اطاعت اور فرمان برداری پر کچھ شبہ کیا گیا تھا اور بس وہ اس نے کبھی کلمہ کہا مہدی سے انحراف نہیں کیا۔ (مترجم)

اپنا توڑا سادقت گزارتے، اسکے بعد چراغ گل کر دیئے جاتے، اور ہر ایک مرد کسی عورت کو پکارتا  
خوہ وہ اسکی قریبی رشتہ دار ہی ہوتی، اگر کسی کو اپنی عورت بڑاپے یا کسی اور وجہ سے پسند نہ آتی  
تو وہ اسکو چھوڑ نہ سکتا تھا، ابن مالک نے بیان کیا ہے کہ ایک مرتبہ ایک مرد کو ایک بوڑھی  
عورت ملی وہ اسکو چھوڑ کر الگ ہو جانا چاہتا تھا مگر عورت نے کہا **دوبد من دی**  
حکم الامیر (یعنی لا بد من الذی حکم الامیر، یعنی ابن فضل)

اس قسم کے اسلام کے برخلاف شرمناک افعال ابن فضل سے سوا کسی سے عامد نہیں ہوئے  
میں نے اس مذہب کے اکثر واقف کار لوگوں سے اسکے متعلق سوال کیا، انکی متفقہ رائے کہ  
ابن فضل ایک زندقہ تھا، برخلاف اسکے وہ لوگ منصور کو اپنے بڑے اور برگزیدہ لوگوں میں شمار  
کرتے ہیں، یہ رائے مجھے بھی صائب معلوم ہوتی ہے،

ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ مذبحۃ ابن فضل کو انا پسند آیا تھا کہ اس نے اسکو اپنا مستقر بنالیا تھا،  
اس نے اسعد بن لیفر کو جبکا ذکر ہم پہلے کر اسے ہیں، صغار پر اپنا نائب مقرر کیا، اسے باطل یقین  
نہ ہوا تھا کہ وہ اس سے مل گیا ہے، بلکہ ہر وقت غرور اور بے وفائی کا خوف تھا، ادھر اسعد بھی  
صغامین مسلمانوں کا انتقام لینے کے لئے پیچ و تاب کھاتا تھا، اور اپنے آپکو ابن فضل سے مامون  
نہ سمجھتا تھا، اسی وجہ سے شاذ و نادر ہی صغامین ٹھرتا تھا، ابن جریر کہتا ہے کہ ابن فضل کے اسعد  
نام خطوط کا عنوان یہ ہوتا تھا، **من باسط الارض و داحضا و منزل الجبال**  
و مرسیہا علی ابن فضل لی عبدی اسعد، یہ عنوان ہی اسکے کفر کی کافی دلیل ہے۔

اسعد کی نیابت کے زمانہ میں ایک اجنبی شخص اسکے پاس آیا، جس نے اپنے آپکو بغداد کا  
شریف اور باشندہ ظاہر کیا، یہ شخص اسعد کے پاس رہنے لگا، اور جلد ہی اسکا ندیم ہو گیا، لوگوں کا  
خیال ہے کہ اسے خلیفہ نے ابن فضل کا حال سن کر دیاں بھیجا تھا کہ کسی حیلہ سے اسے قتل کر دے،

تھوڑی مدت تک وہ اسعد کے پاس ٹہرا رہا، شیخ فضل جراح، عطار، اور فصد کے کہولنے اور زخون کے علاج میں ماہر تھا، جب اسعد کا خوف ابن فضل کی طرف سے بہت بڑھ گیا، تو ایک دن اس اجنبی نے کہا کہ میں نے مصمم ارادہ کر لیا ہے کہ میں اپنی زندگی کو خدا اور مسلمانوں کی خدمت کر کے انکو اس ظالم باغی کے ہاتھ سے نجات دلاؤں، سو وعدہ کر کہ اگر میں اپنے کام میں کامیاب ہو کر واپس آؤں تو تو میرے ساتھ اس ملک کو تقسیم کر لیگا جو تجھے حاصل ہو، اسعد نے فوراً وعدہ کیا، اور اجنبی نے سفر کی تیاری کی اور روانہ ہو گیا، اسعد اس وقت ہمدان کے علاقہ میں الجوف کے مقام پر ٹہرا ہوا تھا، اور ہر وقت ابن فضل کی طرف سے خطرہ میں تھا، اجنبی وہاں سے روانہ ہو کر مدینہ آیا، اور ارکان دولت تک رسائی حاصل کی، انکی فصد کھولی، علاج کیا، اور انکے لئے مرکبات اور معجونیں تیار کیں، آہستہ آہستہ اسکا ذکر ابن فضل کے کانوں تک پہنچا، لوگوں نے بھی اسکی تعریف کی، اسکی طبابت کو خوب سراہا، اور کہا کہ وہ تیرے ہی لائق ہے۔

ایک روز ابن فضل کو فصد کہولنے کی ضرورت پڑی، اس نے اسے طلب کیا، طبیب نے جانے سے پہلے اپنے سر کے سامنے کے بالوں میں جو بہت گہنے تھے، زہر ملا، ابن فضل کے سامنے آنے کے قبل اسے حکم ہوا کہ وہ اپنے کپڑے اتار کر دوسرے کپڑے پہنے، اس نے تعمیل کی، اب اسے فصد کہولنے کے لئے قریب آجائیکلی اجازت ملی، انشتر نکال کر اس نے مزید اطمینان کی غرض سے اسے چوسا، اور پھر اپنے سر کے بالوں سے اسے صاف کر لیا جس سے اس میں تھوڑا سا زہر لگ گیا، اسکے بعد فصد کھولی، اور اسے باندھ کر فوراً اپنا اسباب گدھے پر لا دیندینہ سے روانہ ہو گیا تاکہ اسعد بن یعفر سے جا ملے،

تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد ابن فضل کو زہر کا اثر معلوم ہوا، اور اب اس نے جاننا کہ فصد اسے دہوکہ دیا ہے، اسکی تلاش بے سود ثابت ہوئی مگر ابن فضل نے اسکی تلاش میں ادھر ادھر آدمی



بھیجے کہ جہاں کہیں بھی پھیرا جائے، چنانچہ سپاہی مختلف اطراف میں اسکی تلاش میں نکلے، آخر بعض نے اسے وادی سحول میں ایک مسجد المعروف بہ قینان میں جا لیا، مگر اپنے آپکو حوالہ کر نیکے بجائے اس نے اسکا مقابلہ کیا، اور آخر شہید ہو گیا، اور وہیں دفن ہوا، اب بھی اسکی قبر باعث برکت اور نزول رحمت ہے، میں بھی محرم ۱۹۶۶ء میں وہاں گیا ہوں،

اسی کے ساتھ ابن فضل نے بھی جمعات کی رات کو ۱۰- ربيع الاول ۳۸۶ھ میں انتقال کیا، مسلمانوں کو اسکی وجہ سے سترہ سال مصیبت اٹھانی پڑی، اسعد کو ابن فضل کی موت سے بہت خوشی ہوئی، اور اہل یمن نے بھی خوشی منائی، انھوں نے اسعد کو لکھا کہ مذبحہ پر فوجبکشی کر کے قرامطہ کا قلع قمع کر دے، چنانچہ اس نے بھی تیاری شروع کی، اور صفنا، اور گردونواح کے علاقہ سے فوج جمع کی، جب مخالف جعفر بن ہنچا تو تمام باشندے اس سے مل گئے، یہی حال جند اور معافر کا ہوا، اب اس عظیم الشان لشکر نے مذبحہ کا رخ کیا،

ابن فضل نے ایک بیٹا چوڑا تنہا جو اپنی آنکھ کی سفیدی کی وجہ سے الفافا کے نام سے مشہور ہے، اسعد نے اپنے لشکر کے ساتھ مذبحہ کا محاصرہ کر لیا، اور کوہ ثمان میں ٹہرا، جسکا ذکر ہم جعفری کے بیان میں کر چکے ہیں، اب اسکا نام جبل خولان ہے، کیونکہ اب وہاں بنو لخم قبیلہ کے لوگ رہتے ہیں، لشکر ایک مدت تک وہاں پڑا رہا، جب کبھی مذبحہ کی فوج اسپر چھا یہ مارتی تو مسلمان اسے شکست دیدیتے، یہ حال برابر جاری رہا، آخر اسعد نے مغنیق سے کام لیکر شہر نہاہ کے ایک حصہ کو سمار کر دیا اور شہر میں داخل ہو گیا، علی بن فضل کا بیٹا، اسکے خواص، خاندان کے تمام مرد، اور وہ تمام لوگ جنھوں نے اسکا مذہب اختیار کیا تھا اسعد کے حکم سے قتل ہوئے، ابن فضل کے بیٹے بیٹیاں بتین وہ قید ہوئیں، اسعد نے ایک کو جسکا نام معاوۃ تھا، چن لیا، اور اپنے بیٹے قحطان کے حوالہ کر دیا، اس سے قحطان کا ایک بیٹا عبد اللہ نامی ہوا، باقی دونوں دوسرواردن کے

جسے میں آئیں، اسعد اور مسلمانوں کے مذبحہ کے محاصرہ کی مدت ایک سال ہے کہتے ہیں کہ اس عرصہ میں اسعد نے اپنے ہتیار اور زرہ ذرا سی دیر کے لئے بھی الگ نہیں کئے تھے، مخالف جعفر میں بھی قرامطہ کی سلطنت کا خاتمہ ہو گیا، اور مذبحہ اس وقت سے اتناک ویران پڑا ہوا ہے۔

اب رہا منصور سودہ اپنی مقدمہ الذکر حالت پر برابر قائم رہا، مگر ابن فضل کے مقابلہ میں وہ نہایت ہوشیار اور قابل حکمران تھا جسکی یادگار بن اتناک قائم ہیں، اس نے لائے کے علاقہ کو مرنے تک نہ چھوڑا، اور ابن فضل سے پہلے ۲۷ھ میں مر گیا، حکومت اس نے اپنے بیٹے حسن اور ایک شخص عبد اللہ ابن عباس الشادری کی ماتحتی میں چھوڑی، شادری پر اسے بہت اعتماد تھا اور وہ اکثر اسکے خطوط اور تحفے نیکر ہمدی کے پاس جایا کرتا تھا، اس طرح ہمدی بھی اس سے پوری طور پر واقف تھا، منصور کو جب موت کا یقین ہو گیا تو اس نے دونوں کو بلایا، اور وصیت کی کہ سلطنت کی حفاظت کرنا، اور بنو عبید بن میمون سے اپنے آپ کو جدا نہ کرنا، کیونکہ ہم انہیں کے لکھائے ہوئے ایک پودے ہیں، اگر ہم ان کے داعی نہ بننے تو یہ حکومت چل نہ پوتی، ہمدی سے خط و کتابت کا سلسلہ جاری رکھنا اور کبھی اسکی مرضی کے بغیر کوئی کام نہ کرنا، کیونکہ میں نے یہ حکومت کثرت مال اور کثرت رجال سے حاصل نہیں کی، اور اس ملک میں بھی اپنی مرضی کے خلاف ہی آیا، بلکہ اس مرتبہ کو محض ہمدی کی برکت کی وجہ سے پہچانا، جسکی بشارت خود اسحضرت صلعم دیکھے ہیں، یہی الفاظ وہ اکثر عوام الناس کے سامنے کہا کرتا تھا،

منصور کے مرنے کے بعد شادری نے اسکی وصیت سے ہمدی کو اطلاع دی جو اسوقت ہمدیہ میں مقیم تھا، اور لکھا کہ احکام آنے تک داعی کی جگہ خالی رہیگی، ساتھ ہی یہ بھی یقین دلایا کہ وہ یہ فرض نہایت وفاداری اور دیانت سے منصور کے بیٹوں کے بجائے ادا کر نیکیوتا رہے، اس خط کو اس نے منصور ہی کے ایک بیٹے کے ہاتھ روانہ کیا، اس نے ہمدیہ پہنچ کر خط ہمدی کے

حوالہ کر دیا، مہدی شادری کو پہلے ہی سے جانتا تھا، اور اُسے معلوم تھا کہ وہ داعی کا کام اچھی طرح انجام دیکتا ہے، اسکے برعکس وہ منصور کی اولاد کی کمزوری سے ڈرتا تھا، ابن منصور خط کے مضمون سے بالکل بے خبر تھا، مہدی نے شادری کو جواب دیا، اور اسے مستقل طور پر اپنا داعی مقرر کر دیا، اور ابن منصور نا اُمید واپس آیا، مگر اس نے اپنا کینہ چھپاے رکھا، وہ اور اسکے بہائی شادری سے ملتے جلتے رہے، اور وہ بھی انکی توقیر و عزت ہمیشہ ملحوظ رکھتا تھا، ان میں سے کسی سے وہ الگ نہ رہتا تھا بلکہ جب کبھی وہ چاہتے اُسکے پاس داخل ہو سکتے تھے، اور فیروز حاجب کی مدد سے اس سے مل سکتے تھے، اسکے بعد وہ جو مہدی کے پاس خط لیکر گیا تھا، اسکی غفلت کے وقت کمرو میں داخل ہوا اور اسے قتل کر ڈالا، پھر اس نے تمام علاقہ پر قبضہ کر لیا، قبضہ کے بعد اس نے تمام گرد و نواح سے اپنی رعایا کو جمع کیا، اور انکو شاہد بنایا کہ اس نے پھر سنی مذہب اختیار کر لیا ہے اور اپنے باپ کا مذہب ترک کر دیا ہے، لوگوں کو اس سے تعجب ہوا، اور وہ اس وجہ سے ان میں ہر دل عزیز ہو گیا، اور لوگ اسکی مدد کے لئے تیار ہو گئے، اسکا بہائی اُسکے پاس آیا، اور اسکو اس امر کے متعلق برا بھلا کہا تھا، مگر اُس نے اسپر توجہ نہ کی، خفا ہو کر بہائی مہدی کی طرف چلا گیا، مگر قیروان جا کر معلوم ہوا کہ مہدی فوت ہو چکا ہے، اور اُسکا بیٹا القاکم بامر اللہ اسکا جانشین مقرر ہوا ہے، مہدی کی موت اور قاکم کا جانشین ہونا ۳۲۷ھ کا واقعہ ہے، ابن منصور وہیں اسکے پاس پہنچا، بیان اسکے بہائی نے اپنے باپ کے ہم مذہبوں کو قتل کرنا شروع کیا، اور جلاوطن کیا، حتیٰ کہ اسکے قریب سوائے ان لوگوں کے جو اپنا مذہب خفیہ رکھتے تھے کوئی بھی باقی نہ رہا، مگر شہر میں ایک جماعت ایسی رہ گئی جو خفیہ طور پر قیروان میں مہدی سے خط و کتابت کا سلسلہ رکھتے تھے، پھر ابن منصور مسور سے عین محرم کی طرف روانہ ہوا، جبکا ذکر پہلے گذر چکا ہے اور جب اسوقت بنو العرجا کے قبیلہ کا ایک شخص بادشاہ تھا، مسور پر اپنی غیر حاضری میں اُس نے

ابراہیم بن عبد الحمید الشیبی کو مقرر کیا، جو بنی فنتاب کا دادا ہوا جس کے نام سرکا نام فنتاب ہو گیا، جب وہ عین محرم پہنچا تو ابن العرجا نے اچانک اس پر حملہ کیا، اور اسے قتل کر دیا، ابن عبد الحمید نے منکر اپنے آپ بادشاہت کا دعویٰ کیا اور منصور کے اہل عیال اپنی جان کے خوف سے کوہ حشب (یا جبل بنی اعشب) کی طرف بھاگ گئے، مگر لوگوں نے ان پر حملہ کیا، اور انکو قتل کیا، قید کیا اور ڈوبا ابن العرجا اور ابن عبد الحمید کے درمیان میں عہد نامہ ہو گیا، جسکی رو سے دونوں نے علاقہ کو آپس میں بانٹ لیا، ابن عبد الحمید نے منصور کے مذہب کو ترک کر دیا، ایک جامع مسجد اور منبر تعمیر کیا، حسین خلیفہ عباسی کے نام کا خطبہ پڑھا گیا، اس نے قرامطہ کا بھی تعاقب کیا، اور آخر اسکی کوشش سے ان فسادوں کا بالکل خاتمہ ہو گیا، اگرچہ ایک نہایت ہی قبل فساد مسور کے قریب رہ گئی جو اپنے مذہب کو چھپائے رکھتے تھے، اور ایک شخص کو جسکا نام ابن الطفیل تھا اپنا امیر سمجھتے تھے، اسکو ابراہیم نے قتل کر دیا، اسکے بعد داعی کا کام ابن جعتم یا ابن رحیم کے سپرد ہوا یہ شخص نہایت بدربار اور محتاط آدمی تھا، اسکی جلے سکونت ہمیشہ اس خوف سے چھپائی جاتی تھی کہ فنتاب یا کوئی اور بنی اسے بھی قتل نہ کرے، اسکی خط و کتابت بھی قیروان میں مہدی کی اولاد کے ساتھ برابر جاری رہی، اسی کے زمانہ میں المعز بن النعمان بن المہدی قیروان سے مصر کی طرف آیا، اور قاہرہ کا شہر آباد کیا، اور اسکو اپنا مستقر قرار دیا، جب ابن جعتم کی موت قریب آئی تو اس نے اپنے ہم مذہبوں پر ایک شخص یوسف بن الاسح نامی کو مقرر کیا، ابن جعتم کی موت کے وقت حاکم (معز کا پوتا) قاہرہ پر حکمران تھا، ابن الاسح اسی کے لئے کوشش کرتا تھا اور اسکے لئے بیعت لیتا تھا، جب اسکی موت قریب آئی تو اس نے اپنا جانشین ایک شخص سلیمان بن عبد اللہ الرجاجی کو جو شام کے علاقہ کا رہنے والا تھا مقرر کیا، یہ مالدار آدمی تھا جسکو وہ لوگوں کے دھوکہ دینے اور اپنے ہم مذہبوں کی حفاظت میں صرف کیا کرتا تھا، جب کبھی کوئی اسکے قتل کا ارادہ کرتا تو صاف

کہتا کہ میں مسلمان آدمی ہوں، لا الہ الا اللہ کا معترف ہوں، میرا خون اور مال کسی طرح مباح نہیں ہو سکتا ہے، وہ اسکو چھوڑ دیتا، مرتے وقت اس نے علی بن محمد اصبغی کو اپنا جانشین مقرر کیا جو اخراج کا رہنے والا تھا، اور حزار کے شیعوں میں سے تھا،

---

## بگڑا ہوا اسلام

(از مولانا عبدالسلام ندوی)

قرآن مجید اگرچہ مناظرہ کی کوئی کتاب نہیں ہے، تاہم یہود، نصاریٰ، مشرکین، اور منافقین کو جن مذہبی شبہات نے ضلالت و گمراہی میں مبتلا کر دیا تھا، قرآن مجید نے متعدد موقعوں پر خطابی اور برہانی دلائل سے انکی تردید کی ہے، لیکن یہ کتنی افسوسناک بات ہو کہ اس طریقہ سے قرآن مجید نے جن مذہبی خرابیوں کی اصلاح کی وہ ایک ایک کر کے آج خود اسلام میں نظر آتی ہیں، مثلاً کفار اگرچہ نبوت کے معترف تھے، اور حضرت ابراہیم، حضرت اسمعیل، بلکہ حضرت موسیٰ علیہم السلام کو بھی خدا کا پیغمبر مانتے تھے، تاہم انکا یہ خیال تھا کہ پیغمبر کو تنزہ عن المادیت میں عام انسانوں سے بالاتر ہونا چاہیئے، اس بنا پر انکے دل میں یہ شبہات پیدا ہوتے تھے کہ پیغمبر عام انسانوں کی طرح کیوں کہا تا پتیا ہے، کیوں بازاروں میں چلتا پھرتا ہے، خدا کسی فرشتے کو پیغمبر بنا کر کیوں نہیں بھیجتا؟ ہر شخص پر الگ الگ وحی کیوں نہیں نازل ہوتی؟ اور ان شبہات کی بنا پر وہ تشبیہ، تحریف، اور شرک میں مبتلا ہو جاتے تھے، لیکن آج اسلام پر یہی مصیبت ایک دوسری صورت میں نازل ہوئی ہے، یعنی بہت سے لوگ ہیں جو دلائل کشف اور کرامت کے معترف تو ہیں، لیکن انکے نزدیک اس زمانہ میں اولیاء و صلحاء کا وجود نہیں ہو سکتا، اس بنا پر وہ بجائے اسکے کہ کسی صالح شخص کو اپنا مرجع بناتے، انھوں نے گزشتہ اولیاء کے مزارات کی طرف رخ کیا، اور اس طرح شرک و بت پرستی کی دہی صورت پیدا ہو گئی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں موجود تھی، چنانچہ شاہ

ولی اللہ صاحب مشرکین کے اس شبہ کو نقل کر کے لکھتے ہیں،

اگر در تصویر حال مشرکین و عقاید و اعمال ایشان توقف داری احوال محترمانہ اہل زمان خصوصاً آنانکہ باطراف دارالاسلام سکونت دارند ملاحظہ کن کہ ولایت را چه خیال کردہ اند و باوجود اعتراف بولایت اولیاء متقدمین درین زمانہ وجود اولیاء محال می انگارند و بہ قبور و آستانہاں رونق و انواع شرک بمل می آرند و تشبیہ و تحریف چگونہ در ایشان راہ یافتہ است و بحکم حدیث صحیح بتبع سنن من قبلکم ازین کلمات پیچ چیز نیست کہ امروز قومی مرکب آئند و معتقد مثل آن عاقلان اللہ سبحانہ عنی ذلک اہل اسلام کا یہ ضلالت آمیز اتحاد صرف کفار و مشرکین کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، بلکہ وہ اور مذاہب کے ساتھ بھی ہمیں شریک ہیں، مثلاً عیسائی حضرت مسیح علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہتے تھے، اور اسپر انجیل کے بعض مشتبہ الفاظ سے استدلال کرتے تھے، لیکن قرآن مجید ہر موقع پر اسکی تردید کی اور انکو خدا کا بندہ قرار دیا، لیکن اسلام میں تصوف کی جو گم بازی ہوئی، اور اس نے صلحا و اولیاء کا جو مستقل طبقہ قائم کر دیا، اسکی نسبت بھی قریب قریب اسی قسم کی خوش اعتقادی پیدا ہو گئی جس نے انکو عام انسانی ہستیوں سے بالاتر قرار دیا اور خدا نانی عصیت و حسن عقیدت نے انکو کہان سے کہان پہنچا دیا، چنانچہ شاہ صاحب عیسائیوں کے اس عقیدہ کے بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں،

اگر خدای کہ نمونہ آن ازین فریق ملاحظہ کنی امروز اولاد مشائخ و اولیاء را تماشا کن، کہ در حق آباے خود چه فلزن دارند و تا کجا کشیدہ بردہ اند، و سیعلم الذین

ظلموا ای منقلب ینقلبون،

لہ الفوز الکبیر صفحہ ۱۱۵۵ ایضاً صفحہ ۲۳،

تصوف و اخلاق کی عام کتابوں میں اولیاء و علماء کے کشف و کرامات کے متعلق جو مبالغہ آمیز واقعات مذکور ہیں وہ انہی خوش اعتقادیوں نے پیدا کئے ہیں اور ان کا نتیجہ یہ ہے کہ لوگوں نے ان بزرگوں کو عملاً اپنا خدا بنا لیا ہے،

اسلام میں سب سے زیادہ خطرناک گروہ منافقین کا خیال کیا گیا ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں دو گروہ میں منقسم تھے، ایک گروہ تو زبان سے کلمہ توحید کا اقرار کرتا تھا، لیکن دل سے اپنے اہلی کفر پر قائم تھا، قرآن مجید میں فی الدہاک الاسفل من النار کی وعید شدید اسی گروہ کی نسبت وارد ہوئی، دوسرا گروہ اگرچہ زبان و دل دونوں سے مسلمان ہوا تھا، تاہم اسکے ایمان میں ضعف موجود تھا، اس بنا پر اسکے عقاید و اعمال میں وہ استواری نہیں پائی جاتی تھی، جو مخلصین مومنین میں موجود تھی، اسی قسم کے منافقین کے متعلق حدیث شریف میں آیا ہے کہ جس شخص میں تین باتیں پائی جائیں، ایک یہ کہ جب گفتگو کرے تو جھوٹ بولے، دوسرے یہ کہ جب وعدہ کرے تو وعدہ خلافی کرے، تیسرے یہ کہ جب لڑائی جھگڑا کرے تو فحاشی اور بدزبانی کرے وہ منافق ہے۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد پہلے قسم کے منافقین کا حال معلوم نہیں ہو سکتا تھا، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی کے ذریعہ سے ان لوگوں کے دل کا بھی معلوم ہو جاتا تھا، لیکن آپ کے بعد وحی کا سلسلہ منقطع ہو گیا، اسلئے انکے حالات کے معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ باقی نہیں رہا، البتہ دوسرے قسم کا نفاق جسکو شاہ صاحب نفاق علی اور نفاق اخلاق کہتے ہیں، اسلام میں ہمیشہ موجود رہا، اور اب بھی موجود ہے، چنانچہ شاہ صاحب نفاق کی اس قسم کو بیان کر کے لکھتے ہیں،

اگر گھبراہٹ کا زمانہ نفاق ہو تو یہ نبی و رسول علیہ السلام اور اصحاب انیسان را یہ بین کہ مرضی ایشان را بر مرضی شایع تزج می دهند در انصاف ہیچ فرق نیست اور میان آنانکہ کلام آنحضرت



صلی اللہ علیہ وسلم بلواسطہ شنیدہ نفاق و زیدند و درمیان آنا کہ الحال پیدا شدہ اند  
 و بطریق لقیین حکم شارع معلوم کردہ اند بعد ازان برائتیا رخطاف آن اقدام می نمایند و علی  
 ہذا القیاس جامعہ از معقولیان کہ شکوک و شبہات بسیار بخاطر دارند و معاد را نسیا نیسا  
 ساختہ اند نمونہ آن گردہ اند و با بملہ چون قرآن بخود لی گمان کن کہ خاصہ با تو سے  
 بود کہ بودند و در گذشتند بلکہ حکم حدیث لتبعن مسنن من قبلکم ایچ بلا سے بنو و مگر امروز  
 نمونہ آن موجود است پس مقصود اولی بیان کلیات آن مقاصد است نہ خصوصیات  
 آن حکایات لہ۔

اسلام بین یہ تمام خرابیاں شاہ صاحب کے زمانہ میں پیدا ہو چکی بہتین اور آج تو وہ  
 اضغاث مضاعفہ ہو گئی ہیں، اس بنا پر اگر ان سب کو پیش نظر رکھو تو تم کو صاف نظر آئے گا کہ اسلام  
 جس قدر تمام مذاہب کی خوبون کا جامع تھا، آج اس قدر تمام مذہبی برائیوں کا سرچشمہ ہو گیا ہے،  
 اسلام نے جن مذہبی مفاسد کی اصلاح کی تھی وہ مختلف مذاہب میں الگ الگ پائی جاتی تھیں  
 لیکن آج وہ سب کی سب اسلام میں ایک جگہ جمع ہو گئی ہیں، اسلئے اگر اسلام کسی زمانہ میں  
 تمام مذاہب سے اچھا تھا تو وہ آج تمام مذاہب سے بُرا ہے، خدا نے کس قدر سچ کہا ہے۔  
 لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم ثم ردناہ اسفل سافلین

# تکلیف و تنصیر

## اسلام اور زنانہ ہند

برٹین اینڈ انڈیا، انگلستان کا ایک جدید ممبر رسالہ ہے، اسکے اپریل نمبر میں ایک ہندوستانی خاتون نے ایک مضمون ”موجودہ زنانہ ہند“ پر شائع کیا تھا جو اگرچہ بحیثیت مجموعی ہمدردانہ و موافقانہ تھا، تاہم جا بجا اس میں مسائل اسلام کی غلط تعبیر کی گئی تھی، مولانا سید سلیمان ندوی نے اسکا جواب اسی رسالہ کے جون نمبر میں شائع کر لیا، ذیل میں اسکا ترجمہ درج کیا جاتا ہے۔

میں نے رسالہ برٹین اینڈ انڈیا کے اپریل نمبر میں ”زنانہ ہند در عصر حاضرہ“ پر دلچسپ مضمون پڑھا، راقمہ مضمون نے جس ہمدردی سے اظہار خیال کیا ہے، اسکی شکریہ ادا کرنا میری بحیثیت ایک ہندوستانی کے میرے اوپر فرض ہے، تاہم اسکے ابتدائی فقرہ میں اسلام، پردہ، نسوان اور کمسنی کے شادی سے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے، اسکے بابت مجھے بھی کچھ کہنا ہے۔

دنیا میں محکوم قوم کی فرد ہونے سے بڑھ کر انسان کے لئے کوئی اور مصیبت نہیں، محکوم قوم کی نہ صرف جسمانی آزادی سلب ہو جاتی ہے، بلکہ اپنے احساسات و جذبات، معتقدات و خیالات ہر شے میں محکوم قوم، محکوم و غلام ہوتی ہے، اسکے نزدیک حق و باطل کا معیار حکمران قوم کے خصایل و شمائر، اور اسکی تہذیب و شائستگی رہ جاتی ہے، محکوم قوم، حکمران قوم کی آنکھوں سے دیکھتی، اسکے قانون سے سنتی، اور اسی کے دماغ سے سوچتی ہے، مگر چونکہ محکوم قوم کے پاس بھی اپنے اسلاف کے پر فخر کارناموں کا ذخیرہ ہوتا ہے، سلعے اسکے پاس اسکے سوا چارہ نہیں ہوتا کہ ان میں حکمران قوم کے اعمال و خصائل کے ساتھ مطابقت و موافقت پیدا کرے، اور اسی

جدید معیار عظمت و شرافت کے قالب میں اپنی گزشتہ تاریخ کو ڈھالے، اس صورت حال کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ محکوم قوم جب اپنے شعائر و اخلاق کو حکمران طبقہ سے مختلف پاتی ہے تو اپنے تئیں پست و ذلیل، اور عورت و شرافت سے معریٰ سمجھنے لگتی ہے، اور اسی طرح رفتہ رفتہ حکمرانوں کی کورانہ تقلید میں مبتلا ہو جاتی ہے،

ہندوستان بھی آج ایک مغربی قوم کے ماتحت ہے، اور اسلئے مغربی تہذیب، مغربی فلسفہ، مغربی اخلاق و شعائر کی حکومتِ طاہرہ تمام ملک پر مسلط ہو گئی ہے، ایسی حالت میں عوام اپنے قوانین حیات انسانی کے لحاظ سے اسپر بالکل مجبور ہیں کہ وہ اپنے حکمرانوں کے جو کچھ رسوم و خصایل و کہیں، بلا خیال اختلاف آب و ہوا، ضروریات قومی و خصوصیات نسلی، تائید و تقویت کرنا اپنے لئے باعثِ فخر و امتیاز سمجھنے لگیں، چنانچہ ہمارے اہل ملک میں ایک اچھی خاصی جماعت ایسے اشخاص کی موجود ہے جو ہر مغربی رسم و شعائر سے متعلق علانیہ و دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ انکے زمانہٴ عروج میں خود ان میں بھی موجود تھا، اور اسی کے ترک کر دینے کا نتیجہ ہے کہ اسوقت وہ حالتِ زوال و انحطاط میں ہیں،

فلسفہٴ اجتماع کے اس نکتہ کو ملحوظ رکھنے کے بعد یہ بات بہ آسانی سمجھ میں آجائیگی کہ مسلمان اپنے درمیان میں جب ہندوستان پر قابض و حکمران تھے تو انکے رسوم و شعائر کو بھی ہندوستان کی معاشری زندگی میں حسن و قبح کا معیار سمجھا جاتا تھا، اسوقت اگر پردہ کا رواج فرمانروا قوم میں تھا اور ہندوستان میں نہ تھا تو یقیناً آہستہ آہستہ اسے ہمارے ہندو بہائیوں اور بہنوں نے بطور تمغائے شرافت اختیار کر لیا ہوگا، بلکہ عجیب نہیں اگر اسکو شرفاء و عوام الناس کے درمیان حد فاصل قرار دے لیا ہو، تاریخ میں ماضی و حال کے درمیان کل اور آج سے زیادہ فاصلہ نہیں ہوتا، اگر پچھلی تاریخ آج تفصیل کے ساتھ موجود ہوتی تو مجھے یقین

کامل ہے کہ مسلمانوں کے عہد حکومت میں ٹھہل ہندوؤں کی ایسی تعداد کا وجود قطعاً ظاہر ہوتا جو زبردست مذہبی و تاریخی استدلال کے ساتھ یہ ثابت کرتے کہ رسم پرودہ ہندوؤں کا قدیم ترین مقدس شعار ہے، اور یہ کہ ہندوؤں کی موجودہ پستی اس رواج کو ترک کر دینے کا نتیجہ ہے، اس طرح اگر کل اتفاق سے ہندوستان پر اہل چین کا قبضہ ہو جائے تو یقیناً عجیب و غریب دلائل سے یہ ثابت کرنے کی کوشش شروع ہو جائیگی کہ ہندوستان کے رسوم و عواید عین چینی آئین تمدن کے مطابق ہیں، اور یہ کہ عورت کا جو مرتبہ چینی تہذیب میں ہے یعنی یہی ہماری قدیم تعلیم ہے!

آج جو شدید قسم کا پرودہ بعض اقطاع ہند میں رائج ہے، اسکے خلاف سب سے بڑی دلیل یہی ہے کہ یہ مغربی اصول معاشرت و آئین تمدن کے منافی ہے، عجیب تماشہ ہے کہ ایک طرف مسلمان قانون پر ماتھ رکھتے ہیں کہ حاشا ہمیں اس دستور سے کوئی واسطہ نہیں، اس کا وجود ہندوستان سے باہر کسی اسلامی ملک میں نہیں، ہمارے مذہب میں اس کا حکم نہیں، ہماری پچھلی تاریخ میں اس کا پتہ نہیں، یہ رسم تو ہم نے ہندوستان میں آکر سیکھی، دوسری طرف ہندو شد و مد سے دعویٰ کرتے ہیں کہ قدیم ہندوستان اس رسم سے محض نا آشنا تھا، اور مسلمانوں کی آمد سے قبل ہندوستانی عورتیں بے پردہ مردوں کی طرح آزاد و دربے تکلف آنے جانے میں بالکل خود مختار تھیں، (البتہ یہ معلوم کرنا خالی از دلیلی نہیں کہ ٹھیکہ مذہبی ہندوؤں کا اس بارہ میں کیا خیال ہے)، اسی طرح یورپ کے ایک گوشہ میں غریب ترک آباد ہیں، جنکے ہاں حرم کا رواج ہے، جو یورپ کے تخیل حریت نسوان کے منافی ہے، ترکوں سے جب اسکے متعلق سوال کیا جاتا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ یہ رواج انکا ایجاد نہیں، بلکہ قدیم رومی سلطنت کی یادگار ہے اور اہل روم یہ فرماتے ہیں کہ انکے ہاں یہ دستور معاصر ساسانی و ایرانی اقوام کے ہاں سے آیا تھا، غرض دنیا کا یہی قاعدہ ہے کہ قوموں کے عروج و زوال، اقبال و انحطاط کے ساتھ اصول و

آئین معاشرت بھی برابر بدلتے رہتے ہیں، شروع سے ہی ہوتا آیا ہے اور آئندہ بھی ہی ہوتا ہے۔  
 یمن نے مشرق و مغرب کے مختلف تمدنوں کے مطالعہ کی کوشش کی ہے، خصوصاً  
 پردہ نسوان سے متعلق، اور یمن نے یہ پایا ہے کہ عورتوں کے لئے کچھ نہ کچھ احتیاط و تحفظ کا  
 ردائ ہر قوم میں موجود ہے، اور جبکہ متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ اس قسم کی احتیاط دشمنوں کی  
 چھیڑ چھاڑ سے محفوظ رہنے کے لئے عورتوں کے واسطے ضروری رہی ہے، یورپ میں موجودہ حریت  
 نسوان کا ارتقا رفتہ رفتہ ہی اس منزل تک پہنچا ہے، لیکن شریعت مسیحی میں عورت کو چادر  
 میں لپیٹے رہنے کا حکم سینٹ پال جیسے امام شریعت کی زبان سے ادا ہوا ہے، سرگرون، اور  
 سینہ کی پوشش جیسی آج مسیحی نون میں مستعمل ہے، یہ اسلامی پردہ کے بالکل مطابق ہے،  
 جزیرہ سسلی پر جو قوت عربوں کی حکومت تھی، اس زمانہ میں ابن جبیر اندلسی نے اُسکی  
 سیاحت کی تھی، اُسکے بیان کے مطابق مغربی مسیحی عورتیں اپنی وضع و لباس کے لحاظ سے  
 بالکل مسلمان بہنیں، یہاں تک کہ برقع بھی پہنتی بہنیں!

لہ یونانی تمدن کو یورپ اپنا تمدن سمجھتا ہے، کیسے تماشہ کی بات ہے کہ یونان نے اپنے شباب تمدن میں  
 اسی قسم کے چار دیواری والے پردہ کی بنیاد ڈالی تھی، جیسا اس وقت مسلمان شرفاء اودھ و بہار میں دیکھا جاتا ہے  
 اور اسکی شہادت انگلستان ہی کے ایک مورخ کا قلم دیتا ہے، کیکی، جس نے دو ضخیم مجلدات میں قدیم تاریخ  
 اخلاق یورپ لکھی ہے، لکھتا ہے کہ یونان کا طبقہ نسوان و دھنوں میں منقسم تھا، گہروالیاں اور باہروالیاں  
 باہروالیاں عموماً بازاریاں ہوتی بہنیں، اور گہروالیاں کی اصطلاح شریف زاد یوں کی مرادف تھی،  
 اقتباس ذیل سے مولانا کے بیانات مندرجہ متن کی پوری تائید ہوگی:-

”گہروالیاں، سخت پردہ کے اندر رہتی بہنیں، اُنکے رہنے کے لئے مکان کا ایک پردہ دار

حصہ مخصوص ہوتا تھا، اور اُنکے مشاغل یہ ہوتے تھے، چہرہ کا تنہا، سینا پردہ، خانہ داری کا

اسلامی پردہ کے معنی یہ ہیں کہ بجز چہرہ اور ہاتھ کے باقی سارا جسم سر سے پیر تک ڈھکا ہوا رہے، اور عورت کسی ایسے مرد کے سامنے جس سے نکاح جائز ہے، بغیر ایک محرم کی موجودگی کے نہ آئے، اگر توہین یا چھیڑ چھاڑ کا اندیشہ ہو تو گھر سے باہر نکلنے وقت چہرہ پر بھی نقاب ہونا چاہئے۔ ان قیود کے علاوہ باقی اور ہر طرح آنے جانے میں اسلام عورت کو پوری آزادی دیتا ہے، مسلمان عورت جلسوں میں شریک ہو سکتی ہے، مسجد و مدرسہ کو جا سکتی ہے، تقریریں کر سکتی ہے اور راہ حق میں جنگ تک کر سکتی ہے، چنانچہ اس طرز زندگی پر خود پیغمبر خدا اور صحابہ کرام کی ازواج مطہرات اور صاحبزادیوں کا عمل تھا، یہ کہنا کہ اسلام عورت کو بجز اپنے شوہر کے اور کسی شخص یہاں تک کہ بہائی سے بھی گفتگو کرنے کی اجازت نہیں دیتا، نہ صرف تعلیم اسلام اور اسکی سیزدہ صدائے نابج کے سنائی ہے بلکہ موجودہ صورت حال کے بھی بالکل برعکس ہے۔

اسلام جس قسم کا پردہ چاہتا ہے، وہ آج پوری طح سرحد ہندوستان، افغانستان، ترکستان

انتظام .... یہ لوگ عام مجالس و ملاعب میں کبھی شریک نہیں ہوتی ہیں، .... انکی یہ طرز زندگی گو ایک طرف انکی عصمت و ناموس کی سب سے بڑی محافظہ ہے، لیکن دوسری طرف اسکا یہ اثر بھی ہوا کہ انکے قوای ذہنی کی تربیت نہ ہو سکی، اور ہر وقت لونڈیوں باندیوں میں گھرے رہنے سے انکی نظریں لازمی طور پر تنگ دپست ہو گئیں، گہروالیوں کی خوبی کا بڑا معیار یہ تھا کہ انکی بابت نیک یا بد کسی حیثیت سے بھی سوسائٹی میں ذکر نہ آنے پائے۔ (تاریخ اخلاق یورپ

ترجمہ اردو، جلد ۲، باب ۵، صفحہ ۱۸۰)

کیا یہ طرز معاشرت بھی مسلمانوں کے اثر و صحبت کا نتیجہ تھی؟ جو لوگ یونانی شریف زادیوں کے طرز معاشرت کی تفصیلات سے واقفیت چاہتے ہیں، جو جزئیات تک میں ہمارے ہاں کی شریف زادیوں سے ملتی ہوئی ہی انکے لئے کتاب مذکور، جلد دوم، باب پنجم کا مطالعہ از بس مفید ہوگا، (معارف)

ترکی، مصر، و عرب میں مروج ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ یہ پردہ کسی طرح عورت کی معاشری و ذہنی نشو و نما میں حائل نہیں، ہندوستان میں جو چار دیواری کا پردہ رائج ہے، اسکی تاریخ کا صحیح سراغ لگانا ممکن نہیں، لیکن میرا ذاتی خیال ہے کہ اس رسم کا مولد و منشا، ہندوستان ہی ہے، ڈولیان اور پالکیان جو شریف زاد یوں کی سواریاں ہیں، ہندوستان ہی کی ایجاد ہیں، اور صوبہ بہار اور متحدہ کے ساتھ مخصوص ہیں، یہ اگر خالص اسلامی ایجاد ہوتی تو اسکا سب سے زیادہ رواج پنجاب میں پایا جاتا کہ وہی صوبہ ہندوستان میں اسلامی آبادی کا پہلا مستقر ہے، اور ایران افغانستان، وایشیاء وسطی سے آنے کی عام گذرگاہ ہے، لیکن یہاں چار دیواری کا پردہ نہ اسقدر عام ہے اور نہ اسقدر سخت، جتنا کہ ان دھولوں میں ہے، بلکہ قصبات اور دیہات میں اور بھی زیادہ آزادی ہے، اور بعض بعض مقامات میں تو یہ رواج سرے سے غائب ہے، بمبئی دکن پر بھی اسلامی تسلط عرصہ دراز تک رہا ہے، اور شعائر اسلامی یہاں برابر جاری رہے، لیکن یہو متحدہ و بہار کا ساخت پردہ بیان مطلق نہیں، ان حالات و شواہد سے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ چار دیواری کا پردہ اسی کو رائے تقلید کا ایک منظر ہے، جو محکوم اقوام میں حکمرانوں کے طرز معاشرت سے متعلق عام ہوتی ہے، قدیم بلوک و سلاطین کی طرح جو اپنا سارا وقت قلعہ جات اور محلات کے اندر صرف کرتے تھے، جنہر ہر وقت مضبوط چوکی پہرہ رہتا تھا، اسوقت کی بیگمات اور خیرادیاں بھی اسکی جوگر ہو گئی تھیں کہ عایشان محلوں کے اندر تر کنون، جشنون، اور دوسری اقوام کی گالونوں کی حفاظت میں رہا کرین، اس طرز معاشرت کا اصل مدعا غالباً محض انہار شان و شوکت تھا، لیکن رفتہ رفتہ امرا و دارکان دربار کی بیگمات نے بھی حرم سلطانی کی تقلید شروع کی، اور اس طرح بالآخر چار دیواری کے اندر محصور رہنا لازماً عورت و شرافت قرار پا گیا، اس قسم کا پردہ ہندوستان کے باہر کہیں موجود نہیں، یہاں تک کہ ترکوں اور مغلیہ سلاطین کی تاریخ میں بھی جھوٹے ہندوستان پر

صدیوں تک حکومت کی، کہیں اس دستور کا پتہ نہیں چلتا۔

راقمہ مضمون نے انہیں دلائل کا اپنے مضمون میں اعادہ کر دیا ہے، جو ہندو عامیان پر ردہ اسکی تردید کے اسباب کے ذیل میں بیان کرتے ہیں، لیکن میں یہ عرض کر دینگا کہ تعلیم کو چھوڑ کر حقائق تاریخی پر نظر کرنا چاہیے، یہ طریقہ قرین انصاف نہیں کہ ایک قوم کو جب اپنے کسی شمار میں تقاضے محسوس ہونے لگیں تو اسکی تردید کا بار ہم ساریہ قوم پر ڈال دیا جائے، اس حقیقت سے انکار ناممکن ہے کہ کسی نہ کسی شکل میں پردہ کا وجود ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد سے قبل بھی تھا، اور پٹنہ یا دودھ پٹ کے انچل کو چہرہ پر اس طرح لٹکانا کہ گہو نگہٹ "نکل آئے، اور چہرہ بالکل چُپپ جائے، ہندوستان کی نہایت قدیم رسم ہے، جو ہر حصہ ملک میں عام ہے، اور جسکے لئے ہر ہندوستانی زبان میں لفظ موجود ہے، گہو نگہٹ کے لئے یہ ضروری ہے کہ عورت اسے سسرال کے ہر شخص کے سامنے نکال کر بیٹھے، اور صرف اتنا ہی نہیں بلکہ سسرال کے قریب پہنچتے ہی اسکا نکال لینا عورت پر واجب ہو جاتا ہے، اگر اس دستور کا نام "پردہ" نہیں تو اور کیا ہے؟ ہندوؤں کے ہاں شوہر کا اپنی ساس، سسر، سالے، یا خود اپنے والدین اور بہائی کے سامنے اپنی بیوی سے بات کرنا ایک سخت معاشری جرم ہے، وہ اپنی بیوی کے کمرہ میں دبلے پاؤں چور کی طرح داخل ہوتا ہے، کیا یہ دستور بھی اسلامی اثرات سے ماخوذ ہے؟ ہندو عورت کا بہائی کی موجودگی میں باپ کی جائداد مطلق حق نہیں ہوتا، کیا یہ بھی اسلامی تعلیم کا نتیجہ ہے؟ ہندو بیوہ اندراج ثنائی نہیں کر سکتی، بلکہ سستی ہو جانا باعثِ ثواب سمجھی ہے، کیا یہ بھی مسلمانوں کا اثر صحبت ہے؟ مسلمانوں کے اثر صحبت کا اگر صحیح اندازہ کرنا ہے تو وہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ راقمہ مضمون نے ہندوستان کی جتنی مشاہیر خواتین کا نام لیا ہے وہ ہر ایک یا دودھ کے سب اسلامی عہد کی پیداوار ہیں۔



کسنی میں شادی کر دینے کا رواج ہندوؤں ہی میں پایا جاتا ہے، اور ہندو مصلحین معاشرت  
 اسکے انسداد کی سخت کوشش کر رہے ہیں، اس سعی صلاح کی بہترین صورت یہ تھی کہ تعلیمات وید  
 کی جانب رجوع کیا جاتا، اور اپنے ہم مذہبوں کو اپنے ہاں کی صحیح تعلیم سے روشناس کیا جاتا،  
 لیکن تعلیم یافتہ مسلمان مصلحین کی طرح ہندو مصلحین معاشرت بھی خود اپنے مذہب سے ناواقف  
 ہیں، اور اسلئے وہ یہ غلط اور بے بنیاد دعویٰ کرنے پر مجبور ہو گئے، کہ قدیم ہندوستان میں کمسنی کی  
 شادیوں کا رواج نہ تھا، لیکن جب سے مسلمانوں کا قدم اس سرزمین پر آیا، انکے ظالم سلاطین نے  
 زبردستی رعایا کی لڑکیوں کو کپڑا ناسودا کیا، اس سے مجبور ہو کر ہندوؤں کے ہاں نہایت صغرسنی  
 میں شادی کر دینے کا رواج پڑ گیا، لیکن یہ حضرات اس کھلی ہوئی بات پر غور نہیں کرتے کہ اگر  
 مسلمان فرمانروا ایسے ہی بد چلن، ستم شعار، و بیگانہ مذہب تھے تو اسمین کیا دشواری تھی لڑچپن کی  
 ان برائے نام بیویوں کو بھی زبردستی انکے گھروں سے نکال لاتے؟ ”بیگانہ مذہب“ اسلئے کہا گیا کہ  
 شریعت اسلامی کی رو سے مسلمان غیر توہمن ہیں صرف یہودی دسی عورتوں سے شادی کر سکتا ہے  
 (نہ کہ ہندوؤں سے) پھر ظالم مسلمانوں کے خلاف جو اس قدر زبردست الزام لگایا جاتا ہے اسکا  
 کوئی ثبوت تائید سے ملتا ہے؟ تائید میں تو ہم نے یہ پڑھا ہے کہ ایک عظیم الشان مسلمان فرمانروا ہند  
 شیر شاہ سوری کے دلچہد نے جب رعایا میں سے ایک ہندو عورت کی توہین کی تو اسکے انتقام میں  
 اسکے شوہر کے ہاتھوں اس شہنشاہ نے اپنی بہو کی بعینہ اسی قسم کی توہین کرائی۔

میں ہندو قوم کا بہت بڑا مداح ہوں اور اسکے تمدن اور حیرت انگیز نظامات فلسفہ کا  
 پورا احترام کرتا ہوں، مجھے اسکا بھی اعتراف ہے کہ ہندو عورت عصمت و وفا شعار کا مجسمہ،  
 اور محبت و شفقت کی دیوی ہوتی ہے، براہ منہم یہ تو نہیں ہو سکتا کہ مفروضات کو تاریخی حقائق کا  
 درجہ دیدیا جائے،

برہٹین اینڈ انڈیا کی کسی آئینہ اشاعت میں اس موضوع پر لکھننگا کہ اسلام نے عورت کا کیا مرتبہ قرار دیا ہے، سر دست صرف اتنا کہنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ یہ دعویٰ کہ ”اس مردانہ مذہب (اسلام) نے عورت کی رُوح تک نہیں تسلیم کی ہے۔“ نہ صرف بے بنیاد بلکہ مفلکہ خیر بھی ہے،

(برہٹین اینڈ انڈیا)

## روحانیت و نظام تعلیم

یورپ کو روحانیت سے جو بیگانگی ہے کسی سے پوشیدہ نہیں، یہی سبب ہے کہ اُسکے نظام تعلیم میں روحانیت کی مطلق گنجائش نہیں، اُسکے نصاب کتب، آئین درس، اصول تعلیم کسی شے کو روحانیت سے کوئی تگ و بہنیں، لیکن حال میں لندن کے ایجوکیشنل ٹائمز میں روحانی بنیاد کے عنوان سے ایک مضمون شائع ہوا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہوا کا رخ کچھ بدل چلا ہے، ٹائمز کا تعلیمی ضمیمہ اپنے دائرہ میں نہایت با وقعت و معزز پرچہ ہے، اس کے ایڈیٹوریل کالموں میں اس مضمون کا شائع ہونا ایک خاص اہمیت رکھتا ہے، ذیل میں اسکی تلخیص ہدیہ ناظرین ہے۔

ٹائمز کا مقالہ نگار لکھتا ہے کہ اگرچہ آج تک کسی کی بھی زبان سے یہ صاف صاف نہیں نکلا ہے، تاہم حقیقت نفس الامر یہ ہے کہ نظام تعلیم کی اصل بنیاد روحانیت اور صرف روحانیت ہی ہو سکتی ہے، اور جب تک خود طالعلم کو اسکا احساس نہ ہوگا، اسکی تعلیم، تفسیح و تفسیر کے مرادف رہیں گی، ایک گروہ اس حقیقت کا اظہار ان الفاظ سے کرتا ہے کہ واجب الوجود یا خدا کی تلاش و جستجو روح بشری کے سرشت میں داخل ہے، اور تعلیم کا مقصد اس جذبہ روحانی کی

تسکین رسانی ہے، تعلیم کی یہ تعریف ان لوگوں کے لئے حجت نہیں ہو سکتی جو روح، خدا، و واجب الوجود ہی کے سرے سے منکر ہیں، اور اتنا تو بہر حال یقینی ہے کہ یہ تعریف کم عمر لڑکوں کی فہم سے بالاتر ہے، لیکن روح و خدا کے نام سے جتنا بھی انکار کیا جائے، روحانیت کو اساس تعلیم قرار دینے سے کسی طرح مفر نہیں، اسلئے کہ منکرین جو یہ کہتے ہیں کہ تعلیم کا مقصد اصل تلاش حقیقت ہے سو یہ حقیقت کیا ہے، بجز اسکے کہ واجب الوجود ہی کا ایک مرادف ہے، اور پھر یہ تعریف جامع و مانع بھی نہیں، اسلئے کہ واقفہ روح کی تشنگی محض صداقت رسی تک محدود نہیں، اسکا مطمح تو ایک ایسی شے ہے جسکا پورا اظہار آج تک فلسفہ یا مذہب کسی کی زبان میں بھی نہیں ہو سکا ہے۔

تعلیم کو ہمیشہ زبان حال سے یہ کہتے رہنا چاہیئے کہ میری بادشاہت اس دنیا کے لئے نہیں اور اگر وہ یہ نہیں کہتی تو تعلیم، تعلیم نہیں، بلکہ طالب علم کو چند شعبہ بازیوں کی تدریس رہ جاتی ہے، جسکے سیکھنے کی اسکے پاس کوئی وجہ موجبہ نہیں، فرض کرو ہم طالب علم کو تعلیم کا مقصد یہ بتائیں کہ یہ ذریعہ حصول معاش ہے، تو طلبہ کی ایک جماعت پر تو اسکا مطلق اثر ہوگا، انکی فہم سے یہ فلسفہ بالاتر ہے کہ ذریعہ حصول معاش تک دسترس ہو جانا بھی کوئی ایسی چیز ہے، جسے مقصد حیات سمجھا جائے، رہی طلبہ کی وہ جماعت جسپر یہ جادو چل سکتا ہے، اور جو تعلیم کی اسی تعریف پر قناعت کر سکتی ہے، وہ اپنی لپٹ خیالی و تنگ نظری کے خیال سے کسی شمار و قطار میں نہیں، واصل ہر نفس میں روح کی گرسنگی و ولایت کی گئی ہے، اور اس جذبہ کی سیری بجز کسی عقیدہ رہ جانیت کے ممکن ہی نہیں، ضرورت اسکی ہے کہ اس احتیاج فطری کو کسی منضبط طریقہ پر ظاہر کیا جائے اور اسکی بنیاد پر آئندہ نظام تعلیم مرتب ہو،

اتک اسکی شدید ضرورت پر متوجہ ہونے کا یہ نتیجہ ہے، کہ ہماری نوعمری ہی کے زمانہ سے زندگی ہم پر بار ہونے لگتی ہے، اور پھر ہماری ساری عمر اسی بین گزرتی ہے کہ اس ناگوار کیفیت کو

خود اپنے نفس سے مخفی رکھیں، اس خدع نفس دسی اخفا کی تعلیم ہمیں یہی سنے لگتی ہے،  
 تاآنکہ بالغ ہو کر ہمارے سارے مشاغل اسی محور پر گردش کرتے ہیں، پہلے ہم حوائج اصلی سے  
 کہیں زاید رویہ کھاتے ہیں، اور اس اکتساب زر کے لئے بیسود مشاغل میں ہمیں پڑنا پڑنا ہی  
 پھر اس دولت کو ان مشاغل میں اڑاتے ہیں، جبکہ متعلق ہم اپنے نفس کو یہ دھوکا دیتے رہتے ہیں،  
 کہ ان سے لذت و لطف، انبساط و تفریح حاصل ہوتی ہے، وقت کا ایک حصہ لہو و لعب میں  
 اس انہماک اور خضوع و خشوع کے ساتھ صرف کرتے ہیں کہ گویا ارکان مذہب ادا کر رہے ہیں  
 فنون و صنائع چہر ہم جان دیتے ہیں وہ ایسے ہیں جنہیں واقعہ محض و جمال کی مطلق آمیزش نہیں  
 ہوتی، دنیا میں دوڑتے اس تیزی کے ساتھ ہیں کہ کسی شے پر نگاہ نہیں ٹہرنے پاتی، سو سانسٹی  
 جبکہ بغیر ہم زندگی نہیں گذار سکتے، اسے رفاقت و حقوق صحبت سے کوئی واسطہ نہیں، بلکہ وہ  
 بالکل اس طرح جیسے چوپایوں کو گلہ میں رہنے سے لطف آتا ہے، غرض دنیا اس وقت ایسے نہیں  
 و پر قوت افراد سے معمور ہے جو ہر وقت غل کرتے رہتے، اور مجمع میں اپنے تئیں گھیرے رکھتے ہیں  
 اسلئے ہمیں کہ انہیں اپنے انبا سے جنس سے کچھ محبت ہے، بلکہ اسلئے کہ مباداتہائی میں اور سکوت  
 و سکون کے وقت خود انکی رُوح ان سے کلام کرنے لگے، اور انکے نفوس پر کشف حقیقت ہونے لگے،  
 یہ تمام ثمرہ ہے اس نظام تعلیم کا جسکی بنیاد روحانیت پر نہیں، جو جذبہ روحانی کا منکر ہے اور جو  
 دل کو سیر و تفریح، کاروبار، اور نمائشی فرض شناسی کے خیالات سے بہلائے رکھنا چاہتا ہے۔  
 اس فرض شناسی کو نمائشی اسلئے کہا گیا کہ حقیقی فرض شناسی بھی بغیر روحانیت کے کسی اور  
 بنیاد پر نہیں قائم ہو سکتی، اور روحانیت اپنے اندر فرض شناسی سے زائد کچھ معنی رکھتی ہے،  
 روحانیت کے وسیع مفہوم میں یہ داخل ہے کہ روح ایک جذبہ اشتہار کہتی ہے، نیز کسی ایسی  
 ہستی کا وجود ہے جو اس جذبہ کو تسکین دیکتی ہے، اس ہستی کا کوئی موزون و مناسب نام اب تک

ہنین دستیاب ہو سکا ہے، اور اسی عدم تعمین اسم کے باعث لوگ اب تک یہ سمجھ رہے ہیں کہ اسکا وجود ہمارے کاروباری اور تفریحی مشاغل کے لئے سب راہ ہوگا، لوگ اس موقع پر "خدا" اور "مذہب" کا نام لین گے، لیکن یہ اسماء ہماری ضرورت کے لئے کافی نہیں، پھر ان الفاظ کے ساتھ بعض دوسرے تصورات ایسے وابستہ ہو گئے ہیں، جنکی بنا پر ان سے کام لینا اور بھی دشوار ہو گیا ہے، اصل یہ ہے کہ رُوح کی اشتہار کو موجودہ اسماء و مصطلحات میں سے کوئی ایک شے مٹی تسکین نہیں دے سکتی، اس نامعلوم و ناگزیر ہستی کے لئے کوئی جدید نام وضع کرنا چاہیئے اور اس ہستی کا وجود تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں، لیکن وہ ہستی کیا ہے؟ اصل سوال یہ ہے، نظام تعلیم میں اس المسائل اسی مسئلہ کو رکھنا چاہیئے، اور تعلیم کا مقصد اسی مسئلہ کا حل قرار دینا چاہیئے، تعلیم کا مفہوم اب تک جو یہ شائع ہو رہا ہے کہ جو کچھ معلومات ہوں، انہیں دوسروں تک پہنچایا جائے، اسے بدل کر اب اسکا مفہوم یہ قرار دینا چاہیئے، اسی مجہول اور غیبی آخری ہستی کا انکشاف کیا جائے،

آئندہ سے طلبہ کے پیش نظر اصل مسئلہ صرف یہ رہنا چاہیئے کہ وہ پس پردہ ہستی کیا ہے؟ یہی سوال اُن میں شوق تجسس و تحقیق پیدا کریگا، اور اسی دہن میں انہیں اپنی ساری توجہ صرف کرنا چاہیئے، اگر اس سوال کو مادی مشاغل کے بارے میں دبانے کی کوشش کی جائے گی تو نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم روز بروز صداقت سے دُور ہوتے جائیں گے اور نظام اجتماعی کا شیرازہ برابر منتشر ہوتا جائیگا۔

## اَلْحَيَاةُ عَلِيَّةٌ

داسننگٹن (امریکہ) کے ڈاکٹر آرتھر میکڈانلڈ نے اپنی رائے یہ ظاہر کی ہے کہ دائرہ ہی منڈاتے رہنے سے چہرہ کے عصبی دو گیر امراض پیدا ہوتے ہیں، اور بالآخر اسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کو طویل العمری نصیب نہیں ہوتی، نیویارک کے طبی رسالہ مڈیکل ریکارڈ میں ڈاکٹر مروف اپنی یہ رائے لکھ کر دوسرے ڈاکٹروں کو بھی اس جانب متوجہ کرتے ہیں،

تقطیع کے لحاظ سے یورپ میں سب سے چھوٹی کتاب مشہور اطالوی شاعر دانستے کی "نویو این کامیڈی" کا ایک نسخہ فریخ زبان میں ہے جو ۱۸۸۲ء میں پیرس کی نائٹس میں پیش ہوا تھا اسکی ضخامت ۷۰۰ صفحہ سے اوپر ہے، مگر اسکا سائز نصف انچ مربع سے بھی کم ہے! اس سے اتر کر ایک انگریزی کتاب "بیجو المانک" مطبوعہ ۱۸۳۷ء ہے، جسکی تقطیع کا طول ۱/۲ انچ اور عرض ۱/۴ انچ ہے! جان دیور کی ایک کتاب "ایگنس ڈی" (۱۸۶۷ء) طول میں ۱/۴ انچ اور عرض میں ۱/۴ انچ ہے!

انگلستان کا ایک علمی رسالہ لکھتا ہے کہ دنیا کے موجودہ کتب افسانہ بین قدیم ترین کتاب "دوبائیون کا افسانہ" (The Tale of the Two Brothers) ہے، جو آج سے کچھ اوپر تین ہزار برس ہوئے تصنیف ہوئی تھی، مہربین ایک بادشاہ مرلفظہ ہوا ہے، جسکا ذکر توریت کے باب خروج میں آیا ہے، یہ افسانہ اسی کے دربار کے ایک عالم نے اسکے دیعہہ کیلئے

تصنیف کیا تھا، جو آگے چل کر مستی ثانی کے لقب سے تخت نشین ہوا اور جب کفلی دستخط اس کتاب میں دو جگہ موجود ہیں، یہ کتاب قدیم طرز کے چرمی کاغذ کے بڑے بڑے انیس درقون پر ہیرہ غلافی رسم الخط کے علی حروف میں لکھی ہوئی سترہ سہ سے برٹش میوزیم میں موجود ہے،

علم حشرات الارض کے ماہرین کی ایک کانفرنس کچھ روز پہلے لندن میں منعقد ہوئی تھی اسکے سامنے امریکہ کے ڈاکٹر بیلو نے بیان کیا کہ جن چیزوں کو کیڑوں مکوڑوں سے نقصان پہنچتا ہے، ان میں سب سے بڑا ہوا نمبر ردی کا ہے، دنیا میں جب قدر ردی کیڑوں کے ذریعہ سے برباد ہوتی اتنی اور کوئی چیز نہیں ہوتی، سالہ ۱۹۱۰ء میں امریکہ کی نوریا ستون میں تیار شدہ ردی کے گٹھون اور اسکے تخم کو صرف ایک قسم کے کیڑے سے جو مالی نقصان پہنچا، اسکی مجموعی میزان ۴ کروڑ پونڈ سے کچھ اوپر تھی، اور اسکو نقصان پہنچانے والا صرف یہی ایک کیڑا نہیں بلکہ کثرت ہیں،

ایک سائنسٹک رسالہ لکھتا ہے کہ قدیم سلاطین کے ہاں جو پانی پینے کے کٹورے اور گلاس اگینڈے کی سینگ کے بنائے جاتے تھے تو یہ دستورانکے اس عقیدہ پر مبنی تھا کہ اگر پانی یا شربت میں زہر ملا ہوگا تو اسکے اثر سے فوراً آسمین بلبے اُٹھنے لگیں گے، اور اس طرح زہر کا حال کھل جائیگا۔

پروفیسر لی، گجر، جنون نے ماہ گذشتہ میں دفات پالی، مغربی ہند کے بہترین ماہر کیمیا ایت تھے، انکی سائنسٹک اور کیمیا دی عظمت یورپ کے علمی حلقوں میں مسلم تھی، اور انکے بعض کارنامے انکے معاصرین کے لئے باعث رشک تھے۔

گزشتہ دس سال کے اندر ملک میں جتنی ایجادیں مینیسٹ کرائی گئیں، ان میں بڑی تعداد ان اشیاء کی ہے، جنکے موجد یورپ و امریکہ کے باشندے ہیں، ان سے گہٹ کر ان غیر ملکیتوں کی تعداد ہے جو ہندوستان میں متوطن ہیں، اور سب سے آخر میں خود ہندوستانیوں کا نمبر آتا ہے، ہر سہ طبقہ کا تناسب اعداد ذیل سے ظاہر ہوگا۔

سال	باشندگان بیرون ہند	باشندگان ہند	میزان
۱۸۷۱ء	۲۶۸	۱۳۷	۶۶۷
۱۸۸۱ء	۶۰۱	۱۲۲	۸۰۷
۱۸۹۱ء	۵۰۸	۱۲۰	۶۷۸
۱۹۰۱ء	۵۰۸	۱۳۲	۶۴۰
۱۹۱۱ء	۴۱۵	۱۱۷	۵۸۸
۱۹۲۱ء	۲۷۰	۱۰۵	۳۷۵
۱۹۳۱ء	۲۷۶	۱۰۵	۳۸۱
۱۹۴۱ء	۳۵۹	۱۲۹	۴۸۸
۱۹۵۱ء	۴۱۲	۱۵۵	۵۶۷
۱۹۶۱ء	۷۲۶	۲۰۰	۹۲۶

یورپ کے مشہور و معروف شاعر دانستے باشندہ اٹلی کی وفات ستمبر ۱۹۲۱ء میں ہوئی تھی لندن یونیورسٹی نے یہ طے کیا ہے کہ اسکی چھٹی صد سالہ برسی لندن میں مئی ۱۹۲۱ء میں دہوم دہام منائی جائے اور اسکے لئے حسب ذیل نظام عمل قرار پایا ہے:-



(۱) یونیورسٹی کالج اور اسکے تمام ڈیپارٹمنٹس میں جنہیں اطالوی زبان کی تعلیم ہوتی ہے، دانتے کے متعلق عام لکچر دیئے جائیں گے،

(۲) مختلف علمی و ادبی مجالس کے زیر اہتمام بھی دانتے اور اسکے کلام سے متعلق لکچر دیئے جائیں گے۔

(۳) دانتے سے متعلق کتابوں، تصویروں، کتبوں، مسودوں، وغیرہ کی ایک نمائندگی لندن یونیورسٹی کالج میں قائم ہوگی، جہاں اسکے متعلق ہر قسم کا نادر و کمیاب ذخیرہ فراہم کیا جائیگا۔

(۴) ”یادگار دانتے“ کے نام سے ایک مستقل کتاب شائع کی جائیگی، ان اغراض کی تکمیل کے لئے ایک مختصر کمیٹی مقرر کر دی گئی ہے جس میں اساتذہ زبان اطالوی شامل ہیں، اور جس کے صدر، سفیر اٹلی متینہ لندن ہیں،

برلن کے ڈاکٹر والد شمش نے اپنا نظریہ یہ پیش کیا ہے کہ مے نوشی ایک قسم کا دماغی مرض ہے جسے انسان اکتساب سے نہیں بلکہ پیدائش سے ساتھ لاتا ہے، دماغ اگر اپنی صحیح طبعی حالت میں ہے تو اسے قدرت مے نوشی سے احتراز دے گی، اسکی جانب رغبت انہیں افراد کو ہوتی ہے، جو مروجہ ضعیف دماغ لیکرو دنیا میں آتے ہیں، ڈاکٹر موصوف کے نزدیک مے نوشی ایک بد اخلاقی نہیں بلکہ ایک دماغی مرض کا نام ہے،

برٹش میوزیم (لندن) کے شعبہ مشرقی میں دادی نیل کی بنی ہوئی مٹی کی ایک خاکی تختی موجود ہے، جو طول میں آٹھ انچ اور عرض میں چار انچ ہے، اس پر انہا نوے سطریں نہایت خوشخط لکھی ہوئی ہیں، تقریباً سترہ سہاترہ قبل مسیح میں ایک فرعون مصر نے بابل کی ایک شہزادی کو

نکاح کا پیغام دیا تھا، یہ سختی اسی خط کی نقل ہے، خیال کیا جاتا ہے کہ دنیا میں اس سے قدیم تر کوئی نسبت (منگنی کا پیام محفوظ نہیں)

پچھلے دنوں پیرس میں یورپ کی مجالس مشرقیہ کا جو متحدہ جلسہ ہوا تھا، اور جبکا ذکر کسی پچھلے معارف کے اخبارِ علمیہ کے ذیل میں آچکا ہے، اسکے سامنے مشہور مستشرق سر جارج گریسن نے السنہ ہند سے متعلق اپنی رپورٹ سنائی، اس رپورٹ میں بحرِ دکن و برہما کے اور کل السنہ ہند کا ذکر ہے، یعنی اس خطہ ارض کی زبانیں جسکے حدود اربعہ یہ ہیں، شمال میں کہستان پامیر، جنوب میں شہر گودا، مشرق میں آسام کی سرحد مشرقی، اور مغرب میں ایران کی سرحد مشرقی، اس علاقہ کے اندر سر جارج گریسن کے استقصاء میں، ۷۹ مستقل زبانیں اور ۴۴۵ انکی شاخیں (بولیاں) متعلق ہیں، جنکی تقسیم بخوان نے طبقات ذیل میں کی ہے :-

طبقہ	زبان	شاخ زبان یا بولی
مون کہیر	۱	۳۰
سنڈا	۶	۱۱
سیامی چینی	۳	۴
بتی برہمی	۱۱۳	۸۲
ڈراویدی	۱۶	۲۳
ایرانی	۸	۳۵
ڈارڈی	۱۳	۲۲
انڈو آریائی	۱۴	۳۴
مختلف	۲	۱۹

سر جارج گریسن کے زیر اہتمام اس وقت تک "ساحت السنہ ہند" کے نو ضخیم مجلدات شائع ہو چکے ہیں، دسویں جلد جس میں ایرانی زبانوں کا بیان ہے، زیر طبع ہے، اور عنقریب شائع ہو جائیگی۔ گیارہویں جلد بھی مرتب ہو چکی ہے، اور پریس میں جانے کے لئے تیار ہے، اس میں ان زبانوں کا تذکرہ ہے، جو خانہ بدوش و جرائم پیشہ قبائل بولتے ہیں،

اہرام مصری کی طرح میکسکو (امریکہ وسطی) میں بھی چند بلند منارے ہیں، جنکے نیچے غار ہیں، حال میں انہیں غاروں کے ایک کتبہ میں چند الفاظ ایسے منقوش ملے ہیں، جو قدیم چینی رسم الخط میں ہیں، انگلستان کا مشہور مہفتہ دار ایسٹریٹھ لندن بیوز ان نقوش کی تصاویر دیکھتا ہے کہ اس سانی اکتشاف سے علماء علم الانسان کے اس خیال کی توثیق ہوتی ہے کہ باشندگان امریکہ دراصل ایشیائی نسل کے ہیں، کالیفورنیا یونیورسٹی کے پروفیسر جان فرایر کا دعویٰ ہے کہ کولمبس کے زمانہ سے تقریباً ایک ہزار سال قبل چین کے بعض بودھی مشنری پانچویں صدی عیسوی میں امریکہ کو دریافت کر چکے تھے، اور امریکہ کا ابتدائی تمدن چینی تمدن تھا،

دائنا (اسٹریا) یونیورسٹی کے طبی پروفیسر ڈاکٹر اسٹیناک نے دعویٰ کیا ہے کہ وہ ایک خاص اپریشن کے ذریعہ سے جو ایک غدد پر کیا جاتا ہے، بوڑھوں کو جوان بنا سکتے ہیں، اسکا بیان ہے کہ انھوں نے متعدد مسن و ضعیف العمر اشخاص پر یہ عمل جراحی کیا، اور ان سب کی نہ صرف ظاہری شکل و صورت نوجوانوں کی سی ہو گئی، بلکہ دماغی و جسمانی قوی کے لحاظ سے بھی وہ از سر نوجوان بن گئے، اسٹریا کے طبی حلقوں میں ان تجربات سے متعلق سرگرم مباحثہ ہو رہا ہے۔

فرانس میں اسوقت یونیورسٹیوں کی مجموعی تعداد سترہ ہے، ان میں سے بجز دو کے ہر یونیورسٹی علوم، فنون، قانون، طب، و دوا سازی کے پانچ بڑے شعبوں میں تقسیم ہے، سلسلہ میں نو<sup>۹۱</sup> یونیورسٹیاں ایسی ہیں جنہیں ڈیڑھ ڈیڑھ ہزار سے زائد طلبہ تھے، تین ایسی ہیں جنہیں دو دو ہزار سے زائد طلبہ تھے، لیانس یونیورسٹی میں تین ہزار تھے، اور خود پیرس یونیورسٹی میں ۱۵۰۰ تھے، لیانس یونیورسٹی سے ملحق ایک مشرقی دارالعلوم بھی ہے جس میں سنسکرت، عربی، ترکی، و ہندی زبانوں اور مصر کے آثار و علوم کی تعلیم ہوتی ہے۔

امریکہ میں جو عورتوں کے لئے ایک جداگانہ یونیورسٹی کی تحریک ہوئی تھی، اسکی پرزور مخالفت خود طبقہ نسوان کی طرف سے ہو رہی ہے، یہ لوگ کہتی ہیں کہ عورتوں کی تعلیم مردوں سے علیحدہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں، دونوں کا نصاب درس و طریقہ تعلیم بالکل ایک ہونا چاہیئے۔

مسٹر کینڈی جونز نے انگلستان کے نامور رسالہ فارٹ ناٹیلی ریلو کی ایک تقریبی اشاعت میں صحافت کے تاجرانہ پہلو پر ایک دلچسپ مضمون لکھا ہے، جس میں وہ کہتے ہیں کہ انگلستان کے بڑے اخبارات دراصل بڑی بڑی تاجرانہ اور کاروباری کمپنیاں ہیں، چنانچہ ایننگ نیوز سلسلہ میں ۲۵ ہزار پونڈ کے سرمایہ سے خرید اگیا تھا، ڈیلی میل سلسلہ میں ۳۰ ہزار پونڈ کے سرمایہ سے قائم ہوا، ویکلی ڈسپینچ (ہفتہ وار) ۲۵ ہزار پونڈ کی قیمت سے جدید مالک کے قبضہ میں آیا تھا، اور چند سال کے بعد جب یہ تینوں اخبارات ایسوسی ایٹڈ نیوز میسر کمپنی کی ملک میں آئے تو ان کا سرمایہ ۱۶ لاکھ پونڈ قرار پایا! اس کمپنی کے حصوں کی قیمت روزانہ ٹائمز کے تجارتی کالموں میں شائع ہوتی رہتی ہے، خود اخبار ٹائمز جس کمپنی کی ملک ہو وہ سلسلہ میں

۱۶ لاکھ پونڈ کے سرمایہ سے قائم ہوئی ہے،

ڈاکٹر جے، سی لنگ نے مدت کی تحقیقات کے بعد یہ دعویٰ پیش کیا ہے کہ امراض متعدی خصوصاً متعلق بہ خلق و شش کے پسینے کا ایک بہت بڑا ذریعہ میز کے کانٹے، چھری، اور چمچے ہوتے ہیں، مریض جس چھری کانٹے سے کھانا کھاتا ہے، اگر انہیں اسی پانی میں دھویا جائے جس سے تندرست اشخاص کے کھانے کے چھری کانٹے صاف کئے جائیں تو جراثیم امراض لازمی طور پر ان میں منتقل ہوتے ہیں،

ماہ گذشتہ انگریزی داور کی اساتذہ ادب انگریزی کی ایک مشترک کانفرنس ترقی و تحفظ زبان انگریزی کی تدابیر پر غور کرنے کے لئے لندن میں منعقد ہوئی، اسی کے ساتھ نوادار کتب انگریزی کی ایک مختصر سی تالش کا بھی انعقاد ہوا، اس نمائش میں جو برٹش میوزیم کے ایک حصہ میں قرار پائی تھی، تقریباً تین سو کتابوں کا ذخیرہ تھا، جن میں سے بعض کتابیں ساڑھے چار سو برس کی بہتیں اور باقی اسکے بعد کی، یعنی سولہویں، سترہویں اور اٹھارہویں صدی کی کہتیں،

ایک انگریزی طبی رسالہ لکھتا ہے کہ نشست کا قدرتی طریقہ زمین پر بیٹھنے کا ہی، یاد رہے دو تین صدیوں سے بجائے فرش یا تخت کے کرسیوں پر پیر لٹکا کر بیٹھنے کے طریقہ کو جو رواج دیا ہے وہ سترہویں صدی قدرتی ہے، اور صحت کیلئے اسکے مضرات روز بروز ظاہر ہوتے جاتے ہیں، چنانچہ ایک فریخ ڈاکٹر اپنے تجربہ کی بنا پر کہتا ہے کہ قبض جس آسانی سے کرسی نشینوں کو ہوتا ہے، تخت و فرش نشینوں کو نہیں ہوتا، قبض کے علاوہ اسفل حصہ جسم کی بعض اور بیماریاں

بھی کرسی پر بیٹھے رہنے سے پیدا ہو جاتی ہیں،

اندھوں کی تعلیم کان کے ذریعہ سے ہونے کا جو آلہ آپٹوفون (Optophon) ڈاکٹر ای، فورنیر ڈی ایلبے نے ایجاد کیا تھا، اس میں گلاسکو کے ڈاکٹر بارڈاسٹرڈ نے اصلاحات کر کے اب اسے اس حالت تک پہنچا دیا ہے کہ اس سے بخوبی کام لیا جانے لگا ہے، اسکے ذریعہ سے حروف کو اصوات موسیقی میں تبدیل کر دیا جاتا ہے، اور انہیں ٹیلیفون کے واسطے سے نابینا طالب علم کے کان تک پہنچا دیا جاتا ہے۔

# ایک دنیا

عزیز گلہنوی

ہوگا ہر حال میں جو عشق کی تقدیر میں ہے  
خواب ہستی کا نتیجہ نظر آتا ہے مگر  
دو دن عالم کو جو تقسیم ہوا روزِ ازل  
بزمِ ہستی میں ضروری ہوئی روحِ روان  
سنگ بنیا دوہ دل ہر حرکت جسکی حیات  
سخت ہی مجرمِ ہستی کی سزا ای مالک  
حرف آلودہ بخون گوش بردارِ جہان  
بزمِ ہستی کا مٹانا ہی مگر ہے منظور  
یہ مرے غم کی حقیقت ہے کہ روزِ خلقت  
کارکنِ حن ازل پر وہ تدبیر میں ہے  
دل کی غفلت کہ ابھی حسرتِ تعبیر میں ہے  
وہ اثر صرف مرے نالہ شکیں میں ہے  
ایک جنبش سی جو اس پر وہ تصویر میں ہے  
ابتدا ہی سے خرابی مری تعبیر میں ہے  
میری رگ رگ مجھے جکڑے ہوئے نچر میں ہے  
پوچھتے کیا ہوا اثر جو مری تقریر میں ہے  
مصلحت کوئی ضرور آپ کی تاخیر میں ہے  
جو کسی نے نہ لیا وہ مری تقدیر میں ہے

وقت ضائع نہ کرو ہرزہ سرائی میں عزیز

سوز پیدا نہ کرو جو سخنِ میر میں ہے

(۲)

کرنا ہی اپنے حال میں شبِ بسر مجھے  
یہ کہلے میں نے زہر کا اک جام پی لیا  
اب آکے دیکھینگا قریبِ سحر مجھے  
لینے نہینگے چین کبھی چارہ گر مجھے  
دیکھوں تو کیا دکھائے یہ ذوقِ نظر مجھے  
جلوؤں کو انکے شوق کہ پیدا کر دنِ حجاب

اندازہ میرے حال کا ہو گا یہی ہنسن  
تکلو بھی اپنی قدر ہو دیکھو اگر مجھے  
شاہد ترے وجود پہ ہے میری بخودی  
میں ہوں اگر تو کیوں ہنسن اپنی خبر مجھے  
کوئی تصور اسکی نگہ کا ہنسن عسز  
محبور کر رہی ہے خود اپنی نظر مجھے

### ہادی پٹی شہری

سخت آفت میں ہاں بھی دل حیران ہو گا  
حشر اک جلوہ گرے عتوہ فروشان ہو گا  
راہِ حسرت مری امید میں پناہ ہو گا  
شوقِ برگشتگی بخت کا سامان ہو گا  
میرے دم تک ہی تری بزمِ تم کی رونق  
کون دلا دے غمہائے فراوان ہو گا  
شکل ہی اسکی بدل دیگا مراجعش جنون  
مجھے الجھیکا تو داماں بھی داماں ہو گا  
تکلو بھی ہو گی نہ سرگرمی حالت کی خبر  
سوزِ دل دوو چرخِ تیرے داماں ہو گا  
فتنہ حشر جے سب نے سمجھ رکھا ہے  
تیرے دیوانوں کا اک خواب پریشان ہو گا

زندگی اسکی ہے موقوف اسی پر ہادی

درِ خود ہی دلِ محزون کا گھبانا ہو گا



## مَطْبُوعَاتُ جِدَا

الاستدلال، فن منطق پر اگرچہ ہماری زبان میں متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں، تاہم مولوی محمد سجاد مرزا ایک صاحب دہلوی پر و فیس نظام کالج حیدرآباد نے جو کتاب تالیف فرمائی ہے، وہ اپنے مواد، جامعیت اور زبان کے لحاظ سے سب سے بہتر ہے، اس میں انھوں نے قدیم اور جدید دونوں منطق کے مسائل بیان کئے ہیں، جس سے غیر انگریزی دان طبقہ کو یورپ کی منطق سمجھنے میں آسانی ہوگئی ہے، پر و فیس صاحب نے اصطلاحات کے وضع کرنے میں بھی خاص احتیاط کی ہے، اور حتی الامکان قدیم اصطلاحات کو برقرار رکھا ہے، کتاب کی قیمت ۳۰ روپے ہے، اور پر و فیس صاحب سے بازار عیسوی میان حیدرآباد دوکن کے پتہ سے مل سکتی ہے،

العقائد، مولانا آزاد سبحانی شیخ جامعہ الہیہ نے فن عقاید پر یہ کتاب تصنیف فرمائی ہے، اردو زبان میں اس موضوع پر اگرچہ اور بھی کتابیں لکھی گئی ہیں، تاہم ان میں کوئی بھی دینی کتاب بننے کی صلاحیت نہیں رکھتی تھی، مولانا سے موصوف نے اس کتاب کے ذریعہ سے اسی کمی کو پورا کیا ہے، اور بچوں اور عام مسلمانوں کے فائدہ کے لئے سلیس اور عام فہم زبان میں اسلام کے عقاید تحریر کئے ہیں، کتاب تین حصوں پر مشتمل ہے، یہ اسکا پہلا حصہ ہے اور اسکی قیمت ۱۲ روپے ہے، ملنے کا پتہ: حلیم دارالتصنیف کانپور یا دائرۃ ادیبہ لکھنؤ،

ٹُرکی اور یورپ، سلطنت عثمانیہ کے خلاف آج کل یورپ میں جو جدوجہد ہو رہی ہے اور سُلُطَہ ٹُرکی کا جس طرح خاتمہ کیا جا رہا ہے، مولوی عبد الرزاق خان ندوی نے اس کے متعلق ایک سلسلہ مضامین نکالنا شروع کیا ہے، یہ رسالہ اس سلسلہ کی پہلی کڑی ہے، اس میں انھوں نے

۱۷۹۶ء سے ۱۸۹۶ء تک کے واقعات لکھے ہیں، اور اس زمانہ کے بعد کے واقعات کو دوسرے رسالوں کے لئے اٹھا رکھا ہے، جو عنقریب پریس سے نکلنے والے ہیں، مولوی صاحب موصوف کو اس رسالہ کی اشاعت میں بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہی، اسلئے اُسکے کفارہ کی صرف یہ صورت ہو سکتی ہے کہ پبلک کی طرف سے علی طور پر اسکی قدردانی کا اظہار کیا جائے، رسالہ کی قیمت ۶ روپے اور ارشاد بک ایجنسی نمبر ۱۹۱ گنگا پرشاد روڈ لکھنؤ سے مل سکتا ہے،

**حیات گاندھی**، خواجہ سید عزیز حسن صاحب نقشبندی نے موجودہ رہنمایان ہند کی سوانح عمریوں کا ایک سلسلہ شروع کیا ہے، زیر ریویو کتاب بھی اسی سلسلہ کی ہے، اس میں آئینوں نے مسٹر گاندھی کے عام حالات، اطلاق عادات اور ان تمام کارناموں کا تذکرہ کیا ہے جو انھوں نے وطن اور آبائے وطن کی فلاح و بہبود کے لئے انجام دیئے ہیں، ابتدا میں مسٹر گاندھی کی تصویر بھی ہے، قیمت ۸ روپے۔

**فسانہ سعید**، جناب راشد الخیری صاحب دہلوی افسانہ نویسی میں عام شہرت کھتے ہیں، یہ کتاب انہیں کے قلم سے نکلے ہوئے ہے، جس میں ایک سوتیلے باپ کے مظالم اور مظلوم بچوں کی دردناک حالت کا موثر الفاظ میں نقشہ کھینچا گیا ہے، قیمت ۱۲ روپے، دونوں کتابوں کے ملنے کا پستہ: حسن اینڈ کو، کوپہ چیلان دہلی۔

**التحقیق**، مولوی احسان اللہ صاحب عباسی وکیل گورکھپور اپنی تصانیف اور قانون دانی میں مشہور ہیں، یہ اخبار انکے صاحبزادہ مسٹر وحید عباسی نے جاری کیا ہے، اسکے ایڈیٹر مسٹر محمد فاروق ایم، ایس سی اور سید کامل حسین ایم، اے ہیں، جن میں اول الذکر ہمدرد کے سب ایڈیٹر رہ چکے ہیں اور موخر الذکر نے مسلم گزٹ کے اشاعت میں آخری طور پر کام کیا ہے، اخبار عمدہ ہے اور واقعات حاضرہ پر آزادی کے ساتھ اپنی رائے کا اظہار کرتا ہے، قیمت سالانہ للہ ر۔

جلد ششم ماہ صفر ۳۵ مطابق اکتوبر ۲۰ء عد و چهارم

## مضامین

۲۴۱-۲۴۲	شذرات
۲۴۱-۲۴۲	آیت استخلاف
۲۴۲-۲۴۲	ایک غلطی کا اعتراف
۲۴۵-۲۴۸	مصریوں کی مذہبی حالت
۲۸۶-۲۸۶	مسلمانوں کا دور تنزل ختم ہو گیا
۲۹۲-۲۸۸	روح کی حقیقت
۳۰۱-۲۹۳	ہربرٹ اسپنسر
۳۵-۳۰۲	الاستدلال
۳۱۵-۳۰۶	اخبار علیہ
۳۱۸-۳۱۶	ادبیات
۳۲۰-۳۱۹	مطبوعات جدیدہ

## جدید مطبوعات

روح الاجتماع، یعنی ڈاکٹری بان کی کتاب "جماعتہائے انسانی کے اصول الفیہ کا

ترجمہ، از مولانا محمد یونس زرنگی محلی، قیمت دو روپیہ،

"مینجر"

## مشکلات

خاکسار (ایڈیٹر معارف) آٹھ چھینہ کے سفر یورپ کے بعد ۲۰ اکتوبر کو ہندوستان واپس آیا، گو اسکا افسوس ہے کہ اس طویل عرصہ میں اپنے ناظرین کی خدمت سے معذور رہا، لیکن بحیثیت مسلمان اور ہندی ہونے کے اگر مجھے انکی کوئی خدمت بن آئی تو اس اثناء میں مجھے یقین ہے کہ وہ اسکو میرے گناہ کا پورا کفارہ سمجھیں گے، اس موقع پر میں اپنے دوست مولوی عبد الماجد صاحب بی، اے کا خاص طور سے شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے اپنی کثیر صرفیتوں کے باوجود میری عیجاہی کے ایام میں معارف کی ترتیب و تدوین کے فرائض کو بحسن اسلوب انجام دیا،

جولائی کے معارف میں جو مضمون قصہ ”بکاؤلی و مسائل تصوف“ کے عنوان سے شائع ہوا تھا، اسکے سلسلہ میں یہ خبر دلچسپی سے سنی جائیگی کہ فریخ زبان میں ایک ایسی کتاب موجود ہے جسکے عنوان سے معلوم ہوتا ہے کہ مضمون مذکور سے اسکا موضوع متعلق ہوگا، گارسن ڈی ٹاسی ایک مشہور فریخ فاضل گذرا ہے، انگریزی عملداری کی ابتداء میں وہ ہندوستان میں ت

تمک مقيم رہا تھا اور ادب سے اسے خاص ذوق تھا، اور اردو تصانیف کی سرپرستی اور

اردو مصنفین کی قدر شناسی میں ممتاز تھا، یہ کتاب اسی کے بعض لکچرون کا مجموعہ ہے، اور پورا نام فریخ بین حسب ذیل ہے،

*la doctrine de l'amour en Tajul-Molok  
et Bekawali roman de philosophie  
Religieuse tradant de L'Hindostani*  
یعنی تاج الملوک و بکاوالی کے افسانہ "عشق کے فلسفیانہ و مذہبی نتائج" کتاب اگر  
ہندوستان آگئی تو ناظرین معارف کو اس سے ذرا تفصیل کے ساتھ روشناس کرایا جائیگا،

ماہ گذشتہ کا ایک اہم علمی حادثہ جرمنی کے نامور پروفیسر ونٹ کی وفات ہے، پروفیسر  
موصوف فن نفسیات (سائیکالوجی) میں اس وقت استاد الاساتذہ کا مرتبہ رکھتے تھے، ان کے  
زمانہ سے پیشتر نفسیات کو عام فلسفہ کی ایک شاخ سمجھا جاتا تھا، ونٹ ہی نے سب سے پہلے  
یہ بتایا کہ نفسیات بذات خود ایک مستقل فن ہے، جس کے نتائج کی بنیاد قیاس و استدلال پر  
نہیں بلکہ تجربات و اعتبارات پر ہے، چنانچہ سب سے اول انہیں نے نفسیات کے لئے  
ایک محل (تجربہ گاہ) قائم کیا جس میں مادی علوم کے معلون کی طرح سارا کام تجربات کی مدد سے  
انجام پانے لگا، اور ایک جدید فن نفسیات طبعی (سائیکوفزکس) کی بنیاد ملی، اس کے علاوہ فلسفہ  
اخلاق، منطق وغیرہ پر بھی ان کی گران پایہ ضخیم تصانیف ہیں، ابتداء وہ وجود و روح کے منکر اور  
مادیت کے پیرو تھے، لیکن رفتہ رفتہ روح کے قائل اور بالآخر سخت مذہبی آدمی ہو گئے تھے،  
وفات کے وقت ان کی عمر ۷۰ سال سے متجاوز تھی،

اگر یہ سچ ہے کہ ملک بین کتب مینی کا ذوق پیدا کرنا علم و روشن خیالی کی خدمت انجام دینا، تو اس میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا کہ بڑودہ کی ہندو ریاست کا نام اس وصف خاص میں سب سے زیادہ روشن نظر آتا ہے، انتہایہ ہے کہ ہر شہر نہیں، ہر ہر قریہ میں کتب خانہ کھولے جا رہے ہیں، چنانچہ اس وقت تک ۳۶۷ کتب خانے کھل چکے ہیں، خاص شہر بڑودہ کے کتب خانہ میں ۱۷ ہزار سے اوپر کتابیں ہیں جنہیں سے قریب سات ہزار کے قلمی ہیں، اور دارالمطالعہ میں تقریباً سوا دو سو اخبارات و رسائل منگائے جاتے ہیں، پھر ایک علیحدہ زمانہ شاخ ہے اور ایک شعبہ بچوں کے لئے ہے جس میں مخصوص انہیں کی دلچسپی کی چیزیں ہیں، پہلے سال تقریباً ڈیڑھ لاکھ نفوس نے مرکزی کتب خانہ سے استفادہ کیا، اور اگر عورتوں اور بچوں کی تعداد کو بھی شامل کر لیا جائے تو اس میزان میں سولہ ہزار کا اور اضافہ کرنا ہوگا،

حیدر آباد، ہوپال، ورامپور کے شاہی کتب خانہ اس میں شبہ نہیں کہ بجائے خود اعلیٰ قسم کے ہیں، کلکتہ کی امپریل لائبریری ملک میں اپنا جواب نہیں کر سکتی، لاہور، الہ آباد، وغیرہ مختلف مقامات کے سرکاری کتب خانہ بھی قابل دید ہیں، لیکن بڑودہ میں جو اسکا اعلیٰ نظام قائم ہے اسکے حدود کو جو عظیم الشان وسعت دی جا رہی ہے اور اس چشمہ فیض کو جو طبع گہر گہر پہنچایا جا رہا ہے اسکے لحاظ سے بہتر ہوگا کہ اسلامی ریاستوں اور خود برٹش انڈیا کے خدایان تعلیم شاگردانہ جنسیت کچھ زمانہ بڑودہ میں بسر کریں،

کاغذ کے قحط اور سامان طباعت کی گرانی کے ساتھ ہی علم دوست اصحاب کے لئے ایک اہم اور قابل غور مسئلہ یہ ہے کہ قدیم کتب مطبوعہ کی حفاظت کا کیا انتظام کیا جائے؟ جن جن کتب خانوں میں کتابیں موجود ہیں وہ کوئی موسم دہوا کے زہریلے اثرات سے محفوظ ہیں، اسناد

زمانہ سے کاغذ یا تو خود گھلتا جاتا ہے یا کیڑوں کی خوراک بنتا جاتا ہے، یہاں تک کہ ایک مدت کے بعد کتابیں بالکل ازکار رفتہ ہو جاتی ہیں، ان قدرتی آفات سے تحفظ کے وسائل پر غور کرنا ہر کتاب دوست کا فرض ہے، سلسلہء بین تمام ہندوستان کے کتب خانوں کے ہتھمیں (لائبریریئرس) کی جو کانفرنس لاہور میں منعقد ہوئی تھی اس نے بھی اس مسئلہ پر توجہ کی تھی مگر کسی نتیجہ تک نہ پہنچ سکی، حال میں امپریل لائبریری (مملکت) نے جو اپنی پہلی سالانہ رپورٹ شائع کی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ تو پچانہ روم کے کتب خانہ کی کتابوں کے جو ایک عرصہ سے میرٹھ میں منتقل کر دی گئی ہیں، معائنہ سے دریافت ہوا کہ جو کتابیں آج سے ستر سال پیشتر تک درست و صحیح حالت میں تھیں ان میں سے پچاس فیصدی بالکل بیکار ہو گئی ہیں، اور بقیہ پچاس میں سے ۳۵ فیصدی رفتہ رفتہ بیکار ہو رہی ہیں، انہیں کتابوں کو جب امپریل لائبریری میں نکال کر دیکھا گیا تو معلوم ہوا کہ اتنے عرصہ میں ٹھیک سی تناسب وہاں کے خزانہ کتب کے نقصانات میں بھی قائم رہا، تعجب ہے کہ یورپ کی بلند پرواز و فلک پیا تو تہ ایجاد و اختراع اس عام مصیبت سے بچنے کی کوئی تدبیر اتنا نکال سکی،

امریکہ میں ایک ریاست پنسلوینیا ہے، وہاں کے ایک اخبار پٹیسبرگ ڈیسچ نے جمہور کے مذہبی خیالات کا اندازہ کرنے کے لئے حال میں متعدد سوالات اپنے کاموں میں شائع کئے تھے جن میں سے چند کے عنوانات یہ ہیں :-

(۱) آپ کے پاس وجود باری کا کیا ثبوت ہے ؟

(۲) کیا ابتداء میں صرف خدا کا وجود تھا ؟

(۳) خدا جنگ و خون ریزی کو کیونکر جائز رکھتا ہے ؟

(د) کیا آپ مسیح کی آئینہ آمد کے متفقہ ہیں؟ دس علیٰ ہذا،

ان سوالات کے جو جوابات اخبار مذکور نے پبلک کی طرف سے شائع کئے ان کا نمونہ

ملاحظہ ہو:-

”ابتداءً انسان کو خدا کا تصور اپنی جہالت و خوف کی بنا پر پیدا ہوا، یہ عقیدہ تدریجاً دنیا سے رخصت ہو رہا ہے، اور ایک زمانہ میں اسکا شمار بھی مسلم ادہام میں ہوگا۔“  
 ”خدا اگر کسی زمانہ میں موجود رہا بھی ہو تو اتنا بہر حال یقینی ہے کہ آفرینش ارض کے بعد غائب ہو گیا ہے، ممکن ہے کہ محنت سے خستہ ہو کر کسی درخت کے نیچے مستانے چلا گیا۔“  
 ”مسیح کی آئینہ آمد کسی گذشتہ ہی آئینہ تاسخ سے ہمیں ثابت ہوتی۔“

”بعض مجنوں احواس پیشوایان مذہب اب تک یہ ثابت کر چکی فکر میں ہیں کہ دبا میلاد طوفان، زلزلہ وغیرہ خدا کی نیکی و خوش انتظامی کے ثواب ہیں، لیکن ارباب عقل جانتے ہیں کہ ان حضرات کا سہارا عقل و فہم نہیں بلکہ خوش عقیدگی ہے۔“  
 ”کلیسا کی روایت ہے کہ خدا کے ایک صاحبزادہ عیسیٰ مسیح تھے، انکے جو حالات و ارشادات انجیل میں درج ہیں، اگر وہ صحیح ہیں تو یہ یقیناً جنگ و خون ریزی کے مخالف تھے، لیکن خود خدا تعالیٰ ان چیزوں کو جائز رکھتا ہے، کیا ان لوہیت ماب باپ بیٹوں میں بھی لفاق و شقاق کی مثال موجود ہے؟“

جوابات کا بیشتر حصہ اسی نوعیت کے فغرون سے لبریز ہے، جہور کے مذاق طبیعت کا صحیح اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ان خیالات کی اشاعت سے پرچہ کے خریداروں کی تعداد میں اضافہ ہونا شروع ہو گیا، یہاں تک کہ چند روز میں دس ہزار جدید خریدار پیدا



ہو گئے، ”دنیا سے جدید“ کو مسیح و مسیحیت سے علما جو برکتی ہے، اسکا ثبوت اسکی زندگی کے ہر ہر قدم پر ملا کرتا تھا، لیکن اب معلوم ہوتا ہے کہ جرات و بیباکی کے ساتھ لفظ بھی اسکا اعلان کیا جانے لگا ہے، اور سچ یہ ہے کہ جن دماغی صنمکوں میں جاہ و ثروت، مال و زر، زن و زمین کے دیوتاؤں کی پرستش ہوتی رہتی ہے، انہیں خدا و روح کے تصور سے کوئی واسطہ رہنا بھی نہ چاہیئے تھا، زر پرستی و خدا شناسی کی یکجائی اجتماع ضدین سے محال تر ہے۔

ہندوستان کی تعلیمی تاسیخ کا اہم ترین باب کلکتہ یونیورسٹی کمیشن کی رپورٹ کو قرار دیا جاتا ہے، اسکی تجاویز اور سفارشاتیں وحی آسمانی کا مرتبہ رکھتی ہیں، اور تعلیمی ملازمتی کا ارشاد ہے کہ اگر نجات مطلوب ہے تو انکے حرف حرف پر ایمان کامل رکھنا چاہیئے، وگاہ کہ اور لکھنؤ کی جدید یونیورسٹیاں انہیں کے مطابق قائم ہو رہی ہیں، کلکتہ، مدراس، والہ آباد کی قدیم یونیورسٹیوں کو اسی قالب میں ڈھالا جا رہا ہے، اور علیگڑھ ”مسلم“ یونیورسٹی کے نظام و قانون کی ترتیب میں بھی اسی نمونہ کو پیش نظر رکھا گیا ہے، لیکن اس سارے دفتر تجدید و اصلاح کا حاصل کیا ہے؟ محض یہ کہ فلاں فلاں جدید عمدہ قائم کرنا چاہیئے، فلاں فلاں درجن کو کالج سے نکال دینا چاہیئے، تقسیم اختیارات فلاں فلاں جدید جماعت و مجالس کے درمیان کرنا چاہیئے، انتظامی و تعلیمی امور کا تعلق جداگانہ مجلسوں سے ہونا چاہیئے، بیرونی درسگاہوں کے احاق کے بجائے تعلیمی مرکزیت پر زور دینا چاہیئے، دس علیٰ ہذا،

ظاہریت و ظاہریت ہی جو صدیوں سے لازماً تمدن رہی ہے، اور جس نے مذہب، اخلاق، معاشرت، سیاسیات، غرض ہر شعبہ زندگی کو چھالیا ہے، اسکی حکومت قاہرہ کے

شکبخت نے ہمارے مصلحین تعلیم کے بھی دل و دماغ کو اپنی سخت گرفت میں لے لیا ہے، ہائیکہ کے ہم مین سے جو افراد، اصلاح تعلیم کے لئے بڑے سے بڑے دلوں کے لیکر اٹھتے ہیں وہ بھی اس ظاہریت کے محدود دائرہ سے باہر قدم نہیں رکھ سکتے، اور باوجود انتہائی آزاد خیالی کے ادعا کے ان کا محور فکر تمام تر اسبقدر رہتا ہے کہ نظام مروجہ بین چند خارجی و مادی تغیرات کر دیئے جائیں، چنانچہ کلکتہ یونیورسٹی کمیشن رپورٹ کے ضخیم جلدات کا حرف اسی طریق فکر کے سانچہ میں ڈھلا ہوا نکلا ہے، اور مسلم یونیورسٹی پر جو اعتراضات کی بارش ہو رہی ہے، اسکے بھی سارے تیرون کا ترکش یہی ظاہریت و خارجیت ہے، حالانکہ اگر عمارت کی استواری مقصود ہے تو سب سے مقدم، بنیاد کا استحکام ہے، اور دیوار سقف و محراب کی وضع و ہیئت، نقش و نگار کے سوالات بہت بعد کے ہیں، اصلاح کی حقیقی ضرورت نظام تعلیم کے ڈھانچہ میں نہیں بلکہ اسکی روح میں ہے، اور جو وقت تک تعلیم کا مقصد طلب دنیا، حصول جاہ، اکتساب زر و ریگا، صحیح روح وجود میں آہی نہیں سکتی، تعلیم کا حقیقی مقصد محض تزکیہ نفس و حقیقت شناسی ہے، اسکے سوا اسکا کوئی اور مقصد قرار دینا، اسکی اصلاح نہیں، تخریب کی سعی کرنا ہے،

تعلیم کا یہ خیال دنیا کے لئے بالکل الوکھا نہیں، ہندوؤں کی کتب قدیمہ میں اسکی بکثرت تصریحات ملتی ہیں، اور مسلمانوں کا لٹریچر بھی اس سے خالی نہیں، امام غزالی وغیرہ کی تصانیف سے قطع نظر کہ جنہیں فرائض معلم و متعلم کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے، مقصد تعلیم کی تفسیر ان کتابوں میں بھی ملتی ہے جو خالص تصوف پر لکھی گئی ہیں، مولانا جامی کی مثنوی تحفۃ الاحرار تصوف کی ایک مشہور کتاب ہے، لیکن اس میں ایک مستقل مقالہ احوال علماء سے

معلق ہے، جسکے ضمن میں مقصد تعلیم کو حیرت انگیز جامعیت کے ساتھ بیان کر دیا ہے کہ اسکی غرض محض حقیقت جوئی ہونا چاہیئے، نہ کہ طلب دنیا، اور جو لوگ فلسفیانہ یا مذہبی غیبت سے محض ظاہری اسباب و حوادث کے پیر میں پڑے رہ جاتے ہیں، انکی سخت مذمت کی ہے، فرماتے ہیں،

نورِ دل از سینہ سینا مجموعے روشنی از چشم نابینا مجموعے

اسکے آگے اسکی تصانیف اشارات، شفا، نجات، و قانون کا نام لے لیکر انکی چوکی ہے اور ساتھ ہی فقہ، عقاید و کلام کی کتابوں کو بھی اسی دائرہ میں لپیٹ لیا ہے، مثلاً ہدایہ، نہایہ، موافق، مقاصد وغیرہ، اسلئے کہ یہ کتابیں اصل حقیقت تک پہنچانے میں مارج ہوتی ہیں اور ذہن کو ظاہری وسطی اسباب و علل کی زنجیر دن میں اُجھا دیتی ہیں،

خاصیت علم سبب آموزی است شیوہ جاہل سبب آموزی است

جس علم سے تزکیہ نفس ہو وہ علم لا حاصل ہے،

گر موانع دل تو صاف نیست کشف موانع در کشف نیست

تَرَکِ نفاق و کِبِ تبلیس گیر علم ز سرچشمہ تقدیس گیر

علم چو داوت ز عمل سر پہنچ دانش بیکار ز سر ز داہنچ

سب سے بڑھکر یہ کہ معلم کو خدمت تعلیم کے لئے اگر انقدر معاذیہ لینے کی قطعاً ممانعت ہے اور فضاہت اسکا فرض اولین ہے،

چون دگران را شوی آموزگار کم طلب آن را عوض از روزگار

علم بود جوہر و باقی سفال آن چون حقیقت دگران چون خیال

بیج جوہر بہ سفالے کہ چہ بذل حقانیت بہ خیالے کہ چہ

اسی مقابلہ میں ایک عالم کی حکایت درج ہے جو ایک بار کنوینین میں گر پڑے تھے اور اسکے اندر سے صدائے استغانت بلند کر رہے تھے، اتفاق سے ادھر انکے ایک شاگرد کا گزر ہوا، اور اس نے ایک مصیبت زدہ کی آواز سن کر اسے نکالنا چاہا، عالم نے راہ گیر سے کہا کہ پہلے اپنا نام و نشان بتا دیجئے، شاگرد نے اپنا تعارف کرایا، استاد نے یہ سن کر مٹا اسکی مدد قبول کرنے سے انکار کر دیا، کہ کہیں یہ مدد، انکی بغیر ضائع نہ ہو تعلیم و تدریس کا معاوضہ نہ ہو جائے اور اسکے مقابلہ میں کنوینین کے اندر پڑا رہنا قبول کیا۔

گفت کہ حاشا ازین چاہ پست در زخم امر و زبردست تو دوست

منکہ یہ تعلیم میان بستہ ام از قرض سود دزیان رستہ ام

کوشتم از راہ خداوندیت خاص پے فضل خداوندیت

کے بجز اے دگر آلامش در غرض آلودگی افزا امیش

در تگ این چاہ نشینم اسیر تا شودم بغیرضے دستگیر

مکملہ یونیورسٹی کمیشن کے فاضل ارکان جو ہمیش قرار مشاہدین پر متکلف زندگی بسر

کرتے رہے، اس قناعت و ایثار، بغیرضی و نفس فراموشی کے معنی سے بھی واقف ہیں؟

یورپ اور امریکہ کی یونیورسٹیوں کے اساتذہ فن کے ذہن میں کبھی اس طرز زندگی کا تصور

پیدا ہوا ہے؟ خیر، اغیار سے چنداں گلہ نہیں، دیکھنا یہ ہے کہ جامی و غزالی کے ہمناموں

اور مسلم یونیورسٹی کے موبدین و خالقبین و دونوں جماعتوں میں سے کتنے افراد تعلیم کے اس

مفہوم پر ایمان لانے کو تیار ہیں؟ -

المصنفین اپنی تکمیل میں اگرچہ ابھی تک بہت سی چیزوں کا محتاج ہے، لیکن اسکی

حقیقی روح صرف ایک عظیم الشان کبتخانہ ہے جو افسوس ہے کہ اب تک نہایت ابتدائی حالت میں ہے، مولانا شبلی مرحوم نے اپنا بہترین کبتخانہ جو ان کے روحانی اولاد کا اصلی تکرر ہو سکتا تھا پہلے ہی ندوہ پر وقف کر دیا تھا، اخیر میں جب انھوں نے دارالمصنفین کو عظیم گدھ میں قائم کرنا چاہا تو اس طرف خصوصیت کے ساتھ توجہ مبذول کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی زندگی ہی میں چھ سات الماریاں کتابیں جمع ہو گئیں، اسکے بعد متعدد علم دوست احباب نے کچھ کتابیں نذر کیں اور حسب ضرورت دارالمصنفین بھی اس سرمایہ میں اضافہ کرتا رہا، لیکن باوجود ان تمام کوششوں کے وریا میں ایک قطرہ سے زیادہ کا اضافہ نہ ہو سکا، حال میں مولانا سید سلیمان ندوی نے یورپ کا جو سفر کیا، اس میں علاوہ مذہبی اور قومی خدمات کے انھوں نے دارالمصنفین کے اس مقصد کو ہمہ وقت پیش نظر رکھا اور جہاں تک امکان میں تھا مطبوعات یورپ میں سے دارالمصنفین کے لئے بہترین کتابیں خریدنے اور بھیجے رہے، اب دارالمصنفین میں مطبوعات یورپ کا ایک ایسا ذخیرہ جمع ہو گیا ہے جو نہ صرف مصنفین کے لئے کارآمد ہوگا بلکہ دارالمصنفین کے خصوصیات میں شمار کیا جائیگا، اسکے علاوہ مولانا موصوف نے یورپ کے کتب فروشوں سے مستقل علمی تعلقات قائم کر لئے ہیں، اسلئے جو قدر نادر کتابیں یورپ میں طبع ہوتی رہیں گی اس کا ایک نسخہ دارالمصنفین میں ضرور پہنچتا رہیگا، اور اس طرح دارالمصنفین کی خصوصیت روز بروز اور بھی زیادہ نمایاں ہوتی جائیگی،

# مقالات

## آیت اختلاف

جماعت انسانی کا کوئی اہم کام بغیر کسی خاص نظام کے نہیں چل سکتا، وہ نظام جو تمام مسلمانان عالم کی جماعت کی تشکیل کرتا ہے، اور باوجود اختلاف قومیت، اختلاف زبان، اختلاف وطن، انکو باہد گردالستہ اور مربوط کرتا ہے، وہ خلافت ہے، اسلام جزائی مینوں بین، فسل قومیتوں میں، مصنوعی زبانوں میں، کالی اور گوری رنگتوں میں منقسم نہیں ہے، وہ تمام دنیا کے ان افراد کو جنہوں نے اس کے اصول زندگی اور طریق عمل کو اختیار کر لیا ہے، اخوت اور برادری کی ایک ہی سطح پر کھڑا کر دیتا ہے، اور اسی عالمگیر برادری کا مرکز وہ نقطہ ہے جسکو ہم مسلمان خلافت کہتے ہیں،

مسئلہ کے صحیح پہلو کو سمجھنے کے لئے مسلمانوں کے اساس دین و مذہب یعنی قرآن مجید کی صرف ایک آیت پر غور کرنا کافی ہے، چنانچہ ایک مختصر تمہید کے بعد اسی آیت پاک کی طرف ہم اپنے دوستوں کو متوجہ کرتے ہیں،

”خلافت کے لغوی معنی ”جانشینی“ کے ہیں، مسلمانوں کا اعتقاد یہ ہے کہ ”نوع انسانی“ اس سطح خاکی پر خداوند تعالیٰ کی طرف سے جانشین ہے، وہ تمام خیر و سعادت وہ تمام کمالات و حسنات جنکی وہ ذات اقدس منبع ہے، نوع انسانی کا فرض ہے کہ بحیثیت جانشینی کے اپنی محدود وسعت انسانی کے مطابق اپنے اندر ان کے حصول کی کوشش کرے تاکہ وہ اس کمال مطلق اور حسن مطلق ہستی کی صحیح جانشین ہو سکے،

اسلام کی مقدس کتاب کا پہلا حصہ جس اصولی سبق سے شروع ہوتا ہے وہ یہی مسئلہ خلافت انسانی ہے، حضرت آدم کا قصہ یہود و نصاریٰ دونوں میں مسلم ہے، لیکن اسلام میں اس قصہ کی تشریح ایک اصولی اعتقاد کی حیثیت رکھتی ہے، تخلیق آدم کی غرض و غایت عقاید اسلامی کے مطابق صرف یہ ہے کہ وہ خداوند عالم کا اس سطح خاک پر خلیفہ نامزد ہوا، قرآن مجید کے ابتدا کی سورہ کی یہ آیت ہے،

اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً ،  
یا ذکر جب خدا نے فرشتوں سے کہا کہ تم زمین میں اپنا ایک خلیفہ بنانے والے ہیں،

بالآخر یہ خلیفہ بنایا گیا اور آدم اس کا نام ہوا، یہی آدم جو خدا کی طرف سے خلیفہ بنا، اپنے فرزندوں کے لئے پیشوا اور امام ہوا، یعنی وہ خالق کا خلیفہ اور مخلوق کا امام بنا، حضرت آدم کے بعد اپنے اپنے عہد اور زمانہ میں بہ ترتیب جو انبیاء عظام (صلی اللہ علیہ وسلم) اس دنیا میں تشریف لائے گئے، وہ خلفائے الہی اور ائمہ انسانی تھے، اور قرآن پاک نے انکو اسی نام سے بار بار یاد کیا ہے،

حضرت ابراہیم جو اسلام میں ایک عظیم الشان پیغمبر تسلیم کئے گئے ہیں، انکی نسبت قرآن میں خدا سے پاک کہتا ہے،

قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا مَّذٰبِرَہٗ اِی ابراہیم میں تم کو لوگوں کا امام بنانا والا ہوں

حضرت داؤد جنکو مسلمان پیغمبر یقین کرتے ہیں، قرآن انکو خلیفہ کہہ کر پکارتا ہے،

یٰۤاٰدٰۤا اِنَّا جَعَلْنَاکَ خَلِیْفَۃً فِی الْاَرْضِ (ص) اے داؤد میں نے تمکو زمین میں اپنا خلیفہ بنایا

مسلمانوں کے اعتقاد میں آخرین خلیفہ الہی اور امام انسانی پیغمبر عرب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے، انکی وفات کے بعد خلافت الہی کے بجائے خلافت بنوی کا سلسلہ

شروع ہوا، صحیح مسلم جو اسلام میں حدیث کی دوسری مستند ترین کتاب ہے، اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے عن ابی ہریرۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال کانت بنو اسرائیل تسوسهم الانبیاء کلہما ہلک بنی خلفہ بنی واندل بنی بعدی وستمکون خلفاء سب سے پہلے خلیفہ حضرت ابوبکرؓ خلیفہ رسول اللہ کے خطاب سے مخاطب ہوئے، اسکے بعد یہ سلسلہ اس وقت سے آج تک بلا انقطاع قائم ہے، قرآن مجید کی وہ آیت پاک جو اس عمارت کی بنیاد ہے یہ ہے،

وعد اللہ الذین امنوا و عملوا الصلحت  
لیستخلفنہم فی الارض لما استخلف الذین  
من قبلہم ولیکن لہم دینہم الذی  
ارتضی لہم ولیبدلنہم من بعد  
خوفہم امانا، یعبدوننی ولا یشرکون  
بی شیئ، ومن کفر بعد ذلک فاو لئلا  
ہم الفاسقون، (نور)

خدا نے ان لوگوں سے جو ایمان لائے اور عمل صالح کئے  
(یعنی مسلمانوں) سے یہ وعدہ کیا ہے کہ وہ انکو زمین میں  
اسی طرح خلیفہ بنائیں گے ج طرح انکو نبیایا جو ان سے پہلے تھے  
اور انکے اس دین کو جسکو وہ انکے لئے پسند کر چکے ہیں  
قائم و مستحکم کریں گے، اور خوف کے بعد انکو امن بخند گاہ کہ وہ  
مجھے پوجیں اور میرا سیکو شرک نہ بنائیں اور جو انکے  
بعد بھی کافر ہونگے تو وہ بے شہد مجرم ہونگے۔

ان آیات پاک میں نہ صرف مسئلہ خلافت کا سرسری ذکر ہے بلکہ اسکی حقیقت اور اسکے  
تمام شرائط و مصالح بھی بتا دیئے گئے ہیں، ان آیات پاک میں پانچ الفاظ ہیں جنکی تشریح  
ہمارے مقاصد کی گرہ کشائی کر دیں گی،

(۱) استخلاف

(۲) الارض

(۳) تمکین دین

(۴) تبدیل امن من بعد الخوف،



(۵) عبادت الہی و عدم اشراک،

**استخلاف** | استخلاف کے معنی عربی زبان میں خلیفہ بنانے اور حکمران بنانے کے ہیں، یعنی اس ایک لفظ کے لغوی معنی کے اندر مادی و روحانی، دنیاوی و دینی دونوں قسم کی سرداری و سیادت کے معنی داخل ہیں، علاوہ لغت کے ہم بیان بطور نمونہ کے چند مستند مفسرین کی رائے نقل کرتے ہیں، سب سے قدیم اور مستند مفسر امام ابن جریر طبری کی تفسیر ہے،

لیو، ثم الله ارض المشركين من العرب  
والبحر فيجعلهم ملوكها وساستها  
الله تعالى عرب عجم کے غیر مسلم ملک لیکر مسلمانوں کو  
اسکا وارث بنائے گا کہ وہ اس کے بادشاہ اور اس کے  
منظم کار ہوں گے، (رج ۱۸ ص ۱۰۹)

علامہ لغوی کی مشہور تفسیر معاکم میں ہے،

لیو، ثمهم ارض الكفار من العرب والبحر  
فيجعلهم ملوكها وساستها وسكانها،  
قاضي بفيادى کہتے ہیں،  
خدا مسلمانوں کو کفار کی زمین کا وارث کرے گا تو انکو  
اسکا بادشاہ، منظم اور باشندہ بنائے گا،

ليجعلهم خلفاء متصرفين في الارض تصرف  
الملوك في مصالحهم  
خدا مسلمانوں کو خلیفہ بنائے گا جو زمین کا اسی طرح انتظام کرے گا  
جس طرح بادشاہ اپنی سلطنت کا کرتے ہیں۔

علامہ ابن کثیر جنکی تفسیر تمام تفسیروں میں مستند ترین تفسیر ہے، اسکی تفسیر ان الفاظ میں  
کرتے ہیں،

هذا وعد من الله تعالى لرسوله صلعم بانه  
سيجعل منه خلفاء الارض اى ائمة الناس  
خدا کا پیغمبر سے وعدہ ہے کہ اس کے پیروؤں کو وہ زمین کا  
حکمران، لوگوں کا امام و پیشوا اور اپنے امور کا منظم

والولاة عليهم وبحم تصليح البلاد  
وتخضعهم لعماد العباد،  
ہوگی اور لوگ انکی اطاعت کریں گے،  
و مدیر بنایا گیا، اور انہیں سے ملکوں کی حالت درست

ان تفسیروں کے علاوہ دیگر کتب تفسیر میں اختلاف کے بھی معنی لکھے ہیں، اس تفسیر  
جس پر تمام مسلمان علماء اور ائمہ کا اتفاق ہے، یہ واضح ہو گیا ہو گا کہ خلیفہ دینی و دنیاوی، مادی  
و روحانی دونوں قوتوں کا ایک وقت رئیس و سرور ہے، کوئی روحانی خلیفہ و امام اس  
وقت تک خلیفہ و امام نہیں ہو سکتا جب تک وہ مادی و دنیاوی طاقت کسی نہ کسی  
طرح اپنے ہاتھ میں نہ رکھتا ہو،

الارض | دوسرا لفظ الارض کا ہے، ارض کے لغوی معنی مطلق زمین و ملک کے ہیں،  
لیکن یہاں ارض پر الف لام کسی خاص چیز کو بتاتا ہے اور وہ وہ سرزمین ہے جسکو  
مسلمان روز ازل سے مقدس جانتے ہیں، اور جسکو توراۃ نے ”زمین مقدس“ کا خطاب  
دیا ہے اور جو ابراہیم کی اولاد کو بطور وراثت عطا کی گئی تھی، یہو و اس مقدس زمین کو  
صرف فلسطین میں محدود سمجھتے ہیں کہ وہ ان کا اصلی وطن تھا، لیکن اسلام اس احاطہ میں  
اس تمام سرزمین کو گھرا ہوا تسلیم کرتا ہے جو اب تک اولاد ابراہیم کی بیشمار نسلوں سے آباد ہے  
اور جو ہمیشہ سے پیغمبروں کا مسکن رہا ہے، یعنی وہ سرزمین جسکو جبلہ و فرات، بحر شام، بحر احمر،  
بحر ہند اور خلیج فارس چاروں طرف سے محیط ہے، جہین عراق و شام و عرب واقع ہیں،  
چونکہ یہ قطعہ ارض چاروں طرف سے پانیوں سے گھرا ہوا ہے، اسلئے اسکو پیغمبر اسلام نے  
جزیرۃ العرب کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، اور حکم دیا ہے کہ اس قطعہ زمین کو ہمیشہ غیر مسلم  
دست اندازی سے محفوظ رکھا جائے، لیکن اسلام کی خالص زندگی ہمیشہ قائم رہے،

الغرض ارض خلافت کا قلب و دماغ بھی قطعہ ارضی ہے، اور اسکی وسعت اطراف

ملک بین حالات کے مطابق کہنٹی اور برہنٹی رہی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں صرف جزیرہ نما عرب تک محدود تھی، خلیفہ اول کے عہد میں شام و عراق کے حدود تک پہنچ گئی، خلیفہ ثانی نے اسکو ایک طرف مصر اور دوسری طرف ایران کی سرحد سے ملا دیا، خلیفہ ثالث کے زمانہ میں ارض خلافت افریقہ اور ترکستان تک وسعت پذیر ہو گئی، خلیفہ چہارم کے عہد خلافت میں مملکت اسلامی دو حصوں میں منقسم ہو گئی، عرب و عراق و عجم حضرت علی کے ہاتھ میں رہے، اور شام، مصر و افریقہ امیر معاویہ کے قبضہ میں چلے گئے، حضرت علی کی وفات کے بعد جب مسلمانوں نے امیر معاویہ کو خلیفہ تسلیم کیا، اور اسکے بعد بنو امیہ کے آخری زمانہ تک یعنی ۳۳ھ تک ارض خلافت اسپین سے سندھ تک، یورپ، ایشیا، افریقہ تین براعظموں میں بیللی رہی، بنو عباسیہ جب مدعی خلافت ہوئے تو انکی حدود خلافت دوسری طرف مصر سے آگے افریقہ و یورپ تک نہ پھیل سکے۔

بغداد میں خلافت عباسیہ کی تباہی کے بعد مصر میں جب خلافت عباسیہ منتقل ہوئی تو اسکی وسعت ملکی صرف مصر و شام و عرب تک محدود رہ گئی، سہ میں جب خاندان عثمانی بین خلافت منتقل ہوئی تو اسکی وسعت نے پھر یورپ و افریقہ و ایشیا تینوں براعظموں کو گھیر لیا، اس تفصیل سے یہ واضح ہو گا کہ ارض مقدس ہر زمانہ میں خلافت کا اصلی جزو اور دیگر ممالک خلیفہ وقت کے جاے وقوع و جاے حکومت اور فوجی طاقت کے مطابق اسپین شامل رہے ہیں، مگر ہر حال از روئے اصول کے اسکی وسعت ارضی ہر زمانہ میں اسقدر نہیں چاہئے کہ وہ اس زمانہ کی گرد و پیش کی غیر مسلم سلطنتوں کے مقابلہ میں اپنی بقا و زندگی کی حفاظت کر سکے،

اس نتیجہ کے بعد لفظ الارض کے متعلق مستند مفسرین کی شہادتوں کو سننا چاہئے،

علامہ ابن کثیر جو از روئے صحت روایت، مستند ترین مفسر ہیں انکا بیان ہے،

هذا وعد من الله تعالى لرسوله صلعم  
بانه سيجعل امته خلفاء الارض.... وقد  
فعله.. فانه صلعم لم يميت حتى فتح الله عليه  
ملكه وخيبر والبحرين وسائر جزيرة العرب  
وادخل اليمن بكما دعا واخذ الجزيرة من محو  
جهر ومن بعض طراف الشام وهاد الاهر  
قل ملك الروم وصاحب مصر و  
اسكندريه وملك عمان والنجاشي

خدا نے پیغمبر صلعم سے یہ ایک وعدہ کیا تھا کہ وہ  
انکے پیروؤں کو زمین میں خلیفہ بنائیگا، خدا نے یہ  
وعدہ پورا کیا، چنانچہ آپ نے اس وقت تک وفات  
ہینے پائی جب تک مکہ، خیبر اور تمام عرب اور  
یمن کی انتہی میں نہ آگیا، اور بحر (بحرین) کے  
محو سیوں سے اور شام کے چند مقامات سے جزیرہ  
نہ لے لیا، اور قیصر روم اور مصر و اسکندریہ کے  
سلاطین اور عمان کے امراء اور نجاشی شاہ حبشہ

آپکو ہدیہ دیا،

ملك الحبشة،

علامہ زحمتی نے جو از روئے ادب و زبان بہترین مفسر تسلیم کئے گئے ہیں لکھتے ہیں،  
”خدا نے اپنا وعدہ پورا کیا، اور مسلمانوں کو پہلے جزیرۃ العرب کا مالک بنایا اور اسکے  
بعد مشرقی و مغربی ممالک کو انھوں نے فتح کیا۔“

غراب القرآن میں جو قرآن کا مستند اُنت ہے مذکور ہے،

چنانچہ خدا نے اپنا وعدہ پورا کیا اور انکو جزیرۃ العرب کا مالک اور کسریٰ کی  
ملکت و خزانہ کا وارث بنایا،

ابن الاعرابی کا بیان ہے کہ

الارض کے معنی ملک عرب اور اسکے سوا اور ممالک بھی مراد ہیں،

الغرض ان تمام تصریحات سے واضح ہوگا کہ خلافت کی ارض موعودہ کے اندر جزیرۃ العرب

تو بمنزلہ صل کے ہے اور اسکے علاوہ دیگر ممالک بھی اسکے اندر داخل ہیں،  
 تنکین دین | یہ لفظ جس آیت پاک میں واقع ہے وہ حسب ذیل ہے،

وَيُكِنُّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ | اور خلافت دیکر، انکے اس دین کو جسکو اُس نے  
 ارتضیٰ لہم، اُنکے لئے پسند کیا ہو قوت و استحکام دیگا،

آیات استخلاف کے اس ٹکڑہ سے یہ واضح ہو گا کہ اس خلافت الہی کا مقصد یہ ہے کہ  
 مسلمانوں کا وہ دین جسکو خدا نے اُنکے لئے پسند کیا ہے یعنی اسلام اسکو دنیا میں قوت و  
 استحکام بخشنا جائے کہ ظالموں اور مستکبروں کی زبردستی کے حملوں سے وہ دین اور اسکے  
 ماننے والے ہمیشہ محفوظ رہیں، اور بخت لھر، بیرو، اور چینگیر کے ظہور ثانی کا اسلام کو  
 خطرہ نہ ہے،

مفسرین کی رائے اس کے متعلق آگے آتی ہیں،

تبدیل امن من بعد الخوف | اسلام جب عرب میں ظہور پذیر ہوا، تو دعوت حق کے جواب میں  
 اسکو ہر طرف سے تیغ و خنجر اور تیر و تبر کے زخم کھانے پڑے، ۱۳ برس کی مدت انہیں  
 ظلم و ستم کی پُردرد داستانوں سے ملوے، اُسکے بعد اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو خلافت الہی  
 کی بنیاد ڈالنے کا حکم عنایت فرمایا، اور اُسکا منصفیہ قرار دیا کہ دنیا میں اسلام کے لئے  
 امن و سلامتی قائم ہو، اس بنا پر اس آیت استخلاف کے ان الفاظ سے

وَلِيْبِدَ لِّلْخَوْفِ اَمْنًا | اور (اس خلافت کے ذریعہ سے) مسلمانوں کے  
 خوف کو امن سے بدل دیگا،

یہ واضح ہوتا ہے کہ خلافت کے وجود کا دوسرا مقصد یہ ہے کہ اسکی قوت کے زیر سایہ مسلمان  
 امن و سلامتی کے ساتھ رہ سکیں، اس تفسیر کی اُمید میں حسب ذیل بیان نقل کرتا ہوں جو

تمام مفسرین کی متحدہ عبارت ہے،

اس سے یہ مقصود ہے کہ اسلام کی بنیاد مضبوط و متکلم ہو، مسلمان مدینہ میں مجبور کئے گئے تھے کہ وہ ہمیشہ اپنی حفاظت کے لئے مسلح رہیں، وہ آخر اس طرز زندگی سے تنگ آ گئے اور پیغمبر سے آکر ملتی ہوئے تو خدا نے وعدہ کیا کہ وہ انکو خلافت بخشے گا جس سے وہ امن و امان میں رہیں گے،

ایشیا و یورپ و افریقہ کی گزشتہ موجودہ تاریخ گواہ ہے کہ یہ خطہ اب بھی دنیا میں اسی طرح قائم ہے جس طرح آج سے ساڑھے تیس سو برس پیشتر تھا، اسپین، سسلی، کریٹ، مالٹا، ہرزیگوونا، بوسینا، یونان، سرویا، بلغیریا، مقدونیہ، سمترنا، ارض روم، آرمینیا، وغیرہ کے واقعات کیا محتاج بیان ہیں،

عبادت الہی و عدم اشراک | خدا ارتداد فرماتا ہے کہ اس خلافت کا اس استحکام دین کا، اس امن و امان کا مقصد کیا ہے، مقصد یہ ہے کہ

یعبدا و نئی ولائیشرا کون بای شینا، جھک پڑھیں اور کسی نو میرا شریک نہ بنائیں،

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اسلامی یک خاص پیغام الہی لیکر دنیا میں بھیجے گئے ہیں، انکے خاص عقاید ہیں، انکے خاص عبادات ہیں، انکے خاص علوم و فنون ہیں، ان کا ایک خاص تمدن اور ایک خاص اصول زندگی ہے، خلافت کی مادی طاقت کا اصول اسی مصلحت پر مبنی ہے، کہ مسلمان اپنی مخصوص روحانی زندگی اور مخصوص مادی تمدن کو دنیا میں قائم اور باقی رکھ سکیں،

دنیا کی گزشتہ تاریخ جطرح مظالم و ستم آرائیوں سے مملو رہی ہے، مستقبل تاریخ کے لئے کون ضمانت کر سکتا ہے وہ ایسی ہی یا اس سے بدتر ہوگی، اسی لئے دنیا کی وسیع

مملکت میں انسانوں کی ایک خاص جماعت یعنی مسلمان اپنی بقا اور زندگی کے لئے عقیدہٴ مجبور ہے کہ وہ دیگر برادرانِ انسانی سے اپنے لئے ایک سایہٴ امن کے طلبگار ہوں، اور یہی خلافت ہے جو آغاز اسلام سے ایک دنیا سے اسلام میں قائم رہی ہے اور خدا کا وعدہ ہے کہ وہ آمینہ بھی قائم رہیگی، حافظ ابن کثیر اس آیت کی تفسیر کے آخر میں لکھتے ہیں،

فَالصَّابَةِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ لَمَّا كَانُوا أَوَّلَ  
النَّاسِ بَعْدَ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ  
وَإِطَاعَتَهُمْ لِلَّهِ وَكَانَ نَصْرُهُمْ مَجْبُوعًا  
وَأَكْلَمَهُ اللَّهُ فِي الْمَشَارِقِ وَالْمَغَارِبِ أَيْلَهُمْ  
تَأْيِئًا عَظِيمًا وَحُكْمًا فِي سَائِرِ الْعِبَادِ وَالْبُيُوتِ  
وَلَمَّا قَصَرَ النَّاسُ بَعْدَهُمْ فِي  
بَعْضِ الْأُمُورِ نَقَصَ ظُهُورُهُمْ مَجْبُوعًا  
وَلَكِنْ قَدْ ثَبَتَ فِي الصَّحِيحِينَ مِنْ غَيْرِ حَدِّ  
عَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّهُ قَالَ لَا تَزَالُ طَائِفَةٌ مِنْ  
مُتَّقِي ظَاهِرِينَ عَلَى الْحَقِّ لَا يَضُرُّهُمْ مِنْ خُلُوعِ  
وَلَا مِنْ خَالِفِهِمْ لِيَوْمِ الْقِيَامَةِ وَفِي رَوَايَةٍ  
حَتَّى يَأْتِيَ أَمْرُ اللَّهِ وَهُمْ كَذَلِكَ فِي رَوَايَةٍ حَتَّى يَأْتِيَ  
الدَّجَالُ وَفِي رَوَايَةٍ حَتَّى يَنْزِلَ عِيسَى بْنُ مَرْيَمَ  
ظَاهِرًا وَكُلُّ هَذِهِ الرِّوَايَاتُ صَحِيحَةٌ وَلَا تَعَادُضُ بَيْنَهَا  
رَوَايَتَيْنِ بِمَرَكَبَتِهِ عِيسَى بْنُ مَرْيَمَ نَازِلًا هُوَ غَالِبٌ بِرُوحِهِ، يَرْتَمِمُ رَوَايَتَيْنِ صَحِيحَتَيْنِ أَوَّلَهُمَا مِنْ بَابِهِمْ كُنِيَ الْفَارُصُ نَبِيًّا -

صحابہ کرام آنحضرت صلی علیہ وسلم کے بعد احکامِ الہی کے سب سے  
زیادہ پیرو تھے اور نصرتِ الہی بقدر اطاعتِ الہی ہے  
اور انھوں نے خدا کے کلمہ کو مشرق اور مغرب میں غالب  
و غالب کیا اور خدا نے انکی پوری نائید کی، انھوں نے  
توہن اور ماکون پر حکومت کی، پھر جب لوگوں نے صحابہ کے  
بعد بعض احکامِ الہی میں کمی کی تو انکی ترقی ملی انکے  
عدمِ اطاعت کے بمقدار کم ہو گئی، لیکن صحیحین میں  
یہ روایت متحد و طریقوں سے ثابت ہے کہ آپ نے فرمایا کہ  
میری امت میں سے ایک نہ ایک گروہ قیامت تک  
خفیہ غالب رہیگا اور اسکو کیسا نیک نصرت اور مخالفت  
نقصان پہنچا ہیگی، ایک روایت میں ہے کہ اسوقت تک  
غالب ہیگی جب تک خدا کا حکم آجائے (یعنی قیامت)  
اور اسوقت تک وہ اسی طرح غالب ہیگی، دوسری روایت  
میں ہے کہ جب تک دجال سے وہ قتال کر لینگے ایک اور

## ایک غلطی کا اعتراف

شاہ ولی اللہ اشتیاق دہلوی

اردو شعراء کے پرانے تذکروں میں ایک شاعر شاہ ولی اللہ نام، اشتیاق تخلص دہلوی مسکن کا ذکر ہے، اور سب لوگ جانتے ہیں کہ اس خاک پاک دہلی میں شاہ ولی اللہ نام وہ یگانہ عصر پیدا ہوا تھا جس نے ہندوستان میں اسلام کے کالبند خاکی میں زندگی کی نئی روح پونکی تھی، جسکی تصنیفات و خیالات نے ہندوستان میں تجدید ملت کا سب سے پہلا پتھر نصب کیا، حجۃ اللہ الیہ النبی متروکات علمی میں سب سے زیادہ مشہور ہے، نیز از الانحاء عن تالیخ الخفاء اور قرۃ العین فی تفضیل الشیخین انکی متداول تصنیفات ہیں، علم تفسیر و حدیث میں یہ اپنے عہد کے امام تھے، قرآن مجید کا فارسی میں ترجمہ بھی کیا تھا، جو عام طور سے بازاروں میں ملتا ہے خود مجددی طریقہ میں سمیت تھے، اور اسی طریقہ مجددیہ کے مرشد بھی تھے اور حضرت احمد مجدد الف ثانی کے خاندان سے انکے قریب کے تعلقات تھے، شاہ عبدالعزیز اس نامور باپ کے فرزند ارجمند تھے،

اردو تذکرہ نویسوں میں علی ابراہیم خان ایک بزرگ ہیں، جنھوں نے گزرا ابراہیم کے نام سے اردو شعراء کا فارسی زبان میں ایک تذکرہ ۱۱۹۵ھ مطابق ۱۷۸۱ء میں تالیف کیا سولہ سترہ برس کے بعد ۱۲۱۵ھ میں مرزا علی تخلص بہ لطف نے اس تذکرہ کو مع حذف و اضافہ گلشن ہند کے نام سے اردو زبان میں منتقل کیا، ۱۲۱۵ء میں ایک صدی سے بھی زیادہ مدت کے بعد جدید رآباد دکن سے یہ تذکرہ چمپکر شالیع ہوا، مولانا شبلی مرحوم نے



اس کتاب پر کچھ حواشی لکھے، جنہیں مطالب کتاب کی تصحیح و تشریح کی ہے اور مولوی عبدالحق صاحب موجودہ ناظم انجمن ترقی اردو نے اس پر مقدمہ لکھا، جس میں ایک جذباتی کتاب مذکور پر تنقید و تبصرہ کا فرض انجام دیا، غرض یہ کتاب بڑی دھوم دھام سے چھپی، شائع ہوئی اور ارباب علم کے ہاتھوں میں آئی،

اس تذکرہ کے صفحہ ۳۳ میں شاہ ولی اللہ تخلص بہ اشتیاق کا تذکرہ ان الفاظ میں

مرقوم ہے،

”اشتیاق تخلص، شاہ ولی اللہ نام، متوطن سرہند کے، اس رونق بخش دین احمدی کا سلسلہ ارادت شیخ احمد کو کہ مجد الف ثانی جنکا لقب تھا پہنچتا ہے، اعلیٰ ابراہیم خان مرحوم (اصل تذکرہ نویس صاحب گلزار ابراہیم) نے شاہ محمد گل کو جد انکا لکھا ہے، لیکن راقم حقیر کے گوش زد یہ مضمون نہیں ہوا، فی الحقیقت مرتبہ علم کا اس عالی جناب کے نہایت بلند تھا، خصوصاً علم حدیث و تفسیر میں بڑی دستگاہ رکھتے تھے، یہاں تک کہ اسم گرامی اس برگزیدہ روزگار کا زبان خلاق پر آج کے دن تک شاہ ولی اللہ عودت کر کے جاری ہے، اکثر کتابیں تصنیف اس بحر علم کی مشہور ہیں، چنانچہ دو نسخے کہ ایک کا نام ”قرۃ العین فی البطل شہادۃ الحنین“ ہے، اور دوسرے کا نام ”جنت العالیہ فی مناقب المعادیہ“ کہتے ہیں، تصنیفات سے اس محی الدین کی یادگار صفحہ روزگار میں، والد ماجد میں، یہ اس رونق بخش کشورِ قناعت کے کہ جبکا نام نامی مولوی عبدالحق عزمی آج کے دن تک قدم توکل کاڑے ہوئے شہ جہان آباد (دلی) میں بیٹھے ہیں.....

الغرض وہ جامع جمیع علوم یعنی شاہ ولی اللہ مرحوم عین حیات میں اپنے کو ثلثین فیروز شاہ کے تشریف رکھتے تھے، اوقات شریف کو بطور درویشان اہل معنی کے

بسر کرتے تھے، اشعار فارسی کے فرمانے کا اتفاق کمتر ہوتا تھا اور زبان ریختہ کا مشکل اکثر“  
یہ تذکرہ شاہ ولی اللہ صاحب کے تھوڑے ہی دنوں کے بعد لکھا گیا ہی، انکے صاحبزادے  
شاہ عبدالعزیز صاحب دلی میں اس وقت تک زندہ تھے، اسلئے اس تذکرہ کو استناد کی  
حیثیت حاصل تھی، جن الفاظ میں شاہ صاحب کے اس نے حالات لکھے ہیں وہ چند مثبتہ  
امور کے علاوہ تمام تر حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی مصنف حجۃ اللہ البالغہ پر صادق  
آتے ہیں ان مثبتہ امور کی نسبت ارباب نقد کی نگاہ کے سامنے دو راہیں ہتھیں ایک یہ کہ  
سرے سے شاہ ولی اللہ اشتیاق، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث مصنف حجۃ اللہ  
البالغہ نہیں ہیں اور مصنف نے غلطی سے اسکو ایسا سمجھا ہے، لیکن قرب زمانہ کی وجہ سے  
اسکو جو استاد چل تھا اس بنا پر یہ راہ اختیار نہیں کی گئی بلکہ دوسری راہ اختیار کی گئی اور  
وہ یہ ہے کہ یہ تذکرہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا ہے اور انہیں کا تخلص اشتیاق تھا  
اور جن بعض تصنیفات کے غلط نام جو انکی اصل تصنیفات کے ناموں سے ملتے جلتے ہیں  
مصنف نے لکھے ہیں وہ صحیح نہیں ہیں، چنانچہ مولانا شبلی مرحوم نے اس تذکرہ پر جنوری ۱۹۰۷ء  
میں جو دیباچہ لکھا تھا جسکا قلمی نسخہ دار المصنفین میں انکے ہاتھ کا لکھا موجود ہے اور جو گلشن ہند  
کے ساتھ اپنی اصلی صورت میں شائع نہیں ہوا ہے، اس میں مولانا مرحوم نے اس بحث کے متعلق  
یہ عبارت لکھی ہے،

شاہ ولی اللہ صاحب محدث تخلص بہ اشتیاق کے حال میں لکھا ہے کہ کوئلہ

میں فرد شاہ کے تشریف رکھتے تھے، اوقات شریف بطور درویشان اہل منی کے

بسر کرتے تھے، اشعار فارسی فرمانے کا کمتر اتفاق ہوتا تھا، اور زبان ریختہ کا مشکل اکثر“

پھر اس عبارت پر حاشیہ دیکر مولانا مرحوم کہتے ہیں،

”مصنف نے شاہ صاحب کے متعلق بعض غلطیاں بھی کی ہیں، مثلاً انکی کتاب کا نام قرۃ العین فی البطل شہادۃ الحنین لکھا ہے، حالانکہ نام کا دوسرا حصہ غلط ہے، ایک اور کتاب کا نام مناقب معاویہ بتایا ہے، حالانکہ انکی کوئی تصنیف معاویہ کے فضائل میں نہیں، مصنف شیعہ تھا۔“

گلشن ہند کے مطبوعہ نسخہ میں اس مقام پر مولانا مرحوم کا حسب ذیل حاشیہ چھپا ہوا ہے،  
 ”دونوں نام (کتاب کے) غلط ہیں، پہلی کتاب تفصیل شخین میں ہے، شہادت امام حسین کے ابطال سے خدا نخواستہ اسکو کوئی تعلق نہیں، دوسری کتاب تو بالکل فرضی ہے، معاویہ کے مناقب میں انکی کوئی کتاب نہیں۔“  
 خجائہ جاوید کے مصنف نے بھی ایسی تقلید کی،

اگست ۱۹۱۷ء کے معارف میں، میں نے ”حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی ایک شاعر کی حیثیت سے“ ایک مضمون لکھا، جس میں انکے عربی و فارسی اشعار کا تذکرہ کیا اور تہدید میں یہ لکھا،

”تاہم یہ کسی کو خیال بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ حجۃ اللہ ابالہ کا مصنف ایک اُردو یا فارسی کا شاعر بھی ہو سکتا ہے، ارباب معرفت اپنی خلوت راز میں جبکو شیخ العصر کہتے ہیں، علماء اپنے حلقہ درس میں جبکو امام الہند سے مخاطب کرتے ہیں، انکی کہہ سکتا تھا کہ بزم شاعری میں حضرت اشتیاق اُن کا خطاب ہے، مرزا علی لطف کے تذکرہ گلشن ہند نے سب سے پہلے اس راز کو فاش کیا۔“

میں اسی خیال پر قائم تھا کہ اتفاق سے ایک دن میر قدرت اللہ قدرت کی کتاب طبقات الشعراء میں شاہ ولی اللہ اشتیاق کا تذکرہ میری نظر سے گذرا جسکی عبارت یہ ہے

دو حقائق و معارف آگاہ، شاہ ولی اللہ سرہندی، اشتیاق تخلص، نیرۂ محمد گل  
از اولاد شیخ احمد سرہندی در کولہ فیروز شاہ سکونت داشت، درودیش در پیش  
متوکل گاہ ہے فکر رجنہ میگرد

اس عبارت کے پڑھنے کے ساتھ مرزا لطف کی تحریر بے لطف معلوم ہونے لگی،  
اور دل میں کاوش پیدا ہوئی، کوئی دوسرا تذکرہ دار المصنفین میں موجود نہ تھا اسلئے خیال  
تھا کہ کبھی لکھنؤ جانیکا اتفاق ہو تو وہاں مزید تحقیق کجائے چنانچہ اسی اشار میں لکھنؤ جانیکا  
اتفاق ہوا اور جناب مولانا سید عبدالحی صاحب سے ملاقات کی اور سلسلہ سخن میں اپنا  
شک و اشتباہ اُنکے سامنے پیش کیا، مولانا موصوف نے جو تاریخ ہند کے مسلم الثبوت استاد  
ہیں، میرے شبہ کی تقویت کی اور یہ یقین دلایا کہ شاہ ولی اللہ اشتیاق اور حضرت شاہ  
ولی اللہ مصنف حجتہ اللہ البالغہ دو شخص ہیں،

اب میں نے یہ پختہ ارادہ کیا کہ اس غلطی کے پردہ کو چاک کروں کہ اس اشار میں میرا  
رکن و خلافت کی حیثیت سے یورپ جانا ہوا، وہاں بھی رہ رہ کر مجھے اس ازالہ خطا کا  
خیال بار بار آتا رہا، لیکن سفر کی جیلہ جوئی نے طبیعت کو آمادہ نہ کیا، ۱۰۔ اکتوبر کو جب میں  
سفر سے عظم گڑھ پہنچا تو جناب مولانا حبیب الرحمن خان شروانی کا ایک والا نامہ  
موسومہ مولانا عبد السلام صاحب ندوی نظر سے گزرا جس میں انھوں نے لکھا تھا کہ شعر الہند  
لکھتے ہوئے شاہ ولی اللہ اشتیاق اور حضرت شاہ ولی اللہ مصنف حجتہ اللہ البالغہ میں تفریق  
کیجئے، اس خط کو پڑھ کر مجھے خیال ہوا کہ سب سے پہلی فرصت میں اس مسئلہ کو صاف کر دینا چاہیئے  
اسی فکر میں تھا کہ کل ۱۴۔ اکتوبر کو مولانا شروانی کا بھیجا ہوا ایک رسالہ پہنچا جس میں جناب احسن  
مارہروی کا ایک مضمون اس مسئلہ پر نظر آیا اور یہ دیکھ کر ایک طرف گو حیرت ہوئی کہ میری

اولیت کی فضیلت جناب احسن نے چھین لی، لیکن دوسری طرف نہایت خوشی ہوئی کہ  
 - - - - - موصوف نے نہایت سنجیدگی، متانت اور سلیقہ سے  
 اس مسئلہ کو بخوبی طے کر دیا ہے، اور ہمیں گلشن ہند، مولانا شبلی اور میرے مضمون شائع شدہ  
 معارف کی تصحیح کر دی ہے، دیباچہ میں وہ کہتے ہیں کہ اُنکو اس غلطی کا علم مولانا حالی مرحوم  
 کی تقریظِ خمانہ بجا وید سے ہوا جس میں مولانا نے مصنف کی اس غلطی کی تصحیح کی ہے،  
 بہر حال آج جبکہ میں ان سطور کو لکھ رہا تھا مولانا شہزادانی کا ایک دوسرا گرامی نامہ شرف  
 صدر لایا جس میں وہ تحریر فرماتے ہیں،

”میر حسن دہلوی کا تذکرہ میرے سامنے ہے اس میں لکھا ہے:- شاہ ولی اللہ دہلوی نے  
 بود بکمال خوبی و اخلاق، التخص بہ اشتیاق، از اولاد مجدد الف ثانی نبیرہ شاہ محمد گل  
 مولد او سر نہند....“

شاہ محمد گل کا اصلی نام شیخ عبد اللہ ہے، تخلص وحدت ہے، وہ صاحبزادے ہیں حضرت غازی رحمۃ اللہ علیہ صاحب کے جو صاحبزادے تھے حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی کے (یہ نسب نامہ رسالہ شہرہ آفاق مولفہ سید نور الحسن خان سے اخذ ہے) اس سے صاف واضح ہے کہ یہ شاہ دلی اللہ صاحب نہ تھے، میر حسن نے محدثیت وغیرہ کی جانب مثل صاحب گلشن ہند یا بھی نہیں کیا، میرے خیال میں اس مضمون کے بعد کسی اور مضمون کی حاجت نہیں، البتہ مولوی سید سلیمان صاحب پسند فرمائیں تو ایک نوٹ کے ذریعہ سے معاملہ کو صاف کر دیں۔“

یہ میرے عمل اور مولانا کے خیال میں عجیب توارد ہوا،

## مصریوں کی مذہبی حالت

(۳)

از مولوی عبدلرزاق ندوی

(دیگر خرافات)

قبر پرستی کی طرح اور بھی بے شمار خرافات ہیں جنکا شکار مصری ہو رہے ہیں، صرف عربین اور جاہل عوام الناس ہی نہیں بلکہ بہت سے تعلیم یافتہ اور وہ حضرات بھی جو اپنے کو انتہائی فخر و مباہات سے نایبان رسول میں شمار کرتے ہیں، ذیل میں بعض ادہام و خرافات نمونہ حوالہ قلم کئے جاتے ہیں،

(۱) ابرو کا پٹرکنا خوش نصیبی کی علامت ہے،

(۲) راستہ میں جنازہ کا، بیک چشم کا یا احوال (ڈھیری آنکھ والا) کا لمبا ٹانگوں بد ہے،

(۳) یکشنبہ کو سفر کرنا نحوست ہے،

(۴) چار شنبہ کو دودھ استعمال کرنا ایسے عجیبی کے ساتھ کہنا ناشدید امراض کا باعث ہے،

(۵) شب میں بلی کو نہ مارنا چاہیے، کیونکہ اکثر بلیوں میں ملائکہ کی روح حلول کر جاتی ہے جو چشم زدوں میں انسان کو خاک سیاہ کر سکتی ہے،

(۶) ہر بچہ کے ساتھ اسکی ایک جن بہن بھی ہوتی ہے، چنانچہ جب کوئی بچہ زمین پر گر پڑتا ہے تو اُسٹانے کے قبل ان اسکا نام لیتی، بسم اللہ کہتی اور پھر اسکی جن بہن کا نام لیکر بسم اللہ کہتی اور بچہ کو اٹھا لیتی ہے، کیونکہ اسکے گر پڑنے سے اسکا گرنا بھی لازم ہے، اور اگر اسکو بھی بسم اللہ

کھکھ اور نام بیکرنہ اٹھایا جائیگا تو وہ اُسے مار ڈالیگی،

(۷) محرم کی دسویں شب کو آسمان سے اشرفیوں سے لدا ہوا گدھا اتر کر رہا ہے، اور کسی خوش نصیب لڑکے کو مل جاتا ہے، چنانچہ والدین بچوں کو اس رات میں شب بیداری کرانے ہیں کہ دست بد عارہیں کہ یہ گدھا اُنکے گھر میں اتر آئے،

(۸) سورج گرہن میں بچوں کو تاکید کی جاتی ہے کہ خوب شور و غل کیا کریں، اور پیسے بجائیں تاکہ آفتاب پھر نکل آئے، کیونکہ اُنکے نزدیک اسکی یہ کیفیت اسوقت ہوتی ہے جب فرشتے اُسے پہنچ کر سمندر میں ڈال دیتے ہیں، اور عجلی اُسے منہ میں بیکر نگلنا چاہتی ہے، لڑکوں کے شور و غل سے وہ گھبرا کر اُسے پھر اُگل دیتی ہے،

(۹) ہرمہ کے آخری چار شنبہ کو کپڑے دھونا، یا جمعہ کو اُن کا سینا بخوست ہے،

(۱۰) ہر گرہن اسکی حفاظت کے لئے ایک سانپ مقرر ہوتا ہے جسے ”ناصر المہبت“ (مکاکا) آباد کر دینا (الاکہتے ہیں، چنانچہ جب وہ نکلے تو اُسے مارنا نہیں چاہیئے، کیونکہ سید رفاعی ناراض ہو جاتے ہیں، بلکہ اسے بحفاظت تمام گرفتار کر کے ”سید“ کے پاس روانہ کر دینا چاہیئے، چنانچہ اسے پکڑنے کے لئے وہ لوگ تلاش کئے جاتے ہیں، جنکا یہی پیشہ ہے اور جو راستوں میں یا ”رفاعی مدد“ یا ”رفاعی مدد“ چلاتے پھرتے ہیں، یہ کافی مزدوری لیکر سانپ کو پکڑنے اور انہیں مقام مقصود تک پہنچا دیتے ہیں، ان لوگوں کو ”احداۃ“ کہتے ہیں،

(۱۱) جب بچہ بیماری کی حالت میں ناک کھانے لگتا ہے، تو یقین کر لیا جاتا ہے کہ اُسکے دماغ میں کیرٹے پڑ گئے ہیں، چنانچہ اُنکے نکالنے کے لئے منتر پڑھنے والوں کو بلایا جاتا ہے جو بازاروں میں یا ”فرج“ کی صدائیں لگانے پھرتے ہیں، یہ آتے ہیں اور بچہ کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہیں، جس سے اسکی ناک اور منہ سے چند کیرٹے زمین پر آگرتے ہیں جنہیں اُنکے

منتر کی تاثیر پر محمول کیا جاتا ہے، حالانکہ یہ مکار کیڑوں کو مٹھی یا آستین میں چسپاے رہتی ہیں، اور سر سہلاتے وقت اس صفائی سے گراتے ہیں کہ بادی النظر میں وہ ناک سے گرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں،

(۱۲) جب بچہ کالی کہانسی یا چکی کے مرض میں مبتلا ہو جاتا ہے تو بجائے علاج معالجہ کے اسے کسی آبائی قصاب کے پاس لیجاتے ہیں جو اسکے گلے پر لٹی چھری پھیر دیتا ہے، اسکا خیال ہے کہ اس طرح بچہ شفا یاب ہو جاتا ہے، اسی طرح جب بچہ لال بخار، تنفس یا چھپک میں مبتلا ہو جائے تو اسے مسلسل تین ہفتہ تک ”اولاد عنان“ کے مزار پر لیجاتے ہیں، جہاں مجادر آ سے ایک تنگ و تاریک کمرہ میں داخل کرنے اور انعام لینے کیلئے باواز بلند یہ کلمات پڑھ کر اسپردم کرتا ہے کہ ”یا بکرۃ الطاق و یا فیما، تشافیہ و تعافیہ، و ان کانت نفس تمنحوھا، و ان کانت کافیۃ تزیحوھا، و ان کانت مشاہدۃ فکوھا، یا عانیۃ تشفعوالہا بشفاع و العافیۃ تحفظ بلدک یا، قُورُہات العافیۃ فی ملک اجری کلہما“ (ترجمہ، اے برکت طاق کی اور جو کچھ اسمین ہے اسے بہلا چنگا کر دے، اگر انسانی رُوح ہے تو اسے منع کر دے، اگر بہوت ہے تو اسے دُور کر دے، اگر بلا ہے تو اسے نکال دے، اے عنانیہ، اسکی صحت و تندرستی کی سفارش کر، اے... (بچہ کا نام لیکر) اُمّہ تندرستی کو اپنی آستین میں لا، اور دوڑ اپنی مان سے بائیں کر۔ اس مزار میں ایک کنواں بھی ہے جسکے متعلق عام اعتقاد یہ ہے کہ اسمین ایک ولیہ، ست سکرہ“ (شکر کی بیوی) رہتی ہیں جنکے لئے اسمین شکر چھوڑی جاتی ہے،

(۱۳) بچہ کا نام سپور کے دن رکھا جاتا ہے، جسکا انتخاب اس طرح ہوتا ہے کہ تین شمعیں جلائی جاتی ہیں، اور ان میں سے ہر ایک کا علحدہ علحدہ نام رکھ دیا جاتا ہے، ان میں سے جو شمع سب سے آخر تک جلتی رہتی ہے، اسی کا نام بچہ کے لئے منتخب کیا جاتا ہے، یہ شمع بہت سے



چنوں اور بندق کے دانوں کے ساتھ چیلنی میں ڈال کر پٹکی جاتی ہے، ان کا خیال ہے کہ اس طرح بچہ کی عمر دراز ہو جاتی ہے،

(۱۴) ”مزیرۃ“ ایک چڑیل ہے جسکے جسم پر سو بیان اور کیلین ہوتی ہیں، یہ رات کو خوبصورت عورت کے ہمیں میں بن سنور کر نکا کرتی ہے اور جو شخص اسکی جانب ملتفت ہو جاتا ہے، اسے چمٹ کر غائب کر لی جاتی ہے، (مگر حیرت ہے کہ اس عقیدہ کے باوجود بھی کبھت فق و فخر سے باز نہیں آتے)

(۱۵) ”مارو“ ایک بہوت ہے جو شب میں ظاہر ہوتا اور آدمی کو تنہا پا کر اسے گردایک دیوار بنا کر اسے مقید کر دیتا ہے،

(۱۶) اسی طرح اور بہت سے آسیب مثل ”سمادی“ اور ”مغربی“ وغیرہ ہیں جو کبھی گدھے وغیرہ کی شکل میں نمودار ہوتے ہیں، جو اس گدھے پر سوار ہو جاتا ہے وہ بیمار پڑ جاتا ہے اور کبھی سیاہ کتے یا بلی کی صورت میں آتے ہیں کہ عسکی آنکھیں کٹورہ کی طرح بڑی بڑی اور انگارے برساتی ہیں،

(۱۷) ”زار“ عورتوں کا مخصوص آسیب ہے جو وقتاً فوقتاً اُن پر آتا اور انہیں پریشان کرتا رہتا ہے، جب اسکا سایہ کسی عورت پر پڑ جاتا ہے تو وہ دنیا کے تمام کاموں سے بیکار ہو کر ہر ایک سے انجھتی اور گہر میں قیامت برپا کر دیتی ہے، چنانچہ آسیب اتارنی والی عورتیں بلائی جاتی ہیں، جو عورت کو خوب بنا چنا کر اپنے مکان لی جاتی یا اسی کے ہاں کسی تنہا کمرہ میں اُسے بٹھا دیتی ہیں اور اسکے سامنے خوشبو سلگا کر ڈھول بجانا اور کچھ گانا شروع کر دیتی ہیں جس سے وہ مست ہو کر رقص کرنے لگتی، اور لمبا اوقات بالکل برہنہ ہو جاتی ہے، چنانچہ میں نے خود ایک عورت کو از سر تا پا برہنہ ناچتے ہوئے دیکھا تھا، مصری اس زار سے بہت خوف نہ

رہتے ہیں کیونکہ جہاں ایک مرتبہ اسکا پرچا دیاں عورت پر پڑ گیا وہ شوہر کے ہاتھ سے گویا نکل گئی، واقعہ یہ ہے کہ یہ آسیب خود عورت کے نفس کا آسیب ہوتا ہے، جو اس پر اپنے اصلی شوہر سے نفرت کرنے اور کسی دوسرے سے محبت کرینگی وجہ سے سوار ہو جایا کرتا ہے کہ وہ مذکورہ بالا عورتوں کے ذریعہ سے اپنے دلبر تک باسانی پہنچ جایا کرتی ہے،

(۱۸) ان بہوتوں اور دیگر ارضی دساوی بلاؤں سے محفوظ رہنے کے لئے طح طح کے گنڈے اور تعویذ استعمال کئے جاتے ہیں، اور قسم قسم کی دعائیں پڑھی جاتی ہیں، یا گلاب اور زعفران سے کسی برتن پر کھد بجاتی ہیں، جبین پانی پیا جاتا ہے، چنانچہ بعد نماز فجر یہ دعا پڑھی جاتی ہے یا کشتھطیلوش، یا کشتھطیلوش! اقمی و اقم صورتی و ذاتی و دجھی عندک و ند خلقت! آمین یا ارحم الراحمین!

اسی طرح چیونٹوں کے ددر کر نیکے لئے یہ دعا سبز پتوں پر لکھی جاتی ہے، اطلعم الوب فظنر، والعیوب فسترد الذ نوب فظنر، ارحل ایح الامل کما رحلت الرحمة عن شیخ اقری الذین باعوا الحسن بالنقص ایاعنجر منسجرا (۱۹) جس اونٹ کے منہ سے کف بہت خارج ہوتا ہے، اسے بھی دلی سمجھنے اور اسکی بڑی آؤ بگٹ کرتے ہیں،

(۲۰) محل مصری کا شمار بھی اولیائے کرام کے زمرہ میں ہے،

(۲۱) بڑے بڑے قدیم درختوں کی ”ولایت“ کے بڑی عزت ہوتی ہے، انکا عرس کیا جاتا ہے، اور نام کے بجائے انہیں تعظیماً سیدی اربعین، کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے، چنانچہ جامع حنفی، میں اس قسم کا ایک درخت موجود ہے ”شیخہ خضرہ“ (سبز بڑی بی) کہتے ہیں، اسکی از حد تعظیم و تکریم ہوتی ہے اور زائر دُور دُور سے آتے اور اسکے تنہ میں اپنی نشانیاں کیوں کہ ذریعہ سے لٹکا دیتے ہیں کہ ”شیخہ خضرہ“ انہیں یاد رکھیں اور آڑے وقت میں کام آئیں،

(۲۲) اسی مسجد میں ایک کنواں بھی ہے، جسے اس خیال سے بہت متبرک سمجھا جاتا ہے کہ اس کا سوت چاہ زمزم سے منقل ہے، چنانچہ مشہور ہے کہ کسی مصری حاجی کا کٹورہ چاہ زمزم میں گر گیا تھا جو مصر واپس ہونے پر اس کنویں سے اسے دستیاب ہوا،

(۲۳) قاہرہ میں ایک مشہور دمعوف پہاٹک ہے جسے ”باب التولی“ کہتے ہیں، اس کی زیارت کو ہزار ہا مرد اور عورتیں روزانہ آتیں، مٹین مانیتین اور چلتے وقت یاد دہانی کیلئے اس کی کیلون اور کنڈوں میں کپڑوں کی چینیں یا بالون کی لٹین آویزان کرتی جاتی ہیں،

(۲۴) قاہرہ کے قلعہ میں ایک عظیم الشان کنواں ہے جو اس اعتقاد کی بنا پر مرجع خلایق ہو رہا کہ اس میں حضرت یوسف قید کئے گئے تھے، چنانچہ روزانہ بچا سون عورتیں اولاد طالب کر نیکے لئے اس کی نہ تک جاتی ہیں جنہیں سے اکثر کی مراد پوری بھی ہو جاتی ہے حضرت یوسف کی برکت سے بہنیں بلکہ نفس انسانی کی خباثت کی بدولت جو اس تیرہ و تار یک مقام میں خوب گل کھیلی ہے، نوذباللہ من الخبث والنجاست،

قطع نظر تمام باتوں کے اگر تاہج کے آئینہ میں دیکھا جائے تو معلوم ہو جائیگا کہ اس کنویں کا حضرت یوسف سے کوئی تعلق نہیں، کیونکہ قاہرہ تو ایک ہزار سال سے آباد ہوا ہے حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانہ میں وہاں پر کسی آبادی ہو نی کا قطعاً پتہ نہیں چلتا، اس وقت تو مصر کا پائے تخت ”منقس“ تھا جو قاہرہ سے بہت دور دریائے نیل کے دوسری جانب واقع تھا، اس کنویں کو سلطان صلاح الدین ایوبی نے اپنے قلعہ میں پھاڑ کر انش کر اس غرض سے بنایا تھا کہ بوقت ضرورت اس میں پانی جمع کیا جاسکے، چنانچہ اب تک وہ دیوار میں موجود ہیں جکے اوپر کی نالیوں میں سے نیل کا پانی اس کنویں تک پہنچا کرتا تھا لیکن براہِ حوالہ کا جو انسان کو اندہا بر اور گونگا کر دیتی ہے،

ان خرافات اور مشرکانہ خیالات کے علاوہ ”عملیات اور کیمیا“ کے خط میں ہندوستان کی طرح مصری بھی مبتلا ہیں، چنانچہ ہینس معلوم کتے گہرا لون کو اس منحوس کیمیا نے نان شینہ کو محتاج کر دیا، بخوم اور رمل کا بھی بڑا چرچا ہے اور ہندوستان سے کہیں زیادہ ہی چنانچہ سرکون پر صد ہا مرد اور عورتیں سرخ ریت اور تاش کے پتے لئے بیٹھی رہتی ہیں، جنکے گرد مردوزن کا مجمع اپنی پوٹی ہوئی قسمٹوں کا حال دریافت کرتا ہوتا ہے، ان بد بختوں سے بخومیوں کو بڑی آمدنی ہوتی ہے، چنانچہ ایک پنجابی بخومی اسمبیل نامی کا بازار خوب چمکا ہوا ہے، بڑے بڑے لوگ اسکی طرف رجوع کرتے اور دل کھول کر اُسے روپیہ دیتے ہیں، دائرہ ہی، مصریوں کی مذہبی حالت پر روشنی ڈالتے ہوئے دائرہ ہی کے متعلق بھی کچھ نہ کچھ کہنا ضرور ہے کیونکہ ہندوستان میں اُسے غیر معمولی اہمیت دے جاتی ہے جو ایک سحد تک بجا بھی ہے، ہندوستانی مسلمان یہ معلوم کر کے سخت متعجب ہونگے کہ جس دائرہ کو وہ اسلام کی علامت سمجھتے ہیں اسے مصری یودیت کا طرہ امتیاز سمجھتے ہیں، مصر میں بہت کم لوگ دائرہ ہی رکھتے ہیں، کیونکہ وہ جسکے چہرہ پر ہوتی ہے اسپر یودیت کا شبہ کیا جاتا ہے، چنانچہ خود مجھ پر اس قسم کا ایک حادثہ گذر چکا ہے، اول اول جب میں مصر پہنچا تو اسوقت اگرچہ کم سنی کی وجہ سے میری دائرہ ہی محض برائے نام غلی مگر جو کچھ غلی وہ بلا کم و کاست چہرہ پر موجود غلی، ایک روز میں مسجد میں بیٹھا وضو کر رہا تھا کہ ایک مصری نے حیرت کے ساتھ مجھے دیکھ کر سوال کیا کہ ”کیا تم مسلمان ہو؟“ میں نے درشت لہجہ میں جواب دیا کہ ”کیا مصر میں کافر بھی نماز پڑھنے مسجد میں آتے ہیں، اسپر وہ شرمندہ ہو کر معذرت کرنے لگا، کہ مجھے کچھ اور شبہ ہوا تھا، میں نے کہا کہ ”ایسے شخص کے مذہب کے متعلق کیونکر شبہ ہو سکتا ہے جو مسجد کے اندر وضو کر رہا ہو؟ اسپر اس نے میری دائرہ ہی کی جانب اشارہ کر کے کہا کہ ”اس سے“

میں نے کہا ”چھ خوش یہ کیونکر“؟ اس نے جواب دیا کہ یہاں مصر میں عموماً یہودی ہی واڑھی رکھتے ہیں، اسلئے ہمیں ہر واڑھی والے پر یہودیت کا شبہ ہوتا ہے،

اسی طرح جب دوران جنگ میں ہندوستانی فوجیں مصر پہنچیں تو سکھوں اور صاحب ریش مسلمانوں کو دیکھ کر مصری بڑے تعجب سے کہتے تھے کہ ہندوستان میں یہودیوں کی بڑی کثرت ہے اور دیکھو تو وہ کیسے شجاع معلوم ہوتے ہیں، لیکن واڑھی منڈے ہندوؤں کو مسلمان سمجھ کر انکی عزت کرنے اور بڑے تپاک سے ”السلام علیکم“ کہہ کر مصافحہ کرنے لگے مگر جب انہیں معلوم ہو جاتا کہ وہ مسلمان نہیں ہیں تو انہیں گالیوں دیتے اور ان پر سنگباری کرتے!

چونکہ مصر میں واڑھی رکھنے کا رواج نہیں ہے اسلئے حجام بھی اسکے تراشنے اور درست کرنے میں ماہر نہیں ہوتے اور عموماً اسے خراب کر دیتے ہیں، اس خیال سے میں یہ خدمت خود ہی انجام دے لیا کرتا تھا،

## مسلمانوں کا دو منزل ختم ہو گیا از

از مولوی محمد سعید انصاری رفیق دارالمصنفین

اخطاط و منزل بالکل طبعی چیز ہے، اور  
”طبعی چیزیں کبھی متغیر نہیں ہوتیں، اسلئے زوال و اخطاط بھی وہ مزمن مرض ہے جسکی  
نہ دوا ہو سکتی، اور نہ وہ ذایل ہو سکتا۔“

لیکن وہ جس طرح افراد کے مزاج پر اثر ڈالتا ہے، اسی طرح قوم کا مزاج بھی اس سے متاثر  
ہوتا ہے، دنیا میں جس طرح افراد پیدا ہو کر پلتے، بڑھتے، نشوونما پاتے، اور پھر جوان ہو کر بوڑھے  
ہو جاتے ہیں، بعینہ اسی طرح قوموں کے شباب، اکہولت، اور شیوخیت کا بھی ایک زمانہ ہوتا ہے  
جس میں اسکے مزاج کے عناصر متغیر ہوتے رہتے ہیں اور چونکہ

”مزاج ہی کا نام روح ہے، اسلئے لامحالہ تمام ظاہری اور باطنی اخلاق اسکے

تاج ہوتے ہیں،“

جنکو دیکھ کر قومی مزاج کے تمام تغیرات و انقلابات کا پتہ لگایا جاسکتا ہے، لیکن یہ مزاج جو  
عناصر کی ترکیب سے پیدا ہوتا ہے، اسکے علاوہ ہر قوم کا ایک عقلی مزاج بھی ہوتا ہے جو اسکی  
ساریج کا حقیقی ماخذ ہوتا ہے، اور درحقیقت زوال و اخطاط کے آثار اسی پر طاری ہوتے ہیں  
لیکن یہ منزل دو قسم کا ہوتا ہے، طبعی اور غیر طبعی، طبعی منزل کی صورت یہ ہوتی ہے کہ قوم کے

۱۔ مقدمہ ابن خلدون صفحہ ۳۲۳، ۲۔ کتاب المیاسۃ فی علم الفرائض،

تمام اساسی اخلاق تدبیر کی طور پر فنا ہوتے ہیں، بخلاف اسکے غیر طبعی تنزل میں ان پر دفعۃً زوال طاری ہو جاتا ہے،

حقیقت یہ ہے کہ کسی قوم کا مزاج عقلی چند دنوں میں نہیں پیدا ہوتا بلکہ اسکا خمیر سیکڑوں برس کے بعد بکثرت ہوتا ہے اور اس درمیان میں قوم اپنی طفولیت، حدا ثت، بلوغ، شباب، رجولیت، اور سن متوسط کے تمام مراحل طے کر لیتی ہے، اسی طرح اسپر زوال و فنا بھی قطعۃً طاری نہیں ہوتا، بلکہ تدریجاً طاری ہوتا ہے جسکی وجہ سے قوم سن کھولت، ہیوٹا، شیخوخت اولیٰ، شیخوخت ثانیہ، ہرم اور اپنی عمر کے تمام آخری مراحل سے گزر جاتی ہے اور جب اس کے مزاج کی عمر طبعی ختم ہو جاتی ہے تو اسپر زوال آ جاتا ہے جس سے قوم ہمیشہ کے لئے پردہ عدم میں چسپ جاتی ہے، لیکن یہ مزاج عقلی کے تنزل کی طبعی صورت ہے، اسلئے وہ قوم سب سے زیادہ تمدن اور سب سے زیادہ خوش قسمت ہے،

”جیسکے اساسی اصول کے فنا و بقا کی مدت میں اتحاد ہو، یعنی جتنے دنوں تک وہ

قائم رہے ہیں اتنے ہی دنوں میں وہ فنا بھی ہوں“

لیکن جن قوموں کی ترقی و تنزل کے زمانہ میں اتحاد نہیں پایا جاتا وہ بہت جلد فنا ہو جاتی ہیں اور ان کا تاریخ بین صرف نام ہی نام باقی رہ جاتا ہے،

یہ نہایت عجیب بات ہے کہ دنیا کی تمام قومیں غیر طبعی موت کا شکار ہوئی ہیں اور انکو اس خوش قسمتی کا موقع نہیں ملا ہے، کیونکہ عالم کائنات کا ایک فطری قانون یہ ہے کہ ایک جسم کے بیدار کرنے کے لئے جقدر زمانہ درکار ہے اسکے فنا ہونے کے لئے اس سے بہت کم زمانہ کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ جو عضو اپنے عمل کو چھوڑ دیتا ہے اسکی علی قابلیت

اسی وقت معدوم ہو جاتی ہے۔

اسی بنا پر قوم کے تمام اخلاقی محاسن مثلاً جرات، شجاعت، عزم و ارادہ، قوت و استقامت اگرچہ بہت دنوں میں پیدا ہوتے ہیں تاہم جب وہ اپنا محل استعمال نہیں پاتے تو نہایت سرعت کے ساتھ فنا ہو جاتے ہیں اور چونکہ قوم کے تمام تمدنی مظاہر کی بنیاد انہیں پر قائم ہوتی ہے، اسلئے جب کبھی ان میں تغیر پیدا ہوتا ہے تو دفعۃً تمدنی تاریخ کی عمارت بھی منہدم ہو جاتی ہے،

لیکن یہ کلبہ اسلام کی تاریخ میں غلط ٹھرتا ہے، کیونکہ مسلمانوں کے اساسی اصول جتنے عرصہ تک قائم رہے ہیں، اتنے ہی دنوں میں ان پر زوال بھی طاری ہوا ہے اور اسلئے مسلمانوں کی خوش قسمتی میں کیا کلام ہو سکتا ہے؟ تاہم چونکہ یہ ایک اہم تمدنی نظریہ ہے اسلئے ہم اس پر نہایت تفصیل کے ساتھ بحث کرنا چاہتے ہیں،

تمدنی تاریخ کے علماء، ابن علامہ ابن خلدون اور ڈاکٹر لیبان نے اس موضوع پر جو کچھ لکھا ہے، اسکا اصلی مرجع قوم اور سلطنت ہے، اس بنا پر یہ کلبہ بھی انہیں دونوں چیزوں پر صادق آسکتا ہے، اس میں کچھ شک نہیں کہ ہر قوم اور ہر سلطنت کی ایک طبعی عمر ہوتی ہے جس میں وہ بڑھتی ہے، نشوونما پاتی ہے، عروج چل کر پڑتی ہے، اور پھر اپنی ترقی کا دور ختم کر کے اوج رفعت سے حسیض مذلت میں گر جاتی ہے، لیکن اسلام کسی قبیلہ یا قومیت کا نام نہیں ہے اسلئے اس نے اپنے متبعین کو قومی اور نسلی امتیازات سے الگ رکھا ہے اور سعادت و نبوی کے چال کر نیک مدار قومی عصبیت یا نسبی شرافت کے بجائے اعمال صالحہ کو ٹھہرایا ہے، اس بنا پر اسکے جہت سے کے بچے مختلف قومیت، مختلف جنسیت اور مختلف قبائل کے لوگ جمع

۱۔ انقلاب الامم صفحہ ۴۴۱



ہوئے ہیں، جنہوں نے مختلف زمانوں میں عروج حاصل کیا ہے، اسلئے اگرچہ انفرادی حیثیت سے یہ قانون ہر قوم اور ہر سلطنت پر منطبق ہو سکتا ہے، لیکن مجموعی حیثیت سے اسکا کوئی اثر نہیں پڑ سکتا کیونکہ اسوقت یہ تمام حلقے مل کر ایک مسلسل زنجیر بنجاتے ہیں جو قانون قدرت کے توڑنے سے ٹوٹ نہیں سکتی،

بہر حال مسلمانوں کا متحدہ مزاج عقلی قانون قدرت کی حکومت سے بالکل آزاد ہے، اسلئے وہ جس طرح تدریجی طور پر پیدا ہوا تھا، اسی طرح تندرست و نافع بنایا ہوا ہے، اور یہ وہ خیال ہے جسکی تائید میں تاریخ اسلام کے ہزاروں صفحات پیش کئے جاسکتے ہیں، لیکن قبل اسکے کہ ہم اصل مقصد کی طرف متوجہ ہوں ہمکو تاریخ طبعی کی روشنی میں حیات انسانی کے تمام تغیرات و انقلابات کا مطالعہ کر لینا چاہیئے،

علماء طبیعیین نے حیات انسانی کے تیرہ دور قائم کئے ہیں، جنہیں انسان کے قواسم طبعیہ اور عقلیہ پر مختلف قسم کے تغیرات طاری ہوتے رہتے ہیں، چنانچہ اسکی تفصیل حسب ذیل ہے:

(۱) حیات انسانی کا پہلا دور زمانہ طفولیت سے شروع ہوتا ہے، اس سن میں انسان کو صرف رنج و غم اور ضرورت کا احساس ہوتا ہے، اس میں رغبت و ارادہ کے جذبات پیدا ہوتے ہیں، چیزوں پر حکم لگانے کی قابلیت پیدا ہوتی ہے، اور اس دور کے اختتام تک اسکو ہر شے کا احساس ہونے لگتا ہے،

(۲) دوسرے دور میں جسکو سن حدانت کہتے ہیں، انسان کے دل میں امیدیں پیدا ہوتی ہیں وہ اپنے مستقبل کی نسبت ایک اسے قائم کر سکتا ہے اور اسکے تمام عقلی خصوصیات اور اس نشوونما پاتے ہیں،

(۳) سن بلوغ میں جو انسان کی زندگی کا تیسرا دور ہے غرور اور امید پیدا ہوتی ہے،

اس زمانہ میں وہ محبت ذات، بلے پردائی، غرور اور آزادی کو پسند کرتا ہے، لیکن جب یہ چیزیں حد اعتدال سے تجاوز ہو جاتی ہیں تو معائب بن کر اسکی جسمانی اور اخلاقی زندگی کو برباد کر دیتی ہیں،

(۴) سن شباب میں جو حیات انسانی کا چوتھا درجہ ہے، عشق، لذت، طیش، شجاعت اور عدم استقلال کے جذبات پیدا ہوتے ہیں، اور چونکہ اس سن میں انسان پر عشق اور لذت کا قلبہ ہوتا ہے، اسلئے وہ صرف اہنین چیزوں کے اسباب ہتیا کرنے میں مصروف رہتا ہے، (۵) سن رجولیت میں انسان کو طمع دامنگیر ہوتی ہے، اور ترقی کر نیکا خیال پیدا ہوتا ہے، یہ سن طبعی اور عقلی عیش و مسرت کا زمانہ ہوتا ہے، اسلئے اہین انسان کی جسمانی حالت نہایت بہتر ہوتی ہے، اسپر ہمہ وقت ایک نشاط چھایا رہتا ہے، اور اسکی عقل کامل ہو جاتی ہے، اسی سن میں اسکو آفات زمانہ سے محفوظ رہنے کا خیال پیدا ہوتا ہے اور وہ اپنی مدافعت کا پورا سامان کرتا ہے،

(۶) سن متوسط میں جسکو شباب ثانی بھی کہتے ہیں، انسان میں ثبات اور استقلال پیدا ہوتا ہے، کیونکہ اس زمانہ میں اسکے تمام قواسم جسمانیہ و عقلیہ اپنی نشوونما کے انتہائی مدارج طے کر لیتے ہیں، اسلئے اب اسکو روپیہ جمع کر نیکی فکر ہوتی ہے، وہ فخر کو پسند کرتا ہے اور اپنی عروت و عظمت کی ترقی کے لئے کوشش کرتا ہے، اس عمر میں اسکی تمام امیدیں ذاتی عمل سے وابستہ ہوتی ہیں، اور چونکہ وہ سوسائٹی میں معزز ہو کر رہنا چاہتا ہے، اسلئے رات دن اسی دہن میں لگا رہتا ہے اور اسکے لئے گہر بار، اہل و عیال، ساز و سامان غرض کسی چیز کی بھی پروا نہیں کرتا،

(۷) سن کہولت میں انسان پر عقل و فہم اور حکمت و دانش کا اثر غالب ہوتا ہے اور وہ

سن متوسط میں اپنی محنت و مشقت سے جو رویہ پیدا کرتا ہے، اس سے اس سن میں فائدہ اٹھاتا ہے، کیونکہ اب اسکے مزاج میں عیش پسندی آجاتی ہے،

(۸) سن بہو طبین انسان زیادہ آرام طلب ہو جاتا ہے، اس میں تدبیر و فکر کے اوصاف پیدا ہوتے ہیں، اسلئے اسکے تمام کاموں میں حزم، احتیاط اور پختگی پائی جاتی ہے، لیکن اسکے قواسم جسمانی اور عقلی میں انحطاط شروع ہوتا ہے، اسکا جسم سرو پڑ جاتا اور اس کا احساس کم ہو جاتا ہے،

(۹) شیخوخت کے دورِ اول میں انسان پر تکلیف، حسرت، اور رنج و غم غالب آتے ہیں، کیونکہ اسکے قوی کمزور ہو جاتے ہیں، اسکا دل افسردہ ہو جاتا ہے، اسکے بال سفید ہو جاتے اور وراثت گر جاتے ہیں، اور اس سے نشاط کلیتہً معدوم ہو جاتا ہے، اسلئے اسکی آنکھوں میں ہر وقت موت کی تصویر پہرتی رہتی ہے،

(۱۰) شیخوخت کے دورِ ثانی میں ضعف بڑھ جاتا اور تکلیف زیادہ ہو جاتی ہے، جس سے انسان ہر وقت غصہ بنا کر رہتا ہے، اور وہ اپنے احکام کی تعمیل فوراً کرنا چاہتا ہے، ایسے ہمیشہ کو پسند کرتا ہے جو اسکے مزاج کے مطابق ہوں اور اسکی ہر رائے سے متفق ہوتی ہوں، اس میں حسد و غیرت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں جس سے وہ نوجوانوں کو لو و لعب اور چینی و چالاک کی کام کرتے ہوئے دیکھ نہیں سکتا، اسکے عقلی خصوصیات روز بروز فنا ہوتے جاتے ہیں اور اسکے طبعی فرائض میں بھی خلل واقع ہوتا ہے،

(۱۱) سن ہرم میں انسان کا ضعف اور بڑھ جاتا ہے، اسکو کان سے ادبچاسنائی دیتا ہے اور آنکھ سے صاف طور پر دکھلائی نہیں دیتا، اسلئے اس میں سو رخن پیدا ہوتا ہے اور وہ عریض و بیگانے کسی پر اعتماد نہیں کرتا، اس میں محبت ذات پیدا ہو جاتی ہے، جس سے وہ اپنی واقعات

مبالغہ آمیز طور پر بیان کرتا ہے،

(۱۲) سن ہرم کے بعد ایک اور زمانہ آتا ہے جس کا نام سن تمدو الاصل ہے، اس میں انسان زمانہ طفولیت کی طرف عود کرتا ہے، اس میں بچوں کے سے خواص پیدا ہو جاتے ہیں، اور اسکو اپنے جذبات پر قابو نہیں رہتا، اس زمانہ میں اسکے حواس بالکل جواب دیدیتے ہیں، اسکی آنکھیں بے نور ہو جاتی ہیں، اسکے کان صرف وہا کون کو سنتے ہیں، اور اسکی عقلی زندگی بالکل مردہ ہو جاتی ہے، اسلئے وہ انسانی زندگی کے حدود سے نکل کر نباتی زندگی کے حدود میں داخل ہو جاتا ہے،

(۱۳) اسکے بعد حیات انسانی کا آخری دور ہے، جو سن مئی ”کہلاتا ہے یہ انسان پر شاذا و نادرا آتا ہے، اس میں آدمی بالکل اندھا اور بہرا ہو جاتا ہے، اسکی قوت لامہ، شامہ اور ذائقہ بالکل معدوم ہو جاتی ہیں اور اسپرطبی اور دماغی حیثیت سے عدم طاری ہو جاتا ہے،

لیکن یہ تمام دور صرف افراد ہی پر طاری نہیں ہوتے بلکہ قوموں پر بھی طاری ہوتے ہیں اور انکا قوم کی زندگی پر دہی اثر پڑتا ہے جو افراد کی زندگی پر پڑتا ہے، چنانچہ آغاز اسلام میں جب مسلمانوں کی طفولیت کا زمانہ تہادہ صرف رنج و غم اور ضرورت کا احساس کر سکتے تھے، صحیح بخاری میں حضرت خبابؓ کی جو شکایات مردی ہیں وہ اسی کی موبد ہیں، اور حضرت بلال، عمار، اور صہیب وغیرہ کے واقعات بھی اسی کی تائید کرتے ہیں، اسی زمانہ میں مسلمانوں کو اشاعت اسلام کی طرف رغبت پیدا ہوئی اور حضرت ابوبکرؓ نے چند اشخاص کو خفیہ طور پر مسلمان کیا، لیکن تین برس کے بعد جب مسلمانوں کو اپنی قلت اور کمزوری کا احساس ہوا تو وہ اسلام کی دعوت علانیہ طور پر دینے لگے، اس دور کے بعد اسلام کا سن حدائت

۱۴ افسان کی تاریخ طبعی مولفہ موسیو ڈی صفی امہ تہاہام،

شروع ہوا جس میں امیدین پیدا ہوئیں اور مسلمانوں نے اعلان دعوت کے اثرات کو دیکھ کر اپنے مستقبل کی نسبت رائے قائم کی، اسلئے اگرچہ اس وقت تک انکو بہت زیادہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی تھی، تاہم جب کفار قریش نے ابوطالب سے آنحضرت کی شکایت کی اور انھوں نے انکو بہت پرستی سے باز رکھنا چاہا تو آپ نے صاف جواب دیا کہ اگر یہ لوگ میرے ایک ہاتھ میں سورج اور دوسرے میں چاند لاکر دیدیں تب بھی میں اپنے فرض سے باز نہ آؤں گا، اسکے بعد تیسرا دور شروع ہوا جو اسلام کے سن بلوغ کا زمانہ ہے، اور اسکی ابتدا ہجرت حبشہ سے ہوئی، قریش کی سخت مزاحمتوں کے باوجود اسلام کے دائرہ میں جو وسعت پیدا ہو گئی تھی اس نے مسلمانوں کو اپنی کامیابی کا یقین دلادیا تھا، اسلئے وہ باہم ایک دوسرے کے سخت ہمدرد ہو گئے تھے، اور قریش کے مظالم کو حقارت اور بے پروائی کی نظر سے دیکھتے تھے، اور چونکہ اس وقت ان میں قریش کی جابرانہ حکومت سے آزاد ہو بیٹھا خیال پیدا ہو گیا تھا، اسلئے انھوں نے دربار حبشہ کی طرف ہجرت کی اور جناب رسالت پناہ نے اشاعت اسلام کی غرض سے طائف کا سفر اختیار فرمایا، اسکے علاوہ حج کے موسم میں جو قبائل عرب کے تمام صوبوں سے آکر مکہ میں جمع ہوتے تھے، آپ انکے خیموں میں جا کر اسلام کی تبلیغ فرماتے تھے، تاکہ ان کا ملک مسلمانوں کا دارالہجرت ہو، اب اسلام کا چوتھا دور شروع ہوا جو اسکا عمد شباب ہے، کفار کے مظالم برداشت کرنے اور اسلام پر قائم رہنے سے مسلمانوں کو جو لذت حاصل ہوئی تھی اسکا یہ اثر تھا کہ بہت سے صحابہ نے ہجرت حبشہ پر مکہ کی اقامت کو ترجیح دی، اور اپنی توجہ کو تمام تر اشاعت اسلام کی طرف مبذول کر دیا، اسکا یہ نتیجہ ہوا کہ جب انصار ایمان لائے اور مدینہ دارالہجرت قرار پایا تو مسلمانوں پر

کا میا پون کا دروازہ کھل گیا، کیونکہ اب انکو اپنی شجاعت کے جوہر دکھانے اور کفار سے انتقام لینے کا موقع مل گیا تھا، اور چونکہ وہ کفار کے ظلم و ستم سے عاجز آگئے تھے، اسلئے جب غزوہ بدر میں ان کا مقابلہ ہوا تو مسلمانوں نے اس جوش سے جنگ کی کہ ۷۰۰ کفار صرف ۳۰۰ آدمیوں سے شکست کھا گئے، غزوہ بدر کے بعد اور بھی متعدد غزوات پیش آئے جن میں کفار کو شکست ہوئی اور صرف نو برس کی قلیل مدت میں تمام عرب پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا، اسکے بعد وہ اصل مقصد کی طرف متوجہ ہوئے اور باقاعدہ اشاعت اسلام کا کام شروع کیا، جس سے آنحضرت کی وفات تک تمام عرب مسلمان ہو گیا، لیکن باہرین چونکہ یہ مسلمانوں کے قناب کا زمانہ تھا، اسلئے عدم استقلال کی بھی بعض مثالیں ملتی ہیں، مثلاً غزوہ احد میں آنحضرت شہر کے اندر رہ کر کفار کا مقابلہ کرنا چاہتے تھے، لیکن بعض پر جوش نوجوانوں نے باہر نکل کر لڑنے پر اصرار کیا اور چونکہ کثرت الہین کو حاصل تھی اسلئے آپ نے انکی تائید فرمائی،

اسکے بعد پانچواں دور شروع ہوا اور اسکی ابتداء خلافت فاروقی سے ہوئی، اس زمانہ میں مسلمانوں کو ملک گیری کا خیال پیدا ہوا، اور انکو ترقی کی نیکی خواہش ہوئی، یہ زمانہ حقیقت اسلام کا سن رجولیت تھا، جمہیں طبعی اور عقلی عیش و مسرت کی جہلک نظر آتی تھی، کیونکہ اب مسلمان جسمانی اور دماغی دونوں حیثیتوں سے مکمل ہو گئے تھے، وہ نہایت قوی، تو مند اور بلند و بالا ہوتے تھے، انکے نفوس میں ہر وقت ایک نشاط پایا جاتا تھا، انکے خیالات بلند ہو گئے تھے، اور ان میں علوم و فنون کا عام رواج ہو گیا تھا، اسلئے وہ آفات زمانہ کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار رہتے تھے، اور جو چیزیں انکی ترقی میں سد راہ ہوتی تھیں انکو ہٹا دیتے تھے،

لیکن چونکہ اس زمانہ میں انسان پر حرص و طمع کا غلبہ ہوتا ہے، اسلئے اسلام میں اسکا یہ منظر نظر آتا کہ خلافت راشدہ کے اخیر زمانہ میں امیر معاویہ مدعی خلافت ہوئے، جبکہ دعویٰ خلافت سے اسلام کا چہنچا دور شروع ہوا، یہ اسکا سن متوسط یا شباب ثانی تھا، جس میں مسلمانوں میں استقلال اور ثبات پیدا ہو گیا تھا، کیونکہ اب انکی تمام جسمانی اور دماغی قوتیں انتہا تک پہنچ چکی تھیں، اور وہ مال و دولت کے جمع کرنے کی طرف مائل ہو گئے تھے، چنانچہ خود صحابہ میں اس قسم کا ایک گروہ پیدا ہو گیا تھا جسکی مخالفت میں حضرت ابوذر غفاری نے انتہائی کوششیں کی تھیں، جو ناکامیاب رہیں، بہر حال اقتضائے سن کے مطابق اس زمانہ میں مسلمانوں کی امیدوں کا دار و مدار عمل ذاتی پر تھا، وہ فخر و مباهات کو پسند کرتے تھے، اور ان میں سوسائٹی میں امتیاز حاصل کرنے کا خیال پیدا ہو گیا تھا، یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے اہل و عیال کو چھوڑ کر ویران مقامات میں نکل جاتے تھے، جہاں انکو صرف اپنے مقاصد کے حاصل کرنے کی فکر رہتی تھی، چنانچہ سلطنت بنو امیہ جو نصف صدی کے اندر اندر سترہ اور تترکستان سے لیکر افریقہ اور اسپین تک پھیل گئی تھی، انہیں کوششوں کا نتیجہ تھی، لیکن ان عظیم الشان فتوحات کے باوجود بنو امیہ میں سلطنت اور جاہ و عظمت کی حرص زیادہ ہوتی گئی، جس سے اسلام کا سا توان دور شروع ہو گیا، جو اسکے کہولت کا زمانہ ہے، اب خلافت کے تخت پر بنو عباس متمکن ہوئے، جبکہ زمانہ میں یہ خیال پیدا ہوا، کہ جو مالک مسلمانوں کے قبضہ میں آچکے ہیں ان پر مستحکم طور پر قبضہ کیا جائے، اور ان سے نفع اٹھایا جائے، اس خیال نے مسلمانوں کو عیش پسند اور کاہل بنا دیا، اور انکی فتوحات و فتہ رک گئیں، یہی وجہ ہے کہ سلطنت عباسیہ کے حدود کبھی سلطنت بنو امیہ سے زیادہ وسیع نہیں ہوئے، اسکے علاوہ انکے مزاج کے عناصر میں حکمت اور تعقل کا غلبہ ہو گیا تھا، اور جب کسی قوم کے

مزاج میں تغزل کا عنصر غالب ہو جاتا ہے، تو اسکے اساسی اخلاق میں انحطاط شروع ہو جاتا ہے جس سے اُسکی ترقی رک جاتی ہے، اسکے بعد آئٹھواں دور شروع ہوا جو اسلام کا سن ہبوط ہے اس میں مسلمانوں میں غور و فکر کا غلبہ ہوا، وہ تفکر اور تدبیر کے عادی ہو گئے، اور انکی آرام طلبی اور عیش پسندی بڑھ گئی، اس زمانہ میں اگرچہ انکے ہر کام میں حزم، اعتیاد اور پختگی پیدا ہو گئی تھی تاہم چونکہ وہ ناز و نعمت کی زندگی بسر کرنے کے عادی ہو گئے تھے، اسلئے انکے فوجی جذبات میں تنزل شروع ہوا، اسی کا نتیجہ ہے کہ اس دور میں علوم و فنون کو حقدور ترقی ہوئی کبھی نہیں ہوئی تھی، اسی زمانہ میں وہ بڑے بڑے ائمہ پیدا ہوئے جنکے غلغلہ سے آج تمام دنیا گونج رہی ہے، تاہم ممالک اسلامیہ کے حدود میں کسی جدید ملک کا اضافہ نہیں ہوا، اسوقت تمام دنیا سے اسلام پر ترک قابض تھے، جنکی چھوٹی چھوٹی حکومتیں ہر جگہ قائم تھیں، اور جنہیں اتحاد و یکپہتی کا احساس باقی نہیں رہا تھا، یہ تمام اسباب ایسے تھے، جن سے خود بخود نوین دور کا آغاز ہوا یعنی اسلام پر شیخو جیت کا پہلا دور آیا، جس نے مسلمانوں کے دماغ کو تکلیف، درد، رنج و غم، اور یاس و حسرت سے لبریز کر دیا، یہ کچھوین صدی ہجری کا زمانہ تھا جسکی علامہ ابن خلدون نے اپنے مقدمہ میں شکایت کی ہے کیونکہ اس زمانہ میں مسلمانوں کے قوائے جسمانیہ اور عقلیہ پر انحطاط طاری ہو گیا تھا، ان کے اعضائے جسمانی کمزور ہو چکے تھے، ان کا دل افسردہ ہو چکا تھا، اور ان سے نشاط اور ہمت فنا ہو چکی تھی، اور یہ تمام چیزیں انکو موت کی دہلی دے رہی تھیں،

اسکے بعد دسواں دور شروع ہوا جو اسلام کی شیخوخت ثانیہ کا زمانہ ہے، اس میں مسلمانوں کا ضعف زیادہ بڑھا، اور انکی اخلاقی حالت اسقدر تباہ ہو گئی کہ اسکو ویکملہ شاہ ولی اللہ صاحب کی آنکھ سے خون کے آنسو جاری ہو گئے ہیں، جن سے فوز الکبیر کا ہر صوفی



ایک لالہ زار بن گیا ہے، اسی زمانہ میں مسلمانوں کی بہت سی سلطنتیں انکے قبضہ سے نکل گئیں، جسکی وجہ یہ تھی کہ انکے مزاج میں حسد کے ساتھ ساتھ غصہ بھی پیدا ہو گیا تھا۔ اسلئے اغیار کو ان سے فائدہ حاصل کر نیکا موقع ملا، اور انھوں نے مسلمانوں کے مزاج کو اپنے موافق بنا کر در اندازی شروع کی، جس سے مسلمانوں میں نفاق پیدا ہوا، اور ہر صوبے اپنی خود مختار حکومت قائم کر لی، اسکا یہ اثر ہوا کہ ممالک اسلامیہ میں اغیار کے قدم نہایت مضبوطی کے ساتھ جم گئے، اور چونکہ اس زمانہ میں مسلمانوں کی عقلی خصوصیات فنا ہو گئی تھیں، اسلئے کسی کو احساس تک نہ ہوا، اور وہ اپنے فرائض کے ادا کرنے سے قاصر رہے، ان چیزوں نے انکے ضعف کو اور بڑھایا، اور اب اسلام کا گیارہواں دور شروع ہوا جو اسکا سن ہر م ہے اس دور میں مسلمان بہت زیادہ کمزور ہو گئے تھے اور چونکہ وہ اپنے سرایہ ہوش و حواس کو ضائع کر چکے تھے اسلئے ان میں بطنی کا مرض پیدا ہو گیا، اور وہ بیگانوں کی طرح بیگانوں سے بھی سوزن رکھنے لگے، ان میں محبت ذات نہایت شدت کے ساتھ ترقی کر گئی، اور وہ صرف اپنے کارنامے مبالغہ آمیز طریقہ سے بیان کرنے لگے، ان باتوں نے انکو ایک دوسرے دور میں پہنچایا جو اسلام کا بارہواں دور ہے اس دور میں مسلمان ہر چیز سے بے پروا ہو گئے، انکی بصیرت کی آنکھیں بے نور ہو گئیں اور انکے کانوں سے صدائے حق کے امتیاز کی قابلیت مفقود ہو گئی، اسلئے اب وہ ہر آواز کے سننے کی طاقت نہیں رکھتے تھے، انکو صرف بادل کی گرج اور برق و صاعقہ کی لڑاک ہی اپنی جانب متوجہ کر سکتی تھی۔

بہر حال اس تفصیل سے معلوم ہوا ہو گا کہ مسلمانوں کی ترقی و تدرج انکے مزاج عقلی کے تغیرات کا نتیجہ ہے، اور انکے فنا اور بقا کی مدت میں پورا پورا اتحاد پایا جاتا ہے کیونکہ انکی ترقی کا زمانہ ساتویں صدی میں ختم ہو گیا تھا، اور آج انکا تنزل بھی چودھویں صدی میں ختم ہو رہا ہے، اسلئے تاریخی حیثیت سے مسلمان نہایت خوفناک قسم قوم ہے،

# تَلْخِصٌ مِّن تَلْخِصٍ

## روح کی حقیقت

ترجمہ: پروفیسر فیروز الدین مراد ایم ایس سی ایم اے، اڈکالج علی گڑھ

(۱) بمخلہ ان تمام مظاہر فطرت کے جن سے ہم آشنا ہیں وہ مظاہر جو "حیات روح" کے تحت میں رکھے جاتے ہیں یا جو بالفاظ دیگر نفس انسان کے وظائف اور اعمال مخصوصہ سے وابستہ ہیں ایک لحاظ سے نہایت ضروری اور اہم ہیں گو وہ بہت ہی دقیق اور متنازعہ فیہ بھی ہیں چونکہ کارخانہ قدرت کے متعلق معلومات حاصل کرنا، جو اس کتاب کا فلسفیانہ بحث ہے خود حیات روح کا ایک جزو ہے، اور چونکہ علم الانسان بلکہ علم الکائنات بھی نفس (انسانی) کے متعلق صحیح معلومات کا محتاج ہے، اسلئے ہم علم النفس یعنی روح کے حکیمانہ (سائنٹیفک) مطالعہ کو دیگر تمام علوم کی بنیاد اور اصل مان سکتے ہیں، دوسرے نقطہ نگاہ سے یہی علم النفس، فلسفہ یا علم افعال الاعضاء یا علم الانسان کا ایک جزو تصور ہو سکتا ہے،

(۲) علم النفس کو ایک فطری بنیاد قائم کرنے کے لئے انسانی نظام الاعضاء سے اور بالخصوص دماغ سے جو فعلیت نفسی کا خاص متقرر ہے، صحیح واقفیت درکار ہے، اکثر عالمان نفسیات روح کے اس جسمانی مسکن کے احوال سے یا تو بالکل بے بہرہ یا بہت ہی کم آشنا ہوتے ہیں، اسی سبب سے یہ خرابی واقع ہوتی ہے، کہ بخلاف دیگر علوم کے علم النفس کے موضوع اور صحیح معنی کی تخریج و توضیح میں بہت سی تناقض اور بے تعلل بائین پائی جاتی ہیں، گذشتہ

۱۰ یہ مضمون جرمن پروفیسر ہیکل کی شہرہ آفاق تصنیف "مذہب کائنات" سے مقتبس ہے،

تیس سال میں یہ تناقض اور علم النفس کے موضوع سے صحیح واقفیت ہونی کے بدنتائج تفسیر الابدان اور افعال الاعضاء کی شاندار ترقی اور دماغ کی ساخت اور طبعی وظائف کی بہتر تفہیم کے دوش بدوش اور بھی زیادہ نمایان ہو گئے ہیں،

(۳) میری دانست میں لوگ جسکو روح سے تعبیر کرتے ہیں وہ ایک منظر فطرت ہے، لہذا میں علم النفس کو علوم طبعی کی ایک شاخ اور علم افعال الاعضاء کا ایک جزو سمجھتا ہوں، اسلئے شروع ہی میں مجھے نہایت زور سے یہ بتا دینا چاہیئے کہ اس علم میں (یعنی روح کی حقیقت معلوم کرنے کے لئے) ذرا لچ تخلص صرف وہی ہو سکتے ہیں، جن سے دوسرے علوم طبعی میں کام لیا جاتا ہے یعنی سب سے پہلے ہمیں مشاہدہ اور تجربہ سے کام لینا چاہیئے، دوئم نظریہ ارتقاء سے اور سوئم مابعد الطبیعیاتی قیاسات کی وساطت سے بذریعہ استدلال و استقراء مظاہر نفسی کی کونہ تک پہنچنے کی کوشش کرنی چاہیئے، لیکن اس مسئلہ کو اچھی طرح ذہن نشین کر نیکی خاطر ہم ناظرین کے سامنے ثنویت اور وحدیت کے نظریوں کا تضاد پیش کرتے ہیں،

(۴) فعلیت نفسی کا عام تصور جسکے ہم مخالف ہیں، روح اور جسم کو دو متباہن ہستیاں تسلیم کرتا ہے (اسی بنا پر یہ قیاس نظریہ ثنویت کہلاتا ہے، اور اسکی مفصل تفسیر فلسفہ ثنویت کے نام سے موسوم کیجاتی ہے) یہ دونوں ہستیاں ایک دوسرے پر منحصر نہیں ہیں اور نہ ہی انکا اتحاد انکے وجود کے لئے لازمی ہے، ذی اعضا جسم ایک فانی اور مادی حقیقت رکھتا ہے اور اسکی کیمیائی ترکیب مواد زندہ اور اسکے مرکبات سے ہوئی ہے، برعکس اسکے روح ایک غیر فانی اور غیر مادی ہستی اور ایک ملکوتی عامل ہے، جسکی پر اسرار زندگی اور فعلیت انسانی عقل کی دسترس سے تجاوز ہے، یہ عامیہ قیاس اپنے دعویٰ کے لحاظ سے روحانی اور غیر مادی کہلاتا ہے اور اسکے بالمقابل مذہب کو مادی کہا جاتا ہے، یہ غیر مادی قیاس حدود و ثغور سے

متجاوز ایک فوق الفطرت قیاس ہے کیونکہ اس میں ایسی قوتوں کا وجود تسلیم کیا جاتا ہے جنکی فعلیت کسی مادی اصل کی محتاج نہیں ہے۔ اس قیاس کی بنیاد ایک مفروضہ ”روحانی“ غیر مادی عالم ہے جسکا ہمیں کچھ شعور نہیں ہے اور جو مادی دنیا کے مادر اس طور سے موجود ہے کہ معمولی طبعی ذرائع تحقیقات کی وساطت سے ہمیں اسکا مطلقاً کچھ علم حاصل نہیں ہو سکتا۔

(۵) یہ مبہوم ”عالم ارواح“ جسے مادی کائنات سے بالکل جدا اور آزاد مانا جاتا ہے اور جسکے اوپر فلسفہ ثنویت کے مصنوعی ڈھانچے کا سارا دار مدار ہے، سب کا سب شاعرانہ تخیل کا نتیجہ ہے، اسی عقیدہ کے متوازی جو مذہب ”بقائے روح“ یا ”عدم فنا و روح کو“ مانتا ہے اسکے متعلق بھی تذکرہ صدر تنقید کیا سکتی ہے، ”بقائے روح“ کا سامنتفاک طور پر ناممکن ہوتا ہم آئینہ ابواب میں ثابت کر دکھائیے، اگر اس عقیدہ کی جو ضعیف الاعتقاد زود اعتبار آدمیوں کے حلقہ میں عام ہے کوئی حقیقی اصلیت ہو تو وہ مظاہر جو اس عقیدہ سے متعلق ہیں ”ناموس مواد“ کے (یعنی قانون عدم فنا و مادہ اور قانون عدم فنا و قوت جنکی مفصل تشریح آئینہ ابواب میں کیا گئی) تابع نہیں ہو سکتے، علاوہ از بین کائنات کے اس اعلیٰ ترین قانون کی یہ واحد استثناء تاسیج عالم میں بہت دیر کے بعد ظاہر ہوئی ہوگی، کیونکہ اسکا تعلق صرف انسان اور اعلیٰ حیوانات کے ”روح“ یا نفس ناطقہ سے ہے، نفسیات تنویر کا ایک دوسرا ضروری عنصر یعنی ”عقیدہ اختیار“ بھی اسی طرح اس عالمگیر ناموس مواد کے بالکل غیر مطابق ہے،

(۶) فعلیت نفسی یعنی روح کی زندگی اور اصلیت کے متعلق ہمارا طبعی قیاس یہ ہو کہ مظاہر روح تمام دیگر مظاہر فطرت کے مانند ایک مخصوص مادی جوہر پر منحصر ہیں، فعلیت نفسی کی اس مادی بناء کو جسکے بغیر یہ تصویریں آہی نہیں سکتی ”ہم کلمۃ النفس“ کے نام سے

موسوم کر سکتے ہیں، اور اس طریق تسمیہ کا سبب یہ ہے کہ کیمیائی تحلیل و تجزیہ کی رو سے یہ کثتہ الاولیٰ یا موادِ زندہ کی قسم کے اجسام میں شامل ہے، جو اندے کی سپیدی کی طرح کاربن کے دھیمچیدہ مرکبات ہیں جن پر تمام روحی حرکات و سکنات اور اعمالِ حیات کا انحصار ہے، اعلیٰ حیوانات میں سے جو نظامِ عصبی اور مخصوص مستقراتِ حواس رکھنے کے اہل ہیں، کثتہ لافس میں سے عصبی مادہ یعنی کثتہ الاعصاب بھی الگ کیا جا چکا ہے، مشرہ صدر نقطہ نگاہ سے روح کے متعلق ہمارا یہ قیاس مادی کہا جاسکتا ہے، علاوہ ازیں اس قیاس کو فطری اور مشاہدہ پر مبنی بھی کہہ سکتے ہیں کیونکہ ہمارے سائنٹفک تجربے نے آج تک یہی باتوق الفطرت قوی یا عالمِ ارواح کے وجود کا پتہ نہیں دیا جو معمولی قواسے فطری یا مادی دنیا سے ارفع و اعلیٰ ہوں،

(۷) دیگر تمام مظاہر قدرت کی طرح تغیراتِ نفسی اور افعالِ روحی بھی عالمگیر ناموس مواد کے زیرِ نگین ہیں، یہاں بھی کائنات کے اس اعلیٰ ترین قانون کی کوئی استثناء نہیں پائی گئی، (ملاحظہ ہو باب دوم نہاتات اور حیوانات کی ادنیٰ ترین اقسام کی حقیر حیاتِ نفسی کے مظاہر یعنی انکا اشتغال پذیر ہونا انکے اضطرابی افعال انکی حیثیت اور خود تحفظ کی جدت، ان کے خلایا کے اندر موادِ زندہ میں ان طبعی اور کیمیائی تغیرات کا نتیجہ ہوتے ہیں جو کچھ تو کسباً اور کچھ وراثتاً حاصل کئے جاتے ہیں، اعلیٰ حیوانات اور انسان کی متنازع حیاتِ نفسی کے متعلق یعنی خیالات اور تصورات کے مرتب ہونے اور عقل و شعور کے حیرتناک مظاہر کی بابت بھی ہمیں بجنسہ یہی رائے قائم کرنی چاہیئے، کیونکہ موخر الذکر اعلیٰ حیاتِ نفسی کے متعلق علم ارتقاء انواع بتاتا ہے کہ یہ مقدم الذکر ادنیٰ حیاتِ نفسی کی ارتقائی (یعنی تدریجی طور پر ترقی یافتہ) شکل ہے جو مختلف ادنیٰ حیوانات کے متفرق وظائفِ حیات کے اتحاد و امتزاج اور ایک

مرکز تک ترقی کر جانے سے متج ہو جاتی ہے،

(۸) ہر علم کا پہلا کام یہ ہے کہ اپنے موضوع اور محبت کو واضح طور پر بیان کر سکے، دنیا میں کسی دوسرے علم کے لئے اس فرض اولین کی ادائیگی میں علم النفس سے زیادہ رحمت کہیں لاحق نہیں ہوتی، کیونکہ منطق جسکی وساطت سے یہ فرض ادا کیا جاسکتا ہے خود علم النفس کا ایک جزو ہے، جب ہم مختلف زمانوں کے ممتاز ترین فلسفیوں، حکیموں اور عالمان سائنس کے ان اقوال کا جو علم النفس کے تصور اساسی کی بابت منقول ہیں یکجا جمع کر کے نظر امعان مطالعہ کرتے ہیں تو متناقض آراء اور متباہن خیالات سے حیران و سرگردان ہو جاتے ہیں، ”روح“ دراصل کیا ہے؟ ”دماغ“ یا انسانی نفس ناطقہ سے اسکا کیا تعلق ہے؟ شعور کے حقیقی معنی کیا ہیں؟ حس اور وجدان میں کیا فرق ہے؟ جبلت (جسے عرف عام میں عقل حیوانی بھی کہتے ہیں) کیا ہے؟ ”علم حضوری“ کسکو کہتے ہیں؟ فہم اور عقل میں کیا فرق ہے؟ ”جذبہ“ کی صہیت کیا ہے؟ جسم اور ان تمام مظاہر نفسی کے درمیان کیا علاقہ ہے؟

ان سوالات اور انکے مماثل دیگر متعدد سوالات کے جوابات میں بیحد و حساب اختلاف کر رہے ہیں، نہ صرف بڑے بڑے اہل الرائے علماء کے خیالات میں ان مسائل کے متعلق تفساد و اختلاف ہے، بلکہ غضب تو یہ ہے کہ بہت سے علماء نے جسکی قابلیت میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں ہو سکتا اپنی دماغی ترقی کے مختلف منازل طے کرتے ہوئے بسا اوقات اپنی پوری پوری رائیں بدل دی ہیں، امر واقعہ یہ ہے کہ اتنے کثیر التعداد اہل فکر کی ”دماغی قلب بیہت“ نے علم النفس کے تصورات میں ایک عظیم الشان انقلاب پیدا کر دیا ہے۔

(باقی)

## ہربرٹ اسپنسر

انگلستان کے نامی و گرامی فلسفی ہربرٹ اسپنسر کی ولادت کو پوری ایک صدی ہوئی اس تقریب سے حال میں اسکے متعلق منہدمضامین انگریزی جراید و رسائل نے شائع کئے ہم ذیل میں اس مضمون کا ترجمہ درج کرتے ہیں جو پروفیسر ڈی، آری ٹامسن نے جماعت عقلمین کے مشہور ماہانہ رسالہ لٹیریری گائیڈ میں شائع کیا ہے، یہ واضح رہے کہ خود پروفیسر موصوف کا شمار اس وقت انگلستان کے ممتاز علما میں ہے،

ہربرٹ اسپنسر کی تاریخ ولادت آج سے ہیک سو برس قبل، ۲۷- اپریل ۱۸۲۷ء ہے،

لیکن دنیا میں جتنے تغیرات اس صد سالہ مدت میں ہوئے، یا جتنی طویل اس صدی کی عمر معلوم ہوتی ہے اسکے لحاظ سے موجودہ تاریخ عالم میں کسی پچھلی صدی کو اسکی نظیر نہیں قرار دے سکتے، اسپنسر کی وفات ۸- دسمبر ۱۹۰۳ء کو واقع ہوئی، اور اس حساب سے اسے واقع ہوئے سولہ سال سے کچھ ہی زائد عرصہ گزرا، لیکن ہم میں سے اکثر دن کو یہ شانزدہ سالہ مدت قریباً قرن کے برابر معلوم ہوتی ہے، اس شخص کے ذہن میں اسپنسر کی یاد بالکل تازہ ہے، لیکن ایسے کثیر السن اشخاص کسی کے چند ہیں، دوسری طرف نوجوانوں کی عام جماعت کے نزدیک اسپنسر کی ایک فراموش شدہ شخصیت ہے، اور ایک اسپنسر پر کیا موقوف ہے انکے نزدیک وہ سارا دور ہی بھل ہوتا ہمارا مقصد اس وقت اسپنسر کی مدح و ذم دونوں سے الگ، اسکی سا لگروہ کے موقع پر کچھ دیر کے لئے اسکی بابت سوچنا ہے۔

میں نے اسپنسر کے ساتھ ایک میز پر بیٹھ کر کھانا کھایا ہے، میں نے آتش دان (انگریزی ذرائع) گرم کا ایک لازمی جزدوم کے پاس بیٹھ کر اس سے مکالمات کی ہے، میرے پاس اسکے چند مکاتیب محفوظ ہیں، اور اگرچہ مجھے اس سے بے تکلفانہ دوستی کا شرف کبھی نہیں حاصل ہوا تاہم مجھے فخر و مسرت ہے کہ مجھے اس سے شخصاً ملاقات تھی، میں اسکے فلسفہ کا قائل نہیں، اور نہ اسکے اصول کا متبع ہوں، تاہم میں اپنے خزانہ حافظہ میں اسکی یادداشتوں کو نہایت عزیز رکھتا ہوں میری نوعیت حیات اپنی تشکیل و تعبیر میں اسکے اثرات سے کافی متاثر ہوئی، اور میں پانا ہوں کہ بعض دفعہ بلا قصد و اضطرار بھی اسکے خیالات کو دہرانے اور اسکی زبان بولنے لگتا ہوں،

ملکہ وکٹوریہ آج زندہ نہیں اور نہ اسکے عہد کے شاہی سربراہ جال زندہ ہیں، ایک گروہ کا خیال ہے کہ اسکا عہد آج اس سے زیادہ فراموش شدہ ہے، جتنا ملکہ این (متوفیہ ۱۸۷۱ء) کا ہے، یہ خیال ایک حد تک ضرور صحت و سچیدگی رکھتا ہے، اور جس حد تک صحیح ہے، تاہم کچھ عجائبات میں داخل ہے یہ عجوبہ تاریخی بار بار تجربہ میں آتا رہتا ہے کہ ”حال“ کی دھن میں جو شے سب سے زیادہ فراموش شدہ ہو جاتی ہے وہ ماضی بعید نہیں بلکہ ماضی قریب ہی ہوتا ہے، آج ”سب سے زیادہ کل“ ہی کا دشمن ہوتا ہے، ادھر ہم اپنے مردوں کو دفن کر کے آئے، اور ادھر جدید احباب پیدا کر لئے اور اپنے روزانہ مشاغل میں منہمک ہو گئے، شراب کہنے کی طرح شاہی سربراہ جال کی شہرت کو بھی بچھڑکی تک پہنچے ہیں کافی عرصہ لگتا ہے، اور قبل اسکے کہ انکی بچھڑکی شہرت کا زمانہ آئے ہم خود ہی دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں (اسلئے عظمت و کمال کا اندازہ کئی نسلوں کے بعد جا کر ہوتا ہے،

اسپنسر کی بابت میں نے کئی برس ہوئے ایک مضمون لکھا تھا، اور اس وقت میں یہ سمجھتا تھا کہ اسکے خاص خاص واقعات سب کو معلوم ہیں، لیکن آج کی صحبت میں انہیں کو مختصر بیان کر دینا چاہتا ہوں، اسپنسر کے آبا و اجداد ڈربی کے سیدھے سادھے دیہاتی تھے، ایک زمانہ میں انکے



پاس کچھ جائیداد تھی مگر رفتہ رفتہ وہ ہاتھ سے نکل گئی، اور اسپنسر کے دادا نے اپنے قصبہ میں ایک چوٹا سا مدرسہ اپنی معاش کے لئے قائم کیا، اسپنسر کے والد جارج اسپنسر ایک بد قسمت شخص تھے، میسون کام انھوں نے شروع کئے، مگر کامیابی کسی میں بھی نہ ہوئی، اس زمانہ میں ایجاد و اختراع کی گرم بازاری تھی، اور انھوں نے بھی اختراع کی کوشش کی، پہلے کئی برس انھوں نے فیتہ سازی کی کل بنانے پر اپنا سارا سرمایہ اور وقت صرف کیا، لیکن کچھ نہ چل ہوا، اس کے بعد چرم سازی، پتالیش زمین اور مذہبی کردہ بین داخل ہونگی دہن رہی، بالآخر انھوں نے ایک مدرسہ کھول لیا کہ اکثر ناکام و ناہل افراد کا آخری سہارا بنی ہوتا ہے، لیکن بائین ہمہ وہ بالکل بے مغزیانا ناہل تھے، انکی درسی تعلیم برائے نام تھی، لیکن انھوں نے اپنی ذاتی کوشش سے خوب معلومات بہم پہنچائے تھے، خصوصاً سائنس سے متعلق، اور برابر علل اسباب کے کوجہ میں لگے رہتے تھے، اپنی رائے پر بڑی مضبوطی سے اڑے رہنے والے، بحث میں کبھی نہ ہار ماننے والے خود احکام ضمیر کے پابند، مگر دوسروں پر بڑی نکتہ چینی کرینوالے، کسی کی حکومت نہ سہنے والے تقلید سے متنفر، اور دوسری طرف قوت عمل میں کمزور، اور ظرافت، بذلہ سخی اور فنون لطیفہ کے ذوق سے یکسر معری، یہ اکی خصوصیات زندگی کا خلاصہ تھا،

اسپنسر کا تاناہالی خاندان ایک بالکل دوسری طرز کا تھا، سولہویں صدی کے آخر زمانہ میں بہت سے بیرونی خاندان نواح اسٹربرج میں آکر آباد ہو گئے تھے، مثلاً لورین (فرانس) کے مکہار اوہیمیار کے شیشہ ساز، اور اس سے پہلے اہل نارمنڈی کا ایک معزز خاندان ان سب نوآبادوں نے باہر گر رشتہ ازدواج قائم کیا، اور اسپنسر کی والدہ اسی مشترک و مخلوط نسل کی رکن تھیں، یہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ جس طرح فولاد کسی ناورد ہات کے مل جانے سے اپنی خوبیوں میں کمی گننا بڑھ جاتا ہے، اسی طرح شجرہ نسب میں بیرونی خون کی آمیزش سے غیر معمولی آب و تاب

بیدا ہو جاتی ہے، اسپنسر کو اپنے نسب پر بہت ناز تھا، لیکن میرے نزدیک وہ جتنی اہمیت اپنے  
اسلاف کی حریت پسندی و پابندی ضمیر وغیرہ کی سمجھتا تھا، اتنی اپنے شیشہ ساز اجداد کی کمال  
دستکاری کی بہین سمجھتا تھا،

اسپنسر کی ابتدائی خانگی زندگی بالکل ہی خشک و محدود قسم کی تھی، اسکے والد گرفتار افلاس  
تھے، گہرین مسرت و شادمانی کا نام نہ تھا اور تقریبات مسرت ایک طرف، دوست احباب  
تک کا وجود عقفا تھا، لیکن اسپنسر کے دادا اور چچا صاحبان بڑے ہی "بجاث" اور مناظرہ پسند تھے  
ملک میں اس وقت کاروباری حیثیت سے زلزلہ آیا ہوا تھا، اس زمانہ میں یہ حضرات ہر قسم کے  
سیاسی، مذہبی و معاشری مسئلہ پر خوب جی کھول کر مناظرہ کرتے رہتے تھے، اور اسپنسر کو اس لفظی  
جنگ آزمائی میں شرکت کے موافق بچپن ہی سے ملنے لگے، اسکی تعلیم کا اصلی بار ایک چچا کے  
سر پر، اور یہ تعلیم تھی ہی کیا؟ ابتدائی ریاضی، لاطینی و یونانی کی ابجد (جسے اپنے مذاق طبیعت سے  
بالکل متغایر پا کر کچھ ہی عرصہ میں اس نے چھوڑ دیا) ڈرائنگ اور انگریزی انشا کے ذرا ادنیٰ  
اسباق، بس یہی اسکی تعلیم کی کل کائنات تھی، بچپن کی اس بے توجہی و کم استعدادی کی تلافی  
اس نے سن رشد پر پہنچ کر جس مستعدی و مشقت کے ساتھ کی وہ حیرت انگیز ہے، ابھی اسکا سن  
کل سترہ برس کا تھا کہ اسے لندن اینڈ بزنس ریلوے کے دفتر انجینیری میں نقشہ نویسی کی جگہ  
مل گئی، ریل سازی کا خط اسے نیا نیا شروع ہوا تھا، اور ہر طرف اسی کا زور و شور، اسکی  
بیچ دیکھا رہتی، چنانچہ کچھ ہی روز کے بعد اس نو آموز انجینیر کے تحت بن "انٹی" آدمی کام کر رہے تھے  
جو میرور وڈ کے پل کی تیاریوں میں لگے ہوئے تھے، چار سال تک اسکی زندگی بھی ایسی تعمیر  
خط کے لئے وقف رہی، آگے چل کر اسے خود اس تفسیع وقت پر افسوس رہا، اور وہ اس زمانہ کو  
اپنے زندگی کے بیکار حصہ سے تعبیر کرتا رہا، تاہم یہی وہ زمانہ ہے جس میں اسکے قوی اپنی پختگی کو

پچھے ذہن کی پوری تربیت ہوئی، اور اس سے بڑھ کر یہ کہ انجینیر و معمار کا مذاق طبیعت اس میں  
راخ ہوا، جس کا اثر یہ ہوا کہ آئینہ وہ واقعات عالم کو بھی اسی میکا کی نقطہ نظر سے دیکھنے کا  
خوگر ہو گیا۔

بالآخر اسپنسر اس مشقت سرک سازی سے اکتا گیا، اور اپنے والد کی خدمت کی غرض سے  
اس ملازمت سے استعفا دیدیا، والد بزرگوار اس وقت ایک برقی مشین کی تیاری کی ذہن میں تھے  
لیکن اس کا بھی وہی عشر ہو ا جو اس سے پیشتر دوسری اختراعات کا ہو چکا تھا، یعنی یہ مشین بھی نہ  
چل سکی، اب ریلوے سازی کا خط ملک میں سرد پڑ چکا تھا، رزگار کا ملنا دشوار ہو گیا تھا اور  
انیسویں صدی اپنی چوتھی دہائی میں قدم رکھ چکی تھی، جو افلاس و ناداری کا دور تھا، مجبوراً ہر برٹ  
اسپنسر نے لندن میں آکر قیام اختیار کیا کہ اپنے قلم کے ذریعہ سے کچھ پیدا کریں، اس وقت اس کی عمر  
۳۳ سال کی تھی، اسکے اس دور زندگی کا ابتدائی حصہ بہت ہی افسوسناک ہے، مضامین واپس  
آتے تھے، قدر دانی کیا معنی کوئی بات تک نہ پہنچتا تھا، اور مفلسی کا چار دن طرف سامنا تھا  
لیکن اس کا استقلال بے نظیر تھا، اور محنت و جفا کشی میں کبھی کمی نہ آئی، اس نے چوٹے چوٹے  
مختصرات تیار کرنے شروع کئے، اور حیرت یہ ہے کہ انہیں سے اسے مالی منافع بھی ہونے لگے،  
خاص کر ایک البین کے ایجاد و اختراع سے توجہ طومار کاغذات کی شیرازہ بندی کے لئے تھی،  
اسے ۱۸۷۴ء میں حاصل ہوئے، اسی درمیان میں اسے کبھی کبھی انجینیری کا کام بھی ملتا رہا، اور  
بعض اخبارات بھی خردن کی ترتیب و غیرہ میں اس سے اجرت پر کام لیتے رہے، غرض  
کسی نہ کسی طرح وہ بغیر کسی دست نگر ہوئے اس زمانہ میں اپنی گذر کرتا رہا، اور فرصت کے  
اوقات نکال کر پڑھنے اور لکھنے کے مشاغل بھی جاری رکھے،

اسپنسر کی عمر جب ۳۰ سال کی ہوئی تو اس نے اپنی پہلی تصنیف سوشل سٹیکس شاپ کی

جامعیت و ہمہ گیری، جسکی سعی وہ اپنی ہر آئینہ تصنیف میں کرتا رہا، اسکی جہلک اس پہلی تصنیف میں بھی نمایاں ہے، اس کتاب کا موضوع ایک نظام اخلاق کو پیش کرنا تھا، جسکی تفصیل و تکمیل اس نے بعد کو اپنی پرنسپلز آف پیٹکس میں کی، اخلاق کی تعریف اس نے یہ کی کہ وہ غمط و منع کی چند نوعات کے مجموعہ کا نام نہیں بلکہ اس نظام کا مفہوم آزادی کے ان حدود کو متعین کرنا ہے جنکے مطابق عمل کرنے سے مقاصد حیات پورے لطف و لذت کے ساتھ حاصل کئے جاسکتے ہیں، گویا محکومی و اطاعت نہیں، بلکہ آزادی عمل، حقوق انسانی کی اہم ترین دفعہ، اور حیات انسانی کی غایت اصلی ہے، مسئلہ ارتقا کی داغ بیل اسی کتاب سے پڑی، اور کلیتہً بقاے اصلح کی بھی، جسکے معنی یہ ہیں کہ نسل کے قوی تر عناصر باقی اور ضعیف تر فنا ہوتے رہتے ہیں، ابتدائی تفسیر اس کتاب میں ملتی ہے، نیز انسان اور موجودات کے باہمی فعل و انفعالات تاثیر و تاثر اور تشکیل ہیئت اجتماعیہ (یہ نظریہ اگرچہ ارسطو بیان کر چکا تھا لیکن اسپنسر کا بیان اس سے ماخوذ نہیں)، کی تصریحات اسی کتاب میں ملتی ہیں، اس کتاب کا شمار اسکی اعلیٰ تر تصانیف میں نہیں، تاہم اس نے ایک خاص امتیاز بہت جلد حاصل کر لیا، اسپنسر کے متبعین و مخالفین اسی وقت سے پیدا ہونے لگے، جنکا سلسلہ آخر وقت تک قائم رہا، چند ہی سال کے بعد ہندوستان کے ایک بڑے عہدیدار نے اسپنسر کو یقین دلادیا کہ ہندوستان کے ایک بڑے صوبہ کی حکومت تمام تر اسکی اسی کتاب کے اصول و قوانین کے مطابق کھاتی ہے، اسکی کتاب جس دارالاشاعت سے شائع ہوئی تھی، وہاں ہر ہفتہ ارباب علم کا مجمع ہوا کرتا تھا، اسپنسر کی آمد و رفت وہاں شروع ہوئی، اور چند ہی روز میں اسکی شہرت لندن کی علمی دنیا میں پھیل گئی، اب اسکی زندگی ایک بے یار و آسٹ ناگوشہ نشین کی زندگی نہ تھی، بلکہ اب اُسے اپنے حلقہ احباب میں جارج ایلیٹ، ولیمس، اوپن، ویکس، فاربس، دھورکر، بین و میٹن کے

شمار کر نیکا شرف حاصل تھا، چند روز اور گزرے اور وہ علمی دنیا کے ہر ممتاز رکن سے نہ صرف روشناس تھا، بلکہ خود اسکا بھی شمار اسی جماعت میں تھا، اسپنس نے جس سرعت سے معاشرتی عزت میں ترقی کی وہ حیرت انگیز ہے، اسے احباب آفرینی میں کمال حاصل تھا، تاہم اسکی ذمہ داری ایک جذبات اسکے معاصرین کی علمی فراخ دلی پر ہے، اسوقت کی دنیا موجودہ دنیا سے چھوٹی تھی، علم کی قدر زیادہ اور دولت کی وقعت کمتر تھی، ممکن ہے میری رائے غلط ہو، لیکن میں اپنی جگہ پر تو یہ باور نہیں کر سکتا کہ آج بھی ایک مفلس و گناہم فوج اس آسانی سے اپنے معاصرین سے ہمدردی و عزت حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکتا ہے،

بیان اسکی حاجت ہمیں کہ ان تمام تصانیف کا خلاصہ بیان کیا جائے، یا انکے نام ہی شمار کر دیئے جائیں، جنکا سلسلہ ۱۷۷۰ء میں پرنسپلز آف سائیکا لوجی (اصول نفسیات) سے شروع ہوا، یہ نظام فلسفہ ترکیبی کی سلسلہ کی پہلی قسط تھی، جس میں آگے چلکر اصول اولیہ کے شمول کے ساتھ اصول حیاتیات، اصول نفسیات، اصول عمرانیات، اصول اخلاقیات کے مجملات تیار ہوئے،

اس سارے نظام فلسفہ کا مرکز مسئلہ ارتقا ہے، ممکن ہے کہ اسکا تخم اسپنس کے دل میں لایں اصول ارضیات کے مطالعہ سے پیدا ہوا ہو، (جسے اس نے اپنی ملازمت ریلوے کے

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) ۱۷۷۰ء انگلستان کی مشہور ناولیس خاتون، جسکے ناولوں میں فلسفہ سیرت بشری کی بہترین

حقدہ کشائی ملتی ہے، ۱۷۷۰ء اول الذکر کا مشہور فلسفہ و سائنس، ادب و شاعری کا ایک ممتاز عالم،

۱۷۷۰ء علم الحیات کا ماہر، ۱۷۷۰ء علم الحیات اور سائنس کے دیگر اصناف کا استاذ الاما سائذہ،

۱۷۷۰ء سائنس کا عالم، ۱۷۷۰ء نباتات کا مشہور ماہر،

۱۷۷۰ء فلسفہ نفسیات، منطق کا ایک نامور عالم ۱۷۷۰ء منطق کا پروفیسر، (معارف)

زمانہ میں خرید کیا تھا) جیسا کہ ڈارون کے دل میں اس معرکہ آرا تصنیف کے مطالعہ سے پیدا ہوا تھا، کچھ روز کے بعد ڈارون کی تصنیف اصل انواع شائع ہوئی، اسپنسر کی تعلیمات کے لئے نہ صرف تیار رہتا، بلکہ بعض حیثیات سے اس سے چند قدم آگے تھا، جس طرح ڈارون اپنے نظریات کو حیاتی و جیوالی سایل پر روز افزون شرح و بسط کے ساتھ چپان کرتا رہا، اسی طرح اسپنسر نے مدۃ العمر اپنی توجہ ارتقاء کے نفسیاتی، معاشری و اخلاقی پہلوؤں کی توضیح و تشریح پر مصروف رکھی،

اسپنسر کی تصانیف کے بعض مقامات اگر آج پایہ تحقیق سے ساقط نظر آتے ہیں تو اسکی وجہ یہ ہے کہ اسی شمع سے صد ہا شعلین اب تک روشن ہو چکی ہیں، علم الحیات کے محققین آج ڈارون کی تحقیقات کو کب دجی و الہام کے مرتبہ پر رکھتے ہیں؟ دراصل ایک چند سال پیش تک اسکی تصانیف پر سب بے چون و چرا ایمان رکھتے تھے، بایں ہمہ علم الحیات کی عمارت کی بنیاد آج بھی ڈارون ہی کی تحقیقات ہے، یہی حال اسپنسر کا بھی ہے، اسکی تصانیف کا آج شاید نامور مطالعہ کیا جاتا ہے، بالکل اسی طرح کہ جیسے ویڈیو اور روشو کا مطالعہ متروک ہو گیا ہے اور ہمیں کوئی خاص تکلیف نہیں محسوس ہوتی، لیکن اگر اسپنسر اور ان دونوں کا دعویٰ ہوتا تو آج کونسی کتابیں قابل مطالعہ ہوتیں،

ارتقاء کا ناگزیر و ناقتناہی سلسلہ کائنات کے ہر شعبہ میں عامل ہے، جس سے فلسفہ مستثنیٰ نہیں، ہر دور میں ایک جدید فلسفہ رواج پاتا ہے، اور پچھلے دور کا فلسفہ متروک ہو جاتا ہے، لیکن آزادی خیال انسان کا ایک مسلم فطری حق قرار پا چکی ہے، اب اس سے اسے کوئی محرم نہیں کر سکتا، اور انیسویں صدی کا یہ کارنامہ عقلیت جب قدر ڈارون اسپنسر کا ممنون ہے، کسی اور کا نہیں، اسپنسر کا یہ عقیدہ نہ تھا کہ اسکی عقلیت اور فلسفہ ارتقاء کے

اور اسرار کا وجود ہی نہیں، بلکہ کھلے کی طرح وہ ان چیزوں سے متعلق خاموش و معصمانہ  
 لا اوریت کا عقیدہ رکھتا تھا، اور ان مسائل کو اپنے دائرہ تحقیقات و فہم سے مافوق سمجھتا تھا،  
 اسپنسر نے عمر طبعی کو ہینچکر اور ہر قسم کا اعزاز چھل کر چکے کے بعد وفات پائی، اس کے انتقال پر  
 انگلستان کے اکثر شاہیں نے جنین ہر طبقہ، ہر عقیدہ، اور ہر جماعت کے افراد شامل تھے، اور اجاب  
 ملازمہ و متقدین نے بہ الحاح و درخواست کی کہ اس نامور کی خاک کو قومی قبرستان و لیٹن سٹر  
 ایسے کے ایک گوشہ میں جگہ دیجائے تاکہ دیگر شاہیں وطن کے پہلو میں اس کی بھی دائمی یادگار قائم  
 رہے، لیکن یہ اسناد عام منظور ہوئی، دفن کے بعد ایک عالم و نفع البدیان شخص لارڈ کوکرنٹ نے  
 ایک موثر و لادیز تقریر کی، جس سے بہتر تعزیتی تقریر کبھی بھی نہ ہوئی تھی، لارڈ موصوف نے  
 اسپنسر کے ان ذہنی کمالات کو بیان کیا جن سے اُسے محبوبیت چھل ہوئی تھی، جن اشخاص سے  
 اس کی محکم دوستی تھی، جن مکانات میں وہ ہمیشہ عزت و احترام کے ساتھ مہمان بنایا جاتا تھا، اس کے  
 پیش نظر کام کی عظیم الشان وسعت، اس کی ان ہتک محنت و جفاکشی، کام کی تکمیل پر اس کی مسرت  
 ارتقار کائنات سے متعلق اس کی حقائق و ہمہ گیر نظریہ، انسان کی حریت شخصی سے متعلق اس کی جدوجہد  
 اس کی حق پرستی، مسائل حیات کی گرہ کشائی میں اس کی عالی ہمتی اور انکسار، اور آخر میں غیبات  
 (Unknown) کے دائرہ فہم میں نہ آسکنے، وہ انہی وابدی قانون پر محیط  
 ہونے سے عاجز رہے، اور ابدی، ”نامتناہی“ کے حضور میں خاموشی پر قناعت کر دینا اعتراف  
 ان میں سے ایک ایک چیز کا لارڈ موصوف نے ذکر کیا،  
 ان الفاظ کا ہم بدست اعادہ کر کے اسپنسر کی سادہ زندگی اور مفید خدمات کو یاد  
 کرتے اور اس کے نام کے آگے سر نیا زُجھکاتے ہیں،

(لٹری گائیڈ)

# بَابُ التَّفْصِيلِ وَالتَّجْزِئَةِ

## الاستدلال

مصنفہ پر وفیسر محمد سجاد مرزا بیگ لہوی

از مولوی محمد سعید انصاری رفیق وار المصنفین

دنیا کے تمام علوم و فنون کی طرح فن منطق نے بھی تدریجی طور پر ترقی کی ہے، ابتدا وہ جس بیسط حالت میں تھا اسکا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جب افلاطون نے انسان کی یہ تعریف کی کہ وہ ایک حیوان ہوتا ہے جسکے دو پاؤں ہوتے ہیں اور پر نہیں ہوتے، تو حکیم دیوجانس کلی نے ایک بال دپر شکستہ مرغ لاکر اسکی مجلس میں چھوڑ دیا اور کہا ”یہ افلاطون کا انسان ہے“ لیکن افلاطون کے بعد ہی اس فن نے حیرت انگیز ترقی کی، اور ارسطو نے اسکو ایک مستقل کتاب کی صورت میں مدون کیا جس میں آٹھ باب تھے، اور ہر باب ایک مستقل موضوع پر مشتمل تھا، ارسطو کے بعد مسلمانوں نے اس میں بعض خاص تغیرات کئے، جن میں سب سے بڑا تغیر یہ تھا کہ خطابت، شاعری، اور جدل جو درحقیقت منطق کے اجزاء نہ تھے، اور جسکو ارسطو نے منطق میں داخل کر دیا تھا انکو خارج کر دیا، اور معقولات عشرہ کی بحث کو بھی جو آئیات سے متعلق تھی منطق سے نکال دیا، اسکے علاوہ بعض خاص مباحث کا اضافہ بھی کیا مثلاً عکس نقیض کی بحث جو منطق ارسطو میں سب سے موجود نہ تھی، مسلمانوں نے اضافہ کی، اور قیاس شرعی جو ارسطو کے مان بالکل نہ تھا بلوعلی سینا نے ایجاد کیا، ان تمام باتوں کے ساتھ ایک سب سے بڑا تغیر یہ کیا کہ اس فن کے دو حصے قرار دیئے تصورات اور تصدیقات، جس سے اس فن کی صورت بالکل بد لگئی، لیکن یورپ کی حیرت انگیز



قوت ایجاد و اختراع نے اسپین اور بھی برگ و بار پیدا کئے، اور بیکن نے منطق کی ایک نئی شاخ ایجاد کی جو منطق عملی یا استقرائی کے لقب سے مشہور ہے، یہ ظاہر ہے کہ جب ہم کسی دعویٰ کی دلیل بیان کرتے ہیں تو اسکی دو صورتیں ہوتی ہیں، ایک تو یہ کہ ہم ابتداء ہی سے چند ایسے اصول بیان کرتے ہیں جو سماعت عامہ میں داخل ہوتے ہیں، اور انکی بنیاد پر ثابت کرتے ہیں کہ فلان نتیجہ ان سے ضرور لازم آتا ہے، یہ طریقہ استخراج کہلاتا ہے، مثلاً زید فانی ہے کیونکہ یہ قانون کہ انسان فانی ہے مسلم ہے، اور زید اسی قانون کے تحت میں داخل ہے، اس صورت میں پہلے مقدمات مذکور ہوتے ہیں اور پھر نتیجہ اسلئے ذہن کا عمل اُوپر سے نیچے کو اترتا ہے، بخلاف اسکے دلیل کی دوسری صورت یہ ہوتی ہے کہ ذہن کا عمل نیچے سے اُوپر کو چڑھتا ہے، یعنی پہلے ایک جزئی دافعہ بیان کیا جاتا ہے اور پھر اسکے قانون کلی کی جستجو کی جاتی ہے، یہ طریقہ استقرار کہلاتا ہے، اگرچہ اسپین کوئی شبہ نہیں کہ استخراج کا مقصد بالکل متحد ہے اور دونوں میں منفرد اور جزئی واقعات کے ذریعہ سے قواعد کلیہ دریافت کئے جاتے ہیں، تاہم چونکہ یہ دونوں طریقے بالکل الگ الگ ہیں، اسلئے اہل یورپ نے منطق کو انہی دو حصوں پر جدا جدا تقسیم کر دیا ہے منطق استخراجی میں منطق قدیم کے اکثر مسائل شامل ہیں جنکی انتہا قیاس کی بحث پر ہوتی ہے، قیاس سے آگے منطق استقرائی کی حد شروع ہو جاتی ہے، جس میں استقرار، تمثیل، اور منالطہ وغیرہ سے بحث کی جاتی ہے، یہی حصہ ہے جسکی ایجاد کے اہل یورپ مدعی ہیں، اور جسپر انکو اسقدر ناز ہے کہ وہ مسلمانوں کے تمام کارنامے زہین پر پانی پھیر کر انکو صرف ارسطو کی گاڑی کا قافی کہتے ہیں، لیکن کیا درحقیقت یہ دعویٰ صحیح ہے؟ کیا استقرار منطق کی کوئی علیحدہ شاخ قرار پاسکتا ہے؟ اور کیا اسکا وجود قدیم منطق میں کمین نہیں ہے؟ جو لوگ دنیا کی ہر چیز کو یورپ کی آنکھ سے دیکھنے کے عادی ہیں وہ اسکا جواب اثبات میں دینگے، لیکن جن نگاہوں پر یورپ کی کورانہ تقلید کا پردہ

ہینین پڑا ہے وہ ایک لمحہ کے لئے بھی اس دعویٰ کو سننے کے لئے تیار نہیں، لیکن نے بے شبہہ  
استقرار کی بحث کو زیادہ پسلا کر لکھا ہے، لیکن اس سے نفس فن پر کیا اثر پڑا؟ استقرار کی بحث  
پہلے ہی منطق کا ایک ضروری حصہ تھی اور اب بھی ہے، فرق صرف استقرار ہے کہ پہلے اس  
وضاحت، اس تفصیل، اور اس جامعیت کے ساتھ نہ تھی جیسی آج کل پائی جاتی ہے، اس بنا پر  
اسکو منطق کی کوئی جدید قسم قرار دینا صحیح نہیں ہے، ارسطو نے قیاس کے اقسام میں صرف جلیات  
سے بحث کی تھی، مسلمانوں نے اسپر بالکل جدید قسم (یعنی شرطی) کا اضافہ کیا، تو کیا انکا یہ دعویٰ  
صحیح ہو سکتا ہے کہ انھوں نے ایک جدید منطق ایجاد کی؟ کسی فن کی ایجاد اور چیز ہے اور اسکے  
کسی خاص باب پر اضافہ کرنا اور بات،

لیکن ابھی تک اصل عقدہ حل نہیں ہوا، ہمارا دعویٰ یہ ہے کہ یورپ نے استقرار میں اصولی  
حیثیت سے کوئی اضافہ نہیں کیا، قدیم منطق میں استقرار کے دو طریقے مذکور ہیں، استقرار تام اور  
استقرار ناقص، استقرار تام اسکو کہتے ہیں جہیں کسی خاص واقعہ کے متعلق متعدد تجربات کر کے  
ایک قاعدہ کلیہ قائم کیا جائے، اور استقرار ناقص وہ ہے جہیں چند مثالوں کو دیکھ کر ایک قاعدہ  
کلیہ بنا لیا جائے، قدیم منطق میں انہی طریقوں کو پسلا کر لکھا گیا ہے، لیکن جدید منطق میں انکی ایسی  
تعمیل لگائی ہے جس پر خارج از بحث ہونے کا الزام قائم ہو سکتا ہے، مثلاً یہ ظاہر ہے کہ استقرار کے  
دو روبرو سے جو تفسیر دریافت ہوگا وہ مشاہدہ اور تجربہ کے دساتط سے ہوگا، قدیم منطق مشاہدہ  
اور تجربہ کو نظر انداز کر دیتا ہے، لیکن جدید منطق میں ان پر بھی بحث شروع ہو جاتی ہے، اسی طرح  
تصدیق، قیاس، اور تمثیل وغیرہ قدیم منطق میں بالکل جداگانہ چیز ہیں، اور ان سے استقرار کے  
عنوان میں بحث نہیں کی جاتی ہو لیکن جدید منطق میں ان سب سے بحث ہوتی ہے جو نہایت برا  
خط بحث ہے، اور تو اور تمثیل جو قدیم منطق میں بالکل مستقل چیز ہے اسکو جدید منطق نے استقرار میں

داخل کر دیا ہے جو تالیف منطق کا نہایت افسوسناک واقعہ ہے، اسی طرح علت و معلول کی بحث جو درحقیقت فلسفہ سے تعلق رکھتی ہے اسکو بھی منطق استقرائی میں جگہ دیکھی ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ استقرا کی بحث میں یورپ نے اصولی حیثیت کوئی اضافہ نہیں کیا، بلکہ قدیم منطق اور فلسفہ کے چند ابواب کو لیکر استقرا میں داخل کر دیا ہے،

بہر حال استقرا منطق کی کوئی جدید قسم ہو یا نہ ہو کتاب زیر ریلو میں اسکو اسی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے، اور چونکہ کتاب کا مقصد منطق کو جدید پیرایہ میں لانا ہے، اسلئے مصنف کی کوشش ہر طرح قابل داد ہے، مصنف نے طرز بیان نہایت سادہ اور سلیس اختیار کیا ہے، اور تمام سائل نہایت خوبی سے سمجھائے ہیں، جن سے طلبہ اور اردو دان پبلک کی معلومات میں اضافہ ہو سکتا ہے،

مصنف کو متعدد مواقع پر وضع اصطلاحات کی بھی ضرورت پڑی ہے اور انھوں نے اس کام کو کامیابی کے ساتھ انجام دیا ہے، لیکن کہیں کہیں فرد گزاشتین بھی ہو گئی ہیں مثلاً انھوں نے عرض لازم اور غیر لازم کو فارق لکھا ہے یا مثلاً تنويع کو اصطفا ف لکھا ہے وغیرہ وغیرہ، بایں ہمہ یہ تمام فرد گزاشتین جزئی حیثیت رکھتی ہیں، اور ہر کوئی حیثیت سے بحث ہے اور اس حیثیت سے یہ کتاب اردو زبان میں اپنی آپ نظیر ہے،

## اِحْتِمَائِیَّہ

صوبہ متحدہ کے سرشتہ تعلیم نے سال آئندہ سے اپنے ہاں فارسی و عربی کے چند امتحانات قائم کئے ہیں، جبکہ اسناد عطا کئے جائیں گے، یہ امتحانات تعداد میں چار ہیں جن میں سے ایک فارسی کا ہے اور باقی عربی کے ہیں، فارسی امتحان کے بعد منشی کی سند ملے گی، اور عربی امتحانات کے بعد مولوی، عالم، اور فاضل کی، امتحانات الہ آباد میں ہر سال مارچ میں ہونگے، مدت تعلیم ہر امتحان کے لئے دو سال کی ہے، امتحانات کے رجسٹرار، انسپکٹر صاحب مدارس عربی الہ آباد ہیں، جن سے مزید تفصیلات معلوم ہو سکتے ہیں،

منشی کے امتحان میں آبجیات (آزاد مرحوم) واقعات کر بلا (انیس) شعر الجم جلد پنجم (علامہ شبلی) دروس الادب (مولانا سید سلیمان) حدائق البلاغت وغیرہ داخل درس ہیں، مولوی کے نصاب درس میں کافیہ، بی، اے کورس عربی، الہ آباد یونیورسٹی، شرح تہذیب، شرح وقایہ، ترمذی، جلالین وغیرہ ہیں، عالم کا امتحان متنی، مختصر المعانی قطبی، شرح ہدایت الحکمتہ، نور الانوار، ہدایہ، بیضاوی وغیرہ ہیں ہوگا، فاضل کے کورس میں حریری، بدلی، حماسہ، اسرار البلاغت، ابوداؤد، موطا امام محمد، نسائی، بخاری، مسلم، بیضاوی، سلم الثبوت، ملل والنحل شہرستانی وغیرہ کے علاوہ درسیات طلب فیسی، شرح اسباب، کامل الصنائع، کلیات و معالجات، وحمیات قانون بھی شامل ہیں، شیعہ طلبہ کے لئے کتب دینیات اس نصاب سے علاحدہ ہیں، فاضل کے امتحان میں ادب، دینیات، وطلب میں سے صرف ایک شعبہ کا انتخاب کرنا ہوگا،

دارالسلطنت جاپان (ٹوکیو) میں جو مخصوص درسگاہ السنہ غیر اسکول آف فارن لنگویجز کے لئے قائم ہے، اس میں مختلف زبانوں کے طلبہ کی تعداد حسب ذیل ہے :-

زبان	تعداد و طلبہ
انگریزی	۴۳۹
اسپینی	۱۰۹
چینی	۱۰۵
فرانسیسی	۹۶
جرمن	۹۴
روسی	۵۸
منگولی	۸

ایک انگریزی پرچہ لکھتا ہے کہ ان اعداد سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ جاپان کے سیاسی و تجارتی تعلقات کس قوم کے ساتھ کس درجہ تک ہیں، جنگ سے قبل جرمن زبان کے طلبہ کی تعداد بہت زاید تھی،

سرچارلس بلینس نے ایک لکچر میں بیان کیا ہے کہ اعصاب انسانی اگر مجروح یا ازکار رفتہ ہو جائیں تو ان کے علاج کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ انہیں نکال کر ان کے بجائے کسی حیوان کے جسم کے مسامی جسامت کے تازہ اعصاب لگا دیئے جائیں، اس طریقہ سے مریض یا مجروح اعصاب کا انسان بالکل اچھا ہو جائیگا۔

کرہ ارض کی عمر کے بابت علماء سائنس میں ہمیشہ اختلاف رہا ہے، امریکہ کے ایک مستند ماہر ارضیات (جیا لو جیٹ) کے تازہ تخمینہ کے مطابق کرہ ارض پر اب تک تین درگزر چکے ہیں اور اس وقت چوتھا دور ہے، ان اودار رابعہ کی حسب ذیل مدت اسکے تخمینہ میں گزر چکی ہے،

دور اول	۳ کروڑ ۶۰ لاکھ سال
دور ثانی	۲ کروڑ ۸۰ لاکھ "
دور ثالث	۹۰ لاکھ "
دور رابع (موجودہ)	۳۰ لاکھ "

انگریزی کا ایک ادبی رسالہ لکھتا ہے کہ مختلف ممالک میں موسومہ ذیل اخبارات اول بار فلان فلان زمانہ میں شائع ہوئے ہیں،

ملک	اخبار	زمانہ	کیفیت
انگلستان	انگلش مرکری	۱۸۵۳ء	اسپین نے اس زمانہ میں انگلستان پر بڑا
(شہر لندن کے لئے)			زبردست بحری حملہ کیا تھا جس سے ملک میں

سخت سراسیمگی پھیل گئی تھی، اس اخبار کا

مقصد اجراء بے بنیاد افواہوں کی تردید تھی،

اسکاٹ لینڈ	مرکبوریس پالینکس	۱۸۵۳ء	اول الذکر کا گویا منشی ہوتا تھا -
انگلستان			

اٹلی	گرگٹ	۱۸۶۲ء	(بیرد فیاض کے لئے) نارڈن پوسٹ
			۱۸۶۲ء

ملک	اخبار	زمانہ	کیفیت
امریکہ	بوسٹن نیوز لیٹر	۱۹۰۳ء	
بہمی	بہمی ہیرلڈ	۱۹۰۹ء	
بنگال	بنگال گزٹ	۱۹۰۸ء	
"	سماچار دہرپن (بنگالی)	۱۹۱۸ء	(زیر سرپرستی لارڈ ہیسٹنگز گورنر جنرل)
بہمی	بہمی سماچار (گجراتی)	۱۹۲۲ء	
	باغ و بہار (اردو)	۱۹۲۸ء	

فرانس کی ایک مشہور موسیقی کا جو اس وقت تک انجیل کا ترجمہ ۱۷ زبانوں میں شائع کر چکی ہے بیان ہے کہ دنیا میں منتقل زبانوں کی تعداد چھ سو ہے،

ایک فریخ محقق موسیقار نے پیرس کی اکاڈمی آف سائنس کے سامنے حال میں عمر آفتاب سے متعلق اپنا تخمینہ پیش کیا ہے کہ آفتاب کی پیدائش کو زیادہ سے زیادہ ۹۰ لاکھ سال کا زمانہ ہوا ہے،

موجودہ ہمارا بڑا بڑا علم دوستی دردِ دل خیالی کا ایک مظہر یہ بھی ہے کہ ان کے حدود ریاست کے اندر کتب خانوں کا ایک جال پھیل گیا ہے، پایہ تخت کے مرکزی کتب خانہ میں ۱۰۷۷۷ کتابیں ہیں جنہیں سے ۶۲۲۱ مطبوعہ، اور ۶۷۸ سنسکرت کے قلمی مسودات ہیں، کتب خانہ میں ۲۲۲ اخبارات در سائل آتے ہیں اور حاضرین کا روزانہ اوسط ۲۰۰ کارہنما ہی، شعبہ انسوان میں

۱۷۱۱ کتابین ہیں، اور دارالمطالعہ ۸۱ پرچہ خرید کر تا ہے، آنے والیوں کی تعداد سال گذشتہ میں ۱۸۳۳ رہی، شعبہ اطفال میں حاضری کی تعداد پچھلے سال ۱۴۰۰۰ رہی، اضلاع اور قصوبوں اور قریوں کے کتب خانوں کا شمار ۳۶۵ ہے، اور ان میں کتابوں کی مجموعی میزان اب ۲۳۸۴۲ تک پہنچ چکی ہے جن میں سے پچھلے سال ۱۶۰۶۹ کتابیں لوگوں کے مطالعہ میں آتی رہیں، سفری کتب خانوں میں سے ۱۰۲۷۵ کتابیں دیہات میں پڑھی گئیں،

رایل کالج آف سرجنز کے سامنے پروفیسر کیتھ نے بیان کیا کہ دق دسل کے امراض جس طرح آج پائے جاتے ہیں، اسی طرح ولادت مسیح سے پانچ ہزار سال قبل مصر میں بھی انکا وجود تھا اور اسکا ثبوت اخون نے ان قدیم نعتوں سے دیا جو انکے عجائب خانہ میں محفوظ ہیں اعلیٰ ہذا آج سے پانچ ہزار سال قبل کی تحریروں میں اور وہ دشراہین کی تشریح مندرج پائی جاتی ہے، اسکو بھی اخون نے شرح و بسط سے بیان کیا، اخون نے لوسے کی وہ کہاجیں بھی دکھلائی ہیں جن سے تقریباً سترہ قبل مسیح میں ٹوٹے ہوئے اعضا کی بندش کیجاتی تھی، پروفیسر موصوف کی تحقیقات اگر صحیح ہے تو جدید فن طب تشریح و جراحی اس سے آگے نہیں بڑھا ہے، جہاں وہ آج سے پانچ سات ہزار سال پیشتر تھا،

ماہ گذشتہ میں انگلستان کے ایک مشہور مستشرق سر چارلس لایل کی وفات ہوئی موصوف مدت تک ہندوستان میں ممتاز ملکی مناصب پر مامور رہے تھے، ۱۸۹۸ء میں چیف کمنشنر بنو بسط کے مرتبہ سے پنشن پائی، اور اسکے بعد بارہ برس تک انڈیا آفس میں کام کرتے رہے، مسلمانوں کے علوم و اسنہ خصوصاً فارسی، عربی اور اردو کے وہ ایک مستند عالم خیال کئے جاتے تھے اور



شعرا عرب کے متعدد وادین انکے تحشیہ و مقدمہ کے ساتھ شائع ہوئے، وہ برٹش اکاڈمی کے فیلو تھے، اور ایڈنبرا، آکسفورڈ، اسٹراسبرگ، مختلف یونیورسٹیوں سے ال، ال، ڈی، بی، ایچ ڈی، ڈی، لٹ، وغیرہ کی اعزازی ڈگریاں رکھتے تھے، انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے آخری ایڈیشن میں ہندوستانی (اردو) لٹریچر پر مضمون اپنی کٹلم سے تھا، انکی عمر ۷۷ سال کی تھی،

لنچرگ (جرمنی) کے عجائب خانہ کتب و کتبات نے حال میں اخبار نویسی و فن صحافت کے ارتقا سے متعلق ایک نمائش گاہ قائم کی تھی، اخبارات ابتداء طبع نہیں ہوتے تھے، بلکہ کتابت ہو کر دست بدست تقسیم ہوتے تھے، اسوقت سے لیکر اس زمانہ تک جب اخبارات مفت و ارطیع ہونے لگے، اور پھر اٹھارہویں اور انیسویں صدیوں میں جو تغیرات ہوئے، ان سب عہد بعد ترقیوں کا منظر اس نمائش میں پیش ہوا، سو اہویں صدی کے اخبارات جنہیں تازہ اکتشافات کا بیان ہے یا اپنی اصلی حالت میں، یا انکے عکس، اس نمائش کے لئے فراہم کئے گئے تھے، نمائش کی سب سے زیادہ قابل ذکر شے کو لمبس کا وہ خط تھا جو اس نے ۱۹۶۳ء میں لکھا تھا اور جس میں امریکہ کے دریافت ہونے کی خبر دی تھی،

ماہ ستمبر میں نارنوک (انگلستان) میں عمر خیام، اور اسکے انگریزی شاعر فٹز جیرالڈ کی برسی دہوم و دہام سے منائی گئی، ربا عیات خیام، مترجمہ فٹز جیرالڈ کو ڈراما کی شکل میں تبدیل کر لیا گیا تھا، اور مقامی شاہیر نے ربا عیات کے مختلف اشخاص افسانہ کے پارٹ اسٹیج پر ادا کئے، ڈاکٹر کرکبائی فیلو، نیوکالج آکسفورڈ، خود خیام بنے، اور نارنوک کے پادری چارلس کینیٹ ریفرنس دیپ سنگہ وغیرہ نے دوسرے پارٹ ادا کئے،

امریکہ نے جب گزشتہ جنگ میں شرکت کا اعلان کیا تو جرمنی کے ارباب حل و عقد اسکی شرکت کے قابل مضحکہ سمجھے اور انھوں نے علانیہ اپنا یہ خیال ظاہر کیا کہ امریکہ کی نا آشنا سے فن حرب قوم کا چند ماہ کے عرصہ میں جنگ عظیم کے شرکت کے قابل ہو جانا ناممکن ہے، لیکن امریکی فوج کے عمل کار ناموں نے ثابت کر دیا کہ وہ حربی حیثیت سے کسی دوسری فوج سے بہت تر بہین، اسس، آجاز و کامل امریکی اخبارات نے حال میں شائع کیا ہے، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ جونہی امریکہ نے شرکت جنگ کا اعلان کیا، سپاہیوں کی بہرتی اور اسکی تعلیم و تنظیم کا سارا کام امریکہ کے شاہیر علماء نفسیات کی ایک جماعت کے سپرد کر دیا گیا، میجر برکس اس جدید محکمہ کے افسر اعلیٰ تھے، اور امیدوار دن میں سے پہلے گری کے لئے موزون و مناسب اشخاص کے انتخاب کا کام میٹری سائیکالوجی (نفسیات حربیہ) کے دارالعلوم کے اساتذہ کے سپرد تھا، پہلے عام امیدواروں کو انہو میں سے نااہل و ناموزون افراد چھانٹ چھانٹ کر الگ کر دیئے جاتے تھے، پھر جتنے افراد لے لئے جاتے تھے، ان میں سے کڑل اسکاٹ ان افراد کو مختلف شعبوں میں الگ الگ تقسیم کرتے تھے، جو کسی خاص شعبہ کے لئے مخصوص اہلیت و صلاحیت رکھتے تھے، اور انتخاب و تقسیم کا یہ سارا کام مختلف نفسیاتی تجربات و اختیارات کے ماتحت انجام پاتا تھا، اس طرح جتنے افراد منتخب ہوئے وہ اپنے اپنے کام کے لئے بہترین صلاحیت و اہلیت رکھتے تھے، امریکی نفسیات حربیہ کے اس حیرت انگیز کارنامہ نے فن نفسیات کی عظمت و وقعت کا ایک اور نقش یورپ و امریکہ کے قلوب پر ثبتا دیا ہے،

ایک سائنٹفک رسالہ لکھتا ہے کہ ابتدا رسنہ مسیحی سے لیکر اب تک دنیا کے مختلف اقطاع میں کودے آتشیں کی آتش نشانیوں اور زلزلوں کے حسب ذیل نہایت اہم

واقعات وقوع میں آچکے ہیں :-

۱۹۰۶ء، شہر پامپٹی (رومہ) کوہ ولیو دیس کی آتش فشانی سے برباد ہو گیا،

۱۹۰۶ء، کوہ آٹاکی آتش فشانی سے کینیڈا (اٹلی) برباد ہو گیا، اور پندرہ ہزار نفوس

ہلاک ہوئے،

۱۹۰۶ء، زلزلہ سے بندرگاہ پورٹ رابل (جائیکا) ۲۴۰ فٹ نیچے دھنس گیا، اور

تین ہزار آدمی ہلاک ہوئے،

۱۹۰۶ء، زلزلہ نے کینیڈا (اٹلی) کو ۱۸ ہزار نفوس کے ساتھ غرق کر دیا، کل تعداد

اموات ایک لاکھ تک پہنچی،

۱۸۸۳ء، کوہ کراکوٹوا (جاوا) کی آتش فشانی سے ۲۰ ہزار افراد کی جانیں ضائع ہوئیں،

۱۹۰۲ء، کوہ پہلی کی آتش فشانی نے سارے شہر سینٹ میسرے (مارینک) کو آٹا فانا

مٹا دیا، دس سوٹ کے اندر ایک متنفس بھی زندہ نہ بچا،

۱۹۰۵ء، زلزلہ سے دہر سالہ (پنجاب) میں جبکا اثر لاہور تک پہنچا تھا، دس ہزار

جانیں ضائع ہوئیں،

۱۹۰۵ء، سینا (اٹلی) میں قیامت خیز زلزلہ آیا، جس نے ایک لاکھ انسانی زندگیوں کو

نذر اجل کر دیا۔

کچھ روز ہوئے تو کوپلا (ملکت چلی، جنوبی امریکہ) میں ایک قدیم لاش عجیب و غریب  
ہیئت کے ساتھ برآمد ہوئی ہے، معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص کان کن تھا، اور تانبے کی ایک  
کان کے اندر بیٹھا ہوا کچے تانبے کو صاف کر رہا تھا، عین اپنی حالت میں کان بیٹھ گئی، اور یہ

شخص اسی حالت میں دیکر مر گیا، کام کرتے وقت یہ شخص جس وضع و ہیئت کے ساتھ بیٹھا ہوا ہوگا  
ہینک اسی حالت کے ساتھ اسکی نش برآمد ہوئی ہے، علماء فن کی متفقہ رائے ہے کہ یہ نمش  
چہ صدیوں سے قبل کی ہے، البتہ اس باب میں یہ لوگ مختلف آلا رہیں کہ متونی کس قوم و  
نسل کا شخص تھا،

پونہ میں ہندو کرلیسریج انسٹیٹیوٹ، مشرقی علوم ولسنہ کی جو گراں بہا خدمات انجام  
دے رہا ہے، ان کا ذکر معارف میں اس سے پیشتر آچکا ہے، اسی نوعیت کی ایک دوسری چیز  
بمبئی میں بھی ہے، جسکا نام گاماڈر تیل انسٹیٹیوٹ ہے اور جو ایک فارسی فاضل شمس العلماء  
کے، آرا کا مکی یادگار میں گیارہ سال سے قائم ہے، گزشتہ اگست میں اسکا گیارہواں سالانہ  
اجلاس ڈاکٹر جمشید جی مودی کی زیر صدارت منعقد ہوا، سکریٹری کی رپورٹ سے معلوم ہوا کہ  
پچھلے سال گورنمنٹ سے تیس ہزار کا عطیہ اس غرض سے موصول ہوا کہ تحقیقات عالیہ کے لئے  
رفقا پر یہ رقم صرف کی جائے، سٹریبلو من جی نوشیروان جی ایم، اے، جو اس غرض سے رفیق منتخب  
ہوئے تھے کہ تمام مطبوعات و مسودات موجودہ انسٹیٹیوٹ مذکور کی ایک مفصل و شرح فہرست  
تیار کریں، اپنے کام سے فارغ ہو چکے، سال آئندہ کے لئے ایک جدید رفیق (فیلو) کا تقرر اس  
غرض سے ہوا ہے کہ وہ پہلوی کتبات اور سکھ جات پر لکچر دیں، ایک اور رفیق (فیلو) اس کام پر  
متبین کے لئے گئے ہیں، کہ وہ سورت و بہروچ میں گشت نگار کریں کی تاریخ سے متعلق ہر قسم کا  
سرمایہ معلومات فراہم کریں، ایک فیاض معلمی کی جانب سے اسکا اعلان کیا گیا کہ انھوں نے ایک  
سال کے لئے تین سو موار کا عطیہ تاریخی تحقیقات کے اغراض کے لئے منظور کیا ہے۔

پونہ کی گذشتہ مشرقی کانفرنس کے موقع پر کاما انسٹیٹیوٹ نے اپنے ہان کے پانچ نامہ  
مسودات علمی نمائش کے لئے بھیجے تھے جنہیں حسب ذیل قابل ذکر ہیں:-

(۱) قانون سعودی

(۲) محیط معرفت،

(۳) مہا بھارت، (پانچ ابواب)

ڈاکٹر کاما کو سب سے زیادہ شغف ایرانی علوم و فنون سے تھا، انکے انسٹیٹیوٹ کے کارکنوں کو  
سب سے زیادہ دلچسپی اسی سے ہے، امید ہے کہ انکی کوششوں سے کچھ عرصہ میں ایرانی تاریخ  
ایرانی علوم، و ایرانی السنہ کے متعلق ایک عظیم الشان ذخیرہ معلومات فراہم ہو جائیگا۔

# اُچھڑیا

غزل

حضرت جگر مراد آبادی

جور گلچین دجھاسے باغبانُ کیا کئے      جو دکھایا تو نے وہ اسے آسمانُ کیا کئے  
شامِ وقتِ دل کی آہوں کا دھولنُ کیا کئے      ہر طرف ہم آسمان ہی آسمانُ کیا کئے  
آج کن آنکھوں سے یہ جو غزانُ کیا کئے      سب چین لٹا رہا اور باغبانُ کیا کئے  
جب چین سے لچلا صیاد کر کے ہلکو تید      دُوزخِ مَرَمَر کے سوئے گلستانُ کیا کئے  
اب قفس میں ہوش آیا تو یہ حیرت ہی مہین      کس طرح آنکھوں سے اُٹتے آشیانُ کیا کئے  
جی بہر آیا تا توانی میں جو راہِ شوق میں      دیر تک ہم نقشِ پا سے رہر دانُ کیا کئے  
تہا اسیری میں بھی کچھ ایسا تعلقِ مَوج کو      ہم قفس میں روزِ خوابِ آشیانُ کیا کئے  
کیسی سیرِ لالہ و گلِ باغ میں جتنک ہے      دستِ گلچین یا نگاہِ باغبانُ کیا کئے

(۲)

مرزا احسان احمد بیگ لے ال ال بی وکیل

جب یوں پھری ہوئی نگہ باغبانُ ہے      کچھ کس طرح چین میں مرا آشیانُ ہے  
کچھ ایسے محو لذتِ دردِ نہانِ ہے      دنیا سے بے نیاز رہے ہم جہانُ ہے  
صیاد تجھے خوش رہے یا سرگرانُ ہے      لیکن اسیرِ غم دہی طہر ز فغانُ ہے  
اتنا کرم تو مجھ پہ مرے باغبانُ ہے      سب کچھ مودودِ ریاسِ مرا آشیانُ ہے  
کچھ آج ایسی شان سے آہ و فغانِ ہے      چاروں طرف قفس کے دھوان ہی دھوان ہے

یوں ہوتا رہا رحمت تو لطف ہے  
دل میں بہا ہوا درد مگر چپ زبان ہے  
دروازہ نفیس ہے کہلا دیر سے مگر  
حیرت یہ ہے کہ ہم اتنا کمان ہے  
قید نفیس میں جی جو بہر آیا تو دیر تک  
ہم آج دیکھتے ہی سوئے گلستان ہے  
پامالی چمن ہونکا ہوں کے سامنے  
ادرا سپہ حکم یہ ہے کہ ضبط فغان ہے  
صیاد کی نگاہ میں ہے کس قدر عزیز  
ہوڑی سی وہ جگہ بھی جہاں آشیان ہے  
آنے لگے ہیں خواب اسیری میں نظر  
گلشن میں اب بہا رہے یا خزان ہے  
ذوقِ ستم سے ہونہ سکا بے نیاز میں  
ہر چند میرے حال یہ وہ مہربان ہے  
لٹا رہا نفیس کے قریب اپنا آشیان  
ہم تھے کہ پھر بھی مائل خواب گراں ہے  
اے چشم شوق آج ہو یوں عرضِ بدعا  
ہر جنبشِ نگاہ میں اک داستان ہے

(۳)

## ہادی محلی شہری

ذوقِ کرم کو یوں بھی نہ سوا کرے کوئی  
کتبتک کسی سے عرضِ تنہا کرے کوئی  
ہے کشمکش میں جذبِ نظر سے نقابِ حسن  
اتنا نہ چشم شوق سے پردا کرے کوئی  
مانا کہ اضطراب ہے شرمندہ سکون  
تو اب چلے نہ دل پہ تو پھر کیا کرے کوئی  
کہتا ہے حسنِ سادے علاقے سے چوٹ کر  
تکو ٹہا کے سامنے دیکھا کرے کوئی  
اللہ سے لطف یا رکی بے انتفائیاں  
کتبتک نگاہِ یاس سے دیکھا کرے کوئی  
ہو جائے کاششِ فیصلہ یاسِ دآرزد  
کتبتک تری نگاہوں کو دیکھا کرے کوئی  
لے دیکے اک تہین تو ہو سراپہ بیات  
پوچھو نہ تم بھی بات تو پھر کیا کرے کوئی  
کچھ شغل چاہیئے دلِ محزون کے واسطے  
ہادی نہ مضطرب ہو مگر کیا کرے کوئی

(۴)

مولوی ابوالحسنات تیرندی

یاس کا گہر جو مرا یہ دل بخور ہے آج      آرزو دل کی بھی لب سے کہیں دور ہے آج  
 تنگی اپنی خودی پر دہ دیدار جمال      سامنے رہ کے نگاہوں سے وہ مستور ہے آج  
 حسن کچھ غیر نہیں دید سے محرومی کیوں؟      خود مرا تارنگہ جلوہ گہ طور ہے آج  
 عشق کی خیر ہو یا رب کہ ملی لذت نیست      تن میں ہر قطرہ خون صورتِ ناسور ہے آج  
 دہرائینہ ہے اس جلوہ کی تاک کے لئے      حسن آپ اپنی ہی دیدار سے سرور ہے آج  
 ہاں کیسی نگہ ناز نے پھر چھیر ڈیا      زخم دل دیکھ رہا ہوں کہ بدستور ہے آج  
 ذرہ ذرہ سے انا سختی کی صدا اٹھتی ہے      دل جو شور انگن آوازہ منصور ہے آج

جلوہ داد می امین کی حقیقت معلوم

دل کا جو داغ ہے وہ شمع سب طور ہے آج



## مطبوعات جدید

رباعیات البوسید الباخیز، حضرت سلطان البوسید الباخیز پہلے شخص ہیں جنھوں نے فارسی شاعری میں صوفیانہ خیالات ادا کئے، یہ انہی کی رباعیان ہیں، جنکو پروفیسر کے، ایم مٹرا ایم، اے (لاہور) اور مولوی عبدالعزیز منہاس بی، اے، وکیل (گوجرانوالہ) نے مرتب کر کے شائع کیا ہے، یہ رباعیان چونکہ بالکل ابتدائی زمانہ کی ہیں اسلئے ان میں تصوف کے حقائق اور مسائل موجود نہیں، البتہ عشق و محبت کے جذبات ہیں جنہیں تصوف کا رنگ جہلک رہا ہے، آج فارسی شاعری میں تصوف کا جو وسیع سرمایہ موجود ہے، اسکی بنیاد انہی رباعیوں پر ہے، اس بنا پر ان کے مرتب کرنے والوں نے درحقیقت فارسی زبان کی ایک بہت بڑی خدمت انجام دی ہے جسکے لئے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں، اس رسالہ میں ۲۸ رباعیان ہیں اور اسکی قیمت ایک روپیہ ہے، پتہ: شیخ مبارک علی تاجر کتب و ہاری دروازہ لاہور،

مقام حدیث، احمدیہ انجمن اشاعت اسلام لاہور نے مذہبی رسائل کا ایک نہایت مفید سلسلہ شروع کیا ہے جنہیں سے بعض پر معارف میں ریویو بھی ہو چکا ہے، یہ کتاب بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے، اسکے مصنف مولوی محمد علی صاحب ایم، اے امیر جماعت احمدیہ ہیں جنہیں انھوں نے حدیث کی صداقت، ضرورت، جمع و ترتیب، اور جرح و تعدیل وغیرہ پر بحث کی ہے اور نہایت عالمانہ پیرایہ میں کی ہے، لیکن بعض جگہ فرد گزاشتیں بھی ہو گئی ہیں، مثلاً انھوں نے ایک مقام پر لکھا ہے کہ حدیث کا درس باقاعدہ طور پر تابعین کے زمانہ میں شروع ہوا، حالانکہ اسکا سلسلہ خود حضرت عمر کے زمانہ میں قائم ہو چکا تھا، اور مختلف مقامات میں متعدد صحابہ اس خدمت کو انجام دیتے تھے، بہر حال

چونکہ مولف کا مقصد محض حدیث کا درجہ اور مرتبہ ثابت کرنا ہے، اسلئے بلاشبہ وہ اس میں کلیات ہوئے ہیں، اور ہم اس مفید علمی خدمت پر انکو مبارکباد دیتے ہیں، رسالہ کی قیمت ہے اور مذکورہ بالا پتہ سے مل سکتا ہے،

انجمن ترقی تعلیم کے وظائف، یہ انجمن ترقی تعلیم مسلمانان ہند امرتسر کی سالانہ روداد ہے، جس میں ان طلبہ کی فہرست دی گئی ہے جو اسکے وظائف سے تعلیم پا رہے ہیں اور جنکی موجودہ تعداد ۸۰۰۰ انجمن نے اپنی مختصر سی عمر میں نہایت خاموشی، سکون، اور استقلال کے ساتھ مسلمانوں کی جو خدمت کی ہے اسکی نظیر سے تمام اسلامی مدارس اور انجمنیں خالی ہیں، اور یہ بلاشبہ مولوی محمد عمر صاحب موم سکریٹری اور ارکان انجمن کے جوش، خلوص، دیانت اور ایمان داری کا نتیجہ ہے، جس نے اس انجمن کو قابل تقلید بنا دیا ہے، انجمن مذکور کے موجودہ سکریٹری جناب خواجہ مظہر حسین صاحب بی۔ اے دکیل نے اس روداد میں قلت سرمایہ کی شکایت کی ہے، اور انجمن کے مقاصد کے لحاظ سے پانچ لاکھ روپیہ کی اپیل شائع کی ہے،

انجمن حمایت اسلام کا ماہوار رسالہ: شعبان، رمضان، اور شوال کے یہ پرچے ہیں، جن میں انجمن کے موجودہ تئیرات اور انتظامات کے علاوہ مختلف مذہبی اور تعلیمی مضامین درج کئے گئے ہیں جن میں سے ایک تاتاری مسلمان اور تعلیم عربی ہے جو جناب مولانا عبد السلام ندوی کے قلم کا نتیجہ ہے، ایک پرچہ بن سیر سلیمان کے عنوان سے جناب مولانا سید سلیمان ندوی کا ایک خط نقل کیا ہے، جو انھوں نے مولوی مسعود علی صاحب ندوی کے نام لکھا تھا اور جس میں دینس وغیرہ کے حالات ہیں۔

مجلد ششم	ماہ ربیع الاول ۱۳۹۹ء مطابق نومبر ۱۹۷۸ء	عدد پنجم
----------	--	----------

## مضامین

۳۳۰ - ۳۲۱	شذرات
۳۴۳ - ۳۳۱	نظام اخلاق، مولانا عبدالسلام ندوی
۳۴۱ - ۳۴۴	خوش قسمت حافظ اور بد نصیب خیام
۳۴۲ - ۳۴۴	سیر فلک، مولوی یوسف الزمان صاحب کسبونی
۳۸۲ - ۳۴۳	اسلام بطور عالمگیر مذہب کے
۳۹۱ - ۳۸۳	اخبار علیہ
۳۹۳ - ۳۹۲	نامہ غالب
۳۹۴ -	ادبیات، اکبر
۳۹۸ - ۳۹۵	تقریظ و انتقاد
۴۰۰ - ۳۹۹	مطبوعات جدیدہ

## مطبوعات جدیدہ

سیرۃ عائشہؓ، از مولانا سید سلیمان ندوی، ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے احوال زندگی کی تفصیل، قرن اول کی خانہ جنگیوں کے پہلی اسباب کی تشریح، ام المومنین کے فضائل و اخلاق کا بیان اور ان کے علمی اجتہادات و کمالات پر تبصرہ، چھپکر تیار ہو، ضخامت ۳۵۰ صفحات، قیمت درجہ اول (کاغذ طبع اعلیٰ) ۳۰ روپے، درجہ دوم ۲۰ روپے، درجہ سوم (کاغذ دلی پیسفید) ۱۵ روپے، منجبر

## مشکلات

عدم تعاون اور ترک موالات کے مسئلہ نے ہندوستان کے سطح تعلیمی میں جو زلزلہ پیدا کر دیا ہے، اس سے عربی مدارس بھی غیر متاثر نہ رہے، مدرسہ عالیہ کلکتہ، دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ، مدرسہ نور احمدی بانکی پور، مدرسہ دارالعلوم منور اعظم گڑھ، دارالعلوم اسلامیہ پشاور کے نام اس سلسلہ میں سننے میں آئے ہیں، مگر ہم سے پوچھا جائے تو ان مدارس میں اگر یہ تحریک اس وقت عام نہ بھی ہوتی تو بھی مدرسہ عالیہ کلکتہ کا تو زناہر حیثیت سے فرض تھا، یہ وہ مچلی ہر جسے بنگال کے تمام تعلیمی نالابوں کو گندہ کر رکھا ہے، بنگال کے وسیع رقبہ میں ایک درس گاہ ایسی نہیں جو مدرسہ عالیہ کے جال سے محفوظ ہو، اس وقت صوبہ بنگال میں کم از کم ۲۵ ہزار طالب العلم عربی پڑھنے میں مشغول ہیں اور سیکڑوں مدرسے ہر طرف قائم ہیں، لیکن یہ اس طرح مدرسہ عالیہ کے نظم و نسق و ترتیب کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں، کہ وہ گورنمنٹ کے دیگر صیغوں اور ٹکون کی طرح دست نسل ہو کر رہ گئے ہیں جن میں ہر طرح کی ترقی و تجدید و اصلاح ناممکن ہے، اور وہ کسی حیثیت سے مسلمانوں کی مذہبی و تعلیمی ضرورتوں کو پورا نہیں کر سکتے ہیں، اور ادھکا وجود اونکی جگہ پر دوسرے مدارس کے قیام کے لیے سد سکندری ہو گیا ہے، اس سلسلہ میں اگر بنگال کی عربی تعلیم کی اصلاح کا کام انجام پا جائے تو درحقیقت قوم کی ایک بڑی ضرورت رفع ہو جائے،

دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے ارکان انشطامی نے ڈیڑھ دن کے متصل دس گرم مباحثہ کے بعد ۵ ماہوار کی سرکاری اعانت کا لینا بند کر دیا، دارالعلوم کبیلہ یہ رقم بقدر ناگہیر غمی کم اسکے ہٹ جائیکے

بعد فوراً اسکی زندگی گویا معرضِ ظلمین گئی یہ تقریباً ایک ہزار ماہوار کا اسین فہرستِ سرکاری امداد کے انکار کے بعد صرف سرکار بھوپال کی ۲۵۰ روپیوں کی ایک امداد کے پاس رہ گئی ہے، کسی اور قسم کا سرمایہ اس کے پاس نہیں، ہماری درخواست پر مدرسینِ کرام نے اپنی مقدس جماعت کے رتبہ کے مطابق بڑے ایشار کا ثبوت دیا، تاہم تین برس کے لیے کم از کم تیس ہزار روپے کی ضرورت ہے، کیا ہم قوم سے امید رکھیں کہ وہ اسکی جھولی کے بھرنے میں اپنے رتبہ کے مطابق ایشار کا ثبوت دیگی؟

ع خدا شہرے برانگیزد کہ خیر باد درو باشد، اس مصرع کی صحیح بیانی کی تصدیق موجودہ مسئلہ ترکِ موالات کے ضمن میں بھی ملے تو عجب نہیں، سرکاری یونیورسٹیوں سے قطع تعلق کے بعد قومی یونیورسٹیوں کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، یہ یونیورسٹیاں علی گڑھ اور احمد آباد میں قائم ہو رہی ہیں، ان میں تعلیم کی زبان اُردو، ہندی اور گجراتی ہوگی، ہمارا مدت سے خیال ہے کہ کوئی زبان بغیر تعلیمی زبان بنے علمی اور عام زبان نہیں بن سکتی، اگر قومی یونیورسٹیاں خواب سچا نکلا تو آپ تھوڑے ہی دنوں میں دیکھ لینگے کہ آپ کی زبان ہر قسم کے لٹریچر پر کس قدر مالا مال ہو جاتی ہے،

بیسویں صدی کا پہلا سال تھا (۱۹۰۷ء) کہ اُردو اور ہندی نے دورِ قریب پہلوانوں کی حیثیت سے سرکاری محکموں کے ڈنگل میں قدم رکھا، اس ڈنگل کے جگت استاد میکڈونل صاحب کی نیت جو کچھ ہو مگر اسین شک نہیں کہ اد کا بیچ دونوں حریفوں کو دست و گریبان کرنے میں تہمت کا مایاب ہوا۔ اس وقت سے اس وقت تک اُردو ہندی کے جھگڑوں نے ہماری بزمِ ادب کو مکدر اور غمزہ کر دکھا ہے، بیس برس کے بعد گجرات کی خاک سے ایک صلح جو اور مرغ و مرغبان

ہستی دگاندرمی نے ظہور کیا، جسے اردو ہندی کے تمام جھگڑوں اور نزاعوں کو سکر فیصلہ کیا کہ انکی حیثیت نزاع لفظی کے سوا اور کچھ نہیں، اور ایسے اور ایک تیسری اصطلاح وضع کی یعنی ہندوستانی، گو اس اصطلاح کے اصل واضع انگریز ہیں، تاہم یہ بدیہی چیز اگر دو قوموں کے درمیان مصالحت کر اسکے توسو دیشی کے حامی اور سکوتبرانہ جانگی،

آج کل جب ایک متحدہ ہندوستان کی بنیاد ڈالی جا رہی ہے، اور ہندوستانیوں کی ایک متحدہ قومیت کی تعمیر کی فکر میں ہو رہی ہیں ملک کے لیے ایک متحدہ زبان سے چارہ نہیں، کسی قوم کے اتحاد کے صرف تین عناصر ہیں، نسل، مذہب اور زبان، نسل کے لحاظ تو ہندوستان دنیا کی قوموں کا مجموعہ ہے، ایسے یہ اتحاد تو سرے ہی مفقود، مذہب کا اتحاد بھی ناممکن ہے، اے کے صرف ایک زبان رہ گئی، اگر دہی بھی ایک نہ تو متحدہ قومیت کی دیوار کی انٹین کس سالہ سے پرست ہو گئی، اب کہ قومی تعلیم کا سوال درپیش ہے اس مدت کے اچھے ہوئے مسئلہ کو بھی طے کر دینے کا موقع ہے،

ہم نے متعدد دفعہ انھیں صفحات میں اس مسئلہ کا تذکرہ کیا ہے اور جب کبھی سمجھا رہے ہوں تو ان کے مجمع میں بولنے کا اتفاق ہوا ہے اور صراحتاً ان کو توجہ دلائی ہے، کیمبرج کے ہندوستانی طلبہ کے مجمع میں جہاں تمام ہندوستان کے صوبوں کے نوجوان فرزند موجود تھے اس مسئلہ پر پُر زور تقریر کی، ۶ اکتوبر کو بھٹی کی نوجوان ہندوستانیوں کی ہوم رول لیگ میں اسکی طرف توجہ دلائی کیونکہ اب نظر آتا ہے کہ اردو ہندی کی کشمکش ہندوستان کی دونوں قوموں کے درمیان حیثیت اور بیگانگی کی ایک دیوار کھینچ رہی ہے، ابھی ۱۰ نومبر کو مسوین ایک جلسہ کی شرکت کا اتفاق ہوا جس میں ایک سو امی جی بھی جو گر دکل کے تعلیم یافتہ تھے مقرر کی حیثیت سے شریک تھے، ہم دونوں

کی تقریروں کا موضوع بھی ایک ہی تھا، لیکن یہ کیا عجیب بات تھی کہ نہ وہ میری پوری تقریر سمجھ سکے اور نہ میں اونکی پوری بات سمجھ سکا، کیا حکومت ملکی یا سورا ج کے حصول کے بعد ہمارے ایوان حکومت کے ارکان کا بھی یہی حال ہوگا،

اردو اور ہندی میں جو فرق ہے وہ درحقیقت نہایت معمولی ہر ہر زبان تین غصروں سے مرکب ہوتی ہے، اسم، فعل اور حرف، اگر دو اور ہندی میں جس قدر افعال اور حرف ہیں وہ تانتریک ہیں، جھگڑا صرت اسم کا ہوا اگر عربی اور فارسی اسم از زیادہ ہیں تو وہ اردو ہر اور اگر سنسکرت اور بھاشا کی ہمار زیادہ ہیں تو وہ ہندی ہے، اس مسئلہ میں دونوں زبانوں کے حامیوں کے درمیان افراط و تفریط ہے ہمارا خیال یہ ہے کہ اس وقت تک جو زبان ہندوستانی کے نام سے پشاور سے لیکر برما تک بولی جاتی ہے اور اوس میں جس حد تک عربی فارسی سنسکرت اور بھاشا کے اسماء اور اسکے اندر آگئے ہیں وہ مطلب کے ظاہر کرنے کے لیے کافی ہیں اب نئے نئے اور موٹے موٹے عربی یا فارسی یا سنسکرت کے الفاظ بھر کر مختلف زبانیں بنانا نامناسب ہے، آج سے بیس برس پہلے اب جسکو ہندی کہا جاتا ہوا اسکا وجود بھی نہ تھا، دیہاتوں میں ہندو مسلمان جو زبان بولتے ہیں وہ ایک دیہاتی زبان ہے جو ہر ملک کے دیہاتوں میں پائی جاتی ہے لیکن وہ کمین دفتری یا علمی زبان نہیں بنائی گئی،

یورپ میں سوئٹزر لینڈ کی بالکل یہی کیفیت ہے، اس پہاڑی ملک میں جرمن، فرانچ اور آلمین تین قومیں آباد ہیں، اور ہر قوم اپنی زبان آپ بولتی ہے، اور اپنی آبادی میں اسکی تعلیم، معاملات اور دفتر کی وہی زبان ہے لیکن کل ملک کی عمومی دفتری زبان بھی ایک ضروری

اور وہ فریخ ہے اسی طریقہ سے اگر ہندوستان کی صوبہ دار زبانیں اپنے اپنے صوبوں میں بولی جائیں تو کچھ ہرج منیں، بشرطیکہ ایک نہ ایک عمومی زبان ہی طے ہو جائے،

اردو میں عمومی زبان بننے کی مختلف ترجیحی دہلیں ہیں، اول یہ کہ کم از کم ایک قوم یعنی مسلمانوں کی یہ مشترکہ زبان ہے، لیکن ہندی کو یہ حیثیت حاصل نہیں ہے، دوسرے یہ کہ عملاً ہر صوبہ میں یا ہر اسٹیشن پر بیرونی ملک کے ہندوستان میں رہنے والوں کے اندر بلکہ ہندوستان سے باہر بھی یہ بولی اور سمجھی جاتی ہے، اس سفر یورپ میں تو مجھے اردو کی جعفرانی دعوت پر سخت تعجب آیا ہندوستان سے باہر عدن کی تو یہ گویا زبان ثانی ہو گئی ہے، وہاں بے تکلف یہ زبان بولی اور سمجھی جاتی ہے ہر حضرموت کا ایک عرب لڑکا مجھے مصوع سے آئے ہمارے ملا، وہ خاصی اردو بولتا تھا میں نے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ یہ کبھی ہندوستان نہیں گیا، عدن میں انگریزوں کی نوکری اس نے کی ہے مصر میں پورٹ سعید کے تمام خلاصیوں اور ملاحوں کو دیکھا کہ وہ خاصی اردو بولتے تھے دریافت سے معلوم ہوا کہ انھوں نے ہندوستان کی صورت بھی نہیں دیکھی، مصوع کے افریقی سواحل پر بھی یہی منظر نظر آیا، یہ صرف ہندوستانی مسافروں کی آمد و رفت کا نتیجہ ہے، بصرہ و حلب فارس اور حجاز کی بھی یہی کیفیت تھی ہوا ہر افغانستان تک اسکا اثر اور اقتدار معلوم ہوتا ہے، افغانستان کے اخبارات کی زبان تک سر اردو کی ہوتی ہے، علاوہ ازیں، اندامان، پورٹ بلیر جنوبی افریقہ، مارشس جہان جہان ہندوستانی بونچے ہیں ہندوستان کی یہ زبان جسکو خواہ اردو کہو، ہندی کہو یا ہندوستانی پھیلی چلی گئی ہے،

اخبارات سے یہ خبر معلوم ہو چکی ہوگی، کہ جناب مولانا مفتی محمد عبداللہ صاحب ٹونکی نے



۷۔ نومبر ۱۹۱۷ء کو بھارت فوج بھوپال میں انتقال کیا، مفتی صاحب مرحوم عربی درس گاہ ہونکی قدیم تعلیم کے بہترین نمونہ تھے، ہندوستان کے مشاہیر علمائین اور کاشمار تھا، وہ ادب میں مولانا فیض الحسن صاحب اور دینیات میں مولانا احمد علی صاحب محدث کے شاگرد تھے، مولانا فیض الحسن صاحب کے انتقال کے بعد اور نیٹیل کالج لاہور کی پروفیسری کی جگہ اذکوملی، اور اونکی عمر کا بڑا حصہ اسی درس گاہ میں گزرا، اخیر زمانہ میں وہ دارالعلوم ندوہ کے مدرس اعلیٰ مقرر ہوئے تھے اور اسکے بعد مدرسہ عالیہ کلکتہ کے صدر مدرس ہوئے، اور یہیں سے بیمار ہو کر اپنے صاحبزادہ جناب مفتی انوار الحق صاحب ایم اے ناظم و مشیر تعلیمات بھوپال کے پاس گئے تھے، جہاں وفات پونے نے وفات پائی، غالباً وفات کے وقت مفتی صاحب مرحوم کی عمر نتر کے قریب ہوگی، تعلیمی خدمات کے علاوہ مفتی صاحب کا بڑا کارنامہ انجمن متشاعر العلماء لاہور ہے، جو ایک قسم کا دارالافتاء ہے، مرحوم نے بعض عربی کی درسی کتابیں حواشی ہی لکھے تھے، اونکی وفات سے علما کی صف میں ایک ایسی جگہ خالی ہے جس کے بھرنے کی اب آئندہ امید نہیں،

بعض اہل علم اور سمجھدار ہندوستانیوں نے جو کسی نہ کسی مقصد سے انگلستان میں اقامت پذیر ہیں، مختلف اغراض سے چند انجمنیں قائم کی ہیں، ان میں ایک انجمن ”دی یونین آف اسٹ ایڈز ویٹ“ یعنی ”اتحاد مشرق و مغرب“ ہے، اس انجمن کا مقصد یہ ہے کہ مشرق و مغرب کو علم و فن، مصوری، فلسفہ، ادب، موسیقی اور ڈراما کے میدان میں ایک چہرہ پر جمع کیا جائے، کے، ان، اس گپتا اسکے سکریٹری ہیں، ۱۹۱۷ء میں اسکے متعدد جلسے لندن کے مختلف ایوانوں میں ہوئے جن میں انگریز اور ہندوستانی مقررین نے مختلف مضامین پر تقریریں کیں ذیل میں ہم سال گذشتہ کے مقررین اور عنوانات تقریر کا نقشہ دیتے ہیں،

ہا	مقرین	عنوان
جنوری	یوسف علی سابق ڈپٹی کمشنر (صوبہ قندھار)	گلیپولی میں ایک ہندوستانی ہیرو
مارچ	ایم، ایچ، اصفہانی	اکبر
اپریل		حیات بعد المات
مئی	ارنٹ رہائس کے، ٹی، پاول۔ ان	ہندوستان اور برطانیہ،
	ایم سوارتھ، ایڈمنڈ رسل، کینیڈہ سوڈر	
	ڈاکٹر پولین،	
جون	ایڈمنڈ رسل	ہمانی اراکان
جولائی	سر سید رونا تھہ بزرگی، سری نوہن شاستری	موجودہ اور گذشتہ ہندوستان،
اکتوبر	سر وجہی ناٹو	ہندوستان کا تخیل،

نامور مشرق پر و فیئر براؤن (کیمبرج) کی "تاریخ ادبیات ایران" کی تیسری جلد، جس کا مدت سے انتظار تھا، بالآخر شائع ہو گئی، کتاب کا پورا نام "ہسٹری آف پشین لٹریچر انڈیا" نار نارو وینین ہے اور تقریباً چھ سو صفحہ کی ضخامت کے ساتھ کیمبرج یونیورسٹی پریس سے بر آب و تاب شائع ہوئی ہے۔ کاغذ و طباعت کی تفاوت کے علاوہ متعدد تصاویر سے بھی کتاب کے حسن و زیبائش میں مدد لی گئی ہے، جنین سعدی، حافظ، ابوالسحاق شیرازی کی تصاویر خاص طور پر قابل ذکر ہیں، اس جلد کا رقبہ موضوع ۱۲۶۵ء سے ۱۹۰۲ء تک وسیع ہے، طبقہ شعراء و صوفیہ میں عراقی، حافظ، خواجو، سلمان سادجی، امامی، مغربی، محمود شبستری، خواجہ عبید اللہ احرار، کمال خجندی، ابن یسین، خسرو وغیرہ تمام اکابر عصر کا تذکرہ آگیا ہے،

کتاب پر تفصیلی ریویو کا یہ موقع نہیں، اسوقت صرف ایک ضمنی بات عرض کرنا ہے، آج سے آٹھ دس سال قبل جب شعرالجم کی ابتدائی جلدیں شائع ہوئی تھیں، اسوقت ہمارے ملک کے بعض خوش فہم نقادان فن نے مصنف کی محنت و کمال کی داد یہ دی تھی کہ شعرالجم کا سرمایہ معلومات تمام تر براؤن صاحب کی لٹریچر ہسٹری ہے، ان حضرات کو یہ معلوم کر کے یقیناً صدمہ ہوگا کہ پروفیسر موصوف نے اپنی اس جدید جلد کا ایک خاص ماخذ شعرالجم ہی کو بتایا ہے، ساری کتاب میں شعرالجم اور اسکے مصنف کا ذکر پندرہ بیس مرتبہ آیا ہے کیونکہ، اور کس حیثیت سے؟ اسکا اندازہ اقتباسات ذیل سے ہوگا:-

جو اشخاص اردو سے واقفیت رکھتے ہیں، انہیں بین زمانہ حال کی ایک اہلی ترین

کتاب شعرالجم، مصنفہ شبلی نعمانی کی جانب توجہ دلاؤ، (صفحہ ۱۰۸)

(سلمان سادجی کے سوانح سے متعلق) علامہ ہند کی دو بہترین کتابوں پر بین توجہ دلانا چاہتا

ہوں..... جنہیں دوسری کتاب تقریباً بیس فارسی شعراء کے کلام پر پیش بہا تبصروں کا

مجموعہ ہے، موسومہ شعرالجم، مولفہ شبلی نعمانی“ (صفحہ ۲۶۱)

”حافظ کے متعلق بہترین و جامع ترین تبصرہ جو میری نظر سے گزرا ہے وہ وہ ہے جو

شبلی نعمانی نے شعرالجم میں کیا ہے، جسکا حوالہ میں مکرر دیکھا ہوں“ (صفحہ ۲۷۳)

ان متفرق حوالوں سے قطع نظر کر کے پروفیسر براؤن نے سلمان حافظ و خواجہ کے سوانح و کلام پر جو کچھ لکھا ہے وہ تقریباً لفظ بہ لفظ شعرالجم کی تلخیص ہے، اور مولانا مرحوم نے حافظ کا جو موازنہ سلمان و خواجہ سے کیا تھا، اسکے ایک بڑے حصہ کو بعینہ نقل کر دیا ہے پھر ان چیزوں کو چرچا چھپا کر ہینن لیا ہے، بلکہ قدم قدم پر شعرالجم و مصنف شعرالجم کے حوالے

دیئے ہیں، چھل موصوف کا جو خیال مولانا سے مرحوم کے متعلق ہے، اس کے اظہار کے لئے ہم  
اس کے ایک گرامی نامہ موسومہ ایڈیٹر معارف سے چند فقرے اس مقام پر نقل کرتے ہیں:-

”باز میگویم کہ ہر گاہ بتوانید کتاب مولوی شبلی نعمانی مرحوم را یعنی شعر العجم یا بہ  
فارسی یا بہ انگلیسی ترجمہ و چاپ بکنند، چه قدر از برائے عموم فارسی خوانان خوب و بجا  
می شد، چه قدر انوس میوزم کہ نصیبم نشد آن بزرگوار را ملاقات کنم قبل از آنکہ ازین  
دارالفنا بدرالبقا انتقال فرمایند“

تقریحات بالا سے معلوم ہو گا کہ جو لوگ شعر العجم کو لٹریچر ہی سہی آف پرشیا کا ”سرتر“  
قرار دیتے تھے، وہ دہی اشخاص ہو سکتے ہیں جنکے دماغی دسترس سے یہ دونوں کتابیں بالاتر  
ہیں، ان حضرات کی تائید نہ براؤن کے لئے باعث فخر ہو سکتی ہے اور نہ شبلی کے لئے باعث  
ننگ، اسکا بے شبہہ انوس ہے کہ براؤن صاحب کو اس وقت تک شعر العجم کی صرف ابتدائی  
دو جلدیں دستیاب ہو سکی ہیں، اگر بقیہ تین جلدیں بھی اُنکے پیش نظر ہوتیں تو یقیناً وہ بہت  
زیادہ استفادہ کرتے،

ناظرین معارف اس خبر کو یقیناً نہایت مسرت سے سُنیں گے کہ مولوی عبدالباقی صاحب  
ندوی مصنف ”برکے“ نے جنکے مضامین و تصانیف سے وہ بخوبی روشناس ہو چکے ہیں، یکم و سہمیر سے  
دارالمصنفین میں منتقل قیام کرنے اور اپنی دماغی فیاضیوں سے اُسے مستفید کرتے رہنے کا فیصلہ کر لیا ہے  
انکی قابلیت، انکی قوت تحریر اور سب سے بڑھ کر انکی جامعیت (وہ علوم جدیدہ و قدیمہ دونوں کے عالم ہیں)  
کے لحاظ سے سبک دار المصنفین میں اس جدید گوہر کے اضافہ کو بے شبہہ ایک خوش قسمتی سے قیہر کیا جاسکتا ہے

# مقالات

## نظامِ اخلاق

## یا نظامِ محبت

(از مولانا عبد السلام ندوی)

لیکن نے اخلاق یورپ کی جو تاریخ لکھی ہے، اس میں ضمناً ایک موقع پر اسلام اور عیسائیت کے اخلاقی اثر کا ان الفاظ میں موازنہ کیا ہے،

”لیکن مسیحیت کا خالی یہی کارنامہ نہ تھا کہ اس نے لوگوں کو ڈرا دہمکا کر ان کے ذاتی و خود غرضانہ جذبات کو متاثر کر کے ان کے اخلاق کو درست کیا، بلکہ اس سے بڑھ کر اسکا کمال یہ ہے کہ اس نے بالکل بے غرضانہ و خود فراموشانہ طور پر محض خالصاً للہ لوگوں میں نیکی و نیک چلی کا جذبہ پیدا کر دیا، اور یہ مسیح کی محبت کے ذریعہ سے اشرافیہ کہتے تھے کہ خدا کا متبع کرو، رواقیہ کہتے تھے کہ شاہراہ عقل پر چلو، لیکن مسیحیت نے آکر کہا کہ مسیح سے محبت رکھو، اور تمہارے اخلاق خود بخود درست ہو جائیں گے، محبت کی یہ پہلی ہدایتی وجودیت اخلاق کے سلسلہ میں بلند ہوئی اور اسکا جو کچھ اثر ہوا وہ دنیا پر روشن ہے، اسپیکٹیش و متاخرین رواقیہ یہ کہنے لگے تھے کہ ایک بلند اخلاق شخص کو بطور اسوہ حسنہ کے اپنے سامنے رکھنا چاہیئے اور اسکی تقلید کرتے رہنا چاہیئے، لیکن تقلید و متبع اور الفت و محبت میں زمین و آسمان کا فرق ہے، یہ شرف مسیحیت کے لئے مخصوص تھا کہ اس نے

دنیا میں سب سے اول بار لوگوں کو محبت کے راستہ سے اخلاق کی تعلیم دی اور انسان کے سامنے ایک ایسا بلند کیمکھڑا ایک ایسی دل فریب شخصیت پیش کی جو اپنی دلفریبی و محبت سے ہر قوم، ہر ملک، ہر زمانہ کو متاثر کرتی رہی ہے، جو بہترین محرک اخلاق ہے، جو انیس سو سال گزر جانے پر بھی بدستور قوی و موثر ہے اور جسکی عجیب و غریب قوت کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ گواہی ساری زندگی کے صرف تین سالوں کا علم ہے لیکن اسکے اسی سہ سالہ زندگی کے کارنامے طبیعت پر وہ اثر ڈالتے ہیں جنکا مقابلہ بڑے سے بڑے واعظین کے مواعظ، اور بہتر سے بہتر حکماء کے مقولے نہیں کر سکتے، حقیقت میں مسیحی اخلاق کے چشمہ کا منبع بھی مسیح کی محبت رہی ہے، جو صد ہا انقلابات پر بھی اب تک جون کی تون ہے، اور گو آگے چل کر مسیحین نے خود اپنے دین و ملت میں بیسیوں رخصت پیدا کئے، لیکن اپنے آفاقی نامدار کی سیرت کی دلفریبی پر کبھی کوئی حرف نہ اُٹے دیا، محبت کامل اپنے سامنے کسی استحقاق و دعویٰ کو نہیں ٹھہرنے دیتی، پس جو لوگ ایک مرتبہ مسیح کے عشق و محبت میں سرشار ہو جاتے ہیں وہ جو کچھ کرتے ہیں انتہائی خلوص و ذوق سے کرتے ہیں جمہیں نہ خوف کی آمیزش ہوتی ہے اور نہ حسد و تحقیر کی، سینٹ تریسیا دعا مانگا کرتی تھی کہ کاش ساری کائنات نابید ہو جائے اور اکیلی میں موجود رہوں تاکہ افاقی خداوند گداز کا فخر تنہا مجھ کو حاصل رہے، اور اسکی اس تنہا کی آواز باز گشت اس جیسی ہزار ہا عاشقان مسیح کی زبان سے آتی ہے، خود تعدیوں کے زمانہ میں منتہاے شہادہ پر تحمل و برداشت کی قوت بیسیوں میں کس نے پیدا کر دی تھی؟ اسی عشق مسیح نے، زندہ زمین میں دفن کئے جاتے تھے، جنگلی جانوروں کے آگے چھوڑ دیئے جاتے تھے، زخم پر زخم کھاتے تھے، دوسروں کو انکی حالت پر ترس آجاتا تھا، لیکن وہ خود خوش و خرم تھے، کہ مسیح کے نام پر

یہ زخم کہاں جا رہے ہیں، موت آنی تھی اور وہ اسکا سر سے استقبال کرتے تھے کہ گویا دو لہا اپنی نئی دلہن کو آغوش میں لے رہا ہے، یہ کیوں؟ محض اسلئے کہ موت سے انہیں اپنے مشوق کا وصل نصیب ہوگا، سینٹ فیلیپسین زندان عقوبت میں اسیر تھی کہ وضع حمل کا وقت آگیا، ایسی حالت میں اسے جیسی کچھ تکلیف ہوئی ہوگی ناظرین اندازہ کر سکتے ہیں، اس حالت میں بے اختیار ایک بیچ اسکے منہ سے نکل گئی، ایک تماشائی نے ترس کما کر کہا کہ ابھی اسقدر بیچیں ہو رہی ہو ذرا دیر میں درندوں کے سامنے ڈال دی جاوے گی، وہ تکلیف کیسے برداشت کر دے گی؟ اسپر اس نے پورے اطمینان سے جواب دیا کہ ”ہنیں۔ اسوقت مجھے تکلیف نہیں ہوگی، وہ تکلیف میں جبکہ لئے برداشت کر دے گی حقیقت خود ہی اسے برداشت کرے گی۔“ اسی طرح جب سنٹ میلینا کا شوہر اور دونوں لڑکے دفن ہو چکے اور دنیا میں اسکا کوئی والی وارث باقی نہیں رہا تو وہ انکی قبروں پر جا کر بیٹھی اور کہا کہ الہی تیرا شکر ہے کہ تو نے ان بکھیر دے سے مجھے نجات دی، میں اب پوری کیسوی کے ساتھ تیری خدمت گزار رہ کر سکونگی، جو لوگ اس واقعیت سے بے خبر ہیں کہ جذبات کی قوت و تندی کے مقابلہ میں اکثر محض قوت فرض شناسی کیونکر بیکار جاتی ہے، جو لوگ اس رمز سے آگاہ ہیں کہ اسلام باوجود اپنی خالص توحید اور اعلیٰ نظام اخلاق کے محض اس باعث کہ اسکے متبعین کے سامنے کوئی اعلیٰ نمونہ نہیں تھا، شرافت و محبت کے لطیف ترین جذبات سے کس طرح معریٰ رہا ہے، اور جن لوگوں کے پیش نظر مسیحی تاریخ کے اور انی بین جنکی ہر ہر سطر میں مسیحیت کے کثرت نظر آ رہے ہیں وہ سینٹ آگسٹائن کے اس فقرہ کی اہمیت و لطف کا پوری طرح اندازہ کر سکتے ہیں کہ مسیحی اخلاق فلسفہ اخلاق نہیں بلکہ ایک نظام محبت ہے۔“

(۱) (۲) (۳) (۴) (۵) (۶) (۷) (۸) (۹) (۱۰) (۱۱) (۱۲) (۱۳) (۱۴) (۱۵) (۱۶) (۱۷) (۱۸) (۱۹) (۲۰) (۲۱) (۲۲) (۲۳) (۲۴) (۲۵) (۲۶) (۲۷) (۲۸) (۲۹) (۳۰) (۳۱) (۳۲) (۳۳) (۳۴) (۳۵) (۳۶) (۳۷) (۳۸) (۳۹) (۴۰) (۴۱) (۴۲) (۴۳) (۴۴) (۴۵) (۴۶) (۴۷) (۴۸) (۴۹) (۵۰) (۵۱) (۵۲) (۵۳) (۵۴) (۵۵) (۵۶) (۵۷) (۵۸) (۵۹) (۶۰) (۶۱) (۶۲) (۶۳) (۶۴) (۶۵) (۶۶) (۶۷) (۶۸) (۶۹) (۷۰) (۷۱) (۷۲) (۷۳) (۷۴) (۷۵) (۷۶) (۷۷) (۷۸) (۷۹) (۸۰) (۸۱) (۸۲) (۸۳) (۸۴) (۸۵) (۸۶) (۸۷) (۸۸) (۸۹) (۹۰) (۹۱) (۹۲) (۹۳) (۹۴) (۹۵) (۹۶) (۹۷) (۹۸) (۹۹) (۱۰۰)

لیکن نے پرستار ان مسیح کی دالہا نہ دار فنگی اور خود فراموشانہ جوش محبت کے متعلق جو موثر واقعات نقل کئے ہیں نہ ان کا انکار کیا جاسکتا، اور نہ انکے انکار کی ضرورت ہے، البتہ ہم اسکے اس ریمارک کو کہ

”اسلام باوجود اپنی خالص توحید اور اعلیٰ نظام اخلاق کے محض اس باعث کہ اسکے متبعین کے سامنے کوئی اعلیٰ نمونہ نہیں تھا، شرافت و محبت کے لطیف ترین جذبات سے کس طرح موری رہا ہے؟“

کسی طرح بہین تسلیم کر سکتے، اسلام نے حسب اعتراف لیکن جو اعلیٰ نظام اخلاق ”قام کیا، اسکے معنی اس سے زیادہ نہ تھے کہ اس نے ایک نہایت بلند شخصیت مسلمانوں کے پیش نظر کر دی،

لقد کان کم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ لمن کان یشاء اللہ والیوم مر الاخر و ذکر اللہ کنیدا  
تمنا سے رسول اللہ کی ذات میں بہترین نمونہ اعلیٰ موجود ہی لیکن یہ نمونہ صرف ان لوگوں کے لئے ہے جو ذات خداوندی اور روز قیامت کی توقع رکھتے ہیں اور  
خدا کو بہت یاد کرتے ہیں،

اور مسلمانوں نے عبادات، معاملات، اخلاق و عادات، غرض عملی زندگی کے ایک ایک جزئیات میں اسی کو اپنی تمام حرکات ارادیہ کا محور قرار دیا، چنانچہ قرون اولیٰ کے مسلمانوں کا زندگی میں اس قسم کے واقعات بکثرت مل سکتے ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ انہوں نے قدم قدم پر اسی اسوۃ حسنہ کی تقلید کی، ایک بار حضرت عبداللہ بن عمرؓ سفر میں تھے دیکھا کہ کچھ لوگ نفل پڑھ رہے ہیں، رفیق سفر سے بولے کہ اگر مجھے نفل پڑھنا ہوتا تو میں نماز ہی پوری نہ پڑھتا، میں نے رسول اللہ صلی علیہ وسلم کے ساتھ سفر کیا ہے، آپ نے دو رکعت سے زیادہ کبھی نہیں پڑھی، حضرت ابوبکرؓ اور عمرؓ کے ساتھ سفر کیا، انہوں نے دو رکعت سے زیادہ کبھی نہیں پڑھی، اور



لقد كان لكم في رسول الله  
 اسوة حسنة،  
 تمہارے لئے رسول اللہ ہی کی ذات میں تقلید کیلئے  
 بہترین مثال ہے،

ایکبار حضرت سید بن یسار حضرت عبد اللہ بن عمر کے ساتھ سفر میں تھے، ایک  
 موقع پر اونٹ سے اتر کر پیچھے ہٹ گئے، فرمایا تم پیچھے کیوں رہ گئے؟ بولے وتر پڑھنا تھا، فرمایا،  
 کیا تمہارے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں اسوۂ حسنہ نہیں ہے؟ آپ اونٹ ہی پر وتر  
 ادا فرماتے تھے،

اسی اسوۂ حسنہ کی پیروی کا نام شریعت کی اصطلاح میں اتباع سنت ہے اور صحابہ کرام نے  
 جس شدت کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کا اتباع کیا ہے، اسکی نظیر سے دنیا کے تمام  
 مذاہب کی تاریخ خالی ہے، سخت سے سخت خطرے سے محفوظ رہنے، لیکن اسی اسوۂ حسنہ کی  
 پیروی صحابہ کرام کو مذہبی اعمال و فرائض کے ادا کر نیکی ہمت دلاتی تھی، جس زمانہ میں حجاج  
 اور عبد اللہ بن زبیر کے درمیان جنگ شروع ہوئی وہ حج کا زمانہ تھا، اور خود خانہ کعبہ  
 محاصرہ میں آگیا تھا، لیکن با این ہمہ حضرت عبد اللہ بن عمر نے اس حالت میں سفر حج کرنا چاہا  
 صحابہ جزادون نے روکا تو بولے کہ تمہارے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نمونہ موجود ہے، آپ عمرہ  
 ادا کرنے کے لئے چلے تو کفار نے روک دیا، آپ نے قربانی کر کے سر منڈوا لیا یعنی اگر راستہ میں  
 رکاوٹ پیش آئی تو ہم بھی ایسا ہی کریں گے،

سنن عابدیہ و اتفاقیہ کا اتباع اگرچہ ضروری نہیں، اہم صحابہ کرام نے جوش و خروش میں  
 اسکا اتباع بھی کیا، چنانچہ حضرت ابو درداء جب کوئی بات کہتے تھے تو مسکرا دیتے تھے،

۱۔ ابو داؤد کتاب العلوة باب انظر فی السفر، ۲۔ سنن ابن ماجہ کتاب العلوة باب ماجاء فی الوتر علی الارحلة  
 ۳۔ یہ حدیث بخاری کتاب الحج کے متعدد ابواب میں اجمالاً اور تفصیلاً مذکور ہے،

کسی نے کہا کہ اس عادت کو ترک کر دیجئے، ورنہ لوگ آپ کو احمق بنا بیٹھیں گے، بولے، میں نے رسول اللہ ﷺ صلعم کو دیکھا ہے کہ جب کوئی بات کہتے تھے تو مسکرا دیتے تھے، ایک صحابی آپ کی خدمت میں بیعت کے لئے حاضر ہوا، دیکھا کہ آپ کی قمیص کا ٹکڑہ کھلا ہوا ہے، آپ کی تقلید میں انھوں نے بھی عمر بھر قمیص کا ٹکڑہ کھلا رکھا، لیکن یہ سب کچھ کسی جبرِ ظلم، اور دباؤ کا نتیجہ نہ تھا، بلکہ ایک جذبہٴ محبت کا اثر تھا جسکو خود رسول اللہ صلعم نے جزدایا ان قرار ویدیا تھا،

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ اس وقت تک کسی شخص کا  
 (۱) یوم من احلام حتی اکون احب لہ من  
 (۲) ایام کمل نہیں ہو سکتا جتنک میں اسکو اسکے بیٹے  
 (۳) ولدہ والدہ والناس اجمعین (مسلم) اسکے باپ اور تمام لوگوں سے محبوب تر نہیں ہوں،  
 اور صحابہ کرام کی عملی زندگی میں یہ جزدوسرے موقع پر نہایت نمایاں رہا، لیکنی نے پرستار ان مسیح کے  
 متعلق جو محبت آمیز واقعات نقل کئے ہیں، ان سے بہت زیادہ موثر، ان سے بہت زیادہ اعلیٰ  
 اور اُن سے بہت زیادہ شاندار واقعات اسلام کی تاریخ میں مل سکتے ہیں، اور اس کثرت سے  
 مل سکتے ہیں کہ انکے پیش نظر رکھ لینے کے بعد عہد صحابہ کی تاریخ، تاریخِ ہنہن رہتی، بلکہ عشق و محبت کی  
 ایک ولادہ بزدستان بن جاتی ہے، سیرِ لہجاء میں ہم نے اس داستان کے ایک ایک حرف کو  
 احادیث و سیر کے حوالہ سے ایک خاص باب میں جمع کر دیا ہے، لیکن اس موقع پر صرف چند موثر  
 واقعات کا نقل کر دینا کافی ہوگا،

بی بی سکونہؓ محبوب ہوتی ہے، لیکن خدا و رسول کی محبت میں صحابہ کرام نے ایسی  
 محبوب چیز کو بھی قربان کر دیا، ایک صحابی کی بیوی (ام ولد) رسول اللہ صلعم کو بُرا بھلا کہا  
 کرتی تھی، اسکے ساتھ انکے تعلقات جس قسم کے تھے انکو خود انھوں نے بیان کیا ہے،

لی منھا ابنان مثل اللؤلؤ قین وکانت اس سے میرے دو بچے موتی کی طرح تھے اور وہ

بی سافیقہ، میری ہمدستی،

لیکن ایک بار رات کو وہ آپکو بڑا ہبلا کہہ رہی تھی، اُنھوں نے سُن لیا، اور اُن تمام تعلقات کو بہول گئے، کھٹکھٹائی اُٹھائی اور اُسکا پیٹ چاک کر دیا، لڑکا گود سے اس کے سامنے گر پڑا، اور خون میں بھرتھ گیا،

غزوہٗ تبوک سخت گرمیوں کے زمانہ میں واقع ہوا تھا، حضرت ابو خثیمہؓ ایک صحابی تھے جو اس غزوہ میں شریک نہ ہو سکے تھے، ایک دن وہ گھر میں آئے تو دیکھا کہ بی بیوں نے اُن کی اسٹش کے لئے بہت کچھ سامان کیا ہے، بالا خانے پر چہرہ کاٹو کیا ہے، پانی سرد کیا ہے، عمدہ کھانا تیار کیا ہے، گھر میں آئے تو یہ تمام سامان عیش و تکرار کے لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو اس کو اور اس گرمی میں کھلے ہوئے میدان میں ہوں اور ابو خثیمہؓ سایہ، سرد پانی، عمدہ غذا اور خوبصورت عورتوں کے ساتھ لطف اُٹھائے، خدا کی قسم یہ انصاف نہیں ہے، میں ہرگز بالا خانہ پر نہ آؤں گا، چنانچہ اس وقت زاوراہ لیا اور تبوک کی طرف روانہ ہو گئے۔

ایک بار حضرت عبد اللہ بن عباسؓ آپ کے دائیں، اور حضرت خالد بن ولیدؓ بائیں جانب بیٹھے ہوئے تھے، آپکا معمول تھا کہ ہر کام کی ابتداء دائیں جانب سے فرماتے تھے، حضرت میمونہؓ کو وہ کاپیالہ لائیں، تو آپ نے پیکر حسب معمول حضرت عبد اللہ بن عباسؓ سے فرمایا کہ حق تو تمہارا ہے، لیکن اگر ایتنا نفی کرو تو خالد کو دیدو، بولے، میں آپکا جو ناکبک نہیں دے سکتا۔ ایک بار ایک صحابی آپکی خدمت میں حاضر ہوئے، آپ کہا نا کہا رہے تھے، انکو بھی شریک

۱۔ ابو داؤد کتاب الاموال باب الحكم في سب النبي صلى الله عليه وسلم جلد ۴ صفحہ ۲۹۱ تذکرہ مالک بن قیس، ۲۔ ترمذی ابواب الدعوات باب ما يقول اذا اكل طعاماً،

کرنا چاہا وہ روزے سے تھے، اسلئے انکو سخت افسوس ہوا کہ ہاے رسول اللہ کا کمانا نہیں کیا  
ایک صحابی کی آنکھیں جاتی رہیں، لوگ عبادت کو اسے تو انہوں نے کہا کہ ان آنکھوں سے  
مقصود تو صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دیدار تھا، لیکن جب آپ کا وہ مال ہو گیا تو میری بینائی  
لوٹ بھی آئے تو مجھے پسند نہیں۔

حضرت ابو بکرؓ نے اپنا تمام مال خدا کی راہ میں دیدیا تھا، ایک بار آپ نے فرمایا کہ مجھ کو جو  
نفع ابو بکر کے مال سے پہنچا وہ کسی کے مال سے نہیں پہنچا، حضرت ابو بکرؓ یہ سن کر رو پڑے اور  
کہا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا میں اور میرا مال آپ کے سوا اور کسی کا ہے؟

انصار کا معمول تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رضامندی کے بغیر اپنی لڑکیوں کی شادی نہیں  
کرتے تھے، ایک دن آپ نے ایک انصاری سے فرمایا کہ تم اپنی لڑکی میرے حوالہ کر دو، وہ تو  
منتظر ہی تھے باغ باغ ہو گئے، لیکن آپ نے فرمایا کہ میں اپنے لئے نہیں بلکہ جلیب کیلئے  
یہ پیغام دیتا ہوں جلیب ایک ظریف الطبع صحابی تھے جو راستوں میں بھی ظرافت اور  
مذاق کی باتیں کیا کرتے تھے، اسلئے صحابہ انکو عموماً ناپسند کرتے تھے، انھوں نے جلیب کا نام  
سننا تو بڑے کہ اسکی مان سے مشورہ کر لوں، مان نے انکا نام سنا تو انکار کیا لیکن لڑکی نے  
کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات نا منظور نہیں کیا سکتی مجھے آپ کے حوالہ کر دو خدا مجھے صالح نہ لے کر گیا۔

ایک بار ایک صحابیہ نے آپ کی دعوت کی، آپ نے کہانے کے بعد جس مشکیزہ سے  
پانی پیا اسکو انہوں نے جھوڑا رکھا، جب کوئی شخص بیابھرتا یا برکت حاصل کرنے کا موقع  
آتا تو وہ اس سے پانی پیتی اور پلاتی تھیں، جب آپ حضرت انسؓ کے گھر تشریف لاتے تھے

سنن ابن ماجہ کتاب الاطعمہ باب عرض الطعام لہ ادب الفرد باب العیاذہ من الرمد، سنن ابن ماجہ فضل  
ابی بکر الصدیق، لہ سند جلد ۴ صفحہ ۴۲۲ سے طبقات ابن سعد تذکرہ حضرت ام بیار،

تو انکی والدہ آپ کے پیسے کو بچو کر ایک شیشی میں بھر لیتی تھیں، یہ شیشی حضرت انس کے پاس محفوظ تھی، انھوں نے جب انتقال کیا تو وصیت کی کہ آب حیات کے یہ قطرے انکے حنوط میں شامل کئے جائیں،

غزوہ خیبر میں آپ نے ایک صحابیہ کو خود دست مبارک سے ایک ہار پہنایا تھا وہ اسکو اسقدر منبرک سمجھتی تھیں کہ عمر بھر گلے سے جدا نہ کیا اور جب انتقال کرنے لگیں تو وصیت کی کہ انکے ساتھ وہ بھی دفن کر دیا جائے،

ایک صحابی کے پاس آپکا ایک پیالہ تھا، حضرت عمرؓ انکے پاس آتے تھے تو اسی پیالہ میں پانی پیتے تھے، اور اسمیں زمرم کا پانی بھر کر اپنے منہ پر بھر لیتے تھے،

آپ ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو حضرت ابو ایوبؓ انصاری کے مکان میں قیام فرمایا، آپ بیچے کے حصہ میں اور انکے اہل عیال اُدپر کے حصہ میں رہتے تھے، ایک رات حضرت ابو ایوبؓ انصاری بیدار ہوئے اور کہا کہ ہم اور رسول اللہ ﷺ کے ادپر رہیں اس خیال سے تمام اہل عیال کو ایک کونے میں کر دیا اور صبح کو آپکی خدمت میں گزارش کی کہ آپ ادپر قیام فرمائیں، ارشاد ہوا کہ بیچے کا حصہ ہمارے لئے زیادہ موزوں ہے بولے جس چیت کے بیچے آپ ہوں ہم اسپر نہیں چڑھ سکتے۔ ”مجھو را آپکو بالا خانہ پر قیام کرنا پڑا،“

متحدہ صحابہ نے اپنے آپکو آپکی خدمتگداری کے لئے وقف کر دیا تھا، حضرت عبداللہ بن مسعود کا یہ کام تھا کہ جب آپ تشریف لیجاتے تو وہ پہلے آپکو جوتیان پہنانے، پھر آگے آگے عصا لیکر چلتے، آپ مجلسوں میں بیٹھا چاہتے تو آپکے پاؤں سے جوتیان نکالتے پھر آپکے

لے بخاری کتاب الاستئذان باب من زار قوما فقال عنہم، لے منذ ابن جنبل جلد ۶ صفحہ ۳۸، لے ۱ صابر، لے مسلم کتاب الاشرار باب اباحتہ اکل التمر وانہ یمنعہ لمن اراد خطاب الکبار ترکہ،

ماہمہ میں عصادیتے، آپ اُٹتے تو پھر اسی طرح جو تیان پہناتے، اور حجرہ مبارک تک پہنچا جاتے، آپ نہاتے تو پردہ کرتے، آپ سوتے تو آپکو بیدار کرتے، آپ سفر میں جاتے تو آپکا بچہ بونا، مسواک، اور وضو کا پانی اُنکے ساتھ ہوتا، اسلئے وہ صاحب سواد رسول اللہ یعنی آپ کے میر سامان کہے جاتے تھے،

حضرت ربیعہ اسلمی شب دروز آپکی خدمت میں مصروف رہتے، جب آپ عشا کی نماز سے فارغ ہو کر کاشانہ نبوت میں تشریف لیجاتے تو وہ دروازہ پر بیٹھ جاتے کہ مباد آپکو کوئی ضرورت پیش آجائے، ایک بار آپ نے اُنکو تاہل اختیار کرنے کا مشورہ دیا، بولے یہ تعلق آپکی خدمتگذاری میں خلل انداز ہوگا جسکو میں پسند نہیں کرتا،

حضرت انس بن مالک کو بچپن ہی سے انکی والدہ نے آپکی خدمت کے لئے وقف کر دیا تھا، حضرت سلمیٰ ایک صحابیہ تھیں، اُنھوں نے اس استقلال کے ساتھ آپکی خدمت کی کہ اُنکو خادمہ رسول اللہ کا لقب حاصل ہوا،

سفینہ حضرت سلمہ کے والدہ کی لونڈی تھی، اُنھوں نے اسکو اس شرط پر گزارا چاہا کہ وہ اپنی عمر آپکی خدمتگذاری میں صرف کرے، اُس نے کہا کہ اگر آپ یہ شرط بھی کر تیں تب بھی میں تانفس واپسین آپکی خدمت سے علیحدہ نہوتی۔

صحابہ کرام کے اس جوش محبت اور حسن عقیدت کا اظہار سب سے زیادہ غزوات میں ہوتا تھا، غزوہ بدر میں جب آپنے کفار کے مقابلہ کے لئے صحابہ کرام کو طلب کیا تو حضرت مقدادؓ بولے کہ ہم وہ بہنیں ہیں جو موسیٰ کی قوم کی طرح کہہ دین،

۱۔ طبقات ابن سعد تذکرہ حضرت عبد اللہ بن سعود ۱۷ مسند ابن جنبل جلد ۴ صفحہ ۵۸ و ۵۹ ۲۔ ابو داؤد کتاب الطب باب الجمارۃ، ۳۔ ابو داؤد کتاب العقیق باب فی التلق علی الشرط،

اذهب انت و ربك فقاتلا، تم اپنے خدا کے ساتھ جاؤ اور دونوں مل کر لڑو  
بلکہ ہم آپ کے دائیں سے، بائیں سے، آگے سے، پیچھے سے لڑینگے، آپ نے یہ جان نثارانہ فقرے  
سنے تو آپ کا چہرہ مبارک فرط مسرت سے چمک اُٹھا،

صحابہ کے جان نثارانہ جذبات کا ظہور سب سے زیادہ غزوہ اُحد میں ہوا، حضرت مصعب  
بن عمیرؓ نے جو صورت، شکل میں رسول اللہ صلم سے مشابہ تھے، شہادت پائی تو عام غل جگلیا  
کہ خود رسول اللہ صلم شہید ہو گئے، اس آواز سے تمام فوج میں بدحواسی پھیل گئی اور رسول اللہ  
صلعم کے ساتھ صرف نوصحابی جنین سات انصاری اور دو ماجر یعنی حضرت طلحہؓ اور حضرت سہد  
تھے رہ گئے، کفار نے یہ حالت دیکھی تو دفعۃً آپ پر ٹوٹ پڑے، آپ نے ان جان نثاروں  
کی طرف خطاب کر کے فرمایا کہ ان اشیاء کو کون میرے پاس سے ہٹا سکتا ہے؟ ایک انصاری  
فورا آگے بڑھے اور لڑ کر آپ پر قربان ہو گئے، اسی طرح آپ بار بار پُچھارتے جاتے تھے اور ایک  
ایک انصاری بڑھ کر آپ پر اپنی جان قربان کرنا جاتا تھا، جب ساتوں بزرگ شہید ہو گئے  
تو حضرت طلحہؓ اور حضرت سہدؓ کی جان نثاری کا وقت آیا، حضرت سہد کے سامنے آپ نے خود اپنا  
ترکش بکھیر دیا اور فرمایا کہ تیرے ہینکو، میرے باپ مان تم پر قربان! حضرت ابو طلحہؓ سیر لیکر آپ کے  
سامنے کھڑے ہو گئے، اور تیر چلانے لگے، اور اس شدت سے تیر اندازی کی کہ دتین لکمانیں  
ٹوٹ گئیں، اگر آپ گردن اُٹھا کر کفار کی طرف دیکھتے تھے تو وہ کہتے تھے ہمیرے باپ، مان  
آپ پر قربان، یوں گردن اُٹھا کر نہ دیکھتے، مبادا آپ کو کوئی تیر نہ لگ جائے، میرا سینہ آپ کے  
سینہ کے سامنے ہے، حضرت شماس بن عثمان کی جان نثاری کا یہ حال تھا کہ رسول اللہ صلم  
دائیں بائیں جسطرف نگاہ اُٹھا کر دیکھتے تھے انکی تلوار چلتی ہوئی نظر آتی تھی، آپ پر غشی طاری

لے بخاری کتاب المغازی باب تصد غزوہ بدر سے صحیح مسلم ذکر غزوہ اُحد، سنہ بخاری ذکر غزوہ اُحد،

ہوئی تو انھوں نے اپنے آپکو آپکی سپر بنا لیا، یہاں تک کہ اسی حالت میں شہید ہوئے<sup>۱</sup>  
 اسی غرودہ میں آپ نے ایک صحابی کو حضرت سعد بن ربیع انصاری کی تلاش میں  
 روانہ فرمایا، وہ لاشوں کے درمیان اُنکو ڈھونڈنے لگے، حضرت سعد بن ربیع خود بولے کہ  
 کیا کام ہے؟ جواب دیا کہ رسول اللہؐ نے مجھے تمہارے ہی پتہ لگانے کے لئے بھیجا ہے، بولے  
 جاؤ آپکی خدمت میں میرا سلام عرض کر دو، اور کہو کہ مجھے بارہ زخم لگے ہیں، اور اپنے قبیلہ میں  
 اعلان کر دو کہ اگر رسول اللہؐ صلعم شہید ہو گئے، اور ان میں کا ایک تنفس بھی زندہ رہا تو خدا کے  
 نزدیک اُن کا کوئی عذر قابلِ سماعت نہ ہوگا!<sup>۲</sup>

صحابہ کرام کے اس جوشِ محبت، اس حسنِ عقیدت، اور اس جان نثاری کا منظر اسقدر  
 موثر ہوتا تھا کہ خود کفار عرب بھی اس سے شدت کے ساتھ متاثر ہوتے تھے، صلح حدیبیہ کے  
 متعلق عرودہ نے آپ سے گفتگو کی تو عرب کے طریقہ کے مطابق ریشِ مبارک کی طرف ہاتھ بڑھانا  
 چاہا، وہ جب جب ہاتھ بڑھاتا تھا حضرت عبیرہ بن شعبہ تلوار کے اشارہ سے روک دیتے تھے،  
 اس واقعہ سے عرودہ کو اس طرف توجہ ہوئی اور اس نے صحابہ کے طرزِ عمل کو بغور دیکھنا شروع کیا، اس پر  
 اسکا یہ اثر پڑا کہ پلٹا تو کفار سے بیان کیا کہ میں نے قبصرِ اکسری اور نجاشی کے دربار دیکھے ہیں،  
 لیکن محمدؐ کے اصحاب جطرح محمدؐ کی تعظیم کرتے ہیں، میں نے کسی بادشاہ کے رفتار میں وہ بات  
 نہیں پائی، اگر وہ ہتھوکتے ہیں تو ان کو گون کے ہاتھ میں اُن کا ہتھوکتا ہے، اور وہ اپنے جسم  
 وچہرہ پر اسکو مل لیتے ہیں، اگر وہ کوئی حکم دیتے ہیں تو ہر شخص اسکی تعمیل کے لئے مسابقت کرنا  
 چاہتا ہے، اگر وہ وضو کرتے ہیں تو وہ لوگ بچے کچے پانی کے لئے باہم لڑ پڑتے ہیں، اگر وہ  
 بولتے ہیں تو اُنکی آوازیں لپٹ ہو جاتی ہیں، ادب سے انکی طرف آنکھ بھر کے نہیں دیکھتے،<sup>۳</sup>

۱۔ ابن سعد ذکرہ حضرت شناس بن عثمانؓ سے سوطاے امام الکتاب الجہاد باب الترغیب فی الجہاد سے بخاری کتاب التہجد



اب ان تمام واقعات کو پیش نظر رکھ لینے کے بعد لیکے کے اس فقرہ کو پڑھو،  
 ”کہ اسلام باوجود اپنی خالص توحید اور اعلیٰ نظام اخلاق کے محض اس باعث کہ  
 اسکے متبعین کے سامنے کوئی اعلیٰ علیٰ نمونہ نہیں تھا، شرافت و محبت کے لطیف ترین جذبات  
 سے کس طرح معری رہا ہے“

تو تم کو صاف نظر آئیگا کہ وہ صداقت اور واقعیت سے کس قدر معری ہے؟  
 لیکے کے نزدیک صرف وہی لوگ سینٹ اگسٹائن کے اس فقرے کی اہمیت و لطف کا  
 پوری طرح اندازہ کر سکتے ہیں کہ  
 ”مسیحی اخلاق، فلسفہ اخلاق نہیں بلکہ ایک نظام محبت ہے۔“

جن لوگوں نے مسیحی تاسیخ کے اوراق پر اگندہ کو پیش نظر رکھا ہے، لیکن جن لوگوں نے  
 تاسیخ اسلام کی شیرازہ بندی کی ہے، ان لوگوں نے سب سے پہلے یہ لطف اٹھالیا تھا اور  
 وہ اس فقرہ کی اہمیت کا پورا اندازہ کر چکے تھے کہ

”اس رشتہ و محبت کو سب سے زیادہ اسلام نے دراز کیا تھا۔“

## خوش قسمت حافظ

اور

### بد نصیب خیام

نے ایک ہی قسم کی نواسنجیان کیں، لیکن آج حافظ کے ترانوں سے دنیا اس طرح گونج رہی ہے کہ اس نقارہ خانہ میں خیام کی آواز بالکل طوطی کی آواز معلوم ہوتی ہے، رند دن کی بزم عیش میں، صوفیوں کی مجلس حال میں، اور شعراء کی بزم ادب میں غرض ہر جگہ حافظ ہی حافظ کی آواز سنائی دیتی ہے، اور اس غنفلہ انگیر صدا نے خیام کی آواز کو اس قدر دبا دیا ہے کہ اگر مخصوص اہل ذوق نے اسکی رباعیوں کو نہایت بلند آہنگی ساتھ نہ سنایا ہوتا تو آج لوگ اسکو بھول گئے ہوتے،

موجودہ زمانہ میں یورپ نے اسکی رباعیوں کی طرف جو جوش انفتاح ظاہر کیا ہے اس نے اگرچہ ایک حد تک اسکا کفارہ کر دیا ہے، لیکن یورپ کے اس جوش انفتاح خیام کی گناہی اور حافظ کی شہرت کا مسئلہ اور بھی زیادہ پیچیدہ ولاخیل ہو گیا ہے، ایک آواز جس نے یورپ کی منجمد اور برف آلود فضا میں تھلخل پیدا کر دیا ہے، کئی صدی تک اسلامی تمدن کی فضا میں گونجتی رہی اور اس میں ذرہ برابر متوج بہنیں پیدا ہوا لیکن اسکے دوہی صدی کے بعد اسی قسم کی آواز شیراز کی فضا میں گونجی، اور دنیا کے گوشہ گوشہ سے اسکی صداے بازگشت آنے لگی، آخر اس انقلاب کے کیا اسباب ہیں؟ کیا خواجہ حافظ کے زمانہ میں دنیا سے اسلام کی فضا زیادہ رقیق ہو گئی تھی، جس میں اُن کی آواز نے نہایت آسانی کے ساتھ متوج

پیدا کر دیا؟ کیا اس زمانہ کا شیراز موجودہ زمانہ کا یورپ بنگلیا تھا؟ یا یہ کہ خیام اور حافظ کے لب و لہجہ میں اختلاف تھا؟ لیکن ان سوالات کے جواب سے پہلے ہم کو اپیکورین فلاسفی کی حقیقت اور اسکے نتائج پر تفصیل کے ساتھ بحث کر لینی چاہیے، کیونکہ خیام اور حافظ دونوں کی شاعری کا مواد اسی فلسفہ سے ماخوذ ہے، اسلئے ان سوالات کے جواب میں ہم کو اس سے مدد لینی،

اپیکورس نے فلسفیانہ مسائل پر غور و فکر شروع کی تو

قبل اسکے کہ وہ دنیا کی کسی چیز پر غور کرتا، اس نے خود اپنے نفس سے سوال کیا کہ اسکے علم و ادراک کا اصلی ماخذ کیا ہے؟ اس سوال کے بعد اس کو معلوم ہوا کہ علم و ادراک کا اصلی ماخذ شعور ہے، اور وہی مختلف حالات کے لحاظ سے لذت، خوشی اور غم وغیرہ کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے، لیکن یہ تمام جذبات درحقیقت شعور ہی کی مختلف صورتیں ہیں جو مختلف رنگ میں رنگی گئی ہیں، اسلئے اپیکورس کا مذہب حتیٰ مذہب ہے جو صرف محسوسات اور مشاہدات کی بنیاد پر قائم ہے، اور موجودہ فلاسفہ میں لاک وغیرہ کا بھی یہی مذہب ہے،

لیکن انبیاء کے متعلق اسکے جو عقاید ہیں ان کا حال قابل اعتماد طریقے پر ہم کو معلوم نہیں ہے، لہذا ہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان میں سے کسی چیز کا قائل نہ تھا لیکن اسکے ساتھ اس سے یہ بھی منقول نہیں ہے کہ اس نے علانیہ ان چیزوں کا انکار کر دیا تھا بلکہ یہ منقول ہے کہ وہ معبودوں کا ذکر ادب و احترام سے کرتا تھا، لیکن یہ کہا جاتا ہے کہ وہ عوام کے خوش کرنے کے لئے ایسا کرتا تھا، زینوں کے مقلدین نے اس کو ان حکماء میں شمار کیا ہے جو وجود باری کے منکر تھے، بعض فلاسفہ نے اسکے اس

دعویٰ پر تعجب کیا ہے، کہ رُوح انسانی ایک جوہر لطیف ہے اور وہ خالص عالمیہ  
رہتی ہے، اُس نے ایک مدت تک اس بدن میں قیام کیا اور اس سے کام لیا،  
لیکن جب بدن بیکار ہو گیا تو وہ اس سے الگ ہو کر خود بھی گم ہو گئی،  
ایکو رس سے چار اخلاقی اصول مردی ہیں، جنکی بنا پر اسپریتہمت لگائی گئی ہے

کہ وہ شہوت پرست تھا، اور وہ اصول یہ ہیں،

(۱) وہ لذتیں تلاش کرو جنکے بعد رنج نہ ہو،

(۲) اس رنج سے بچو جو کوئی لذت نہ پیدا کرے،

(۳) اس لذت سے احتراز کرو جو تمکو اپنے سے بڑی لذت سے محروم کر دے یا

اسکا انجام ایک ایسا رنج ہو جو اس لذت سے بڑا ہو،

(۴) اس رنج کو برداشت کرو جو اپنے سے بڑے رنج سے نجات دے یا جسکے بعد

بڑی لذت حاصل ہو،

ان اصول کے علاوہ وہ اور چند عظیم الشان اصول کی تعلیم دیتا ہے، ان چاروں

اصول کا مقصد صرف ایک فضیلت ہے یعنی اعتدال، لیکن وہ اس اعتدال کے

ساتھ اور تین اصول کی تعلیم دیتا تھا یعنی ہوشیاری، احتیاط، اور عدل،

ایکو رس نے لذات انسانی کی طرف اس شدت سے اسلئے توجہ مبذول کی کہ

اُس نے انسان کے حالات اسکے جسمانی، روحانی اور اخلاقی مقاصد سے بحث کی تو

معلوم ہوا کہ وہ فطرۃً جسمانی مقاصد کے بوجہ سے دبا ہوا ہے اور وہ فطرۃً اسپرسلط ہو گئی ہیں

اسلئے اُس نے اس بحث کو نظر انداز کرنا مناسب نہیں سمجھا، اور اپنی تعلیم و تلقین کے

ذریعہ سے اس میں اعتدال پیدا کرنا اور اس تسلط کو کم کرنا چاہا، اس بنا پر لذت کو

اس نے ایک جائز چیز قرار دیا اور جب تک اعتدال ملحوظ رہے، اُس نے اپنے مقلدین کو کسی لذت سے محروم کرنا پسند نہیں کیا،

اُس نے مادی خواہشوں کی متعدد قسمیں کیں، ایک وہ جو طبعی اور ضروری ہیں ایک وہ جو انسان پر شدت سے غالب آتی ہیں، مثلاً ہبوک اور پیاس، انکے علاوہ اور خواہشیں بھی ہیں جو اگرچہ طبعی کہی جاسکتی ہیں، لیکن وہ زیادہ تر شہوانی ہیں مثلاً مختلف قسم کی لذیذ غذائیں، مختلف قسم کے حلویے، اور مختلف قسم کے شربت وغیرہ انکے علاوہ اور خواہشیں بھی ہیں جو بالکل مصنوعی ہیں، اور انکو ہمارے تو دے پیدا کیا ہے، مثلاً شراب اور ہینگ وغیرہ، اب ایک کورس کے نزدیک اعتدال کی حقیقت یہ ہے کہ انسان کی طبعی، ضروری اور سخت غالب آتی خواہشیں پوری کی جائیں، شہوانی خواہشوں سے احتراز کیا جائے، اور مصنوعی اور عادی خواہشوں کو ہر ممکن طریقہ سے روکا جائے، پس فلسفہ سے اسکا مقصد صرف یہ تھا کہ خواہش چکومت کیجائے، یہ نہیں کہ جو اس کے سامنے سرطاعت ختم کر دیا جائے،

یہی فلسفہ ہے جسکو عام طور پر لذتیت اور فلسفہ اخلاق کی اصطلاح میں افادیہ کا لقب دیا گیا ہے، لیکن اسکے اخلاقی اثرات کے نمایان کرنے کے لئے سب سے پہلے اسکے حریف ضمیریت کو پیش نظر رکھنا چاہیے، ضمیریت کے اخلاقی اصول کی بنیاد یہ ہے کہ ہم میں فطرۃً ایک ایسی اندرونی بصیرت موجود ہے جو ہمیں یہ سمجھاتی رہتی ہے کہ بعض خصوصیات اخلاق مثلاً فیاضی، عصمت، اور راستبازی وغیرہ دوسرے خصوصیات اخلاق کے مقابل میں بہتر و قابل اعتبار ہیں، اور انکے اضداد لائق ترک ہیں، اسے دوسرے الفاظ میں یوں کہنا

چاہیئے کہ فرض کے احساس کے ساتھ اسکی تعمیل بھی بشر کی سرشت میں داخل ہے، یعنی فرض کی بجا آوری اسکے نتائج کے پسندیدہ و ناپسندیدہ ہونے سے قطعاً مستغنی ہے، اور شاہراہ فرض پر چلنے کے لئے ہمارے باطن و ضمیر کا یہ فتویٰ بالکل کافی ہے کہ وہ فرض ہے، لیکن جو لوگ نادیت کے قائل ہیں وہ کسی اخلاقی حاسہ باطنی کے وجود سے بالکل انکار کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ طبعاً تو ہمارے پاس حسن و قبح کے شناخت کا کوئی ذریعہ ہے، اور نہ ہم کسی حس باطنی کی مدد سے اپنے افعال و جذبات میں اخلاقی حیثیت سے کوئی ترتیب مدراج قائم کر سکتے ہیں بلکہ ہم ان نتائج پر صرف تجربہ و مشاہدہ کی وساطت سے پہنچ سکتے ہیں، یعنی جن افعال کو ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اُن سے نوع انسان کی مجموعی راحت و مسرت میں اضافہ ہوتا ہے یا انسانی درد و کلفت میں اُنسے کمی ہوتی ہے، انہیں ہم افعال حسنہ قرار دیتے ہیں، اور جن افعال کے متعلق ہم یہ پاتے ہیں کہ وہ اسکے برعکس اثر ڈالتے ہیں انہیں افعال مذموم سے تعبیر کرتے ہیں، محقر یہ کہ بڑی سے بڑی تعداد افراد کو بڑی سے بڑی مسرت پسند یہ کلیہ ہر ماہر اخلاقیات کے لئے شیعہ ہدایت ہونا چاہیئے کہ یہی حسن اخلاق کا بہترین مظہر اور کمال تزکیہ نفس کا اعلیٰ ترین معیار ہے،

فلسفہ اخلاق کے یہ دونوں نظریئے مذہبی، شخصی اور تمدنی حیثیت سے بالکل مختلف نتائج پیدا کرتے ہیں، مذہبی حیثیت سے رواقیت، (ضمیریت) نے خود داری و ضبط نفس کا جو نظام قائم کیا تھا اسکی بنیاد غرور پر مبنی، اعتقاد نفس کا مرتبہ رواقیت نے اس درجہ بڑا دیا تھا تو یہ دستغفار کی کوئی گنجائش ہی نہیں باقی رہی تھی، رواقیوں کے نزدیک معصیت کی حقیقت اس سے زائد کچھ نہ تھی کہ وہ ایک طح کا مرض ہے، جسے دور کرنا تو بے شبہ انسان کا

فرض ہے، لیکن اسکے اسباب کی چھان بین کرنا یا اسپر تا سرف کرنا ضرور نہیں ہے،  
 تحقیق طہر دنیا میں ہمیشہ دو طرح کے آدمی پائے جاتے ہیں، ایک وہ جو ثبات، استقلال و  
 ضبط نفس کے بہت بڑے حصہ دار ہوتے ہیں، جو خود داری و نفس کشی کی بڑی سی بڑی  
 آزمائشوں میں پورے اُتر سکتے ہیں، جنکا خمیر، ایشیا، دیانت داری، جرأت و ہمت سے  
 ہوتا ہے، اور جو حق و صداقت کے مقابلہ میں جان و تنک کی پروا نہیں کرتے، دوسرے قسم  
 کے وہ لوگ ہوتے ہیں جو ہر شے میں سہولت ڈھونڈتے ہیں، اور محمل شہید پر قادر نہیں  
 ہوتے، جو اپنی زندگی کو لطف و اسالتش سے بسر کرنا چاہتے ہیں، جو خوشنوی، جناب پروری  
 لمساری و لطف صحبت کو حاصل عمر سمجھتے ہیں، اور جو شدید نفس کشی، ایشیا و جان بازی کے  
 ناقابل ہوتے ہیں، ان میں سے اول الذکر قسم کے لوگ طبعاً و فطرۃً رواقین (خمیر ہیں)  
 ہوتے ہیں اور ثانی الذکر لذتیں،

لیکن اگرچہ ان معاملات میں انسان کی سیرت فطری اسکے عقاید و خیالات کی تشکیل  
 میں مدخل عظیم رکھتی ہے، تاہم اس میں شبہ نہیں کہ افراد کی سیرت بجائے خود اپنی تشکیل کیلئے  
 قومی حالات و خصوصیات پر منحصر ہے، مثلاً یونان و ایشیائے کوچک میں جو لطیف، نفیس  
 و پر تکلف تمدن شائع ہوا، اسکے لحاظ سے وہاں لذتہ کے انداز کے بہت سے افراد آسانی سے  
 پیدا ہو سکتے تھے، لیکن خود اپیکورس کا فلسفہ اخلاق اس قسم کے افراد کو نہیں پیدا کر سکتا تھا،  
 وہ بذات خود نہایت اعلیٰ سیرت اور بیدار چال چلن رکھتا تھا، اور اس نے جو اصول قائم  
 کئے تھے وہ بہت بلند اور جملہ فضائل و محاسن اخلاق پر عادی تھے، اسکے تلامذہ بھی بعض  
 اخلاقی فضائل کے لحاظ سے بہت ممتاز تھے،

البتہ اس کے اصول میں تاویل کی بہت کچھ گنجائش تھی، اسلئے جو لوگ اُن سے عیاشانہ زندگی میں کام لینا چاہتے تھے، اُنکے لئے وہ ایک عمدہ جیلہ بن سکتا تھا، قدیم رومن قوم میں ضبط، نفس کشی، اشیاء، اور بان بازی کا مادہ شدت سے موجود تھا، اور جنگی طوائف الملوکی اور فوجی زندگی نے اُنکے اخلاق میں اور بھی شدت و صلابت پیدا کر دی تھی، اسلئے قدرتی طور پر رومان میں روایت یعنی ضمیریت کا فلسفیانہ اثر اور اخلاقی اقتدار شدت سے قائم رہا۔

شہنشاہی کے زمانہ میں اگرچہ اکثر حالات بدل گئے تھے تاہم روایت کا فلسفیانہ اثر اور اخلاقی اقتدار اب بھی باقی تھا، اسپین شک بہنیں کہ اس دور میں لذتیت کی بھی اشاعت رہی، لیکن اسکو کوئی اخلاقی اہمیت کبھی حاصل نہیں ہوئی، بلکہ یہ ہمیشہ بد اخلاقی تعیش کے لئے لوگوں کے ہاتھ میں بطور ایک جیلہ کے رہی یا زیادہ سے زیادہ اُسے ان افراد نے اختیار کیا جو پہلے ہی سے ضعیف الاخلاق تھے، لیکن جس مسلک کی بنیاد لذت و مسرت پر ہو وہ جنگی طوائف الملوکی کے زمانہ میں شدید اخلاقی کشاکش کا لبتک مقابلہ کر سکتا، اور رومیوں کے جبلی فضائل و در ذائل تو سرے سے اسکی مقبولیت و کامیابی کے مخالف تھے، انکے تمام تخیلات ایک بالکل مختلف سانچہ میں ڈھلے ہوئے تھے، اُنکے لئے یہ ناممکن تھا کہ وہ لذتیت کے اثر میں اگر اشیاء و نفس کشی کے جذبات اپنے اندر رکھ سکیں، اور پھر اپیکورس نے لذت کے جو دقیق اقسام کئے تھے اور انسان کی مسرت حقیقی کی جو تعریف کی تھی، یہ بھی رومیوں کی سمجھ سے باہر تھی وہ اگر حصول لذت کی کوشش کرتے تو بس عیش پرستیوں کی انتہائی ہی صورتوں پر جھک پڑتے، پس اپیکورس کے مذہب کا رومن تارکچ پر جو اثر پڑا اسکی حیثیت بالکل سلبی و منفیانہ رہی، یعنی صرف اس قدر کہ وطن پرستی و قومیت کے جوش و خروش کو دبا کر اور عام اخوت انسانی کے خیال کو چمکا کر اس نے مذہب مروجہ کے انحطاط و زوال میں



اور عجلت پیدا کر دیتی،

ضمیریت اور افادیت کے ان نتائج مختلفہ سے صاف طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ  
ضمیریت میں ہر حیثیت سے جمود، صلابت، شدت، اور غور و خود بینی پائی جاتی ہے اور  
افادیت میں لطافت، نزاکت، لفاست، انکسار، فروتنی، اور عجز و الحاح کا مادہ موجود ہے  
یونان، ایشیائے کوچک اور روم میں یہ دونوں مذہب الگ الگ قائم تھے، اور اسلئے اُنکے  
نتائج بھی مستقل مظاہرین نمایاں ہوتے تھے، لیکن اسلام نے ان دونوں مذاہب کو مخلوط کر دیا  
ضمیریت کا تمام تر دار مدار وجدان، ذوق، اور ایک اخلاقی حاسہ باطنی پر تھا، اور  
اسلام نے بھی نہایت صراحت کے ساتھ اسکے وجود کو تسلیم کیا، چنانچہ حدیث شریف میں آیا ہے  
البر حسن الخلق والاثم ما حاک فی  
نفسک و کراہت ان یطلع علیہ الناس  
یعنی حسن خلق کا نام ہی اور گناہ وہ ہے جو تنہا سے دل میں  
کھینٹے اور تم یہ نہ پسند کرو کہ لوگ اس سے واقف ہوں،  
لیکن دنیا کی اخلاقی تحریک اور اخلاقی روک ٹوک کے لئے علی طور پر صرف یہ وجدان کافی  
ہو نہیں ہو سکتا، نیکی کو صرف نیکی کے لئے اگر کر سکتے ہیں تو صرف حکما، رواقین ہی کر سکتے ہیں،  
عام طور پر لوگ اسی کام کو کرتے ہیں جو اُنکے لئے مفید ہوتا ہے اور اس کام سے بچتے ہیں  
جس میں اُنکو علانیہ اپنا نقصان نظر آتا ہے، اسلئے عملی حیثیت سے ایک مؤسس اخلاق کا  
اصلی فرض یہ ہے کہ وہ صرف دنیا کے حاسہ اخلاقی پر اعتماد نہ کرے بلکہ ہر چیز کے منافع و  
مضار کو بھی نہایت وضاحت کے ساتھ بتا دے، افادیت نے صرف یہی فرض ادا کیا تھا،  
اور اسلام نے بھی یہی فرض ادا کیا، چنانچہ شراب و فحار کے متعلق فرمایا،

فیہما منافع للناس و اثمهما اکبر من نفعهما ان دونوں میں لوگوں کیلئے فوائد بھی ہیں لیکن گناہ ان دونوں میں سے

۱۴۲ مسلم باب تفسیر البر والایثار،

اس موقع پر دو مفید چیزوں کو اسلئے واجب التکرار دیا کہ انکے نقصانات کا پلہ انکے فوائد سے ہماری تھا، لیکن چند مخصوص حالتوں میں ایک بد اخلاقی کے جواز کا اسلئے فتویٰ دیا کہ وہ مفید نتائج پیدا کرتی تھی، چنانچہ جھوٹ کو ہر حال میں ناجائز بتایا، لیکن تین صورتوں میں اسکی اجازت دی،

الحرب ولا صلاح بین الناس وحده  
الرجل امواته وحده لا لملکة و زوجا  
لڑائی میں اور لوگوں کے درمیان مصالحت کرانے کے لئے  
اور میان بیوی میں باہم جو باتیں ہوں ان میں،

فلسفہ اخلاق کے ان دونوں نظریات کے اختلاط کا یہ نتیجہ ہوا کہ جمود، صلابت، شدت، غرور، خود بینی، اور لطافت، نفاست، انکسار، اور عجز و الحاح کی باہمی آمیزش، انکے فعل و انفعال، اور کسر و انکسار سے ایک نہایت معتدل قسم کا تمدن پیدا ہو گیا جو صحابہ کے زمانہ تک اسی معتدل حالت میں قائم رہا، لیکن جون جون زمانہ گذرتا گیا مذہبی بندشیں کمزور ہوتی گئیں، اور اسلامی تمدن میں روز بروز لطافت آتی گئی، یہاں تک کہ خلفائے بنو امیہ کی بزم عیش سے فحش و سرود کی آوازیں آنے لگیں، اور اخطل نے اس نشہ آور شاعری میں نام پیدا کیا، جسکی تکبیل خیام اور حافظ نے کی، خلفائے عباسیہ کے دور میں اسلام کی تمدنی لطافت کے ساتھ ایرانی نفاست بھی شامل ہو گئی، اور ان دونوں کے امتزاج نے ابونواس کو پیدا کیا، جس نے اخطل کی شراب کو اور بھی دو آتشہ کر دیا، تمدنی رنگینوں کے ساتھ فلسفیانہ خیالات کی عام اشاعت نے پانچویں صدی میں ابو العلاء معری جیسا آزاد خیال شاعر پیدا کیا جس نے نہایت کلمے ہوئے الفاظ میں عذاب و ثواب، نبوت، رسالت، حشر و نشر غرض تمام نظام شریعت کا انکار کیا، ابو العلاء معری نے <sup>۱۹</sup>مسئلہ ۱۹ میں

۱۹ مسلّم باب تحریم الکذب و بیان ما یباح منه،

وفات پائی، اور اسی کے بعد خیام کا غلغلہ بلند ہوا، اور اس نے اخطل، ابو لواس اور معری کے کہنڈر پر ایک نئی عمارت تعمیر کی، اخطل اور ابو لواس صرف شراب کی تعریف میں تھیں کہتے تھے، معری صاف صاف ملحدانہ بولی بولتا تھا، لیکن خیام نے ان خیالات میں ایک خاص ترتیب پیدا کر کے انکو ایک مستقل فلسفہ کے قالب میں ڈھال دیا، اور اس کے زمانہ میں دنیا سے اسلام کی جو حالت تھی، اسکا قدرتی نتیجہ بھی یہی تھا، خیام کے زمانہ میں دین و دنیا دو گروہ کے ہاتھ میں منقسم ہو گئے تھے، علماء و فقہاء کا گروہ جو خشک مزاجی، رہبانیت، جہود و عجب غرور و خود بینی میں ضمیر بین اور رواقیین سے مشابہت رکھتا تھا، دین کا مالک تھا، اور ارباب سیاست یا اصحاب حکومت جنہیں منہ از ترخانہ جنگی، طوائف الملوکی، اور فوجی ہنگامہ آرائی نے سخت قسادت، سنگدلی، بیرحمی اور جاہ پرستی کا مادہ پیدا کر دیا تھا، دنیا کے مالک بن گئے تھے، اور ان دونوں گروہ کی اخلاقی حالت نے تمدن کی لطافت اور اخلاق کی پچک کو بالکل فنا کر دیا تھا، دنیا میں جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے، دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں، ایک وہ جو ثبات، ہنغفال اور ضبط نفس کے بہت بڑے حصہ دار ہوتے ہیں، دوسرے وہ جو ہر شے میں سہولت ڈھونڈتے ہیں، اور تحمل شداید پر قادر نہیں ہوتے، پہلی قسم کے لوگ طبعاً رواقیین ہوتے ہیں، اور دوسری قسم کے لوگ لذتین، خیام فطرۃً اسی دوسرے قسم کے لوگوں میں تھا، نظام الملک کے دربار میں اگرچہ اسکو بڑے سے بڑا سیاسی منصب مل سکتا تھا، لیکن اس نے اس درد سر کو گوارا نہیں کیا، اور معمولی وجہ معاش پر قناعت کر کے عورت گزینی اختیار کر لی، اس بنا پر نہ تو وہ زاہدون کی طرح ریاضت شاقہ کر سکتا تھا، نہ سپاہیوں کی طرح میدان جنگ کی مصیبتیں جہیل سکتا تھا، لیکن اسکی نگاہ کے سامنے یہی دو گروہ تھے، اور اسکو اپنے طبعی فضاہٹ کی بنا پر نظر آتا تھا کہ ان دونوں گروہ کی بے اعتدالیوں نے دین و دنیا دونوں کے مطلع کو

غبار آلود کر دیا ہے، اسلئے اس نے ان دونوں کے جذبات و خیالات میں اعتدال پیدا کرنا چاہا، ایکوئرس نے طبعی اور ضروری خواہشوں کے پورا کرینکی اجازت دی تھی، غیام نے بھی اس اعتدال کو سراپا، مسرت و راحت قرار دیا،

درد ہر ہر آنکھ تیم نالے دارد      دز بھشت آستانے دارد  
نے غام کس بود نہ مخدوم کسے      گو شاد بزمی کہ خوش زمانے دارد

لیکن غیام کو نظر آتا تھا کہ یہ مسرت دنیا سے کا فور ہو گئی ہے اور افق عالم پر شہوانی خواہشیں اس قدر محیط ہو گئی ہیں کہ قناعت، فضائل انسانی کی فہرست سے خارج کر دی گئی ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ

ابن جمیع اکابر کہ مناصب دارند      از غصہ و غم ز جان خود بیزارند  
دائکس کہ اسیر صحن ایشاق      این طرفہ کہ آدمیش مے شمارند

اسلئے غیام نے بالکل زائدانہ، لہجہ میں بتایا کہ دنیا جس دنیا پر جان دے رہی ہے وہ خود ایک چلتی پھرتی چھاؤں ہے، جن لوگوں نے دنیا کو اپنی نالغہ گاہ بنایا تھا، اب وہ خود دوسروں کی نالکشی کا سامان بنے ہوئے ہیں،

خاکے کہ بزیر پاس ہر حواری نے است      زلفِ صنفی و عارض جانانے است  
بہشت کہ برگنگرہ ابوالے است      انگشت و زیرے دیر سلطانے است

لیکن اسکے ساتھ غیام کو یہ بھی نظر آیا کہ جن لوگوں نے اس حقیقت کو سمجھ کر اپنا دامن سمیٹ لیا ہے ان میں بھی جمود تو ہے، لیکن سکون نہیں، ان میں بھی قناعت تو ہے لیکن بے فکری نہیں، ان میں بھی ذوق تو ہے، لیکن اس ذوق میں لطافت نہیں، اسلئے غیام نے اس گروہ سے بھی علحدگی اختیار کی، اور عفاف صاف کہہ دیا کہ

ایک شیشہ شراب ولب یار و کشت  
 این جلمہ مرانقد و تر انسبہ بہشت  
 قومی بہشت و دوزخ اندر گردند  
 کہ رفت بد و نرغ و کہ آمد ز بہشت  
 زان پیش کہ بر سرست بشخون آرند  
 فرماے کہ تا بادہ گلگون آرند  
 تو ز نہ اسے غافل نادان کہ ترا  
 در پوتہ ہنند و باز بیرون آرند  
 این عقل کہ در رہ سعادۃ پوید  
 روزے صد بار خود ترمای گوید  
 در یاب تو این یکدم فرصت کہ نہ  
 آن ترہ کہ بدروی و آخر روید

لیکن اس موقع پر اسکو نظر آیا کہ اسکی یہ تعلیم مذہب اور فلسفہ دونوں کے مخالف ہے  
 مذہب تو صاف صاف اسکی مخالفت کرتا ہے، اور اپیکورس بھی شراب پینے کی اجازت  
 نہیں دیتا، اسلئے اس نے جیسا کہ ایک رفیق الطبع اپیکورین کو ہونا چاہیے اس سے پہلے  
 ان عاجزانہ الفاظ میں خدا کے سامنے الحاح و زاری کی،

بر سینہ غم پذیر من رحمت کن  
 بر جان و دل اسیر من رحمت کن  
 بر پائے خرابات روم بنائے  
 بر دست پہا کہ گیر من رحمت کن  
 من بندہ عاصم رہا تو کجا است  
 تباریک و لم توصفائے تو کجا است  
 مارا تو بہشت اگر بطاعت بخشی  
 آن بیع بود و لطف و عطا تو کجا است

اسکے بعد اس گناہ کا اصلی سبب تلاش کیا تو معلوم ہوا کہ وہ مجبور تھا اسلئے نہایت ادب کے  
 ساتھ اُس نے اس گناہ کا ذمہ وار خود خدا کو قرار دیا،

نفقہ است کہ بر وجود مار سینہ  
 صد بوالعجب ز ما برا نیگینہ  
 من زان بر ایزن نمی توانم بودن  
 کہ ز پوتہ چنین مرا فرو ریختہ

فلسفیانہ حیثیت سے اگرچہ اس نے اپیکورس کے اصول اعتدال کی خلاف ورزی کی

لیکن جہاں تک ممکن تھا، اس نے اس بے اعتدالی میں بھی اعتدال کو ملحوظ رکھا اور شراب نوشی کے لئے متعدد شرطیں مقرر کیں،

مے گرچہ حرام ہے دے تاکہ خورو۔      انگاہ پر مقدار؟ دو گرہا کہ خورو؟

ہر گاہ کہ این چہاں شرط آید جمع      پس مے خورو مردم و انا کہ خورو؟

پھر صاف صاف ان شرائط کی تشریح کی،

گر بادہ خوری تو باخرو دندان خور      یا باصنہ سادہ رخنہ خندان خور

بسیار محذور، دروکن فاش ساز      اندک خور و گدگ خور و پنهان خور

اسکے نزدیک شراب پینے کا جو مقصد تھا اور یہ مقصد جس طریقہ سے حاصل ہو سکتا تھا اسکو اس طرح بیان کیا،

چون بشارم طب من نہان است      درست شوم و درخروم نقصان است

حالے است میان مستی و بشاری      من بندہ آنکہ زندگانی آن است

چون بادہ خوری ز عقل بیگانہ مشو      مدہوش مباش جہل باخانہ مشو

خواہی کہ مے لعل حلاوت باشد      آزار کے جوے دیوانہ مشو

اب اگر ان خیالات کو ایکویرین فلسفہ کے قالب میں ڈالنا چاہیں تو انکی ترتیب یہ ہوگی،

تقاعدت اور آزادہ روی میں جو مسرت ہے اُس میں شخصی اور اجتماعی رنج و غم کی آمیزش

ہنیں ہے، اسلئے اگر

خواہی کہ ترا تر بیت اسرار رسد      پسند کہ کس راز تو آزار رسد

از مرگ میندیش و غم رزق محذور      کیمن ہر دو بوقت خویش ناچار رسد

اور ایکویرس بھی یہی کہتا ہے کہ ”وہ لذتیں تلاش کر دینے کے بعد رنج ہوں۔“

شراب اگرچہ اپیکورس کے نزدیک جائز نہیں، لیکن اگر اعتدال کے ساتھ پی جاوے تو اس سے کسی قسم کا عقلی، اجتماعی اور اخلاقی نقصان نہیں پہنچ سکتا، اسلئے وہ بھی اسی اصول کے تحت میں داخل ہے، اسکے علاوہ جتنی چیزیں ہیں، سب میں منفعت کے ساتھ مضرت، اور صرت کے ساتھ بچ دغم کی آمیزش ہے، زہد و تقشف، مجاہدہ و مراقبہ، ریاضت و عبادت میں یا تو سرے سے کوئی فائدہ ہی نہیں ہے، کیونکہ

تو زرنہ اے غافل نادان کہ ترا در لوتہ ہند و باز بیرون آرند

اسلئے حسب ارشاد اپیکورس ”اس رنج سے بچنا چاہیئے جو کوئی لذت نہ پیدا کرے، اور اگر فائدہ ہے تو وہ ان فوائد کے مقابل میں پہنچ ہے جو ہکو دنیا میں حاصل ہو سکتے ہیں، ایک شیشہ شراب دلب یا رولب کشت

این جلیہم الرفق و ترانیہ بہشت

اسلئے اپیکورس کی ہدایت کے مطابق ”اس لذت سے احتراز کرو جو تم کو اپنے سے بڑی لذت سے محروم کر دے۔“

اپیکورس کے اخلاقی دستور العمل کی آخری دفعہ یہ ہے کہ، ”اس رنج کو برداشت کرو جو اپنے سے بڑے رنج سے نجات دے یا جسکے بعد بڑی لذت حاصل ہو۔“

لیکن خیام نے اس چند روزہ زندگی کے بسر کر نیکے لئے جو روش اختیار کی ہے اسکے لئے کسی رنج کے برداشت کر نیکی ضرورت نہیں اسلئے وہ ہمیشہ خوش رہنے کی تعلیم دیتا ہے،

روزیکہ گذشتہ است از و یاد مکن فردا کہ نیامدہ است فریاد مکن

برنامہ و گذشتہ بنیاد مکن حالے خوش باش و عمر برباد مکن

لیکن خیام نے جس زمانہ میں اس فلسفہ کی تعلیم دی اسکی عدم مقبولیت کے مختلف اسباب جمع ہو گئے تھے اس نے جو زمانہ پایا،

(۱) وہ فوجی ہنگامہ آرائیوں کا زمانہ تھا، قوم میں اگرچہ عیش پسندی آگئی تھی، لیکن باہن ہمہ جذبات و خیالات میں وہ رقت و لطافت نہیں پیدا ہوئی تھی جو اس لطیف فلسفہ کا خیر مقدم کرتی، ترک تمام دنیا پر چھائے ہوئے تھے، اور وہ فطرۃ قدیم رومن قوم سے مشابہت کہتے تھے شاعری کی تمام انواع میں صرف رزمیہ شاعری کا عام طور پر چرچا ہوتا، قدما نے غزل کا جو خاکہ تیار کیا تھا اس میں اس قدر رنگینی نہیں کی تھی جو خیام کے خیالات کو رنگین و تر بنا دیتا،

(۲) ابوالعلا معری نے جن خیالات کی بنا پر محمد و بد دین کا خطاب پایا تھا، خیام نے اگرچہ بہت کچھ انکی اصلاح کر دی تھی، تاہم وہ قیامت کے انکار میں اسکا ہمریان تھا، اور اہل ظاہر کی طرح اہل تصوف نے بھی اس مسئلہ میں شدت کے ساتھ اسکی مخالفت کی، اُس نے دنیوی عیش کو نقد اور اخروی لذتوں کو اُدھار قرار دیا تھا،

ایک شیشہ شراب و لب یار و لب کشت      ابن جملہ مرا نقد و تر انسہ بہشت

خواجہ فرید الدین عطار نے اسکی تردید میں کہا،

گر نعم در بہشت نسیہ نتوانی رسیدن تو      ولے خود را ازین دوزخ کہ نقد تست برانی

اس نے شاعرانہ انداز میں کہا تھا کہ انسان کچھ گماںس پات نہیں ہے کہ ایک مرتبہ اگر اسکو

کھاٹ ڈالا جائے تو پھر اس میں نشو و نما ہو،

دریاب تو این یکدمہ فرصت کہ نہ      آن ترہ کہ بدردی و آخر روید

مولانا روم نے بھی شاعرانہ انداز میں اسکا جواب لکھا،

کدام دائہ فرد رفت در زمین کہ نہ رست      چرا بداند انسانست این گمان باشد

(۳) اسلام کے گمراہ فرقوں میں باطنیہ، مزدکیہ اور خرمیہ عقاید و خیالات میں خیام کے ساتھ اشتراک رکھتے ہیں، یعنی فرقہ باطنیہ شریعت کو ایک معما قرار دیتا ہے، جسکے دو رخ ہیں



ظاہر و باطن، اور مرد و یکہ اور خرمیہ جائز و ناجائز کا فرق اُنہا دیتے ہیں اور ہر لذت کو اپنے لئے مباح قرار دیتے ہیں، خیام کے زمانہ میں ان فرقوں کی نشوونما کا شباب تھا، اور وہ مذہبی اور پولیٹیکل دونوں حیثیتوں سے خطرناک خیال کئے جاتے تھے، خیام جو خیالات ظاہر کرتا تھا اُن کا مقصد اگرچہ ان فرقوں سے مختلف تھا، تاہم وہ ان خیالات کی ترجمانی کر کے مقبول عام نہیں ہو سکتا تھا،

لیکن خیام کے بعد خواجہ حافظ نے اس فلسفہ کا اعادہ کیا تو انکی خوش قسمتی سے دفعۃً حالات بدل گئے،

(۱) تاتاری حملہ نے مسلمانوں کے فوجی جذبات میں عام تنزل پیدا کر دیا اسلئے جذبات میں عام طور پر رقت و لطافت آگئی،

(۲) تمدنی حیثیت سے شیراز بالکل موجودہ زمانہ کا فرانس بنگیا اور عیش پسندی کی یہ حالت ہو گئی کہ جب شاہ ابوسعحاق کے عہد میں شاہ مظفر نے شیراز پر چڑھائی کی تو ابوسعحاق نے بالاخانے سے اسکے لشکر کو دیکھ کر کہا کہ ”عجیب الحق ہے اس بہار میں یوں اوقات خراب کرتا ہے“ نیز شعر پڑھ کر نیچے اتر آیا،

بیاتایک امشب تماشا کینم چو فردا شود فکر فردا کینم

خواجہ حافظ اسی شاہ ابوسعحاق کے زمانہ میں تھے، اسلئے اُن سے زیادہ کون اس شعر کی داد دے سکتا تھا،

(۳) جن لہذاہ خیالات کی بنا پر ابو العلاء اور خیام بدنام تھے، خواجہ صاحب نے اُن سے بہت کم تعرض کیا، خیام بار بار حضرو نشر کا انکار کرتا ہے، اور صاف صاف کہتا ہے،

لے شعر العجم تذکرہ خواجہ حافظ،

توزرنہ اسے غافل نادان کہ ترا      در لوتہ ہند و باز بیرون آرند  
 دریاب تو این یکدم فرصت کہ نہ      آن ترہ کہ بدر دی و آخر وید  
 لیکن خواجہ صاحب نے صراحتہ قیامت کا کہیں انکار نہیں کیا، ایک بار انکی زبان سے شعر نکل گیا،  
 گر سملانی این است کہ واعظ دارد      داسے اگر دل پس امر و زب و فدا سے  
 اسپر شاہ شجاع نے انکو ستانا چاہا، لیکن مولانا زین الدین ابوبکر تائیابادی کے منورہ سے  
 انھوں نے اسکو بھی ایک عیسائی کا مقولہ بنا دیا،

دی و دہیم چہ خوش آمد کہ سحر کی گفست      بادف و بر لوط نے مہچہ تر سائے  
 اس بنا پر باوجود زندگی و سمرتی کے کسی نے انکو ملحد یا بد دین نہیں قرار دیا،

(۴) رزمیہ شاعری بالکل فنا ہو چکی تھی اور صوفیانہ شاعری کو قبول عام حاصل ہو رہا تھا خواجہ  
 صاحب کا کلام صوفیانہ خیالات سے لبریز تھا، اسلئے صوفیوں کے حلقہ میں خصوصیت کے  
 ساتھ مقبول ہوا، آخر زمانہ میں خیام کو بھی اس مقدس حلقہ میں رسائی حاصل ہوئی، چنانچہ  
 علامہ جمال الدین قطفی اخبار الحکماء میں لکھتے ہیں

وقف متاخر و الصوفیۃ علی شی من ظاہر شعرہ      متاخرین صوفیہ اسکے اشعار کی چہ نظا ہری باتوں سے  
 فنقلو ہا الی طریقہ تم و متاخر و ابانی جالہ تم      واقف ہو سے اور انکو اپنے طریقہ کی طرف نقل کر لیا اور  
 و خطواتہم لہ      اپنی مجلسوں اور اپنی خلوتوں میں انکو پڑھا،

(۵) خواجہ صاحب نے اپنے خیالات کے اظہار کے لئے غزل کو انتخاب کیا تھا جسکی  
 بحردن میں موسیقیت پائی جاتی ہے، بالخصوص خواجہ صاحب کا کلام تو سراپا موسیقی ہے مثلاً  
 چور دست است رد و خوشن من مطربہ کد خوش      کہ دست افشان غزل غزلیم دیا کو بان سزنا ایم

لے شعر العجم تذکرہ حافظ لے اخبار الحکماء صفحہ ۱۶۲ :

یکی از کھڑی لاف و کلمات می باند  
 بیابین داور و پادشاه پیش داور اندازیم  
 اگر غم لشکر انگیزد که خون عاشقان ریزد  
 من دستانی بهم سازیم و بنیادش بنوازیم  
 شراب ارغوانی را گلاب اندر قیج ریزم  
 نسیم عطردان را شکر در محجر اندازیم  
 اسلئے وہ قوالوں کی زبان پر نہایت آسانی سے چڑھ گیا، اور خیام کی رباعیوں کو یہ بات  
 نصیب نہیں ہوئی،

(۶) اب مزدکینہ اور خرمیہ وغیرہ کا وجود باقی نہیں رہا تھا، اسلئے حافظ کی آواز مذہبی  
 بدگمانانہ نہیں پیدا کر سکتی تھی،

(۷) خواجہ صاحب کے کلام میں تنوع پایا جاتا ہے جس سے انسان کی طبیعت نہیں  
 گھبراتی، اور خیام بار بار ایک ہی خیال کو دہراتا ہے جس سے جی اکتا جاتا ہے، ان اسباب کا  
 یہ نتیجہ ہوا کہ خواجہ صاحب کا کلام گھر گھر پھیل گیا، اور اس نے ہر جگہ ایک عام جوش نشاط  
 پیدا کر دیا، چنانچہ خود خواجہ صاحب فرماتے ہیں،

بہ شعر حافظ شیرازی گویند می رقصند  
 بیہوشان کشمیری و نرکان سمرقندی  
 لیکن خیام کی مقبولیت مخصوص اہل ذوق کے حلقہ تک محدود رہی، اور اس دائرہ سے  
 باہر اس کا کوئی اثر قائم نہ ہو سکا۔

عبد السلام ندوی

## سیرِ فلک

از یوسف الزمان صاحب آسیونی

آسمان کا منظر اندھیری رات میں بیٹھا رچھوٹے چھوٹے تاروں سے جگمگاتا ہوا شاعر دن اور فطرت کے عاشقوں کے واسطے ایک دل بہلانے والا منظر ہے، کوئی تاروں کی جہلملاتی روشنی کو بہت خفہ کی بیداری سے تعبیر کرتا ہے، کوئی کسی تاریک رات کی لامتناہی دلری سے تنگ آکر فراق یا زمین اختر شمار کی پر مجبور ہو جاتا ہے، کسی شاعر کی حسرت ناک امید اس شعر میں فراق کی راتوں کے مشاغل پر کافی روشنی ڈالتی ہے،

انی اسری واطنات ستری وضح النہاس وعلی النجم

روشن چاند اور نکہری سفید چاندنی بھی کیسے دلکش مناظر قدرت ہیں، جیسے اندھیری رات کو عموماً فراق کی تکلیف اور خیال یا ر کے ساتھ نسبت دی جاتی ہے، ویسے ہی چاندنی رات شب وصل کے لوازمات اپنے ساتھ لاتی ہے، اور اسی سبب سے جاڑوں کی شفاف چٹکی چاندنی کو نوجوان بیوہ سے مشابہ کہا جاتا ہے، شعراء اور عشاق نے چاند کو وہ درجہ دے رکھا ہے کہ جیسے خود خبروں کو رشک کرنا چاہیے وہ خبروں کو ”مہ جبین“ ”مہ لقا“ ”ماہ رخ“ کے نام دیتے ہیں اور شاید اس خیال کی بنیاد پر انے اعتقاد سے کوئی تعلق رکھتی ہو، جب چاند ہی کو بہن بلکہ دوسرے سیاروں اور ستاروں کو بھی دیویان کہا جاتا تھا، جو خوبصورتی اور حسن میں لاثانی سمجھی جاتی بہنیں، ”نہرہ جبین“ اور ”نثر یا شملیل“ اسکی خاص مثالیں ہیں، پھر ذرۃ کے نکلنے والے سورج کو بھی معشوق سے مشابہ کر نیکو چنا گیا، صاحب فسانہ عجائب کی ملکہ ننگل

عقل و فزائگی بین مردوں کے کان کا تھی تھی، اور جان عالم کی دوسری ملکہ ماہ طلعت سے جو نیکی، بولے پن اور شرم و حیا کی تصویر تھی کہیں زیادہ سمجھدار تھی، سرور نے کمال فہانت سے ہوشیار، چالاک، اور شوخ تند خو ملکہ کو ہر نگار کا نام دیا، اور نیک، سنجیدہ مزاج بولی بہالی، زور رنج ملکہ کو ماہ طلعت، کہا، اور حقیقت یہ ہے کہ سورج اور چاند میں کچھ ایسے ہی اوصاف پائے جاتے ہیں، ہمارے ہر عالم تاب کو مے و مینا نہ سے خاص نسبت دیجاتی ہے غالب کہتے ہیں،

مینا نہ نہ منظر ہے کہ ہر صبح جہاں شمع  
دیوار پہ خورشید کا سستی سے سراوے  
آفرینش آدم کے ایک عرصہ بعد تک محض اس قسم کے توہمات سے فضا بے بسیط کی  
سمتہ کو حل کیا جاتا رہا، اور یہ توہمات کچھ اس طرح سیکڑوں صدیوں سے ہمارے اجداد کی  
فطرت میں داخل ہو گئے تھے کہ اکثر اصحاب محض اس سبب سے کہ جدید اکتشافات چونکہ  
روایات سابقہ کے خلاف ہیں، انکو ناقابل قبول تصور کرتے ہیں، حالانکہ ہیئت کے متعلق  
جدید معلومات کا دار و مدار ریاضی، طبیعیات، اور علم کیمیا (کیمسٹری) کے ان علوم متعارفہ پر  
مبنی ہے، جن سے کوئی انکار نہیں کر سکتا،

انسان نے اپنی عقل اور اپنے تجربہ کے موافق ہر دور اور ہر زمانہ میں فضاے آسمانی  
کی چہان بین کی ہے، اسیریا، چین، مصر، ہندوستان، یونان، اور قزاقانہ یسب قدیم  
ترین تہذیبوں کے مرکز رہے ہیں اور کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ علم نجوم ہمیشہ زمانہ قدیم میں  
تہذیب و تمدن کے ساتھ رہا ہے، ان تمام قدیم اقوام نے اس راز کو افشا کر نیکی کی کوشش کی ہے  
ستاروں کو دیوتا مانا گیا، چاند کی پرستش کی گئی، سورج کے سامنے سر جھکا گیا، اپنی محدود معلومات  
کے موافق زمین کو مرکز سمجھ کر تمام کائنات کو اسکا ماتحت بیان کیا گیا، آسمان کو ٹھوس

قرار دیا، پھر پٹیلیموس نے ان تمام مناظر کو علمی سانچہ میں ڈالا، لیکن یہ اور اس سے پہلے کے تمام نظریات و افہامات سے دور تھے، اصل ہیئت جدید کی ابتدا حق و صداقت کے تہذیب کا پرنکیس اور گیلیلو کے ساتھ ہوتی ہے، انھوں نے نظام عالم میں ایک انقلاب عظیم پیدا کر دیا، زمین کو ایک ماتحت تیارہ بتلایا، سورج کو نظام شمسی کا مرکز قرار دیا، چاند کو خوبصورت دیوی کے بجائے زمین کا لڑکا کہا، دور میں سے تمام فضاے بسیط چنان ڈالی، اور وہ سب ثابت کر دیا جسکو تسلیم کر لینا اسوقت لوگ تیار نہ تھے،

لیکن ہیئت جدید کی نئی ترکیب اسوقت ایک حد تک مکمل ہوئی جب نیوٹن نے صحیفہ ہیئت میں نئے باب کا ہینن بلکہ ایک مستقل جلد کا اضافہ کیا، قانون کشش نے بہت سی ان باتوں کو ثابت کر دیا جسکو گیلیلو اور کا پرنکیس نہ ثابت کر سکے تھے، یہ اس زمانہ کا ذکر ہے جب قرون مظلمہ (تیرہویں، چودھویں اور پندرہویں صدی عیسوی) کی کثیف تاریکی سے نکل کر روز روشن کے مناظر اور ان چیزوں کی حقیقت جان کر جو شب تاریکی ظلمت میں کچھ کی کچھ نظر آتی تھی، یورپ اپنی لاعلمی کے باعث کی ہوئی حرکتوں پر اظہار ماسف کر رہا تھا، اہل یورپ کی بیداری سے عقل انسانی کی بلند پروازی نے ہیئت جدید کو ایک نئے ڈھنگ پر پیش کیا، کا پرنکیس کے نظریات، گیلیلو کی دور بین کی ایجاد، نیوٹن کے قانون کشش، انیسویں صدی میں فولو گرافنی کا ہیئت میں استعمال، اور سب آخر میں اسپیکٹر اسکوپ سے روشنی کے اجزاء کی تقسیم، ان سب باتوں نے مل کر اب ایک ایسے نظام کائنات کا نقشہ ہمارے سامنے پیش کیا ہے جسکا ذکر تعجب خیز ہیئت اور حیرت انگیز عظمت ہمارے دلوں میں پیدا کرتا ہے،

لے ہم اپنے ایک آئینہ مصنون میں دکھائی گئے اس خیال میں کہ چاند اہل میں زمین کا ایک حصہ نہایت کچھ لہر تو لگتا ہے

قبل اسکے کہ اس پر ہیبت منظر کا کچھ ذکر کیا جائے، ہیبت کی ایک ضروری اصطلاح کو واضح کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے، ”روشنی کے سکند“ ”روشنی کے منٹ“ ”روشنی کا سال“ ہیبت کی ایک اصطلاح ہے جس سے فاصلہ ظاہر کیا جاتا ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ فاصلہ کو وقت کی صورت میں تبدیل کر کے قابل قیاس بنایا جاتا ہے،

اندھیری رات میں اگر آتش بازی چوٹی ہو تو گولوں کی آواز روشنی نظر آنے کے بعد سنائی دیتی ہے، اسکا سبب یہ ہے کہ روشنی کی رفتار آواز کی رفتار سے کہیں زیادہ ہے، آواز کی رفتار محض دو فرلانگ فی سکند ہے، اور روشنی کی رفتار ۱۸۶۰۰۰ میل بلکہ یکسکند زیادہ) فی سکند ہے، ایک سال میں ۳۶ کروڑ ۵ لاکھ ۳۶ ہزار سکند ہوتے ہیں، اسلئے وہ روشنی جو ایک سال میں ہم تک پہنچی ہم سے تین کروڑ ۸۶۰۰۰ میل یعنی ۵۵ کروڑ ۸۰۰ میل کے فاصلہ سے آتی ہے، اور اسلئے بغرض آسانی اس فاصلہ کو ایک روشنی کے سال سے تعبیر کریں گے، آفتاب کی روشنی زمین تک آٹھ منٹ میں آتی ہے اور دونوں کے درمیان ۹ کروڑ میل کا فاصلہ ہے، اس فاصلہ کو قیاس میں آنے کے قابل بنانے کی غرض سے کہیں گے کہ آفتاب ہم سے آٹھ ”روشنی کے منٹوں“ کے فاصلہ پر ہے،

آفتاب ہمارے نظام شمسی کا مرکز ہے، عطارد، زہرہ، زمین، مریخ، مشتری، زحل نو دریافت شدہ یورینس اور نیپچون، مع اپنے رفتار کے آفتاب کے مستقل خلیہ شینوں میں ہیں، لیکن ہر سال دو تین ہمان فضا سے بسیط کے دور از قیاس حصص سے سفر کر کے ہمارے نظام میں داخل ہوتے اور خسر و انجم کے سامنے زانوے ادب تہ کرتے ہیں، ان ہمانوں کو ہم و مدار ستارے کہتے ہیں، ہر سال پر شاید آپ کو تعجب ہو اہو، ہر سال یہ آتے تو ضرور ہیں لیکن بلا دور بین کے نظر نہیں آتے، البتہ چند مشہور و مدار ستارے جو ہمارے مستقل ہمانوں

میں بین اور ایک خاص مدت کے بعد نمودار ہوتے ہیں، انکو ہر شخص چشم عریان سے (بلا دور بین کی مدد کے) دیکھ سکتا ہے، پہلی صاحب کا مدار ستارہ جو ہر ۷۷ یا ۷۸ سال کے بعد نمودار ہوتا ہے، خاص طور سے قابل ذکر ہے، ستارہ مین بھی ستارہ نمودار ہوا تھا،

ہمارا نظام شمسی نظامون اور ستاروں کے جہرٹ سے دور و راز فاصلہ پر ہوا اندازہ کیا گیا ہے کہ اگر نظام شمسی کو ایک میل لمبا چوڑا خلستان تصور کر لیں تو اس خلا کو جہین کوئی دوسرا ستارہ اتناک نظر نہیں آیا، اور جو ہمارے نظام (شمسی) کے گردا گرد پھیلا ہے، نسبتاً صحراے افریقہ کا دو گنا ماننا پڑیگا، ایک ”روشنی کا سال“ ۷۷ کرب میل (۱۶ بلین) کے برابر ہے، اور ہمارے آفتاب سے نزدیک ترین ستارہ (Alpha Centauri) تین ”روشنی کے سالوں“ یعنی تقریباً ایک نیل ۷۷ کرب (۱۶ بلین) میل کے فاصلہ پر ہے، اگر ان ستاروں کی روشنی آج کسی سبب سے غائب ہو جائے تو تین سال کے بعد ہمیں اسکی اطلاع ہوگی،

گر میوں کی اندھیری رات میں جب بچہ کسی قدر سمجھدار ہوتا ہے تو ان چمکتے جہلا تے ستاروں کو شمار کر نیکی کوشش کرتا ہے، لیکن اسکی کوشش بیکار ہوتی ہے، وہ مان سے جو اسکے نزدیک ہر سوال کا تسلی بخش جواب دینے پر قدرت رکھتی ہے انکی تعداد کی بابت سوال کرتا ہے، اور مان ہون مان کر کے اس معاملہ کو ”عالمانہ“ سکوت سے ٹال دیتی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ ہیئت قدیم تو صحت اعداد کے معاملہ میں حقیقت سے بہت دور فٹی سوائے اسکے کہ لاتعداد، لائحہ، بے شمار سے انکی تعداد کا پیر ہیبت اندازہ کیا جائے، تمام قدیم زبانوں کے لٹریچر میں ہمیشہ ستاروں کی تعداد کو ناقابل شمار ظاہر کیا گیا ہے، اور بہت سی اسنہ جدیدہ نے بھی قدما کی تائید میں یہی طرز عمل اختیار کیا ہے، چنانچہ اردو زبان





ظاہر کرنا فضول ہے، محض یہ یاد دلانا کافی ہے کہ ایک روشنی کے سال ۵۰۰۰۰ سال ہیں ۵۰۰۰۰ کرب  
۱۰۰۰۰ بلین میل ہوتے ہیں

ستاروں کی زندگی کے مختلف دور ہیں، نیلگون روشنی کے ستارے اپنی زندگی کے  
ابتدائی دور سے گزر رہے ہیں، زردی مائل روشنی کے ستارے عالم شباب کے مزے  
اٹھا رہے ہیں، اور سرخی مایل ستاروں پر پیری کے آثار ہو چکے ہیں، اور وہ ایسے دور سے  
گزر رہے ہیں جس کے بعد انکی ساری چمک دمک تبدیل ہو جائیگی، اور وہ ہماری دنیا  
سے پھر نظر نہ آئیں گے، لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ انسان کی یاد میں کوئی ستارہ ان  
تینوں دوروں میں سے گزر گیا ہو، کروڑوں برس میں ایک دور سے دوسرے دور میں  
ستارے پہنچتے ہیں،

ہمارا آفتاب جو اپنی زندگی کے آخری دور سے گزر رہا ہے، زمانہ قدیم میں تمام  
ستاروں کی ملکیت کا سرگرم تصور کیا جاتا تھا، اور چونکہ دوسرے ستارے آفتاب کے  
روشن ہین نظر آتے تھے اسلئے آفتاب کے ماتحت سمجھے جاتے تھے، غالب نے اسی  
خیال کو یوں نظم کیا ہے،

خسرو انجم کے آیا صرف میں      شب کو تھا گنجینہ گوہر کہلا

لیکن اس خیال کا ایک دوسرا سبب بھی تھا، اس قدر بعد کا خیال قدامت میں ہین پیدا  
ہوا تھا، وہ لوگ ان تمام ستاروں کو ہوس آسمان یا آسمانوں میں جڑا ہوا تصور کرتے تھے،  
بطلموس اور اسکے بعد کے ہیئت دانوں نے ان خیالات میں بہت کچھ جلا دی، پھر بھی  
کوئی اصولی تغیر ستاروں کے بارہ میں ہین ہوا، جدید تحقیقاتوں نے جو عظیم ترین دوربینوں  
اور بہترین سامان فوٹو گرافی کی مدد سے کی گئی ہیں، ثابت کر دیا ہے کہ خسرو انجم محققاً محض

نویسارون اور چند مدار تارون کا مرکز ہے،

وہ زبردست ستارے، عظمت و ہیبت کے ناقابل قیاس مجسمے جو اس فضاے

آسمانی کی خلا میں غیر معمولی سرعت اور انتہائی سکون اور خاموشی سے کسی نامعلوم منزل

کی طرف سرگرم سفر ہیں، ہمارا آفتاب باوجودیکہ ہماری زمین سے کئی لاکھ گنا بڑا ہے، انکے

مقابلہ میں حقیقتاً ایک ذرہ کے برابر ہے، اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر ان لائقہ اد

نظاموں کے مجموعہ کے بعد کیا ہے؟ یہ منجملہ ان سوالات کے ہے جنکا جواب دینے سے

اتیک انسان کی عقل، اسکی معلومات، اور اسکے کل تجربات قاصر رہے ہیں، انکی انتہا کے

متعلق اسکے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ یہ ایک لامتناہی سلسلہ تارون یا بالفاظ دیگر

آفتابوں کا چلا گیا ہے، جنکا قیاس کرنا بھی ہمارے خیالات کو ہیجان میں ڈال دیتا ہے

اور اس جگہ ہم اس ”قانون کل“ کا ہیبت ناک تصور کرتے ہیں، جو ان تمام تارون اور

انکے ماتحت سیاروں، ان سیاروں کی آبادی، انکے جانداروں کے وجود کا راز ہی، یہی

جگہ ہے جسکے بعد انسان کی عقل، اسکے تجربات، اسکی علمیت کا زعم اور اسکی معلومات کا

گہنڈ باطل ثابت ہوتا ہے، اور یہیں سے سرحد اعتقاد ”یا ایمان بالغیب“ کی ابتدا ہوتی ہے

جسکو طے کر کے لوگ مذہب کی ملکیت میں داخل ہوتے ہیں،

ہماری داستان ابھی ختم نہیں ہوئی، ستاروں کے اس سارے قصہ کو بیان کرینگے

بعد اگر یہ نتیجہ نکالا جائے تو بیجا ہندوگا کہ ممکن ہے یہ ستارے بھی ہمارے آفتاب کی طرح اپنی

اپنے نظاموں کے مرکز ہوں، انکے ماتحت بھی بہت سے سیارے ہوں اور کون کہہ سکتا ہے کہ

ویسے ہی تغیرات کے زیر اثر رہ کر جنھوں نے ہماری زمین پر عمل کیا تھا، ان سیاروں میں

لے ہم اپنے آئینہ مضمن میں اس بحث پر غما، ہیبت کی رائے سے ناظرین معارف کو مطلع کرینگے،

بھی جاندار مادہ کا وجود نہیں، ہاں یہ ممکن ہے کہ وہ جاندار مادہ اس دنیا کے جانداروں سے مشابہ ہوں، اب ذرا غور کیجئے کہ لاتعداد آفتاب اور انکے لاتعداد سیارے اور انکی ناقابل قیاس آبادی، ان نتائج تک پہنچنا، تخیل کی انتہائی بلند پروازی اور قیاس کی رفیع ترین پرداز ہے،

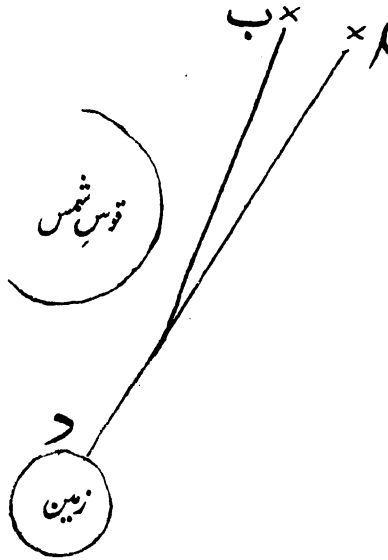
اجرام فلکی کی گردش کے متعلق بہت سی تحقیقاتیں ہوئی ہیں، لیکن ان میں سے دو خاص طور سے قابل ذکر ہیں، ستارے جیسا کہ پہلے خیال تھا ساکن نہیں، محوری گردش کے علاوہ تمام ستارے بلحاظ سمت گردش دو گروہوں میں تقسیم ہو سکتے ہیں، دونوں گروہ ایک دوسرے سے مختلف سمت کو گردش کرتے ہیں، ہر ایک ستارہ ان دونوں گروہوں میں سے کسی ایک میں شامل ہے، ستاروں کے اس سفر کی ابتدا کہاں سے ہوئی، اور ان کی منزل مقصود کیا ہے؟ اسکا کوئی جواب ہمارے پاس نہیں،

اسپیکٹرا سکوپ ایک آلہ ہے جسکو آلہ گردش نما "کھنٹا چاہیئے"، اس سے روشنی دیکھ کر ستاروں کی حرکت اور انکی سمت وغیرہ معلوم کی جاتی ہے، ولینہ (Vega) نامی ستارہ کی روشنی کو اس آلہ سے جانچا گیا، علماء ہیت اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ہمارا آفتاب صبح اپنے ذریعات کے اس ستارہ کی جانب جا رہا ہے، یہ صحیح ہے کہ ولینہ ہم سے نیلون (نیل) = ملین = ملین = میل دور ہے، لیکن رفتار جس سے آفتاب سرگرم سفر ہی "دنیا دی" لحاظ سے زیادہ ہے، یعنی ۱۹ میل فی سکند یا قریب قریب ۴۰ کروڑ میل سالانہ، یہ تباہ کن نتائج پیدا کر بیوالی رفتار اسلئے ابھی خطرناک نہیں کہ ولینہ ہم سے بہت ہی دور ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ فضا سے آسمانی بین آفتاب کی حرکت دوسرے ستاروں کی کشش کے باعث کچھ اس طرح بدل جائے کہ ہمارے آفتاب کا سفر اس منحوس دن کو نہ دیکھے

جب ولقیہ اور ہمارا آفتاب بر سر پیکار ہوں اور دونوں کی گراگر می میں ہماری ذرا سی زمین بھی گیہوں کے گہن کی طرح نیست و نابود ہو جائے،

غیر مناسب ہنوکا اگر اس جگہ اس نئے نظریہ کا سرسری ذکر کیا جائے جو نظام کا ریتا کو ایک نئے ڈھنگ سے پیش کر گیا، اب تک یعنی ۱۹۱۵ء سے پہلے سرائیک نیوٹن کا یہ نظریہ کہ روشنی خط مستقیم میں حرکت کرتی ہے، مسلہ اور تسلیم کردہ نظریوں میں سے تھا لیکن جرمنی کے منہور ریاضی دان انیسٹن نے سب سے پہلے ۱۹۰۵ء میں اور اس کے بعد ۱۹۱۵ء میں اپنا یہ دعویٰ پیش کیا کہ روشنی پر بھی قانون کشش کا اثر پڑتا ہے، مگر مئی ۱۹۱۹ء سے پہلے بہت کم لوگ اس خیال کو کچھ بھی اہمیت دیتے تھے، تاہم ہیئت دانوں کو فکر دامنگیر ہوئی کہ کسی نہ کسی طرح اس خیال کی تائید یا تردید کرنی چاہیے چنانچہ یہ معلوم کر کے کہ مئی ۱۹۱۹ء کو جنوبی امریکہ اور شمالی افریقہ میں کسوف کامل ہونی والا ہے، برٹش اسٹراؤمیکل سوسائٹی کی جانب سے دو مشن روانہ کئے گئے، ایک برازیل (جنوبی امریکہ) دوسرا شمالی افریقہ کے مغربی ساحل پر ایک جزیرہ میں، وقت معینہ پر جب آفتاب میں پورا گہن پڑا تو دونوں جگہوں آسمانوں کے نقشے لئے گئے، اور بعد کو ان نقشوں سے اُن نقشوں کا مقابلہ کیا گیا جو ایسے وقت سے لئے گئے تھے جب آفتاب درمیان میں حائل تھا، دونوں کے مقابلہ سے معلوم ہوا کہ پہلے نقشوں کی نسبت بعد کے نقشوں میں ستارے آفتاب کی سمت کو کیسے قدر دبلے ہوئے تھے، پہلے نقشوں میں روشنی بلا کسی روک ٹوک کے ہم تک آئی تھی، لیکن بعد کے نقشوں میں روشنی چونکہ آفتاب کے قریب سے گزری اسلئے کیسے قدر اسکی کشش کے زیر اثر آفتاب کی جانب خط منحنی بناتی ہوئی دب گئی، مثال سے یہ بات پورے طور پر ذہن نشین ہو سکتی ہے،

نقشہ ذیل میں آ وہ جگہ ہے جہاں ایک ستارہ معمولی نقشون میں ملتا ہے، لیکن ب  
وہ جگہ ہے جہاں روشنی کی آفتاب کی جانب کشش کے سبب مئی ۱۹ کو لے ہوئے نقشون  
میں وہی ستارہ ملتا ہے،



۵ وہ مقام ہے جہاں اس منظر کے نقشے لئے لگے تھے، ایسٹن کے نظریہ کی اس علی  
تائید نے دنیا سے جدیدین ایک تہلکہ ڈال دیا، اور گزشتہ جون سے بیکر و سمبر تک ولاہتی  
اجارات اس جدید تغیر کے نتائج اور خوش آئند توقعات پر قلم فرسائی کرتے رہے،

# تلخیص و تبصیر

## اسلام بطور عالمگیر مذہب کے

خواجہ کمال الدین سالہا سال سے اشاعت اسلام کی جو سرگرم کوششیں عمل میں لارہے ہیں، اور غیر اقوام کے سامنے تبلیغ اسلام جن بہترین صورتوں کے ساتھ فرما رہے ہیں انکا اعتراف ہر منصف مزاج شخص پر لازم ہے، چند ماہ ہوئے انھوں نے جنوبی ہند کا دورہ کیا تھا، اور اس دورے میں جا بجا انھوں نے اپنی مجوزہ ”انجمن مذاہب“ کے مقاصد کی غبی تفسیر کی تھی، اس سلسلہ میں ایک لکچر انھوں نے ”پیام اسلام“ کے عنوان سے دیا تھا، جسکی تلخیص درج ذیل ہے :-

خواجہ صاحب نے آیہ کریمہ کل یا اهل الکتاب تعالوا الی کلمۃ شواء بیننا و بینکم ان لا نعبد الا الله ولا نشرك به شیئاً اولاً فیخذ بعضنا بعضاً ارباباً من دون الله کی تلاوت کر کے بیان کیا کہ اخوت عامہ کا یہ وہ پیام ہے جو آج تیرہ سو برس ہوئے اسی نبی کی زبان سے ادا ہوا تھا جو ان انبیاء کرام کے سلسلہ کی آخری کڑی تھی، جو خدا کی طرف سے ہر ملک اور ہر زمانہ میں اس غرض سے مبعوث ہوتے رہے ہیں کہ نسل انسانی کے تنازعات و اختلافات کو مٹا کر ان میں اتحاد و یکجہتی پیدا کریں، اور میں آج اس پیام کو پھر اسلام کی جانب سے پیش کر رہا ہوں حاضر ہوا ہوں، آپ حضرات میں سے جو لوگ دیکھ کو کلام ربانی تسلیم کرتے ہیں اور ہندوستان کے رشتیوں کی اولاد میں ہیں، جو لوگ یہودی ہیں یا عیسائی ہیں، یا اور کسی الہامی مذہب کے قائل ہیں، میں انکی خدمت میں عرض کرتا ہوں کہ آئیے ہم آپ سب مل کر ایک امر پر متحد

ہو جائیں اور وہ یہ کہ ہم سب خدا سے واحد ہی کی پرستش کریں، ہم سب مل کر ایک مشترک  
معبود بنائیں، جہیں سب ایک ہی بڑے معبود کے آگے سر جھکائیں،

حضرات، آپ یہ اندیشہ نکرین کہ مذاہب و ملل کے اس تعدد و تنوع کے زمانہ میں  
اتحاد و یک رنگی کی کوششیں کیونکر بار آور ہو سکیں گی، ترقی نام ہی تعدد و تنوع کا ہے، فطرت نے  
اپنے قدم آگے بڑھانے کا راستہ بھی رکھا ہے، تخم ایک واحد و غیر منقسم شے ہوتی ہے لیکن  
اسکے ارتقاء کے معنی ہی یہ ہیں کہ اسپن بکے پیدا ہوں، شاخیں ہوں، پھنیاں ہوں، پھول  
ہوں، پتیاں ہوں، ڈنڈھل ہوں، پھل ہوں، لطفہ اپنی ابتدائی حالت میں نسبتاً ایک  
مفرد و بسیط شے ہوتا ہے، لیکن جنین کی حالت میں اسپن کتنے نئے نئے اجزاء پیدا ہونے  
لگتے ہیں، اس قانون کی بیشمار مثالیں ہیں، اور جمادات، نباتات، حیوانات، ہر جگہ  
یہی قانون اپنا عمل کرتا ہوا نظر آتا ہے،

انسان کی اجتماعی زندگی بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں، وحشی قبائل میں ہر فرد خود اپنی  
ضروریات کا کفیل رہتا ہے، لیکن جون جون تمدن و تہذیب کے قدم آتے جاتے ہیں  
تقسیم عمل شروع ہونے لگتی ہے، یہاں تک کہ کچھ روز میں مختلف پینے، صنایع اور مشاغل  
پیدا ہو جاتے ہیں، دیہات اور قریے بڑھنے بڑھنے شہر ہو جاتے ہیں، شہروں کا اجتماع  
ملک و سلطنت کی شکل حاصل کر لیتا ہے اور مختلف ممالک ملکر ہر عظم بنانے میں،

پس مذاہب کے تنوع و تعدد سے گھبرانے کی کوئی وجہ نہیں، یہ تو عین ترقی و نمو  
کی علامت ہے، خود ہمارے پیہر نے اختلاف امت کو ”رحمت“ سے تعبیر کیا ہے، البتہ  
اصل سوال یہ ہے کہ ان میں باہم رابطہ انخاد کیونکر پیدا کیا جائے، اسکے جواب میں یہیں  
ان اصول کو ملحوظ رکھنا چاہیے، جنکے ماتحت ارتقاء کائنات کی رفتار جاری ہے، اگر



نختم کی حالت سے درخت بننے کے منازل کو پیش نظر رکھا جائے تو حسب ذیل مراتب ہفت گانہ معلوم ہونگے:-

(۱) سارے نظام شجری کی اہل ایک شے، نختم ہوتی ہے،

(۲) اس سے کلے پہوٹتے ہیں،

(۳) تمام شاخیں جڑ کی ماتحت و محکوم رہتی ہیں،

(۴) ہر شاخ دوسری شاخ کا مستقل و علحدہ وجود تسلیم کرتی رہتی ہے،

(۵) ہر شاخ ایک دوسرے سے منفعت ہوتی رہتی ہے،

(۶) کوئی شاخ ایک دوسرے کی بربادی کے درپے نہیں رہتی،

(۷) درخت کا وجود و قیام، اسکے تمام مختلف اعضاء کا مشترک مقصد رہتا ہے،

ہر مفرد و بسیط شے کو مرکب حالت تک تبدیل ہونے اور ہر شے کو کمال و تکمیل پہنچنے

میں انہی منازل ہفت گانہ سے ہو کر گذرنا پڑتا ہے، مادیات و جسمانیات، نفسیات و

روحانیات، اخلاقیات و سیاسیات، غرض ہر شعبہ موجودات میں بھی قانون عامل ہے

اور دنیا کو ایک مرکز پر لانے میں، اگر کبھی بھی کامیابی ہو سکتی ہے تو انہیں قوانین سبعہ کی پابندی

و رعایت کے ساتھ،

اصول بالا میں سے اصول چہارم، جس کا مفہوم رواداری یا ایک دوسرے کی ہستی کے

اعتراف و احترام کا ہے، اتحاد مذاہب کی راہ میں سب سے زیادہ دشوار نظر آتا ہے، ہر مذہب

صرف اپنے تئیں سچا قرار دیتا ہے اور دوسروں کو گمراہی و ضلالت کے مرادف تسلیم کرتا ہے،

لیکن اسلام کی تعلیم اس دشواری کا نہایت صحیح حل پیش کرتی ہے، اسلام سے پہلے تمام

مذاہب صرف اپنے تئیں حامل حق اور دوسروں کو جاوہ ضلالت قرار دیتے تھے، اور یہی صمد

آج بھی ہر غیر اسلامی حلقہ سے آرہی ہے کہ نجات صرف اسی کے مخصوص عقاید کے اندر محدود ہے حالانکہ منافع مادی کے جتنے اہل مراکز ہیں، مثلاً چاند اور سورج، آسمان و زمین، ستارے اور بادل، ہوا اور پانی، انکی فیض رسانی سے کسی فرقہ و عقیدہ کے لوگ محروم نہیں، انکی نفع رسانی جہد مخلوقات کے لئے یکساں و مشترک ہے، تو کیا قدرت کا بخل صرف نجات روح کے بارہ میں ہے؟ کیا فیوض روحانی بہ نسبت منافع مادی کے غیر اہم ہیں؟

قرآن سب سے پہلی کتاب ہے جس نے اس خطرناک غلطی کو مٹایا، اسکی پہلی ہی آیت نے دنیا کو اسکی تعلیم دی کہ خدا تعالیٰ نے کسی مخصوص ملک، فرقہ، قوم، یا قبیلہ کا خدا نہیں بلکہ رب العالمین یعنی جملہ موجودات کا پروردگار ہے، تنہا عرب و عراق، مصر و شام، یورپ و امریکہ کا نہیں، انوت عامہ کا یہ درس قرآن میں بار بار بتا لیکہ و نصیح کے ساتھ ملتا ہے، مثلاً یہ کہ ہر قوم کے لئے ایک ہادی ہے، ہر جماعت کے لئے ایک رسول ہے، کوئی طبقہ انسانی ایسا نہیں جس میں خدا کی جانب سے ڈرانے والا نہ بھیجا گیا ہو، دقت علی ہذا۔

حضرات، یہ اس کتاب کی تصریحات ہیں جسے اسکے مخالفین تعصب و عدم رد و ادائی کا سرچشمہ بتاتے ہیں، میں آپ سے عرض کرتا ہوں کہ اس فراخ دلی و رواداری کی بغیر اگر دنیا کی کسی اور الہامی کتاب میں مل سکتی ہو تو پیش کیجئے، یہ قرآن اور محض قرآن ہی کی تعلیم کا اثر ہے، جسکی بنا پر میں آپکے سامنے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جس طرح میرا بیان قرآن پر ہر وہی طرح میں غیر تحریف و تبیل و دیکھ کو بھی کلام الہی مانتا ہوں، اور جس طرح میں موسیٰ کو رسول برحق مانتا ہوں، اُسی طرح یہ عقیدہ رکھتا ہوں کہ کرشن درامچند رب بھی خدا ہی کے فرستادہ پیامبر ہیں جو سرزمین ہند پر بشیر و نذیر کی حیثیت سے بدی کو کچلنے اور نیکی کو ابھارنے کے

لے کل قوم ہاد لے و کل امتیہ رسول لے دان من امتیہ الا خلا فیہا نذیر۔

لئے مبعوث ہوئے تھے، اور جس بحر معرفت سے مسیح ابن مریم سیراب تھے، اُسکے جہرہ نوش  
 زرِ تَنْشَت بھی تھے، تاکہ ایران میں آتشِ حق پرستی کو شعلہ زن کریں، اور انہیں چند ناموں پر  
 موقوف نہین، دنیا میں جہان کہیں انسانی آبادی کا وجود رہا ہے، وہاں کوئی رسولِ پیغمبر  
 بھی ضرور بھیجا گیا ہے، جہاں کہیں ظلمت رہی ہے وہاں نور بھی پہنچایا گیا ہے، اور میں یہ  
 جو کچھ کہہ رہا ہوں میری ذاتی رائے نہین، قرآن کی صاف و واضح تعلیم ہے:-

قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَا اُنْزِلَ الْيَنَّا وَمَا اُنْزِلَ اِلٰى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ  
 وَيَعْقُوْبَ وَاِلْيَاسَ وَمَا اُوْنِيَ مُوسٰى وَعِيسٰى وَمَا اُوْنِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ سُلٰلِمِ  
 لَا تُغْرِقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِنْهُمْ وَخَنُ لِهٖ مُسْلِمُوْنَ - (سورہ بقرہ آیت ۱۲۶)

جبکہ لحاظ سے مسلمان پر ہر نبی کو برحق سمجھنا واجب ہو جاتا ہے، اور اس طرح اصولِ مذکورہ  
 بالابین چوتھے اصول کی منادوی جس جامعیت سے قرآن کرتا ہے، اسکی نظیر دنیا کے مذہبی  
 لٹریچر میں مجھے نہین ملتی، اور مسلمان نہایت کشادہ دلی سے ہر دوسرے مذہب و ملت کا  
 احترام کرنے کے لئے آمادہ رہتا ہے،

• اصولِ رد و اداری کے علاوہ ارتقاء کائنات کے باقی چہ اصول کُل ایک بار پھر

پیش نظر کر لینا چاہیے،

(۱) اتحادِ اصل،

(۲) انشقاق و انشعاب،

(۳) مرکزیت و مرجعیتِ اصل

(۴) باہدگر نفع رسانی

(۵) عدم ضرر رسانی

(۷) متحدہ فرائض کے لئے اشتراکِ عمل،

اب دیکھئے کہ قرآن ان میں سے ہر اصول کی کیسی صریحی و پیرزور تائید کرتا ہے، نمبر وار ایک ایک اصول کو لیجئے:-

(۱) پہلا عنوان اتحادِ اصل کا ہے، یعنی سب کا مبدأ اور سب کی اصل ایک ہی ہے قرآن کا ارشاد ہے، قُلْ اَتُحِبُّونَنَا لِلّٰهِ وَهُوَ يُحِبُّنَا وَيَاذْكُرْكُمْ (بقرہ آیت ۱۳۹) جسکے صاف معنی یہ ہیں کہ خدا کو سب کا معبود ہے، پہلے اہل مذاہب کیوں باہم مخالفت و مناقشہ میں مشغول رہتے ہیں؟ ضمنی و فرعی مسائل میں کتنے ہی اختلافات ہوں، پھر بھی سب کا اصلی مبداء ذاتِ باری ہی ہے،

(۲) دوسرا اصول، اسی پہلے اصول کی تفریع ہے، ارشاد ہوتا ہے:- کَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيِّينَ مُبَشِّرِينَ وَمُنْذِرِينَ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ (بقرہ ۲۱۳) اسکا کہلا ہوا مفہوم یہ ہے کہ تمام نوعِ انسانی کو یا ایک ہی خاندان تھا جو رفتہ رفتہ مختلف شعب و قبائل میں تقسیم ہوتا گیا، اور ہر ایک کی ہدایت کے لئے جدا جدا انبیاء مبعوث ہوتے رہے اور اس بنا پر کسی مذہب کو باطل نہیں کہا جاسکتا، بلکہ سب ایک ہی منزلِ مقصود کی طرف لیجانے کی مختلف راہیں ہیں،

(۳) تیسرا اصول مرکزیتِ اصل کا ہے، اس باب میں فرمانِ خداوندی ہے:- يَا اَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَنْ لَا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا یعنی ہر صورت میں اور ہر پیرایہ سے معبود واحد ہی کو جو سب کی اصل ہے) ماننے رہنا چاہیئے،

(۴) چوتھے اصول سے متعلق قرآن کی تصریحات تفصیل سے اُدپر گزر چکیں کہ ہر قوم اور ہر ملک میں انبیاء برحق پیدا ہوتے رہے ہیں، اور کوئی نبی جو نہا نہیں،

(۵) اصولِ پنجم کا عنوان باہدگر نفع رسانی و نفع یابی کا ہے، اسکے بابت ہمارے پیہرِ صلح کی

تاکید ہے کہ دانائی کی بات مسلمان کی گم شدہ دولت ہے، وہ جہاں کہیں بھی ملے اسے حاصل کرنا چاہیے، الحکمۃ ضالۃ المومن غلۃ و حاجۃ و جدۃ و ما بہ اسی تعلیم کا اثر ہے کہ میں نے تکلف انجیل و دید سے فائدہ اٹھاتا ہوں، اور آپ حضرات سے اسند عاکرتا ہوں کہ آپ بھی قرآن کے مطالعہ سے مستفید ہوں،

(۶) چٹا اصول عدم مخالفت و ضرر رسائی کا ہے، اس باب میں قرآن کی تصریح ہے کہ جو لوگ شرک میں گرفتار رہیں، انہیں سب و شتم سے نہ یاد کرو، ولا تبتوا الذین یدعون من دھون اللہ۔ (العام، آیت ۱۰۹)

(۷) آخری عنوان، مقصد اصلی کے لئے اشتراک عمل کا ہے، اس باب میں مجھے جیسی تصریح قرآن میں ملتی ہے، دنیا کی کسی دوسری المامی کتاب میں نہیں ملتی، میں نے دوسرے مذاہب کی کتب مقدسہ کا مطالعہ کمال بے تعصبی کے ساتھ خالی الذہن ہو کر کیا ہے، لیکن مجھے ان میں ایسے متعدد احکام ملے جو مسائل اسلام و مقتضیات عقل کے خلاف ہیں، اور یہ اس امر کی بین دلیل ہے کہ ان میں تحریف ہوئی ہے، اور قرآن نے انکے محرف ہونے کے بابت تیرہ سو برس ہوئے جو دعویٰ کیا نہادہ بالکل صحیح ہے، مذاہب کے وجود میں آنے کا اصلی مقصد جو قرآن نے بتایا ہے یہ ہے: ”ہم نے تمکو اسلئے پیدا کیا ہے کہ نوع انسانی کی خدمت کرو، نیکیوں کی تلقین و ہدایت کرتے رہو، بُرائیوں سے ڈراتے رہو، اور خدا سے واحد کو ماننے رہو۔“

حضرات، میں آپکی توجہ خاص طور پر مقصد حیات انسانی کی جانب منطوف کرنا چاہتا ہوں جو یہ ہے کہ مسلم کی زندگی صرف خدمت خلق کے لئے ہے، یہ میرے ہاتھ، میری آنکھیں، میرے کان، اور یہ تمام اعضا و جوارح صرف اسی مقصد خدمت خلق کیلئے ہیں، میری زندگی محض ایک امانت الہی ہے جسکا مقصد دوسروں کی خدمت ہے، خود پیر صلح کو یہ کہنے کا ارشاد ہوا ہے کہ

”میری عبادت، میری قربانی، میری زندگی سب کچھ خدا سے رب العلمین کے لئے ہے،“  
 اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔ (انعام۔ آیت ۱۶۴)

غرض قرآنی عقیدہ کے رُوسے میری بیداری و خواب، میرا خورد و نوش، میری نماز و عبادت سب کچھ خدا، یعنی خدمتِ خلق کے لئے ہے،

یہی وہ اصولِ مہفت گانہ ہیں، جنکی بنا پر اتحاد و اتفاق کی استوار عمارت قائم ہو سکتی ہے  
 میں آپ سے صحیح عرض کرتا ہوں کہ اس وقت جو مخالفت و منافرت کے شعلے اُٹھ رہے ہیں اُن  
 سب کی نہ بن یہی مذہبی اختلافات کام کر رہے ہیں، اور یہ مذہبی اختلافات نتائجِ مبین اس  
 تحریف کے جو مذاہبِ مردِ جہنم واقع ہو گئی ہے، اس مخالفت کو دور کرنے کا طریقہ صرف یہ ہے کہ  
 ہم سب ایک نقطہ پر متحد ہو جائیں، اور وہ نقطہ توحید الہی کا ہے، ہندوستان جو مختلف ادیان  
 و مذاہب کا گہوارہ ہے وہاں اس اتحاد کی سب سے زیادہ ضرورت ہے، اور اس مقصد کے  
 حصول کی بہترین تدبیر یہ ہے کہ ہم سب خدا کی وحدانیت کا اقرار کریں اور سری راجندر  
 سری کرشن، حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ، اور حضرت محمدؐ تمام انبیاءِ برحق کو تسلیم کریں، آج سے  
 نصف صدی اُدھر ہندو مسلمان باہم شیر و شکر تھے، مسلمانوں کے لڑکے اپنے والد کے ہندو  
 دوستوں کو اپنا باپ، اور ہندوؤں کے لڑکے اپنے والد کے مسلمان دوستوں کو اپنا پتا کہکمر  
 پھارتے تھے، کیا آپ لوگ اس زمانہ کو بھول گئے ہیں؟ اور جب مادی و دنیوی حیثیت سے  
 آپ لوگ دوسرے مذاہب والوں کو مرتبہ پداری پر رکھ دیتے تھے تو روحانی حیثیت سے  
 یہ رشتہ قرابتِ تسلیم کر لینے، یعنی دوسروں کے پییر کو اپنا پییر قرار دے لینے میں آخر کیا قیاحت  
 میں جو انہیں اتحادِ مذاہب قائم کرنا چاہتا ہوں، اسکے شرکت کے لئے ارکان سے معاہدہ  
 ذیل پر دستخط چاہتا ہوں:-

”میں خدائے تعالیٰ کی وحدانیت کا اقرار کرتا ہوں اور اسکی الوہیت میں کسی اور کو

شریک نہیں کرتا،

میں سری راجندر، سری کرشن، گوتم بدھ، حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ اور حضرت

محمدؐ کو انبیاء برحق تسلیم کرتا ہوں،

میں جلد مذاہب کی کتب مقدسہ پر انکی غیر تحریف حالت میں کتب الہامی ہونے کا

اعتقاد رکھتا ہوں، اور قرآن کو وحی الہی کا خاتم سمجھتا ہوں، میں دوسرے مذاہب کو برا

کہنے سے باز رہنے کا عہد کرتا ہوں،“

سب سے پہلے میں خود اس اقرار نامہ پر دستخط کر بیٹھو حاضر ہوں، اور اگر آپ لوگ بھی

اسپر آمادہ ہوں تو میں اپنی جانب سے دس ہزار افراد کی شرکت کی ذمہ داری کرتا ہوں،

خواجہ صاحب کے اس لکچر کے بعد صدر نشین جلسہ مسٹری، بی، راما سوامی آیر بی، اے

بی، ایل نے جو مداس کے نہایت ممتاز و ذلیل و کلیل ہیں، اپنی تقریر میں خیالات ذیل کا اظہار کیا،

”اسلام کی یہ خصوصیت میری نظر میں ہمیشہ سے رہی ہے کہ یہ مذہب فطرت بشری کے

متناقض خصوصیات کا جامع ہے، یہ مذہب ایک طرف تو ہمت و اقدام عمل کا معلم ہے اور

دوسری طرف غور و فکر و مراقبہ کا داعی ہے، اسلام کی اس امتیازی خصوصیت کے شواہد نہ

صرف قیلم اسلام، بلکہ شائع اسلام، ہمیر اعظم کی زندگی میں بھی بکثرت ملتے ہیں، وہ ایک

طرف پوری طرح عملی زندگی میں مشغول تھے، اور دوسری طرف معرفت و خدا شناسی میں منہمک

تھے، فاضل لکچر کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلام کی دعوت یکجہتی و اتحاد، امن و رواداری

کی دعوت ہے، اس بارہ میں میرا اور لکچر صاحب کا مذہب بالکل متحد ہے، وہ جو وقت اپنے

و عادی کی تائید میں آیات قرآنی پڑھ رہے تھے، میرے ذہن میں بھی اپنشد کا یہ فقرہ آیا کہ صدقت  
 صداقت ہے، اور وہ صرف ایک ہی ہے، البتہ مختلف علماء اسکو مختلف پیرایوں میں بیان  
 کرتے ہیں، اپنشد کی بھی تعلیمات کا حاصل یہی ہے کہ خدا رسی کی منزل ایک ہی ہے، البتہ اسکے  
 راستے بیشمار ہیں، اور ہر شخص اور ہر قوم کو اسکے مذاق، اور اسکے سطح و ماغی کے متناسب ہدایت  
 ربانی ملتی ہے، ہر اوتار (منظہر خدا) کی پیدائش کا مقصد یہی رہا ہے کہ وحدت باری و اتحاد  
 انسانی کا درس دنیا کو دیا جائے، میں ندامت کے ساتھ اعتراف کرتا ہوں کہ ٹائل مقرر نے  
 جو وقت اسلام کی سزاوائہ تعلیمات کا ذکر شروع کیا، معاً میرا ذہن قتل و جہاد کی طرف منتقل  
 ہونے لگا، لیکن تھوڑی ہی دیر میں مجھے اپنی غلطی معلوم ہو گئی، اور یہ نظر آنے لگا کہ اسلام کی دعوت  
 دیگر مذاہب کی طرح توحید باری ہی کی دعوت ہے، میں اپنے اس تصحیح خیال کے لئے مقرر کا  
 ممنون ہوں، موصوف نے آخر میں اتحاد مذاہب کا جو نسخہ بتایا ہے، یعنی تمام ہادیان عالم کو  
 انبیاء برحق تسلیم کیا جائے، اور ہندو حضرت محمد اور حضرت عیسیٰ کی رسالت کا اقرار کریں،  
 اسکی بابت میں ہندوؤں کی طرف سے انکو پورا اطمینان دلانا چاہتا ہوں کہ ہندوؤں کو یہ تسلیم  
 کرنے میں مطلق تامل نہیں ہو سکتا، ہمارے ہاں کی خود ہی یہ تعلیم ہے کہ تمام مذاہب راہِ حق  
 دکھاتے ہیں اور کسی کو برا کہنا نا واجب ہے۔“

(اسلامک ریلویو، و نیوا انڈیا)



## ایجنڈا علیہ

کچھ روز ہوئے نقشت جنرل سر آرثر پیچٹ نے رایل جیوگرافیکل سوسائٹی (لندن) کو دنیا کا ایک نقشہ تحفہ پیش کیا ہے جو دو نصف کرڈن کی شکل میں ہے، اور جو ہالینڈ میں سترہویں صدی کے وسط میں تیار ہوا تھا، اس نقشہ کا ایک نسخہ برٹش میوزیم میں پیش ہے موجود ہے، مگر وہ جا بجا سے ناقص ہو گیا ہے، بخلاف اسکے یہ نسخہ ہر طرح صحیح و سالم ہے، اس نسخہ کی پشت پر کچ چڑھی ہوئی ہے، اسکا طول ۱۰ فٹ اور عرض ۶ فٹ ہے اور ہر نصف دائرہ کا قطر ۴ فٹ ۱۰ انچ ہے، غلامی فن جغرافیہ کی رائے میں یہ نقشہ اپنے زمانہ کی بہترین صنعت ہے،

مشہور محقق و مکتشف سینیر مارکونی نے ایک اطالوی رسالہ میں ایک ایسی ایجاد کی پیشین گوئی کی ہے جس سے لاسکلی تاروں کے موجودہ نظام میں ایک عظیم الشان تغیر پیدا ہو جائیگا، اسوقت لاسکلی پیامات خط مستقیم میں سفر نہیں کر سکتے، اسلئے انکے واسطے پیچدار راستے بنانا ہوتے ہیں، آئندہ اسکی ضرورت باقی نہ رہیگی، بلکہ ہر لاسکلی پیام ایک ہی وقت میں براہ راست تمام انقطاع ارض میں موصول ہو سکیگا، اور اسوقت موسم کی خرابی سے پیامات کے سمجھنے میں جو غلطیاں واقع ہو جاتی ہیں انکا امکان تک نہ باقی رہیگا، اس ایجاد کے مکمل ہوجانے پر صرف ایک ہفتام کے دبانیے سے ہر حصہ زمین سے فوراً سلسلہ نامہ و پیام قائم ہو جائیگا، اور گراموفون کی جسامت کے مساوی ایک مشین کی مدد سے

تمام دنیا کے معلومات حاصل ہونے لگیں گے،

ایک جگہ پر ساکن کھڑے رہنے کی حالت میں ہمارا جتنا وزن ہوتا ہے، اس سے اس وقت کم ہو جاتا ہے، جب ہم ہنیک مغرب کی جانب حرکت کرتے ہوئے ہیں وزن میں اس تخفیف و اضافہ کی تعداد بیشک بہت ہی قلیل ہوتی ہے تاہم کچھ نہ کچھ ہوتی ضرور ہے ایک ماہر ریاضیات نے حال میں حساب لگایا ہے کہ ایک متوسط الجسم انسان جس کا وزن ساکن کھڑے ہونے کی حالت میں ایک من ۲۵ سیر ہے، وہ جب ڈائی میل فی گھنٹہ کی رفتار سے مشرق کی جانب حرکت کرتا ہے تو اس کا وزن ۱۴۰.۱۳۴۴۴۴ اونس گھٹ جاتا ہے، اور جب رفتار مذکور سے مغرب کی جانب حرکت کرتا ہے تو اس کا وزن بڑھ جاتا ہے گردش ارض مغرب سے مشرق کی رخ ہوتی رہتی ہے اور اگر زمین میں قوت کشش ہوتی تو انسان کے لئے ساکن کھڑا رہنا ناممکن ہوتا، بلکہ فی گھنٹہ تقریباً ایک ہزار میل کی شرح سے وہ فضا میں جا پڑتا،

ایک یورپین رسالہ لکھتا ہے کہ دنیا کے مشہور ترین منارے حسب ذیل مہندسیان مکتبی ہیں

۹۸۴ فٹ

(فیل ٹاور) (پیرس)

۵۳۲

الم کتھڈرل

۵۱۲

کولون کتھڈرل (کولون)

۴۸۳

روبن کتھڈرل (روبن)

۴۸۰

سینٹ نکولس (ہمبرگ)

۳۳۰ فٹ

سینٹ پیٹرز کتھڈرل (رومہ)

۴۰۴

سالبری کتھڈرل

۳۶۵

سینٹ پال کتھڈرل (لنڈن)

۳۲۵

سینٹ پیٹرک کتھڈرل (نیویارک)

اخبارات میں اس قسم کی خبریں وقتاً فوقتاً شائع ہوتی رہتی ہیں، کہ فلان مقام پر خون کی بارش ہوئی، ایک انگریزی رسالہ لکھتا ہے کہ تاسیخ میں خونی بارش کا ذکر سب سے پہلے ۱۲۲۲ء میں ملتا ہے، اس زمانہ کے رومی مورخین کہتے ہیں کہ متصل تین دن تک خون آلود خاک کی بارش ہوتی رہی، اور جسوقت ابر مٹ جاتا تھا، آفتاب ایک دریا آتشیں میں غرق نظر آتا تھا، اسکے بعد ۱۲۲۶ء کا ایک اطالوی مصنف لکھتا ہے کہ ملک شام میں اس سال جتنی برف گرمی وہ پگھلنے کے بعد خون کی شکل میں تبدیل ہو گئی، اور تمام سڑکوں پر اسی خون کی ندیاں بہنے لگیں، اور اس خون کی تاثیر یہ تھی کہ جو شے اس سے مس ہو جاتی تھی وہ بھی سبز ہو جاتی تھی، پھر ۱۳۳۶ء کے تذکروں میں یہ مندرج ہے کہ اس سال جنوبی اٹلی کے سارے علاقہ میں متواتر تین شبانہ روز خون کی بارش ہوتی رہی، اسکے بعد تاسیخ کی شہادت یہ موجود ہے کہ ۱۳۶۱ء میں برگنڈی میں بارش خون ہوئی، اسوقت اس واقعہ کو ظہور قیامت کی علامت قرار دیا گیا، ملاہی و ملاعب کا سد باب ہو گیا، لوگ توبہ، استغفار میں مصروف ہو گئے، بابائے کلیسا دعاؤں مانگنے لگے، اور علماء حکمت و طبعیات بھی دنگ ہو کر رہ گئے، یہاں تک کہ بالآخر ایک سائنس دان نے اس واقعہ کی توجیہ یہ کی کہ محاربات صلیبی کے کسی شہید کا خون بذریعہ بخارات آسمان تک پہنچ گیا اور

اور وہاں سے بارش کی صورت میں پھر دنیا میں منتقل ہو رہا ہے، یہ توجیہ آج مضحکہ خیز سمجھی جاگئی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ موجودہ علماء سائنس بھی کوئی معقول و تشفی بخش توجیہ اب تک نہیں پیش کر سکے ہیں،

کرہ ارض کی عمر سے متعلق علماء سائنس میں شروع سے اختلاف آرا چلا آ رہا ہے لارڈ کولن، مشہور ماہر طبیعیات نے انیسویں صدی کے آخر میں اپنا یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ زمین کا وجود آفتاب سے پیشتر نہیں ہو سکتا تھا، اور آفتاب کی عمر زیادہ سے زیادہ دو کروڑ سال کی ہے، لیکن عام سائنس دان حلقہ بین کولن کے اس نظریہ کو مقبولیت حاصل نہ ہو سکی، علماء سائنس کے دو طبقات خصوصیت کے ساتھ کولن کی رائے کے مخالف رہے ہیں، ایک علماء حیوانیات (زولو جیٹ) جنکے اصول کے لحاظ سے موجودہ حیوانات کے ارتقاء میں اس قدر عظیم نشان مدت صرف ہوئی ہے کہ ذہن بشری اسکے اندازہ سے عاجز ہے، دوسرے علماء ارضیات (جیولوجیٹ) جنکا قول ہے کہ ایک ایک چٹان کے موجودہ حالت تک پہنچنے کے لئے کروڑوں بلکہ اربوں سال کی مدت درکار ہوئی ہے ہر دو طبقات بالا کے بیان کے مطابق آفرینش ارض کو اس قدر بعید زمانہ منقضی ہو چکا ہے کہ اس وقت انسانی دماغ اسکا کوئی تخمینہ نہیں کر سکتا، چند ماہ ہوئے کارٹف میں برلش ایسوسی ایشن کا جو سالانہ اجلاس ہوا تھا اسکے شعبہ ریاضیات و طبیعیات کے صدر نے اپنے خطبہ میں اس مسئلہ کا بھی ذکر کیا لیکن کوئی قطعی رائے ظاہر نہیں کی،

دنیا کے پہاڑوں میں بلند ترین چوٹی کوہ ہمالیہ کے مونٹ ایورسٹ (گوری شنکر) کی

جسکی بلندی ۲۹۰۰ فٹ ہے، جسپر آج تک کسی ہستی کا گزر نہیں ہو سکا ہے، علماء و جغرافیہ سالہا سال سے اس چوٹی تک پہنچنے کی کوشش میں مصروف ہیں، مگر اتنا کامیابی نہیں ہو سکی ہے، حال میں لندن کے رایل جیوگرافیکل سوسائٹی نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ہوائی جہاز کی وساطت سے اس محکم کو سر کرنا چاہیے، لیکن جو محققین کوہ نوردی کا عملی تجربہ رکھتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ یہ جدید سعی ہی ناکام رہیگی، کیونکہ (انکے بقول) اصلی دشواری اتنی بلندی کی طے کر نیکی نہیں بلکہ وہاں تک پہنچ کر کچھ دیر کے لئے بھی زندہ رہنے کی ہی، ایورسٹ کی سطح ایک بالکل خاص قسم کی ہے، وہاں کی ہوا اسقدر لطیف ہے کہ اس فضا میں انسان تنفس جاری ہی نہیں رکھ سکتا، پس اگرچہ یہ باسانی ممکن ہے کہ ہوائی جہاز کی مدد سے کوئی انسان وہاں تک پہنچ جائے لیکن وہاں پہنچ کر سانس لینا کیونکر ممکن ہوگا، اس سے قبل جن محققین کی رسائی چوٹی کے قریب تک ہوئی ہے وہ اسی ضیق تنفس کے باعث فی الفور ہلاک ہو گئے ہیں،

میرا ایٹ ہل نے جیوگرافیکل سوسائٹی کے سامنے اپنے تجربات و مشاہدات الی سینا (جسٹ) کے متعلق کچھ کے ضمن میں بیان کیا کہ انکے ایک رفیق میجر ڈارلے، جہیل رڈولف کے قریب پہنچ کر شدید بچیش میں مبتلا ہوئے، اتفاقاً عین اسی زمانہ میں انہیں ایک بچھو نے کاٹا، اور معاً اسی وقت سے انہیں صحت شروع ہو گئی، یہاں تک کہ بالکل تندرست ہو گئے، بعض ڈاکٹر اس امر پر غور کر رہے ہیں کہ کیا واقعی بچھو کے زہر میں بچیش کے دور کرنے کی خاصیت موجود ہے؟

ایک فرانسیسی انجینیر میو ماڈر ڈیلین نے سالہا سال کی مشقت و عرق ریزی کے بعد ایک ایسی مشین ایجاد کی ہے جس سے اصوات کی طرح تصاویر بھی صد ہا میل کے فاصلہ تک بذریعہ ٹیلیفون کے منتقل کیا جاسکتی ہیں، چنانچہ چند روز ہوئے اسکا تجربہ بھی کیا گیا، بلجیم کے شہر انتورپ میں چند پہلوان عورتیں کوچ کرتی ہوئی جا رہی تھیں انکا فوٹو لیا گیا، اور فوراً ٹیلیفون کے ذریعہ سے دوسو میل کے فاصلہ پر پیرس میں منتقل کیا گیا، جہاں وہ آہٹ منٹ کے عرصہ میں پہنچ گیا،

امریکہ دیورپ میں بلند ترین عمارتیں لوہے کی بنائی جاتی ہیں، اور امریکہ میں تو بہت منزلہ وسی منزلہ فلک نما عمارتیں عموماً آہنی چادرون کی ہوتی ہیں، ایک سائنس دان نے حال میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ہر آہنی عمارت اپنا ایک مخصوص ساز ترمیم، اپنا ایک مخصوص سر رکھتی ہے، پس اگر اس عمارت میں اسی سر میں مسلسل باجہ بجایا جاتا رہے تو کچھ عرصہ کے بعد وہ عمارت منزلہ لرل ہونے لگیگی اور کچھ عرصہ کے بعد ہندم ہو جائیگی،

۱۹۰۱ء کی بابت حکومت ہند کی جانب سے جو تعلیمی رپورٹ ضائع ہوئی ہے، اسکے اعداد و معلومات ذیل غالباً دلچسپی سے پڑھے جائیں، سرکاری و خانگی مدارس کو ملاکر طلبہ کی مجموعی تعداد ۹۳۶۵۷۷ تھی جو سال پیوستہ سے بقدر ۱/۱۰ فیصدی کے کم ہے، طلبہ کی تعداد میں نمایاں کمی، بنگال و بہار کے صوبوں میں رہی، بخلاف اسکے بمبئی، پنجاب و صوبہ سرحدی میں انکی تعداد میں اضافہ رہا، مصداق فی تعلیم میں ایک کروڑ رسولہ لاکھ کا اضافہ ہو کر اسکی میزان ۳۳ کروڑ تک پہنچی، آرٹ کالجوں میں آٹھ کا اضافہ ہو کر انکی تعداد ۱۲۶۱ تک اور

دکٹر طلبہ کی تعداد میں ۲۸۹ کا اضافہ ہو کر ۷۰۷ تک پہنچی، مخصوص پیشوں کے کالج بدستور ۶۳ رہے، مدارس ثانوی کی تعداد میں ۲۹۵ کا، اور اسکے طلبہ کی تعداد میں ۴۵۴ کا اضافہ ہوا، اور انکی مجموعی تعداد علی الترتیب ۸۱۴۹ اور ۲۱۲۱۳ تک پہنچی، ابتدائی جدید مدارس ۶۶۲ کی تعداد میں قائم ہوئے، لیکن طلبہ کی تعداد میں صرف ۸۷۷ کا اضافہ ہوا، وہ بھی لڑکیوں کے شمول سے ورنہ لڑکوں کی تعداد تو خاصی گہٹی ہوئی رہی، اعلیٰ، اوسط و ادنیٰ تعلیم کو ملا کر مسلمان طلبہ کی تعداد میں ۴۱۲۴ کا اضافہ ہوا، اور انکی میزان ۶۵۹۵۳۹ تک پہنچی، لیکن یہ اضافہ زیادہ تر محض ابتدائی مدارس کے طلبہ میں ہوا،

پروفیسر جادونا تہہ سرکار نے کنٹک کی ایک علمی مجلس کے سامنے پچھلے ہینہ ایک لکچر دیا، جس میں انہوں نے بیان کیا کہ انہیں پیرس کے نیشنل لائبریری سے ایک قدیم قلمی فارسی کتاب دستیاب ہوئی ہے، جس سے بنگال کے مشہور ہیرو پرزتاب اومت کے انجام سے متعلق موجودہ تاریخی تحقیق کی بالکل ترویج ہوتی ہے، موجودہ تاریخین یہ بتاتی ہیں کہ پرزتاب کو شہنشاہ اکبر کے نامور جنرل راجہ مان سنگھ نے ایک پتھر میں قید کر دیا تھا اور اسی میں وہ مر گیا، لیکن یہ جدید کتاب جس کا مصنف ایک مسلمان ہے اور جس کا سن تصنیف ۱۶۲۵ء ہے اس بیان کی بالکل ترویج کرتی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پرزتاب راجہ مان سنگھ کی وفات کے بعد مدت تک زندہ رہا بلکہ اسکی زندگی کا پتہ اسلام خان کے زمانہ مصوبہ واری تک چلتا ہی جو جہاگیر کے عہد کا ایک گورنر تھا،

فرانس کے ایک ڈاکٹر پروفیسر سین مینگر نے حال میں یہ دعویٰ پیش کیا ہے کہ آلہ اکسیریز کی مدد سے انسان کے اندرونی جذبات و احساسات، افتاد و مزاج و رنگ طبیعت کا پورا پتہ چل سکتا ہے اور ہونہوالے شوہر شادی سے قبل اسکی تحقیق کر سکتے ہیں کہ انکی منسوبہ میں غصہ و حسد، جلد بازی و دناؤت، نیکی و فیاضی، ہمدردی و محبت کے عناصر کس تناسب کے ساتھ موجود ہیں،

جنگ سے قبل فرانس کی ایک موٹر کمپنی نے یہ اشتہار شائع کیا تھا کہ جو شخص ہوائی بائسکل ایجاد کر لے گا اسے دس ہزار فرانک کا انعام ملیگا، چنانچہ اس زمانہ میں بیسیوں اشخاص نے اسکی کوشش کی لیکن تجربہ کے وقت سب ناکام رہے بلکہ اکثر مدعیان ایجاد کو ضربات شدیدہ پہنچیں، چند ماہ ہوئے کہ یہ شوق از سر نو پیدا ہوا ہے اور اب پھر متعدد کمپنیوں نے انعامی اعلانات شائع کرائے ہیں، اٹلی کے انعام کی تعداد دس ہزار لیٹر ہے، فرانس کے انعام کی دس ہزار فرانک اور امریکہ کے انعام کی ایک ہزار ڈالر، توقع ہے کہ ہوائی جہازوں، طیاروں کے پہلو بہ پہلو عنقریب ہوائی بائسکلوں کا بھی رواج ہو جائیگا،

جس طرح انجمن اقوام کچھ روز سے قائم ہوئی ہے، اسی طرز پر ایک بین الاقوامی انجمن اخلاقی تعلیم و تربیت کے لئے یورپ میں بارہ تیرہ سال سے قائم ہے، اسکا پورا نام انٹرنیشنل مارل ایجوکیشن کانگریس ہے، اسکا پہلا جلسہ لندن میں ۱۹۰۷ء میں منعقد ہوا، دوسرا ۱۹۱۲ء میں بمقام ہیگ (ہالینڈ) اور تیسرا ۱۹۱۵ء میں پیرس میں ہونیوالا تھا،



مگر جنگ کے باعث ملتوی ہو گیا، انجمن مذکور اس وقت سے نیم مردہ تھی، ۱۹۳۱ء سے اس میں دوبارہ آثار حیات پیدا ہوئے ہیں، اور اب اسکا آئندہ اجلاس ۱۹۳۱ء میں بمقام پیرس منعقد ہوگا، انجمن مذکور کا مقصد محض اخلاقی تعلیم کی ترویج و اشاعت ہے اسے کسی مذہب و ملت، قوم و ملک سے تخصیص نہیں، اس کے ارکان میں عیسائی و یہودی، ہندو و مسلمان، دھرمیہ و لاادریہ، چینی و جاپانی، افریقی و ایشیائی سب شامل ہیں، اسکی مجلس انتظامیہ کے تین ارکان ہندوستانی ہیں، ایک سر دیو پرشاد سر بہدکاری (دایس چانسلر کلکتہ یونیورسٹی) دوسرے مسٹر کے، انٹارجن، ایڈیٹر انڈین سوشل ریفارمر (ممبئی)، اور تیسرے مسٹر عبداللہ یوسف علی، ایم، اے، دیگر ارکان مجلس میں سر مائیکل سیدلر، سرفرائس بنگ ہینڈ وغیرہ کے نام نظر آتے ہیں، صدر مجلس سرفریڈرک پولک، اور سکریٹری مسٹر اف، جی، گولڈ ہیں جو ۱۳ سالہ میں کئی ماہ تک ہندوستان میں سیاحت کر چکے ہیں، اور جنھوں نے حال میں اہل ہند کے نام ایک اپیل شائع کیا ہے کہ اس انجمن میں کثرت سے شریک ہوں اور اسے اپنے مشوروں سے مدد دیں،



# اشعار علیہ السلام

## نامہ غالب

بنام حضرت سید ابوالحسن علیہ السلام الشہر شاہ فرزند علی اہدی فرودسی میری القلص سمعی تلمیذ غالب مرحوم

منا غالب مرحوم کے اردو خط کا ایک ایک حرف تدریشان غالب کی آنکھوں کی سرسبز  
 مرزا مرحوم کے جو مجموعہ خطوط شائع ہو چکے ہیں، ان کے علاوہ ملک میں ابھی اور بہت سی  
 غیر منظرین کے علاوہ کے خاندان میں موجود ہیں، بظہر اسکے مجھے معلوم ہوا کہ شاہ آباد کے  
 کے ایک علی خاندان میں بھی یہ نقلی نوادر موجود ہیں اور وہ اسکے طبع کے اہتمام میں ہی ہیں انہی  
 خواہش کی تھی کہ وہ سارف میں چھاپنے کو چند خطوط عنایت کریں مگر ہمارے ملک میں  
 اخفا سے نوادر کی جو بیماری ہے، اس نے اجازت طبع نہ دی، ہم اپنے دوست مولوی  
 حکیم محمد عثمان صاحب ندوی کے مشکور ہیں کہ ان کے ذریعہ سے یہ نامہ غالب ہم تک پہنچ سکا،  
 حضرت شاہ فرزند علی رحمہ اللہ صوبہ بہار کے علماء و صوفیائے مشاہیرین میں نمونہ اولین تھے،  
 ذوق ادب ان کا فطری وصف تھا، راحت روح سہل و روان نقی و وسیع درگاہیں امداد  
 عبارت میں بطور افسانہ تصوف پر ایک بہترین تصنیف انہی سے یادگار ہے،

زبدہ اولاد حضرت خیرالامام قبلہ و کعبہ مجموعہ اہل اسلام حضرت پیر و مرشد عالم مقام کی  
 خدمت میں فقیر غالب کی بندگی قبول ہو، اپنے اجداد ابا کے بڑے غلام کو آپ نے اتنا کیوں  
 بڑایا کہ وہ بیچارہ شرم سے پانی پانی ہوا جاتا ہے، کافی تھا اور اتنی اشعار کا بیحد بیاد رکھ  
 اصلاح کی اجازت دینی، میری مدح آپ کے غلاموں کو موجب تنگ دھار اور میرے آباء

د اهداد کو ذریعہ عرف و افتخار، حکم بجالایا، دو ایک جگہ املا کی صورت بد گئی، کہیں مصرعہ کی جگہ مصرعہ لکھا گیا، بے غائلہ تکلف و تملق آپ کا کلام معجز نظام ہے، لفظ عمدہ، ترکیب اچھی، معنی بلند، فقیر اپنا حال زار لکھتا ہے، اکہتر برس کی عمر، پاؤں سے اپانچ، کانوں سے بہرا، دن رات پڑا رہتا ہوں، دو سطرین لکھیں بدن تہرپا، حرف سوچنے سے رہا، تو تین ساقط جو اس محفل، غذا قلیل بلکہ اقل، ۵

عمر بھر دیکھا کئے مرنے کی راہ مر گئے پر دیکھئے دکھلائی کیا

ایام شباب میں کہ بحر طبع روانی پر تھا، جی میں آیا کہ غزوات صاحب ذوالفقار لکھنا چاہیئے حمد و نعت و مقبت و ساقی نامہ و معنی نامہ لکھا گیا، داستان طرازی کی توفیق پنائی، ناچار اُس آہٹہ سو نو شعر کو چھپوا لیا، اغلاط برہان قاطع از روئے انصاف نکالے، اور اس کا ایک رسالہ مرتب کیا، قاطع برہان اس کا اسم، اور درفش کا دیانی اس کا علم، ان دونوں رسالہ نامہ مطبع کو ایک پارسل میں اور حضرت کے بیٹھے اور اراق بھی اسی پارسل میں اور یہ خط جدگانہ ڈاک میں بھجوا دیا اور توقع رکھتا ہوں کہ اسکی رسید روز و ردیا اسکے دوسرے دن لکھی جائے،

# اخترِ بیبا

## افاداتِ اکبر

جس بات کو مفید سمجھتے ہو خود کر دو      اور دن پہ اسکا بار نہ اصرار سے دہر دو  
 کافی ہی بس یہ وعظ کہ غیرت ضرور ہے      تقویٰ بہت ضرور ہے اللہ سے ڈر دو  
 حالات مختلف ہیں ذرا سوچ لو یہ بات      دشمن تو چاہتے ہیں کہ آپس میں لڑ دو

مجھے کیا خبر یہ ہے کیا اثر نہ وہ ہوش ہی نہ وہ جان ہے  
 فقط اک نظر ہے جہاں پر نہ خیال ہے نہ زبان ہے  
 نہ دماغ صرف رہ نظر، نہ دلیل باعثِ ورود سر  
 وہی جوش لذت دید ہے نہ قیاس ہی نہ گمان ہے  
 نہ بیان حدوں کا نشان کہیں نہ محل حرف و بیان کہیں  
 مرا عشق ہے ترا حسن ہے، مری آنکھ ہی تری شان ہے

# بَابُ الْمَعَارِفِ الْعِلْمِيَّةِ

## لباب المعارف العلیہ

نی

### مکتبۃ دارالعلوم الاسلامیہ

ہم نے پہلے لکھا ہے اور اب پھر کہتے ہیں کہ پشاور کے دارالعلوم اسلامیہ کی بنیاد  
تاسیس کی غرض و غایت جو کچھ ہو مگر اسکے ذریعہ سے کم از کم اتنا ضمنی فائدہ ضرور پہنچا ہے کہ صوبہ  
سرحدی بین علم و فن کا ایک مرکز قائم ہو گیا ہے، اور اب یہ مسلمانوں کا کام ہے کہ اسکو صحیح مصرف  
میں صرف کریں،

دارالعلوم پشاور کے مشرفی کتب خانہ کا ذکر معارف کے کسی گذشتہ سال کے پرچہ میں ہو چکا ہے  
یہ کتاب جسکا نام زیب عنوان ہے، اسی کتب خانہ کی فرست ہے، جبکہ جناب مولوی عبد الرحیم صاحب  
مولوی فاضل نے بکمال محنت و جانفشانی ترتیب دیا ہے،

کتب خانوں کی فرست نویسی آجکل کی علمی دنیا میں بڑا درجہ رکھتی ہے، مسلمانوں میں اس  
قسم کی سب سے پہلی کتاب چوتھی صدی ہجری کے ایک بغدادی فاضل ابن ندیم نے لکھی، اور  
سویس کے قریب زمانہ گذرا کہ یورپ میں چھپی، اور علماء یورپ نے اس سے قیمتی فوائد حاصل کئے  
اسکے بعد مسلمان قوموں میں صرف ترکوں کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ دعویٰ کریں کہ اس میدان میں  
کوئی سبقت انہیں کے ہاتھ رہا، مفتاح السعاده طاش کبری زادہ، مدنیۃ العلوم ارنیقی،  
اور کشف الظنون حاجی چلی خلیفہ، نزک علماء کی اس فن میں بہترین تصنیفات ہیں، خصوصاً

آخری کتاب اسلام کے علمی تصنیفات کا سب سے بڑا خرمن ہے، پہلی کتاب دائرۃ المعارف حیدرآباد میں اور آخری یورپ قسطنطنیہ اور مصر میں چھپ چکی ہے اور عام طور سے متداول ہے، یورپ میں شاید ہی کوئی چوٹا بڑا کتبخانہ ایسا ہوگا جسکی فہرست نہ چھپ گئی ہو، خصوصاً برٹش میوزیم، اور فرینچ نیشنل لائبریری اور جرمنی کے سرکاری کتبخانہ کی فہرستیں اہل علم کے لئے لازوال دولت ہیں، پیرس میں بزبان فرینچ، ضخیم جلدوں میں صرف ان عربی کتابوں کی فہرست شائع ہوئی ہے جو یورپ میں چھپی ہیں، ڈاکٹر ریو کی فہرست کتبخانہ برطانیہ یورپ میں بھی مقبول ان فہرستوں میں کتابوں کے نام انکی خاص خاص خصوصیات، نا درمضامین اور تاریخی و علمی فوائد اور انکے مصنفین کے سوانح و حالات، قلمی کتابوں کے نسخوں کا ذکر، انکی اہمیت، حتیٰ کہ انکی وضع قطع، خط، تقطیع، تعداد اوراق، صنف کا غرض ہر چیز کا ذکر تفصیل ہوتا ہے۔ قسطنطنیہ کے متفرق عربی کتابوں کی مختصر فہرستیں جن میں صرف کتاب اور مصنف کے نام جداولوں میں لکھے ہیں چھپ گئی ہیں، ٹیونس کے ایک کتبخانہ کی فہرست ہمارے پیش نظر ہے، مشرق میں صرف مصر کے خدیوی کتبخانہ کی فہرست ایسی ہے جو جامع مکمل اور جدید اصول پر حاوی ہے، ہندوستان میں بنگال اور بمبئی ایشیاٹک سائینٹون کے مشرقی کتب خانوں کی فہرستیں بھی ذکر کے قابل ہیں کتبخانہ حیدرآباد کی فہرست محض کاغذی جداول ہے، جن سے اس علم کو کوئی علمی فائدہ نہیں پہنچ سکتا، اسے صرف کتاب کا نام اور بشرط غرض قسمتی مصنف کا نام اور تاریخ طبع و کتابت کا پتہ چل سکتا ہے، رامپور کے کتبخانہ کی فہرست غیر مکمل ہونے کے ساتھ ناقص بھی ہے، صرف پٹنہ کا مشرقی کتبخانہ ایسا ہے جسکی ایک قدیم فہرست محبوب الالباب کے نام سے ۱۳۱۳ھ میں مرحوم خدابخش نے لکھ کر چھپوائی تھی اور جدید اصول و مطالب پر وہ حاوی تھی، لیکن وہ صرف ساڑھے آٹھ سو کتابوں پر مشتمل ہے، حالانکہ اس کتبخانہ میں اس سے بہت زیادہ کتابیں ہیں، اور اب بڑھ گئی ہیں، اندوۃ العلماء کے

کتبخانہ کی ترتیب و تنظیم اور نئے طریق سے اسکی فہرست کی تدوین کے لئے تقریباً تین سال سے کام ہو رہا ہے، اور ایک حد تک تحریری صورت میں وہ مکمل بھی ہو چکا ہے، لیکن ابھی حلیہ طبع سے عاری ہے، ان حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے دارالعلوم پشاور کے مشرقی کتبخانہ کی اپنی فہرست کی اشاعت میں پیشقدمی اور باب علم کے خاص شکریہ کی مستحق ہے،

ان فہرستوں سے سب سے بڑا فائدہ مصنفین کی جماعتوں کو پہنچتا ہے جو کہ جیسے ہوئے نہایت آسانی کے ساتھ تمام دنیا کے علمی خزانوں کا جائزہ لے سکتا ہے، یورپ میں ایک مصنف اپنے کتبخانہ میں بیکھر یورپ کے دوسرے سرے کے کتبخانوں کی درق گردانی انکی فہرستوں سے کرتا ہے، طبع و اشاعت کے لائق کتابوں کا انتخاب ہر جگہ سے کرتا ہے، ایک کتبخانہ اپنے ناقص یا غلط نسخہ کی تکمیل یا تصحیح دوسرے کتبخانہ کے نسخہ سے کرتا ہے، طبع کے لئے ایک نسخہ کسی کتاب کا اسکو ہاتھ آجاتا ہے تو فہرستوں کو دیکھ کر وہ اسکے بیسیوں نسخے دوسرے کتبخانوں سے بہم پہنچا لیتا ہے ایک فن کی کتابوں کو جو دنیا میں کہیں بھی موجود ہیں اکٹھی کر لیتا ہے، یا کسی ایک مصنف کی تمام نادر تصنیفات کو جو دنیا کے مختلف گوشوں میں پھیلی ہوئی ہیں، فہرستوں کی توثیق سی درق گردانی سے معلوم کرتا ہے، ہمارا یہ حال ہے کہ ہم اعظم لٹہ میں بیٹھے کوئی کتاب ڈھونڈ رہے ہیں اور ہلکے بہین معلوم کہ ہمارے ہمسایہ ہی میں جو پور، بنارس یا لکھنؤ میں وہ کتاب موجود ہے معرض ان فہرستوں کی اشاعت، اشاعت علم اور تہذیب مقصد کے لئے سچ ضروری اور لجا بیت مفید ہیں،

زیر نظر فہرست، دارالعلوم پشاور کے مشرقی کتبخانہ کی عربی، فارسی اور اردو تصنیفات اور مصنفین کے اسماء اور حالات کا مجموعہ ہے، مصنف نے ہر صفحہ میں چار حدودین قائم کی ہیں، عدد مسلسل، نام و کیفیت عمومیہ کتاب، نام و احوال مصنف، کیفیت خصوصیہ، فہرست کی ترتیب علوم پر رکھی ہے، یعنی تفسیر، حدیث، فقہ وغیرہ، اخر میں چند ضمیمے ہیں، ضمیمہ اول بین خاص اردو کتابوں کی فہرست ہے

جہیں بہ ترتیب پہنچی اردو کتابوں کے نام دیدیئے ہیں، ضمیمہ دوم میں تمام مصنفین کے صرف نام اور انکی تصنیفات کا کتاب میں نمبر بتایا ہے، تیسرے ضمیمہ میں کتب مندرجہ فہرست کی یکجائی بہ ترتیب پہنچی فہرست ہے، چوتھے ضمیمہ میں مولوی عبدالعزیز صاحب ندوی راجکوٹی پروفیسر اور ڈوشن کالج پشاور نے فہرست مذکور پر نظر ثانی کر کے کچھ مزید امور و حالات مصنفین اضافہ کئے ہیں، ضمیمہ پنجم میں نئی کتابوں کا جو اثناے تدوین میں آئیں مختصر ذکر ہے، ہر علم کی فہرست شروع ہونے سے پہلے اس علم کی مختصر تاریخ بھی لکھی گئی ہے سب سے پہلے ہکو اس فہرست کو جدولوں پر منقسم کرنا ناپسند آیا، بہتر ہوتا اگر یورپ اور مصر کی فہرستوں کے طریق پر سہل عبارت کی صورت میں یہ لکھی جاتی، اس سے کتابت کے حسن اور کاغذ کی کفایت میں بھی فائدہ ہوتا، علوم و فنون کی تہدید تاریخیں ناسلی بخش اور محتاج تبصرہ ہیں، صرف ان مصنفین کے حالات لکھی جوتاریخ نامی پر لکھے ہیں وہ مصنفین جنکے حالات مقدم میں لے کتابوں میں نہیں لکھے یا ہکو ہم سے جدا ہوئے کچھ ہی عرصہ گزر رہی انکے حالات سادہ ہیں، حالانکہ اسکی تکمیل کچھ مشکل تھی معروف و منند اہل مصنفین اور تصنیفات کے حالات زیادہ اور مخصوص اور معلوم لوگوں اور کتابوں کے کم، حالانکہ منقشی اسکا اٹانتا، علمائے کبار کو ضمیمہ پنجم مولانا "اور علمائے لکھنؤ چھ ضمیمہ واحد اور ضمیر واحد سے ذکر کرنا ہم صحیح نہیں سمجھتے، کتاب کے آخر میں مصر کی عربی دائرۃ المعارف کی مسلمانان مصر کی طرف نسبت غیر صحیح ہے، وہ عیسائیوں کے برکات علی میں شامل ہے، سلیمان لبتانی بیروت کا ایک عیسائی فاضل ہے،

بایں ہمہ ہم اس فہرست کا نہ دل سے خبر مقدم اور اسلامی کتب خانوں کے براہ ترنی ایک قدم اور بڑھنے پر ارکان کتب خانہ مشرقی دارالعلوم پشاور کو مبارکباد دیتے ہیں، اس فہرست کے مدون جناب مولوی عبدالرحیم صاحب پنجاب کے فضلائے علم میں ہیں، انکے رشحات فکر سے ہم اور بہت سی توقعات قائم کر سکتے ہیں، فہرست مذکور میں کل دو ہزار اٹھائیس کتابوں کا تذکرہ ہے، اہل علم جو مصنفات اور مصنفین اور نوادر کتب کا ذوق رکھتے ہیں ہکو یقین ہے کہ یہ کتاب انکو پسند آئے گی، قیمت غیر،



## مطبوعات جدید

غزلیات نظیری، نظیری نیشاپوری، ان شعرائے باکمال میں ہے جسکے ایک ایک شعر پر اہل معنی سر دہنتے ہیں، خوش قسمتی سے پنجاب یونیورسٹی نے اسکی غزلیات کے حصہ کو ایم اے اور منشی فاضل کے کورس میں داخل کیا ہے، اس تقریب سے یہ نوبت آئی کہ نظیری کے غزلیات کا مجموعہ شیخ مبارک علی صاحب تاجر کتب لاہوری دروازہ لاہور نے شائع کر دیا ہے، مجموعہ مذکور دیہی سفید کاغذ پر صاف خط میں اچھا چھاپا گیا ہے، ۷۵ صفحوں میں یہ مجموعہ غزلیات تمام ہوا ہے، قیمت ۵۰، تاجر موصوف سے ملے گی،

چترا، راجندر ناتھ ٹیگور کے ایک افسانہ کا جناب عبد المجید خان سالک بٹالوی نے اردو میں ترجمہ کیا ہے، ترجمہ ردان اور صاف ہے، چوٹی نفل کے ۷۹ صفحوں پر دارالاشاعت پنجاب لاہور نے اسکو شائع کیا ہے، اور سلسلہ لکھنشان کا یہ دوسرا نمبر ہے، قیمت ۱۲،

خیر الکلام، جناب منشی فاضل ابوالخیر محمد غیر اللہ صاحب (درنگل، وکن) نے اس نام سے مفید و نافع احادیث مبارکہ کا مجموعہ تیار کیا ہے، اسنے کی دوسری جد دل میں ان کا بحاورہ اردو ترجمہ کیا ہے، کل احادیث ۷۰۰ ہیں، انکو بہ ترتیب تہجی جمع کیا ہے، یہ اچھا کیا ہے کہ ہر حدیث کے آخر میں ماخذ کا حوالہ دیدیا ہے، ۶۴ صفحات، طبع عمدہ قیمت معلوم نہیں، مترجم موصوف کے پتہ سے ملے گی،

فاطمی دعوت اسلام، جناب خواجہ حسن نظامی صاحب چند سالوں سے تالیف اسلام کے اس شعبہ پر کتب و رسائل کا ایک بڑا ذخیرہ ہماری زبان میں فراہم کر رہے ہیں، ہم نہیں جانتے کہ

انکی ان تعصیف کا مقصد کیا ہے، مگر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان تمام تیرون کا ایک نہ ایک ہدف ہے، باوجود اس نیاز محنت کے جو ہمارے انکے درمیان ہے، ان مباحث پر ہمارے انکے رائے کا اختلاف ناظرین سے مخفی نہیں،

اس کتاب میں خواجہ صاحب نے سادات بنی فاطمہ اور مدعیان سیادت فاطمی کی ان کوششوں کو جمع کیا ہے جو اپنے مذہب کی تبلیغ و اشاعت میں ان سے ظہور میں آئیں ہم نے سادات بنی فاطمہ اور مدعیان سیادت فاطمی کے دو لفظ استعمال کئے ہیں اور انکے لئے اپنی مذہب کی تبلیغ و اشاعت کا ذکر کیا ہے، اس سے مقصود یہ ہے کہ سادات بنی فاطمہ نے اپنے آبائی مذہب (اسلام) کی تبلیغ کی، اور مدعیان سیادت فاطمی نے اپنے آبائی مذہب کی لینی ایران میں جو سیت کی آمیزش کے ساتھ اور ہندوستان میں ہندو سیت کی ترکیب و اختلاط کے ساتھ اچھا ہوتا اگر خواجہ صاحب حق و باطل کے ان دونوں حدود کو الگ الگ رکھتے، آخر میں دیکھ کے بہت سے مسلمان فقراء کے فرقوں کا دلچسپ بیان اضافہ کیا ہے، ہمارا خیال ہے کہ دکن کی سرزمین جس میں گجرات، کاتھیاوار، ہمارا شتر اور دکن خاص کے تمام ممالک داخل ہیں، مذہب عالم کا ایک زندہ نمائش گاہ ہے، مل و نخل کی کتابوں میں جن فرقوں کا نام ہم سنتے ہیں، اور انکو عدم واقفیت سے ہم مفقود سمجھتے ہیں کسی نہ کسی نام کے ساتھ ہم انکو وہاں ضرور پائیں گے، بہر حال خواجہ صاحب کے لٹریچر کے قدر دانوں کے لئے یہ ایک نیا سلسلہ بھی دلچسپ کا باعث ہوگا، ضخامت ۴۰ صفحات، قیمت ۳۰۰ روپے، خواجہ بک ڈپو دہلی،

جلد ہشتم

ماہ ربیع الثانی ۱۳۹۹ مطابق دسمبر ۱۹۷۸ء

جلد ہشتم

## مضامین

## شذرات

خلافت اور ہندوستان

قدیم اور جدید علم ہیئت مولوی محمد سعید صاحب انصاری - ۲۳۹

- ۲۴۰

جرمنی اور علوم و فنون

۲۵۲-

امن عالم

۲۵۹-۲۵۳

آزادی روح

۲۶۰-۲۶۷

اخبار علمیہ

مولوی عبدالمجید صاحب بی، اے ۲۶۸-۲۷۹

تقریظ و انتقاد

- ۲۸۰

مطبوعات جدیدہ

## مطبوعات جدیدہ

سیرۃ عائشہؓ، از مولانا سید سلیمان ندوی، ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کے احوال زندگی کی تفصیل، قرن اول کے خانہ جنگیوں کے اصلی اسباب کی تشریح، ام المؤمنین کے فضائل اخلاق کا بیان اور ان کے علمی اجتہادات و کمالات پر تبصرہ چھپکرتیار ہے ضخامت ۳۵۵ صفحہ قیمت درجہ اول (کاغذ مطبع اعلیٰ) ۳۳ روپے، درجہ دوم ۳۳ روپے، درجہ سوم (کاغذ میسی سفید) ۲۸ روپے۔

”منیجر“

## مشکلات

مشرقی لٹریچر کے ہوا خواہ بالعموم، اور ڈاکٹر اقبال کے کلام کے مداح بالخصوص اس خبر کو سن کر خوش ہونگے کہ انکی مشہور فارسی شہنوی اسرار خودی کا انگریزی ترجمہ لندن میں چپ کر شائع ہو گیا ہے، مترجم کیمبرج یونیورسٹی کے ممتاز مشرقی پروفیسر گلسن بین جو اسلامی ادبیات و تصوف پر متعدد تصانیف کے مصنف ہیں اور عربی و فارسی کی چند نادرومیش بہا کتا بین ایڈٹ کر چکے ہیں، اس ترجمہ پر انھوں نے بکثرت حواشی دیئے ہیں، اور ایک بسوط مقدمہ بھی تحریر کیا ہے، ٹائمز لٹریچر پبلیسٹ، دوبار اسپرلوٹ لکھ چکا ہے، جو علمی حلقوں میں کتاب کی اہمیت و مقبولیت کی ایک واضح دلیل ہے، سطور ہذا کی تحریر کے وقت تک کتاب ہندوستان نہیں پہنچی ہے،

عربی و فارسی لٹریچر سے یورپ کو جب قدر و اعتنا رہے، غنیمت ہے، لیکن حیرت و تاسف کا مقام ہے کہ اردو کی جانب اسکی بے اتفاقی ہنوز جون کی توں ہے، حالانکہ ہندوستان کے بیشتر حصوں کی زبان اردو ہی ہے، اور سات کروڑ مسلمانوں کی مشترک زبان تو صرف یہی ہے، انکے اخبارات اسی زبان میں نکلتے ہیں، انکے علمی و ادبی رسائل اسی زبان میں شائع ہوتے ہیں، انکے شاعری کی یہی زبان ہے، انکے گہروں میں یہی زبان بولی جاتی ہے، انکی تصنیف و تالیف اسی زبان میں ہوئی ہے، انکے سیاسی جذبات کی ترجمانی یہی زبان کرتی ہے

انکی مجاہد و غلط و محافل میلاد وغیرہ میں ہی زبان مستعمل رہتی ہے، غرض انکی سیاسی، تعلیمی، مذہبی، قومی، خانگی، اعلیٰ، ہر قسم کی اجتماعی زندگی کی روح رواں یہی زبان ہے، ایسی حالت میں اس سے اس بے انتہائی دے اعتنائی کا ظہور یورپ اور خصوصاً انگلستان کی جانب سے جسے ہندوستان پر حکومت کرتے ڈیڑھ سو سال سے زائد ہو چکے ہیں جعفر ہمارے لئے حیرت انگیز ہے اسقدر اُنکے لئے افسوسناک ہے،

میر دور، غالب و مومن، انیس و دبیر، حالی و اکبر، سرسید و آزاد، نذیر احمد و شبلی جس زبان کے خزانہ کو اپنے جواہر پاروں سے مالا مال کر چکے ہیں کیا اسکے وجود کی بھی خبر کیہ سرج و دم کسفر و کے ایوانہائے علم تک پہنچی ہے؟ پروفیسر براؤن کو فارسی زبان ادب سے جو شغف ہے وہ خود مسلمان علماء کے لئے باعث رشک ہے، فارسی سے متعلق جو کچھ بھی لکھا جاتا ہے، اسکے حرف پر انکی نظر رہتی ہے، لیکن براہین ہمہ کاوش و تحقیق، شغف و اہتمام، حال یہ ہے کہ ہندوستان کا ایک محقق فارسی شاعری کی مفصل و مبسوط تاریخ شائع کرنا ہے، (شعر العجم) اور سالہا سال تک براؤن صاحب کو اس کتاب کے وجود کی خبر نہیں ہوتی ہے، اور آٹھ دس سال کے بعد بھی انکی رسائی بمجملہ پانچ جلدوں کے کتاب کی صرف ابتدائی دو جلدوں تک ہوتی ہے، یہ کیوں؟ محض اسلئے کہ کتاب اردو میں تھی، مستشرقین کی جماعت قدیم اسلامی لٹریچر کی جو کچھ خدمت کر رہی ہے، اسکا اعتراف بارہا ان صفحات میں ہو چکا ہے، لیکن ماضی کی یاد میں حال سے بالکل بیخبر رہنا کونسی دانشمندی؟

ڈین انگ، جبکہ ایک فلسفیانہ مضمون کی تلخیص اسی نمبر میں ملیگی، ایک جید مذہبی

عالم ہونے کے ساتھ ہی مستند فلسفی بھی شمار کئے جاتے ہیں، چنانچہ حال ہی میں ارسطائیں جیسا (جمعیت ارسطاطالیسی) نے جو انگلستان کی سب سے بڑی فلسفیانہ انجمن ہے، انکو اپنا صدر مجلس منتخب کیا ہے، ریورنڈ موصوف نے کرسی صدارت پر بیٹھے ہی حاضرین کے سامنے ایک خاص استدلال پیش کیا جسکے قضا یا خلاصہ ہم ناظرین معارف کے لکھنؤ کے لئے بیان درج کرتے ہیں،

(۱) سینا گوگراف (متحرک تصویر) کے پردہ پر جب کسی مرتب و مسلسل واقعہ کی تصویر آتاری جاتی ہے تو اسکی ترتیب اصل واقعہ کے بالکل برعکس ہوتی ہے، مثلاً اگر یہ دکھانا منظور ہوتا کہ ایک شخص ۵۰ فٹ میں غوطہ لگانا چاہتا ہے تو اس منظر کی ترتیب یوں دکھائی دیتی ہے کہ پہلے ایک ساکر، حوض نظر آتا ہے، پھر اسمین تلاطم پیدا ہوتا ہے، پھر اسکے اندر سے دوپیر نکلتے ہیں، رفتہ رفتہ ایک بلندی نمودار ہوتی ہے، یہاں تک کہ بالآخر ایک مکمل انسانی شکل پیدا ہوتی ہے، جسکے ہاتھ اُدپر کو اٹھے ہوئے ہیں اور جو حوض میں جست کر نیکو تیار ہے۔

(۲) یہ بھی ایک بدیہی حقیقت ہے کہ ایک ہی واقعہ جو ایک شخص کے لئے داخل ماضی ہے دوسرے کے لئے مستقبل کا حکم رکھتا ہے، شہر کے گھنٹہ گھر میں جب گھنٹہ بجتا ہے تو جو لوگ ہمسایہ ہیں وہ فوراً سن لیتے ہیں، اور جو لوگ دور کے محلوں میں رہتے ہیں ان تک اسکی آواز چند سکند کے اندر پہنچتی ہے، اور اس درمیانی وقفہ میں وہی آواز بعض افراد کے لئے حکم ماضی میں داخل رہی، اور بعض کے لئے مستقبل میں،

(۳) لیکن ادراک ہمیشہ ادراک ماضی ہوتا ہے، ادراک کے معنی ہی یہ ہیں کہ کسی شے کا جو واقع ہو چکی ہے، شعور ہم کو ہو،

(۴) اس سے معاذم یہ ہوا کہ ہماری اصطلاح میں ماضی و مستقبل دونوں محض اضافی مفہوم

رکتے ہیں، یعنی جس ترتیب سے واقعات ہمارے شور میں آتے رہتے ہیں، ان پر ماضی و مستقبل کا اطلاق اسی کے لحاظ سے کیا جاتا ہے، مثلاً ہمارے لئے اس واسطے ماضی ہے کہ اسکے واقعات ہمارے شور میں آچکے ہیں، اور ۱۹۳۷ء سے مستقبل ہے کہ اسکے واقعات ہمارے شور میں نہیں آئے ہیں،

(۵) اس صورت میں بالکل ممکن ہے کہ جن ہستیوں کا شور ہمارے شور سے مختلف ہے انکے لئے ماضی و مستقبل بھی بالکل جداگانہ مفہوم رکھتے ہوں اور جو ہستی شور مطلق یا ہمہ دانی سے متصف ہوگی، اسکے لئے ان الفاظ کے کوئی معنی ہی نہ ہونگے،

ان قضایا کے پیش کرنے کے بعد فہل موصوف بالآخر اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ماضی و مستقبل، مقدم و مؤخر علت و معلول کوئی مستقل وجود نہیں رکھتے بلکہ اس ہستی مطلق کے جو قید زبان سے آزاد ہے، محض مظاہر و شہود ہیں،

سن ۱۸۵۷ء کو علی گڑھ میں اُس ”مسلم“ یونیورسٹی کا افتتاح ہو گیا، جو سر سید مرحوم کے ”رہنمایہ یوسفی“ کی تعمیر خیال کیجاتی ہے، اگر یہ عید شام کو نہ ہوئی ہوتی تو داکٹر چانسلر کا نفرین صرف سڑیچے بال میں گونج کر نہ رہ جاتا، بلکہ اسکی آواز بازگشت سارے ہندوستان میں سنائی دیتی۔ اور ہم بھی بغداد و قرطبہ کی کھوئی ہوئی دولت کا اسکو نشان باز یافت سمجھ کر خوش ہوتے لیکن اب تو اگر ہم اسکو اسحیات بھی سمجھا چاہیں، تو بھی مسلمانوں کی ”مرگ آرا غیرت قلم پر پڑی ہے“ اور عرفی کی زبان سے کہتی ہے کہ

مفت بازیچہ عیسیٰ کش بہر حیات      از رشِ مدون پر بس ”انفسِ مرگ آرا“ من

# مقالات

## خلافت اور ہندوستان

آج کل مسئلہ خلافت نے ہندوستان میں جو اضطراب اور بیجان پیدا کر رکھا ہے، کوتاہ بین سمجھتے ہیں کہ یہ صرف موجودہ زمانہ کی آزادی طلبی اور جنبش سیاسی کی ایک لہر ہے، اس مضمون میں یہ دکھانا ہے کہ خلافت اسلامیہ سے ہندوستان کا تعلق کس قدر پرانا اور گہرا ہے، اور ہمیشہ سے اس کو آستانہ خلافت سے کس درجہ عقیدتمندی اور ارادت رہی ہے، اور مسلمانین ہند خلفائے اسلام کو کس عظمت دینی اور وقت مذہبی کی نگاہ سے دیکھتے تھے،

عرب اور ہندوستان کا تجارتی تعلق تاریخ کی عمر سے ہی زیادہ قدیم ہے، اسلام جب عرب کی سر زمین میں رونما ہوا، تو اس کے آس پاس کے دوسرے ملکوں کی طرح ہندوستان بھی غیر متاثر نہیں رہا، تحفۃ المجاہدین کی روایت کے مطابق، سواحل ہند تک اسلام کی مصالجانہ دعوت خود آنحضرت صلعم کی زندگی میں پہونچ چکی تھی، ملیبار کے راجہ نے مذہب اسلام کی تحقیق کے لیے عرب میں جو وفد بھیجا تھا وہ خلافت اولیٰ یعنی حضرت ابو بکر صدیق کے عہد خلافت میں مدینہ پہونچا تھا، اور وہاں سے پر تو اسلام سے منور ہو کر ملیبار واپس آ گیا تھا، یہ روایت اگر صحیح ہو تو ہندوستان و خلافت کے باہمی تعلق کا یہ پہلا دن تھا،

سندھ کا علاقہ ایران کے زیر اثر ہونے کے باعث، ایران کے فتح ہونے کے بعد خود بخود مسلمانوں کے زیر اثر ہو گیا، اس کے سواحل سلمان تاجرون اور مسافرون کے رگھڑ



اور رشتہ داران و بلوچستان کے علاقے مسلمان فوجوں کے معسر کرتے، بہر حال حضرت عثمان کے عہد خلافت سے ہندوستان اور خلافت اسلامیہ کے درمیان ایک ایسا مضبوط رشتہ قائم ہو گیا جو آج تک بدستور باقی ہے، خلافت راشدہ کے بعد بنو امیہ جب خلافت اسلامیہ کے مالک ہوئے تو مسلمانانِ ہند نے بھی دوسرے ملک کے مسلمانوں کی طرح او کو خلیفہ تسلیم کیا، حضرت عمر بن عبدالعزیز اموی جب مسندِ آرائے خلافت ہوئے تو اوہنوں نے یہاں کے روساء کے نام دعوتِ اسلام کے خطوط لکھے، چنانچہ اونکی ذاتی نیکی، زہد و اتقا، اور عدل و انصاف کو دیکھ کر بہت سے راجہ مسلمان ہو گئے، اور عربوں کے جیسے اپنے نام اوہنوں نے رکھنے شروع کیے، آغاز خلافت راشدہ سے لیکر خلفائے بنی امیہ کے اخیر عہد تک دربار خلافت کی طرف سے جو لوگ وقتاً فوقتاً نائب ہو کر یہاں آتے رہے، انکے نام حسب ذیل ہیں:

شمار	نائبین خلافت کے نام	خلفاء کے نام	سنین
۱	حکیم بن جبلة العدوی	حضرت عثمانؓ	
۲	حارث بن مرثدہ عبدی	حضرت علیؓ	۳۹ھ
۳	مطلب بن ابی حفرہ	امیر معاویہ	۴۳ھ
۴	عبداللہ بن سوار العبیدی	"	
۵	راشد بن عمرو التجیدی لازدی	"	
۶	سنان بن سلمۃ المذلی	"	
۷	زیاد المنذر بن جارد العبیدی		
۸	عبید اللہ بن زیاد الباہلی		
۹	سعید بن اسلم الکلابی		

- |    |                           |                        |
|----|---------------------------|------------------------|
| ۱۰ | محمد بن سمرائیمی          |                        |
| ۱۱ | محمد بن ہارون النمری      |                        |
| ۱۲ | عبد اللہ بن بہان          |                        |
| ۱۳ | محمد بن القاسم اشقی       |                        |
| ۱۴ | یزید بن ابی کبشہ اسکلی    | سلیمان بن عبد الملک    |
| ۱۵ | حبیب بن مہلب              |                        |
| ۱۶ | عمر بن مسلم الباہلی       | حضرت عمر بن عبد العزیز |
| ۱۷ | جندب بن عبد الرحمن المرزی | ہشام بن عبد الملک      |
| ۱۸ | تیم بن زید العتبی         |                        |
| ۱۹ | حکم بن عواد کلبی          |                        |
| ۲۰ | منصور کلبی                |                        |

اسکے بعد بنو عباس کا دور شروع ہوا، بنی امیہ کے اخیر عہد میں تیم کی نیابت نہایت کمزور اور ضعیف رہی، اور مسلمانوں کو سخت تکلیفیں پہنچیں محفوظ نام ایک شہر بسا کر اوس میں محصور رہا لیکن بنو عباس کے تخت نشین ہونے کے ساتھ اسے سر نو مسلمانوں میں نئی قوت پیدا ہوئی، خلیفہ منصور نے مغس عہدی کو بیان اپنا نائب بنا کر بھیجا، اور اسکے نام سے سندھ میں منصورہ شہر آباد ہوا، اسکے بعد اسکے دوسرے نائب موسیٰ بن کعب تیمی نے نئی سرو سامان سے خلافت عباسیہ کی قوت کو بیان نمایاں کیا، منصورہ کی مرمت کرائی، یہاں کی جامع مسجد کو وسیع کیا، خلیفہ مامون کے عہد میں بشر بن داؤد وہاں کا نائب مقرر ہو کر آیا، لیکن وہ یہاں آکر باغی ہو گیا اوسکی سرکوبی کے لیے غسان بن عیاد دوسرا نائب بھیجا گیا، غسان کے بعد آل برکات میں سے

موسیٰ بن یحییٰ یہاں نائب ہو کر آیا، یہاں اوسے شہر ریضا آباد کیا، خلیفہ معتصم آخری طاقتور عباسی خلیفہ ہے، اس کے عہد میں موسیٰ برکی کا بیٹا عمران نائب مقرر ہوا، اس کے بعد خلفائے عباسیہ کے سیاسی ضعف نے ہندوستان کو سیاست مرکز خلافت سے الگ کر دیا، تاہم مذہباً وہ ہمیشہ خلفائے عباسیہ کا مطیع و فرمانبردار رہا، اور انہیں کے نام کے خطبے یہاں پڑھ جاتے تھے، خلفائے عباسیہ کے عہد میں جو لوگ وقتاً فوقتاً، خلیفہ عہد کے نائب ہو کر آئے اونسے

نام بہ ترتیب یہ ہیں،

شمار	نائبین خلافت کے نام	خلفائے کے نام
۲۱	مفلح عبدی	خلیفہ منصور
۲۲	موسیٰ بن کعب تمیمی	"
۲۳	ہشام بن عرقعلی	"
۲۴	عمر بن حفص	
۲۵	داد بن یزید بن حاتم	
۲۶	بشر بن داد	خلیفہ مامون
۲۷	غان بن عباد	"
۲۸	موسیٰ بن یحییٰ برکی	"
۲۹	عمران بن موسیٰ برکی	خلیفہ معتصم

خلیفہ معتصم کے بعد سیاسی حیثیت سے سندھ کی حیثیت ایک خود مختار ریاست کی ہو گئی ملک کا بڑا علاقہ مسلمانوں کے ہاتھ سے ٹکلیا، تاہم وہ اس ملک کو چھوڑنے پر مجبور نہیں ہوئے سندھیوں نے مسلمانوں کی مسجدوں کو ہاتھ نہیں لگایا اور انکی مذہبی آزادی کو برقرار رکھا،

اور فریبادہ ہمیشہ خلفائے بغداد کے ماتحت رہی، چنانچہ وہ مجمعہ کے خطبہ میں خلیفہ، وقت کا نام لیتے تھے، مورخ بلاذری جسے ۲۹۷ھ میں وفات پائی ہے فتوح البلدان میں شہادت دیتا ہے،

ثم ان الصند غلبوا على السندان فتركوا  
بہر اہل ہند، سندان پر غالب آگئے، لیکن وہ ان کی  
مسجد ہا المسلمین یجمعون فیہ و  
مسجد کو مسلمانوں کیلئے چھوڑ دیا، جن میں وہ جوہر کی نماز  
یلعون للخلیفة، (فتوح السند)  
پڑھتے ہیں اور خلیفہ کے لیے دھا کرتے ہیں،

اسکے بعد سندھ کی تاریخ پر ایک سیاہ پردہ پڑ جاتا ہے، صرف مسلمان سیاحوں کے متفرق بیانات سے اس پردہ میں کبھی کبھی کوئی روزن پڑ جاتا ہے، جس سے اندہ کا حال ایک آدھ چکر معلوم ہو سکا ہے، اس سے بہر حال یہ بات پایہ وثوق کو پہنچتی ہے کہ مسلمانوں کی جو کچھ آبادی یہاں رہ گئی تھی وہ برابر کسی نہ کسی خلافت کے دامن سے اپنے کو وابستہ سمجھتی رہی، بعد کو مسلمانوں میں یہاں دو فرقے ہو گئے تھے، ایک اہل سنت و دوسرے باطنیہ شیعہ، اہل سنت کامرکز بدستور خلافت عباسیہ تھی، لیکن باطنی شیعہ مصر کے فاطمی سلاطین کو اپنا خلیفہ جانتے تھے، بشاری مقدسی جو چوتھی صدی میں ہندوستان آیا تھا منصورہ پایہ تخت سندھ کے حال میں لکھتا ہے،

واما المنصورۃ فلیحاط سلطان من  
منصورہ میں ایک مستقل بادشاہ ہے جو نڈا  
قریش، یخطبون للعباسی،  
قریشی ہے، یہاں کے مسلمان خلیفہ عباسی کا خطبہ  
رصفہ ۴۸۵، مطبوعہ یورپ،  
پڑھتے ہیں،

مندان کے تذکرہ میں کہتا ہے،

واما بالملتان فیخطبون للفاطمی ولا یحلون  
لیکن ملتان میں خلیفہ فاطمی کے نام کا خط پڑھتے ہیں  
ولا یحقدون الا بامرہ وابداءا رسلم  
اور اسی کے احکام کی تعمیل کرتے ہیں یہاں کے مسلمان

وہذا یا ہم تذہب الی مصر، اپنی اور تحالف ہمیشہ معر جاتے رہتے ہیں،

چو مسلمان افغانستان کی راہ سے ہندوستان آئے، انہیں سب پہلانا نام سلطان محمود غزنوی کا ہے، سلطان کی سیاسی طاقت اور فوجی قوت کا یہ حال تھا کہ وسط ایشیا میں اس سے کوئی بڑی طاقت اور قوت موجود نہ تھی، بلکہ یہ کتنا صحیح ہو گا کہ یہ اپنے زمانہ میں سب سے بڑا طاقتور مسلمان حکمران تھا، اور فوجی و سیاسی حیثیت سے خلافت عباسیہ درحقیقت بزرگوں کی مہم سس پڑیوں کا ایک ڈھانچ رہ گئی تھی، لیکن تکو معلوم ہے کہ یہ دنیا کا طاقتور انسان اس ڈھانچ سے کتنا ڈرتا تھا، اور اپنی پوری جنگی قوت و طاقت کے باوجود وہ خلیفہ عصر القادر باللہ کی اطاعت کو اپنے لیے کتنا ضروری سمجھتا تھا، ہرنئی کامیابی کا اعلان عامہ دیوان خلافت میں معمولاً بھیجتا تھا کسی نئے ملک پر قبضہ و تصرف کرنے کے لیے اسی دربار سے باقاعدہ اجازت چاہتا تھا، دربار خلافت سے فتوحات کے موقع پر اس کے لیے جو خلعت آتے تھے اس کی خوشی کسی نئے ملک کی فتح سے کم اس کو نہیں ہوتی تھی، اس کو دنیا کی بڑی سے بڑی عزت، بڑی سے بڑی عظمت اور بڑا بڑا فخر حاصل تھا، تاہم اس کی سب سے بڑی عزت، سب سے بڑی عظمت اور سب سے بڑا فخر یہ تھا کہ ایوان خلافت سے اس کو یمن والدولہ کا خطاب عطا ہو، سلطان نے گویا ان و ترکستان کے تمام ممالک اپنے زور بازو سے حاصل کیے تھے، لیکن وہ اس وقت تک ان ممالک کا جائز بادشاہ نہ ہو سکا جب تک کہ ۱۵۸۶ء میں خلیفہ نے اس کے لیے فرمان جاری نہ کیا، چنانچہ بلقات اکبری اور تاریخ فرشتہ وغیرہ کی عبارت ہے،

خلیفہ القادر باللہ عباسی القاب نامہ لسلطان محمود نوشتہ اسے خراسان و ہندوستان

و غیرہ و خواہ زم فرستاد،

خود سلطان کا لقب جو محمود سے پہلے کسی دوسرے بادشاہ نے اختیار نہیں کیا تھا، اور سب سے پہلے

محمود ہی کے لیے یہ بادشاہی کے استعمال میں آیا، یہ بھی خلیفہ ہی کی جانب سے اوسکو عطا ہوا تھا۔ ہندوستان کے باطنی اسماعیلیوں کے استیصال پر اوسکو خلیفہ نے کھٹ الدولہ والا سلام (سلطنت اور سلام کی جاے پناہ کا خطاب دیا،

سنہ ۵۷۱ھ میں ہندوستان کی عظیم الشان فتح پر دربار خلافت میں اوسنے جو عزیمت بھیجا، اوسکی کیفیت سنو: ”سلطان در شکستہ فتح نامہ کہ شمل بود بر جمع فتوحات کہ ادر ادر مالک ہندوستان روی نمودہ بود بہ بغداد فرستاد، خلیفہ القادر باللہ عباسی آزدوز محلے عظیم ساختہ فرمود تا آن فتح نامہ را بر دوس منابر پیش خلایق آباد بلند خوانند مردم بواسطہ اعلای معلّم سلام شکر ہا کردہ و زبان بستایش سلطان محمود کشادہ نصرت و ظفر ادا از حق سبحانہ و تعالیٰ مسکت نمودند۔ آزدوز در بغداد آنچنان سرور و خوشحالی انتشار یافت کہ گوی کے اعزید طے مقررہ اسلام (فرستہ) سلطان پر سب سے بڑی عنایت خلیفہ کی یہ تھی کہ اوسنے لکھا کہ ”تم جسکو اپنا ولی عہد بناؤ میں بھی اوسکو قبول کروں گا، اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ سلاطین کی جانشینی کا مسئلہ ہی خلفاء کے ہاتھ میں تھا،

سلطان محمود کے دو بیٹے تھے، امیر مسعود اور امیر محمد، سلطان امیر محمد کو چاہتا تھا تا جیکہ از خلیفہ عباسی التماس نمود کہ اسم امیر محمد را بر سلطان مسعود مقدم نویسد،

لیکن ایسا نہ ہو سکا، سلطان محمود کے بعد امیر مسعود بادشاہ ہوا، اور امیر محمد نے بھائی سے شکست کھائی، امیر مسعود کو دربار خلافت سے جلال الدولہ جمال الملک کا خطاب پہلے ہی عطا ہو چکا تھا۔ افسوس ہے کہ ہمارے ہندوستانی مورخین نے اس قسم کے واقعات بہت کم قلمبند کیے ہیں، اور خود عرب مورخین نے یہ واقعات شاذ و نادر ہی لکھے ہیں، ۵۷۱ھ میں انصار لدین اللہ خلیفہ تھا، (یہ زمانہ ہندوستان میں غوریوں کی حکومت کا تھا) اسنے خبر رسانی اور جاسوسی کے

محکمہ کو اس قدر وسعت دی تھی کہ دنیا کے اسلام کا کوئی گوشہ اسکے خبر رسالوں اور جاسوسوں سے خالی نہ تھا، مورخین نے اسکے عجیب و غریب حالات لکھے ہیں، منجملہ اسکے ایک ہندوستانی تاجر کا قصہ سننے کے لائق ہے، ہندوستان میں ایک تاجر کے پاس ایک طوطا تھا جسکو قُلُّ ھُوَ اللہ ۱؎ سکھایا گیا تھا، تاجر نے یہ نادر تحفہ دربار خلافت کے لیے مناسب سمجھا، چنانچہ وہ یہ تحفہ لیکر بغداد روانہ ہوا، اتفاق سے جب وہ بغداد پہنچا تو طوطا گر گیا سخت زخمی ہو کر اب کیا کیا جاے، اسی اثنا میں ایک شخص قرآن کے بھیس میں اس کے پاس پہنچا، اور طوطے کو طلب کیا، تاجر رونے لگا اور واقعہ بیان کیا، قرآن نے کہا کہ ہم کو یہ معلوم ہو چکا تھا تم وہ مرا ہی طوطا دیدو لیکن یہ بتاؤ کہ اس تحفہ کے انعام میں تم خلیفہ سے کتنی رقم کی امید رکھتے تھے، اس نے کہا مجھے ۵۰۰ شریفیوں کی توقع تھی، قرآن نے کہا، یہ ۵۰۰ شریفیوں کا توڑ لو، یہ خود خلیفہ نے تمھارے پاس بھیجا ہے جب تم ہندوستان سے اس ارادہ سے نکلے تھے تب ہی خلیفہ کو اس کی اطلاع مل چکی تھی، علامہ سیوطی خلیفہ الناصر کے حال میں لکھتے ہیں،

کان الناصر قد ملأ القلوب هیبة	ناصر نے لوگوں کے دلوں کو اپنے خوف و دہشت سے
ونخيفة فكان یرهبہ اهل الصند و	مُرعب کر دیتا تھا اس سے ہندوستان اور مصر کے
مصر کما کان یرهبہ اهل بغداد فاجلی	لوگ ویسے ہی ڈرتے تھے جیسے بغداد ولے، اس نے
ھیبة الخلافۃ وکانت قد ماتت بموت	خلافت کی اوس ہیبت و جلال کو زندہ کیا جو مقتصر
المعصم،	کے مرنے سے مر گیا تھا،

سلطان شہاب الدین غوری بڑے جاہ و جبروت کا بادشاہ تھا لیکن اس کے تاج فخر کا طرہ یہ ہے کہ وہ قسیم امیر المومنین (امیر المومنین کا حصہ دار) اور ناصر امیر المومنین (امیر المومنین کا

مدوگار) تھا (طبقات ناصری صفحہ ۱۱۴ و ۱۲۵) قطب مینار دہلی اور مسجد قطبی کے دروازہ پر سلطان کے نام کے جو کتبے ہیں اور مین بھی سلطان کے یہ القاب پتھرون پر منقوش ہیں، ہندوستان کے خود مختار سلاطین میں سلطان شمس الدین التمش کا نام آتا ہے، جس نے باقاعدہ ہندوستان کی مملکت کو ایک مستقل سلطنت کے قالب میں ڈھال دیا، وہ سنہ ۶۰۰ھ میں تخت نشین ہوا تھا، سنہ ۶۱۰ھ میں خلیفہ نے اسکو خلعت بھیجا، اسکے یہ معنی تھے کہ اب وہ خلافت نے ہندوستان کے استقلال اور خود مختاری کو تسلیم کر لیا، سلطان نہایت ادب و احترام کے شرائط بجالایا اور اس کو اس خلعت سے اسقدر خوشی ہوئی کہ اسکے لیے تمام دارا سلطنت میں جشن منایا گیا، سلطان نے افسردہ کو انعام اور خلعت تقسیم کیے صاحب طبقات اکبری کا بیان ہے، (صفحہ ۶۰)

در سنہ ۶۱۰ رسولان عرب، جائے خلافت، جہت سلطان شمس الدین آورند، سلطان انچہ شرط اطاعت و ادب بود، بجا آورده، جائے دار الخلافت پوشیده و از پوشیدن آن خلعت فرحت و بہجت بے نہایت و احوال سلطان محسوس میشد، سلطان اکثر امر را خلعتہا داد و در شہر قُبۃ بابتند و کوس شاد و یانہ بستند،

خلیفہ کا نام ہندوستان کے مورخوں نے نہیں لکھا ہے، مگر یہ زمانہ ناصر الدین اللہ کا تھا، شمس الدین التمش کا لقب بھی ناصر امیر المومنین، (امیر المومنین کا مدوگار) تھا، اور اور یہی لقب اسکے سکون پر منقوش پایا جاتا ہے، اسی زمانہ میں ناصر الدین اللہ نے وفات پائی اور مستنصر باللہ نے مسند خلافت کو زینت بخشی، سلطان شمس الدین التمش، سلطانہ رضیہ اور سلطان ناصر الدین محمود، سلطان علاء الدین محمد کے سکون پر خلیفہ مستنصر باللہ کا نام سلطان کے پہلو پر پہلو کندہ ہے، بلکہ ان سلاطین کے بعض ایسے سکے بھی ہیں جن پر صرف خلیفہ



کاتام منقوش ہے، ریشیہ کے سکھ پر ریشیہ کے بجائے یہ الفاظ کندہ ہیں، المستنصر امیر المومنین  
 مستنصر باللہ کے بعد آخری خلیفہ بغداد مستعصم باللہ جلوه آراے خلافت ہوا، سلطان علاؤ الدین  
 ابوالمظفر مسعود، سلطان ناصر الدین ابوالمظفر محمود، سلطان غیاث الدین بلبن، سلطان مظاہر الدین  
 قیقاہ، سلطان جلال الدین فیروز شاہ، سلطان رکن الدین کیکاؤس کے سکون پر خلیفہ مستعصم  
 باللہ کاتام کھدا ہوا تھا ہے،

خلافت اور ہندوستان کا تعلق سب سے زیادہ محمد شاہ تغلق کے زمانہ حکومت میں نمایاں  
 نظر آتا ہے، سلطان جطح اپنے اور تمام کا زاموں میں بے مثال اور عظیم النظیر معلوم ہوتا ہے  
 اسی طرح اس مسئلہ خلافت میں بھی اسکا اعتقاد اور طرز عمل تمام سلاطین اسلام میں بے مثال  
 ہے، سب جانتے ہیں کہ مستعصم باللہ کے عہد میں تاتاریوں کے ہاتھوں بغداد کی خلافت عباسیہ  
 کا یہ اہم تاریخی گہوارہ گھونسا گیا تھا، اس کے بعد مصر میں دوبارہ خلافت عباسیہ نے از سر نو ایک دوسری  
 زندگی حاصل کی، چونکہ پہلے زمانہ میں آمدورفت کے طریقے اس قدر آسان نہ تھے اسلئے ایک  
 ملک میں دوسرے ملک کی خبریں سالہا سال کے بعد پہنچتی تھیں، اسلئے خلافت بغداد کی  
 تباہی کے بعد ہندوستان میں کئی سال تک یہ معلوم نہ ہو سکا کہ مسلمانان عالم نے خلافت کا  
 دوبارہ کیا نظام قائم کیا ہے، چنانچہ تاجرون اور مسافرون کی زبانی اس کی تفتیش ہوتی رہتی  
 تھی، اس موقع پر ہم خود کچھ نہیں کہنا چاہتے، بلکہ خود ایک مورخ کے بیان کو لفظ بلفظ نقل  
 کرتے ہیں، فیروز شاہی کا مصنف ضیاء البرنی لکھتا ہے،

مخاطرات و اس کی سلطنت و امارت سلاطین بے امر	سلطان کے دل میں آیا کہ خلیفہ عباسی کی اجازت کے
دولت خلیفہ کا زائل عباس بود، درست نیست و ہر	بغیر سلطنت و حکومت جائز نہیں، جن بادشاہوں نے
بادشاہی کہ بے مشورہ خلفائے عباسی بادشاہی	خلفائے عباسی کے فرمان کے بغیر حکومت کی ہے

کردہ است و یا بادشاہی کند متغلب ہو رہا است  
 و متغلب ہو، و از خلفائے عباسی سلطان بسیار  
 قتل میگردانید بسیار مسافران شنید کہ خلیفہ از  
 آل عباس در مصر خلافت ممکن است سلطان  
 مجربا اعران و انصار و دولت خود آن خلیفہ کہ  
 در مصر است بیعت کردہ و در سرکرداری عرضداشت  
 بجانب خلیفہ سوار میگردانید ہر بابت چیز یادان  
 می نوشت و چون در شہر آمد نماز جمعہ و نماز عیداد  
 را در توقف داشت و از سکہ نام خود در کنایہ  
 و فرمود تا در سکہ نام و لقب خلیفہ نویسند و در  
 اعطاء خلافت آل عباس مبالغہ نکرد کہ در تحریر  
 و تقریر نتوان گنجایید، ص ۴۹۲  
 ۱۱۱۱ ہجری میں حاجی سعید مصری کی سرکردگی میں مصر کے دربار خلافت سے سلطان کے نثری  
 خلعت اور لوہے سلطنت اور فرمان آیا، سلطان نے تمام ارکان دولت، علما، سادات اور  
 مشائخ کے ساتھ شہر سے باہر نکل کر استقبال کیا، سواری سے اتر کر فرمان و خلعت کو سر پر رکھا  
 قاصد خلافت کے پاؤں کو بوسہ دیا تمام شہر میں جشن منایا گیا، جمعہ و عیدین کی نمازیں شروع ہوئیں،  
 اسکے بعد سلطان اور خلیفہ کے مابین یہ نامہ و پیام اور تحفہ تحائف برابر جاری رہے، ابن بطوطہ  
 مغربی جو اسی زمانہ میں ہندوستان آیا تھا، وہ بھی شہادت دیتا ہے کہ سلطان کو خلیفہ وقت کے  
 ساتھ حد درجہ عقیدت تھی، اور بہت واقعات اور وفد خلافت کے حالات لکھتے ہیں اس سے چند باتیں ثابت ہوتی ہیں

یا جو بادشاہ کرین وہ غاصب تھا اور غاصب ہو گیا  
 سلطان خلیفہ عباسی کے حالات دریافت کرتا  
 رہتا تھا، یہاں تک کہ بہت سے مسافروں سے  
 اس نے سنا کہ خلیفہ عباسی مصر میں ممکن ہو سلطان  
 یہ سن کر خود مع تمام ارکان دولت کے خلیفہ مصر کی  
 بیعت کی و ایک وفد کے ساتھ خلیفہ کی خدمت میں  
 عرضداشت بھیجا کرتا تھا اور اس میں تمام باتیں  
 لکھا کرتا تھا، جب اس سلطنت میں پہنچا تو جمعہ اور عیدین  
 کی نماز (خلیفہ کے جواب آنے تک) بند کرادی،  
 اور کہہ کر اپنا نام مٹا کر خلیفہ کا نام اور لقب لکھ لیا  
 سلطان کو خلفائے عباسیہ کی خلافت کے ساتھ ہمدرد  
 عقیدت تھی کہ تقریر و تحریر میں وہ نہیں ساسکتی،

- ۱- ادنیٰ مسلمانوں کو چھوڑ کر سلاطین تک خلافت کے باب میں کیا اعتقاد رکھتے تھے،
- ۲- ہر مسلمان بادشاہ جو اطراف عالم میں کین حکمران ہوا اسکے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ خلیفہ وقت کا مطیع و فرمانبردار ہو، بلکہ اصلی حکومت و حقیقت خلیفہ عصر کی ہوتی ہے، اور دیگر سلاطین زمانہ اسکے نائب اور قائم مقام کی حیثیت رکھتے ہیں،
- ۳- جب تک خلافت و بیعت امام نہ ہو، جمعہ و عیدین تک روا نہیں،

اس سے یہ معلوم ہو گا کہ آج کل علماء نے جو فتوے دیے ہیں وہ محض سیاسی نہیں بلکہ اونکی مذہبی حیثیت ہے اور یہ خود سرد مجنون بگستاخ مسلمان آج سے پہلے ہی ہندوستان کی سر زمین میں موجود تھے،

بہر حال محمد توفیق کی وفات کے بعد فیروز شاہ تخت نشین ہوا، اس وقت دکن میں بہمنی سلاطین عروج حاصل کر رہے تھے، اور دکن میں رقابت پیدا ہو گئی تھی، خلیفہ نے سلطان کو فزوان سلطنت ہندوستان اور خلعت بھیجا، اور لکھا کہ سلاطین بہمنیہ کے ساتھ فرق و برات کا برتاؤ کرو، فرشتہ کی عبارت ہے،

• ”دراہ ذیجہ سنہ مذکور (۷۵۸ھ) خلعت و منشور خلیفہ عباسی مصر الحاکم بامر اللہ ابوالفتح بن ابی

ربیع سلیمان تفضلن تفریض مالک ہندوستان و سفارش بادشاہان بہمنیہ دکن آمد،

علامہ سیوطی تاریخ الخلفاء میں لکھتے ہیں کہ خلیفہ المستعین بامر اللہ عباسی کے عہد خلافت میں سلطنت میں غیاث الدین اعظم شاہ بن سکندر شاہ بادشاہ ہندوستان نے خلیفہ کے پاس قاصد بھیجا اور اسے فرشتہ نے حاکم بامر اللہ ابوالفتح بن ابی الربیع سلیمان نام غلط درغلط لکھا ہے، ۷۵۸ھ میں مقتصد بامر اللہ ابوالفتح ابو بکر بن ابی الربیع سلیمان خلیفہ تھا، حاکم بامر اللہ ابوالعباس احمد بن ابی الربیع سلیمان تھا، ۷۵۸ھ میں وفات پائی،

فرمان حکومت کی درخواست کی، اس نام کا بادشاہ نہ دتی میں نظر آتا ہے اور نہ دکن و بنگالہ میں یہ وہ زمانہ ہے جب تیمور کے حملوں سے ہندوستان چور چور ہوا اور ملک میں کوئی باقاعدہ حکومت قائم نہیں تھی، لیکن ہے کسی امیر نے اس موقع سے خلیفہ کا فرمان حاصل کر کے فائدہ اُٹھانا چاہا، چند صفحہ پہلے ہندوستان کے قدیم مورخین کی کوتاہ قلمی کی تسکایت قلم سے نکل چکی ہے کہ وہ تا ریخون میں اپنے اپنر عہد کے اس قسم کے واقعات کو عام اور معمولی سمجھ کر قلم انداز کرتے آئے ہیں، انھیں یہ گمان نہ تھا کہ مسلمانوں پر ایک زمانہ آئیگا جب یہی عام اور معمولی واقعات محتاج ثبوت و تصدیق ہو جائیں گے، لیکن ایک عیسائی مورخ اڈورڈ ڈامس (EDWARD THOMAS) کی کوششیں ہم مسلمانوں کے شکریہ کی مستحق ہیں جس نے بہت حد تک ہلکے بزرگوں کے ادھورے کارناموں کو پورا کر دیا ہے، اڈورڈ ڈامس آج سے سچاس برس پہلے انگلستان کے ایک مشہور مستشرق تھے، انھوں نے مسلمان سلاطین ہند کی تاریخ اور ان کے عہد کے سکون کے نقوش و کتبات سے مرتب کی ہے، ہر سلطان و بادشاہ کے سگے فراہم کیے ہیں، ان کے کتبے پڑھے ہیں اور اوپر پوری بحث کی ہو میں نے اس کتاب کے ایک ایک کتبہ کو پڑھا اور اس کو عہد بہ عہد کی ترتیب سے یکجا فراہم کیا، ان کتبوں کو پڑھ کر کس درجہ حیرت ہوئی ہے کہ جو باتیں تاریخ کے کرم خوردہ اوراق میں بہت کم پائی جاتی ہیں، وہ سونے چاندی کے پتروں میں کس بہتات کے ساتھ موجود ہیں،

(۱) ان میں سے ہر سکے پر اور ہر کتبہ پر ہندوستان کے سلطان وقت کے نام کے ساتھ لبرہ خلیفہ زمان کا نام بھی ثبت ہے، اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ سلطان محمد تغلق کی طرح ہندوستان کے تمام سلاطین یہ اعتقاد عملی رکھتے تھے کہ وہ بجاے خود مختار بادشاہ نہیں ہیں بلکہ لے بنگالہ میں سلطان غیاث الدین بن سکندر شاہ ایک بادشاہ گذرے گا اور ساکڑا مہ دفات فتنہ ہو،

ادنیٰ خشیت اپنی ملک میں خلیفہ کے ایک نائب اور قائم مقام کی ہے، چنانچہ خود سکون میں آپ اسکی تصریح پائینگے (دیکھو نمبر ۶۱-۶۲-۶۸-۶۹)

(۲) یہ دیکھ کر اور حیرت ہوتی ہے کہ نہ صرف سلاطین دہلی، بلکہ اطراف ہند کے وہ بادشاہ بھی جو دہلی کی سلطنت سے ہٹ کر اپنی مستقل و خود مختار حکومتیں قائم کرتے تھے وہ ہزاروں کوس دور پڑے ہوئے خلیفہ کی اطاعت سے باہر نہیں تھے، چنانچہ سلاطین گجرات ماوہ و مشرق و بنگالہ کے سگے آپکو اسی قسم کے بیٹے،

(۳) ایک اور لطیف تر بات یہ ہے کہ ان میں سے بہت سے سکون پر سلاطین وقت کے بجائے صرف خلفائے عصر کے نام ہیں، اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان سلاطین کی نیت یہ تھی کہ وہ خلفائے مقابلہ میں اپنے کو مجازی بادشاہ بھی کہلا نا نہیں چاہتے تھے،

(۴) عجیب یہ ہو کہ بعض سکون پر سنسکرت خط میں ”سری ہمیرا“ اور سری خلیفہ ”اور سری شلیفہ“ منقوش ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نامسلمان رعایا ہند تک کو یہ سمجھنا منظور تھا کہ ملک کا اصل حکمران خلیفہ ہے، اگر مزید محقق کہتے ہیں کہ ”ہمیرا“ امیر المومنین کی اور ”شلیفہ“ خلیفہ کی خرابی ہے،

(۵) ان سکون میں ایک اور بات آپ پائینگے جب کسی خلیفہ کا متعین نام و لقب نہیں معلوم ہوا ہے تو صرف مطلق خلیفہ یا امیر المومنین کا لفظ لکھ دیا ہے، اور اگر کوئی ایسا دانا نہ پڑا ہے کہ کوئی خلافت قائم نہیں ہوئی تو خلفائے اربعہ کے نام لکھ دیے گئے ہیں مثلاً نمبر ۶۲ میں کہ یہ بغداد کی تباہی کا زمانہ ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بہر حال کسی نہ کسی قسم کی خلافت کا ذکر وہ ضروری سمجھتے تھے،

(۶) یہ سگے معز الدین غوری سے لیکر بہ ترتیب ابراہیم شاہ سکندر رودی تک کے ہیں اسکے بعد

تیموریہ سلطنت شروع ہوتی ہے، اور مصر میں خلفائے عباسیہ بھی خاتمہ قریب قریب ہو جاتا ہے، ان میں سے ہر سکہ ”ہندوستان اور خلافت“ کے دعویٰ کے لیے دلائل کا ایک دفتر ہے،

ذیل میں ہم بہ ترتیب ان سکون کو درج کرتے ہیں،  
سلاطین ہند کے سکون کے کتبے

محمد رسول اللہ	لا الہ الا اللہ	الناصر الدین اللہ السلطان المعظم معن
محمد رسول اللہ	الناصر باللہ السلطان	الدینا والدین ابوالمظفر
السلطان المعظم	الاعظم غیاث الدینا	محمد بن سام
معز الدینا والدین	والدین ابوالفتح	۳
ابوالمظفر محمد	محمد بن سام	السلطان الاعظم
بن سام	ہو الذی رسل رسولہ علی الذی	معز الدینا و
غزنیہ فی شعور سنۃ	کلہ ولوکہ الامشراکون	الدين ابوالمظفر
اشنی وتسعين سماء	۲	محمد بن سام
ہو الذی رسل رسولہ بالہذی و دین الحق	دہندی، سر، ہیرا۔ سر محمد سام پرتوی	۴
لیظہ علی الدین کلہ ولوکہ الامشراکون	تطب ینار دلی کا کتبہ	السلطان المعظم شہنشاہ الاعظم، مالک قراب
لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ السلطان المعظم	غیاث الدینا والدین ابوالفتح	الاصم مولیٰ ملوک العرب والجمہر سلطان
محمد بن سام	محمد بن سام	السلطان فی العالم، غیاث الدینا والدین
محمد بن سام	محمد بن سام	محمد بن سام

معز الاسلام والمسلمین محی العادل فی العالمین	محمد بن سام	ضرب ہذا الدینار ببلد
علاء الدولۃ القاهرۃ فذلک المملۃ الطاهرۃ		غزنۃ فی شہر مستنک ستا
جلال الامۃ الباہرۃ شہاب الخلافۃ باسط		۷
الاحسان والوفاء فی الثقلین، ظل اللہ فی	لا الہ الا اللہ	السلطان المعز
الخافقین المحامی ببلاد اللہ الراعی لعباد اللہ	محمد رسول اللہ	عبد و مولانا تاجر الدین
محرم مالک الدنیاء مظهر کلمۃ اللہ العلویا	الناصر لدین اللہ	یلدنا السلطانی،
ابو المظفر محمد بن سام قسیم امیر المومنین	امیر المومنین	
خلد اللہ مملکۃ،	ضرب ہذا الدھم ببلد	
۵	غزنۃ فی شہر مستنک ستا	
محبوبی کے شمالی جانب کے داخلہ کے دروازہ پر تاریخ ۵۹۲		
بسم اللہ الرحمن الرحیم ید عوالی دار السلام	اقادار	(ہندی میں)
ویصدی من یشاء الی صراط المستقیم فی شہر	لا الہ الا اللہ	ابیا کتمک
سنۃ اثنی و تسعین جرت ہذا العمادۃ	محمد رسول اللہ	محمد ادا قونریا
بعالی امر السلطان المعظم معز الدنیا	یمین الدولۃ	فی محمود
والدین محمد بن سام ناصر امیر المومنین،	وامین المملۃ	
۶	محمود	
السلطان المعظم	لا الہ الا اللہ	بسم اللہ ضرب ہذا الدھم
معز الدنیا و	محمد رسول اللہ	محمود پور سنۃ ثمان عشر
الدین ابو المظفر	الناصر لدین اللہ	واربع مائۃ
امیر المومنین		

<p>۹ یلتمش السلطان ناصر امیر المومنین تیسرے منزل کے دروازہ پر</p>	<p>۹ فی عہد الامام لا الہ الا اللہ</p>
<p>۱۳ امیر مجتہد العارف فی یام اللہ السلطان الاعظم شمس المظہر مالک قابلا لامہ ولی طوکر لکر العرب وجمہ شمس لدنیا والدین معز الاسلام سلیمین ذکالامنی الامان وادث ملک</p>	<p>۱۰ المستنصر امیر محمد رسول اللہ المومنین</p>
<p>۱۵ سلیمان ابو المظفر یلتمش ناصر امیر المومنین، فی عہد الامام السلطان الاعظم المستنصر باللہ امیر ناصر لدنیا والدین</p>	<p>۱۱ ہندی میں مستغفر باللہ سری خلیفہ</p>
<p>۱۶ ابو المظفر محمود شاه بن سلطان رضی اللہ عنہ المومنین اللہ المستنصر امیر المومنین</p>	<p>۱۲ السلطان المعظم لا الہ الا اللہ شمس لدنیا والدین محمد رسول اللہ ابو المظفر القمش المستنصر باصر اللہ</p>
<p>۱۷ السلطان الاعظم لا الہ الا اللہ علاء الدین والدین محمد رسول اللہ</p>	<p>۱۳ السلطان ناصر امیر المومنین امیر المومنین اشید وثلثین سترائے</p>
<p>۱۸ ابو القم محمد الناصر لدین اللہ بن السلطان اسم اللہ ضرب امیر المومنین هذا الدینا ریلد اغزنی فی شہر ثلث عشر سترائے</p>	<p>۱۴ السلطان المعظم صرب شمس لدنیا والدین نکور ابو المظفر القمش محمد رسول اللہ</p>
<p>۱۹ جلال لدنیا والدین منکبر بن بن السلطان</p>	<p>۱۵ القطبی بزمان امیر المومنین لذا الشمس ثمن وسترائے قطب مینا کے دوسرے منزل کے دروازہ پر میراتام هذا العارف الملک المودع من السام شمس الحق والدین</p>



۱۹	الناصر لدين الله	العاذل	۲۳	في عهد الامام
امير المومنين	الاعظم	چنگز خان	المستعصم امير	
۲۰	سيف الدنيا والدين	واله الا الله	المومنين	
ابو المظفر الحسن	محمد رسول الله	ضرب سنة احدى واربعين وستمائة	۲۵	هندي بين
قرن	المستنصر بالله			
هذا الدرهم في شهر	امير المومنين	سري شليفه	۲۶	سريطان سري علاودين
سنة ثلث وثلثين وستمائة	۲۱	في عهد الامام	السلطان الاعظم	في عهد الامام
جلالة الدنيا والدين	المستنصر امير	ناصر الدنيا والدين	المستعصم امير	
ملكة ابنة التمش سلطان	المومنين	ابو المظفر محمود	المومنين	
مصر امير المومنين	ضرب هذه الفضة بكنونتي	ضرب هذه الفضة بحضرة دهل في سنة اربع وخمسين وستمائة	۲۷	
۲۲	السلطان الاعظم	في عهد الامام	السلطان الاعظم	في عهد الامام
مغل الدنيا والدين	المستنصر امير	ناصر الدنيا والدين	المستعصم امير	
ابو المظفر بجرام شاه	المومنين	المظفر محمود بن السلطان	المومنين	
بن السلطان	ضرب بحضرة دهل في سنة ثمان	خمين	۲۸	
ناصر امير المومنين	وثلثين وستمائة	السلطان الاعظم	الامام	
۲۳	السلطان الاعظم	في عهد الامام	غياث الدنيا والدين	المستعصم امير
علاء الدنيا والدين ابو	المستنصر امير	ابو المظفر بلبن	المومنين	
المظفر مسعود شاه	المومنين	السلطان		
بن السلطان	ضرب دهل	ضرب هذه الاسكة بحضرة دهل في سنة ثمانين وستمائة		



امیر المومنین	ابوالمظفر	ضرب هذه الفضة بمحضرة دهل في سنة سبع وعشرين سبعا <sup>۴۱</sup>
ضرب هذه السلعة بمحضرة دهل في سنة احدى وعشرين وسبعمائة	السلطان ابن	الامام الاعظم
تعلق شاه <sup>۴۲</sup>	السلطان الغازي	خليفة ديل علمين
السلطان ناصر	غياث الدين والدين	قطب الدين والدين
امير المومنين	ابوالمظفر	ابوالمظفر مبارکشاه
ضرب هذه السلعة بقلعة ديوكير في سنة احدى وعشرين سبعا <sup>۴۳</sup>	السلطان	ضرب هذه السلعة بمحضرة دار الخلافة في سنة ثمان وعشرين سبعا <sup>۴۴</sup>
الامام الاعظم	مبارکشاه السلطان	الامام الاعظم
السلطان الاعظم	ابن السلطان الواثق	قطب الدين والدين
المستعصم	شمس الدين والدين	ابوالمظفر خليفة الله
امير المومنين	ابوالمظفر فيرش شاه السلطان	ضرب هذه الفضة بمحضرة دار الخلافة في سنة سبع وعشرين سبعا <sup>۴۵</sup>
ضرب هذه الفضة بمحضرة الكفوت في سنة عشرين سبعا <sup>۴۶</sup>	السلطان الاعظم	السلطان الاعظم
السلطان الاعظم	الامام	ناصر الدين والدين
شمس الدين والدين	المستعصم	ابوالمظفر
ابوالمظفر بغيره شاه السلطان بن السلطان	امير المومنين	ضرب هذه الفضة .. عشرين وسبعمائة <sup>۴۷</sup>
ضرب هذا ...	السلطان الاعظم	السلطان الاعظم
السلطان الاعظم	الامام	عظيم ناصر الدين والدين
غياث الدين والدين	المستعصم	السلطان والي امير المومنين
ابوالمظفر بجاد رشاه	امير المومنين	السلطان الثاني بين الخلافة <sup>۴۸</sup>
ضرب هذه الفضة بمحضرة الكفوت في سنة احدى وعشرين سبعا <sup>۴۹</sup>	تعلق شاه	السلطان الغازي
ابوالمظفر بجاد رشاه	السلطان ناصر	غياث الدين والدين



خليفة ابو عبد الله خلدت خلافته ۸۴	خبرت هذا السكة في زمان الامام ابو العباس
خلدت ملكه ۶۰	خلدت ملكه ۶۰
فيروز شاه سلطاني	السلطان الاعظم في زمن الامام
ابو العباس احمد ۶۸	سيف امير المؤمنين ابو الفتح
فيروز سلطاني	ابو المظفر فيروز شاه
خليفة ابو الفتح ۶۹	السلطاني خلدت ملكه
فيروز شاه	خبرت هذا السكة بحضرة... بن وسبعائه ۶۱
ابو عبد الله خلدت خلافته ۷۰	السلطان الاعظم سيف امير المؤمنين ابو المظفر فيروز شاه السلطان خلدت ملكه
في زمن الامام شاه	خبرت هذا السكة في زمن الامام امير المؤمنين ابو الفتح المعتمد بالله
امير المؤمنين	خلدت ملكه ۶۲
فتحان فيروز	السلطان الاعظم سيف امير المؤمنين ابو المظفر فيروز شاه السلطان
ابو الفتح المعتمد بالله	خلدت ملكه
خلدت خلافته ۷۱	خلدت ملكه
السلطان الاعظم	في زمن الامام
فيروز شاه ظفر	خبرت هذا السكة ۷۳
امير المؤمنين	فيروز شاه سلطاني
ابو عبد الله	نائب امير المؤمنين
خلدت خلافته ۷۲	فيروز شاه سلطاني خبرت بحضرة دهلې ۷۴
فيروز شاه ظفر السلطاني	الخليفة امير المؤمنين خلدت خلافته ۷۵
فيروز شاه ظفر السلطاني	فيروز شاه سلطاني خلدت ملكه
خبرت بحضرة دهلې ۷۳	الخليفة ابو الفتح خلدت خلافته
السلطاني	الخليفة ابو عبد الله خلدت خلافته ۹۱

فیروزشاه	۶۴	ابو عبد الله	محمد شاه فیروز شاه سلطانی
ظفر ابن			
فیروزشاه		خلدت خلافته	ابو عبد الله خلدت خلافته
فیروز	۶۵	الخليفة	ضربت بحضوره دهلی سنه ۸۲
شاه ظفر		ابو عبد الله	السلطان الاعظم ابوالحامد محمد شاه فیروز شاه سلطانی
السلطان		خلدت خلافته	فی زمن الامام امیر المومنین خلدت خلافته ۸۳
تقلق شاه	۶۶	نائب	سلطانی الخليفة ابو
سلطانی ضربت		امیر المومنین	فیروز شاه عبد الله خلدت
بمحضره دهلی	۶۷	۹۰	محمد شاه ۸۴ خلافته ۹۳
تقلق شاه		ابو عبد الله	محمد شاه
سلطانی	۶۸	۹۱	ضربت بحضوره دهلی
ابوبکر شاه		الخليفة ابو	نائب امیر المومنین ۹۳ ۸۵
بن ظفر بن فیروز شاه		عبد الله خلدت	السلطان الاعظم فی زمن
سلطانی		خلافته ۹۱	ابوالجاهد محمد شاه امیر المومنین
ابوبکر شاه	۶۹		فیروز شاه خلدت خلافته ۸۱ ۸۲ ۸۳
ظفر بن فیروز شاه سلطانی			سلطانی سکندر شاه محمد شاه سلطانی ۸۴
نائب امیر المومنین	۷۰	۹۲	الخليفة ابو عبد الله خلدت خلافته ۸۵
ابوبکر شاه		نائب	السلطان الاعظم فی زمن الامام
ظفر بن فیروز شاه		امیر المومنین	ابوالحامد محمود شاه امیر المومنین
سلطانی		خلدت خلافته	محمد شاه فیروز سلطانی خلدت خلافته سلطانی ۹۲

نائب امیر المومنین ۸۷	الخليفة امير المومنين خلد خلافتہ ۸۶	محمود شاہ محمد شاہ سلطان
۱۰۱ المتوکل علی الرحمن فی زمن	۹۵ سلطان عام شاہ بن محمد شاہ بحضور دہلی	الخليفة ابو عبد اللہ خلد خلافتہ ۹۶
امير المومنين	۹۳ الخليفة امير المومنين خلد خلافتہ ۹۲	محمود شاہ
سکند شاہ	۹۶ عالمشاہ	سلطان ضربت بحضور دہلی
۱۰۲ خلد خلافتہ	نائب امير المومنين ۸۵	نائب امير المومنين ۸۴
۱۰۳ بھڑ دہلی	۹۷ سلطان مالوہ	نصرت شاہ سلطان
۱۰۴ المتوکل علی الرحمن سکند شاہ بھڑ شاہ	۹۸ الخليفة امير المومنين خلد خلافتہ ۹۷	نائب امير المومنين
۱۰۵ المتوکل علی	۹۹ بالظفر محمود شاہ خلد بحضور شاہ بابا	فی عہد السلطان الغازی المتوکل
۱۰۶ الرحمن براہیم شاہ امير المومنين	۱۰۰ سلاطین گجرات	علی الرحمن مبارک شاہ سلطان
۱۰۷ سلطان	۱۰۱ المتوکل علی	فی زمن کام امير المومنين خلد خلافتہ ۹۲
۱۰۸ ابراہیم شاہ سلطان	۱۰۲ الرحمن بھڑ	مبارک شاہ
۱۰۹ امير المومنين خلد خلافتہ	۱۰۳ شاہ سلطان	سلطان ضربت بحضور دہلی
۱۱۰ ابراہیم شاہ سکند	۱۰۴ بھڑ دہلی	نائب امير المومنين ۸۳
۱۱۱ امير المومنين خلد خلافتہ ۹۲	۱۰۵ بھڑ شاہ سلطان بحضور دہلی	السلطان ابو محمد شاہ بن شاہ شاہ سلطان
۱۱۲ جوہنپور نائب	۱۰۶ الخليفة امير المومنين خلد خلافتہ	فی زمن کام امير المومنين خلد خلافتہ ۹۳
۱۱۳ بارکشاہ	۱۰۷ بھڑ شاہ	۹۴ سلطان محمود شاہ بن نصیر شاہ بحضور دہلی
۱۱۴ سلطان	۱۰۸ السلطان	

اس آخری سلسلے کے معنی سمجھئے سلطان بارکشاہ جوہنپور میں امیر المومنین کا نائب اس کے بعد تیمور یوہکا محمد تاج، بنی عثمان میں خلافت مقل ہو جاتی تھی، تیمور یونین اور عثمانی ترکوں میں یکساں دانی عدوت تیمور اور سلطان بایزید کے وقت پہلی آتی تھی جس کے سبب وہ انکی اس عزت و فتحا کو تسلیم کرنا نہیں چاہتے تھے چنانچہ اگر نے خود خلافت ماست کا دعویٰ کیا، لیکن علما اور عام مسلمانوں میں بدعت شعاری کی جس حد تک شہرت ہوئی اس کی حد میں آج بھی ہندستان کے درویدوار سوار ہی ہیں چنانچہ حرمین شریفین کے شہزادوں کے علی الرغم صاحبین اور منبر و نیر خلیفہ بنی عثمان کے نام پڑھے گئے اور اب تک پڑھے جارہے ہیں،

قدیم اور جدید علم ہیئت

”سرزمینِ جانشین نے جو احمقان کے ایک مشہور آدمی ہیں حال میں یونیٹیشن لندن میں اسلامی تہذیب و تمدن کے عنوان سے ایک مضمون طبع کرایا ہے، جس میں انھوں نے نہایت بیباکی کے ساتھ علمی، ادبی، مذہبی، تمدنی، تاریخی، غرض ہر حیثیت سے اسلام پر الزامات رکھے ہیں، اسی سلسلہ میں وہ ایک مقام پر فرماتے ہیں ”آج عربی تاریخ، فارسی یا اردو زبان میں علمِ حجراتِ ارضیہ، آسان قبل التاریخ، سائنٹفک جغرافیہ، علمِ ہیئت (نجوم نہیں)، ..... پر کوئی رسالہ موجود ہے؟“ یہ مضمون اسی آخری ٹکڑے کا جواب ہے۔“

علم ہیئت ایک فطری اور طبعی علم ہے، اور اسکے ساتھ ہر قوم نے اپنے زمانہ میں اعتناء کیا ہے۔  
اسیے ہم آسانی کے خیال سے دو سکوتین دور میں تقسیم کرتے ہیں

قدار | پہلا دور قدما کا ہے، جس میں مصری، بابلی، ایرانی، ہندی، رومی، اور یونانی شامل ہیں۔  
ان میں سے مصری، بابلی، ہندی اور ایرانی علم ہیئت کا اہم قدیمہ کے علوم و فنون میں  
ذکر آچکا ہے، اس لیے اس کا اعادہ غیر ضروری ہے، البتہ یونانی علم ہیئت پر ہم بیان تفصیل کے  
ساتھ بحث کرنا چاہتے ہیں،

یونانیوں نے علم ہیئت میں اگرچہ مصر، بابل، اور ایران سے بہت کچھ فائدہ اٹھایا تھا تاہم چونکہ ان قوموں کا علم ہیئت نظریات اور رصدہ و زون خشیت سے ناکمل تھا، اس لیے یونانیوں نے

لے یہ مضمون معارف میں شائع ہو چکا ہے،



اوسکو مکمل کر دینا چاہا، چنانچہ بطليموس نے قدیم علم ہئیت کے تمام مسائل کو براہین ہندی سے ثابت کیا، اور اوسپر ایک مستقل کتاب لکھی، جسکا نام مجسطی ہے، مجسطی پہلی کتاب ہے جس میں علم ہئیت کے تمام اصول و فروع نہایت تفصیل کے ساتھ قلمبند کئے گئے ہیں، علامہ جمال الدین تفتلی اوسکی نسبت لکھتے ہیں،

ولا يعرف كتاب الف في علم من العلوم  
تمام قدیم و جدید علوم میں کوئی کتاب ایسی نہیں  
قد يمحوا وحدها فاشتل على جميع  
لکھی گئی، جس نے ایک فن کی تمام جزئیات کا  
ذلك العلم واحاط باجزاء ذلك الفن  
احاط کر لیا ہو، بجز ان تین کتابوں کے، ایک  
غير ثلاثة كتب، احدها كتاب لمجسطي  
تو یہی مجسطی جو علم ہئیت اور نجوم پر ہے، دوسری  
هذا في علم هيئة الفلك وحركات  
ارسطو کی کتاب جو منطق میں ہے اور تیسری  
النجوم، والثاني كتاب ارسطوطاليس  
سيبويه کی کتاب جو عربی علم نجوم میں ہے،  
في علم صناعة المنطق، والثالث كتاب  
سيبويه البصري في علم النحو العربي،

اور محمود بن جابر بن سنان بتانی نے اپنی زینج میں لکھا ہے کہ

قد تقصى علم الفلك من وجوه  
اوس نے علم ہئیت کے تمام پہلوؤں کا احاطہ  
و دل على العلل والاسباب لعارضة  
کر لیا ہے، اور برہان ہندی و عددی کے  
فيه بالبرهان الهندسي والعددي  
مدرسے ایسے اسباب و علل بیان کئے ہیں  
الذي لا تدفع صحته ولا يشك  
جن کی صحت سے انکار نہیں کیا جاسکتا،  
في حقيقته.....

اسلہ اخبار الکرام ص ۶۹، اسلہ اس زینج کا نام الزینج الصابی ہے اور رومان چھپ گئی ہے،

بہر حال محلی میں تیرہ مقامے ہیں، پہلے مقالہ میں مقدمات ہیں، مثلاً زمین و آسمان  
 کر دی ہیں یا مثلاً زمین ساکن ہے وغیرہ وغیرہ، دوسرے میں اس امر کا بیان ہے کہ عرض بلد کے  
 اختلاف کا دن کے طول اور قطب و مطلع کی بلندی پر کیا اثر پڑتا ہے؟ تیسرے میں دکھایا ہے  
 کہ آفتاب نقطہ اعتدال اور نقطہ انقلاب میں کب ہوتا ہے؟ سال شمسی کی کیا تعداد ہے؟ آفتاب  
 کی معتدل اور مختلف حرکت کی کیا مقدار ہے؟ رات اور دن میں کیوں فرق ہوتا ہے؟  
 چوتھے میں چاند کی حرکت اعتدالی کا بیان ہے، پانچویں میں چاند کی حرکت کا اختلاف اور اس کا  
 حساب بتلایا ہے، اور یہ دکھایا ہے کہ وہ مختلف شکلوں میں کیوں نظر آتا ہے؟ چھٹے میں آفتاب  
 و ماہتاب کے اجتماع اور کسوف کا بیان ہے، ساتویں میں ثوابت اور اوکلی شکلوں کا تذکرہ  
 ہے، آٹھویں میں ثوابت کی فہرست اور اس کے طول و عرض کی تفصیل ہے، نویں، دسویں،  
 اور گیارہویں میں کوکب خمسہ متحیرہ کی اس حرکت کا بیان ہے جو طول میں ہوتی ہے،  
 بارہویں میں ان ستاروں کی ویسی، سکون اور مقابلہ کا ذکر ہے، اور تیرہویں میں اس کے  
 عرض، اونظور و خفا کی تشریح کی گئی ہے،

اس سے ثابت ہوا کہ بطليموس کے نزدیک علم ہدیت کی دو قسمیں ہیں، ایک ہدیت الافلاک  
 اور دوسرے احکام نجوم، یعنی ستاروں کو دیکھ کر آئندہ واقعات کی نسبت پیشینگوئی کرنا، اور  
 یہی تمام اہل یونان کا مذہب ہے۔

عرب اہل عرب نے انہیں کتابوں پر دسترس حاصل کی تھی اس لیے ان کے ہاں بھی علم ہدیت  
 کی ابتداء دو قسمیں رہیں، لیکن چونکہ اس فن کا تمام تر دار مدار (۱) نظریات پر عبور اور (۲)  
 رصد کی صحت پر ہے، اس لیے جیسا کہ بطليموس نے لکھا ہے،

انہ قد یجوز ان یتدرک علیہ فی  
ارصادہ علی طول الزمان کما استدرک  
ہو علی ابرخس وغیرہ من نظر انہ  
لجلالة الصنعة ولا نفاسا مائیة  
جسیمة لا تدرك الا بالتقريب (زنجبانی)  
یہ بہت ممکن ہے کہ جس طرح اس نے ابرخس وغیرہ کی  
رصد پر اضافہ کیا تھا، ایک طویل زمانہ کے بعد  
خود اسکی رصد پر بھی اضافہ ہو سکے کیونکہ یہ فن  
نہایت عظیم الشان ہے، اور آسانی ہونے کی وجہ  
صرف ظن و تخمین سے معلوم ہوتا ہے،  
اونہوں نے اس فن میں بہت جلد ترقی کر لی،

بہر حال اہل عرب نے ہیئت کی ابتداء دو قسمیں کیں، چنانچہ فارابی نے لکھا ہے،  
”علم نجوم دو قسموں پر مشتمل ہے، ایک مستقبل پرستاروں کی دلالت کرنے کا علم، دوسرے  
علم تعلیمی..... علم نجوم تعلیمی میں اجرام سماوی، آواز زمین سے تین طریقہ پر بحث کی جاتی  
ہے، (۱) ان اجرام کی تعداد، شکل، ہیئت اور ترتیب کیا ہے؟ اور ان کا زمین سے  
کتنا فاصلہ ہے؟ زمین ساکن ہے، وہ نہ عوری حرکت کرتی ہے، اور نہ دوری (۲)  
اجرام سماوی کی حرکت، اسکی مقدار، اسکا استداری ہونا، اسکا تمام کو اکب میں عام ہونا  
اور بعض کو اکب میں خاص طور پر پایا جانا، اور اسکے نتائج یعنی آفتاب و ماہتاب کا اجتماع  
استقبال اور کسوف وغیرہ، (۳) زمین کے آباد اور ویران مقامات، اسکی تقسیم، مقامات  
کے حالات، اسکی حرکت یومیہ سے مطالع و مفارب کا اختلاف، اور ارات دن کے  
طول کا سبب وغیرہ وغیرہ“

لے فارابی نے علوم و فنون پر ایک کتاب لکھی تھی جو اب ناپید ہو گئی ہے، لیکن اسکا لاطینی ترجمہ جو  
جررڈو ڈکریونا کا کیا ہوا ہے اب تک موجود ہے، یہ عبارت اسی سے عربی میں ترجمہ ہوئی ہے، اور  
یعنی عربی سے اسکو اردو میں منتقل کیا ہے،

ان تین طریقوں کے علاوہ ایک چوتھا طریقہ محمد بن ابراہیم انصاری الکفانی نے بیان کیا ہے اور وہ حسب ذیل ہے،

”ستاروں کی تعداد، اوس کے بُود، اور اوس کے افلاک کی پیمائش،“

یہ قسم اگرچہ فارابی کی پہلی قسم میں آجاتی ہے، تاہم الکفانی نے اوسکو ایک مستقل قسم شمار کیا ہے، اور اس طرح اوسکے نزدیک علم ہیئت کی حسب ذیل پانچ شاخیں ہو گئی ہیں،

(۱) علم النہجات و التقاویم: یہ آجکل کے علم ہیئتِ علی کے حسابی حصہ کا قائم مقام ہے،

(۲) علم المواقیت: یہ علم ہیئتِ کردی، اور علم ہیئتِ علی کے رصدی حصہ کی اوس شاخ کا قائم مقام ہے جس میں زمانہ کا تخمینہ کیا جاتا ہے،

(۳) علم کیفیت الارصاد: یہ علم ہیئتِ علی کے رصدی حصہ کی بقیہ شاخوں کا قائم مقام ہے، اور اس کا نام ابن رشد نے صناعت النجوم التجربیہ رکھا ہے،

(۴) علم تسلیح الکرة والالات الشعاعیة: یہ دونوں بھی علم ہیئتِ علی کی رصدی شاخ کے (۵) علم الآلات النظمیہ: قائم مقام ہیں،

لیکن درحقیقت یہ پانچوں قسم موجودہ علم ہیئت کی صرف دو شاخوں (یعنی علم ہیئتِ کردی اور علم ہیئتِ علی) میں آجاتی ہیں، اس لیے ہکو ابھی اس فن کے اور اقسام کا بھی پتہ لگانا چاہیے، اخوان الصفا میں ہے کہ

”علم نجوم کی تین قسمیں ہیں، (۱) افلاک کی ترکیب، ستاروں کی تعداد، بروج کے اقسام

اور ان چیزوں کے بُود، جسامت، اور حرکت وغیرہ کا جاننا، (۲) زقج کا حل، تقویم بنانا،

اور تارخ نکالنا وغیرہ، (۳) آسمان کی حرکت، بروج کے طالع، اور ستاروں کی گردش سے

کائنات کے متعلق استدلال کرنا،

ان تین قسموں میں پہلی قسم آج کل کے علم نظری اور دوسری قسم علم عملی کے علاوہ ہے، اور تیسری قسم جو احکام نجوم کے نام سے موسوم ہے، آج کل بالکل لغو سمجھی جاتی ہے لیکن قانون موسوی میں علم ہیئت نظری کو نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، چنانچہ اس کے عنوانات حسب ذیل ہیں،

۱۔ قوانین علم ہیئت،

۲۔ علم تواریخ ریاضی،

۳۔ حساب مثلثات، (خصوصاً مثلثات کردیہ کا حساب)

۴۔ کرہ آسمان کے دائرے، اور ان کے احداثیات، ان کے نسبت زمین کے گردشرون یا فلك مستقیم میں جو بروج کے مطالعہ پیدا ہوتے ہیں، مشرق و مغرب کی وسعت، مختلف ممالک میں آفتاب کی بلندی، اور عرض بلد کا معیاس کے سایہ سے معلوم کرنا وغیرہ وغیرہ

۵۔ زمین کی شکل، اور کالبد، طول بلد کی درستی، ایسے دو شہروں کے درمیان کی مسافت دریافت کرنا جن کا طول و عرض معلوم ہو، قبلہ کی سمت، در عرض وہ تمام مسائل جو جغرافی طول و عرض سے متعلق ہیں زمین کا اقلیموں پر تقسیم کرنا، وغیرہ وغیرہ،

۶۔ آفتاب کی حرکت کو ہندی اشکال میں بیان کرنا،

۷۔ ماہتاب کی حرکت کو شکل ہندی میں بیان کرنا، اور یہ دکھانا کہ چاند بلندی، اور عرض و طول میں کیوں مختلف دکھائی دیتا ہے؟

۸۔ آفتاب و ماہتاب کا اتصال، کسوف، اور رویت ہلال کا حساب،

۹۔ ثوابت اور ادن میں چاند کے منازل،

۱۰۔ کوکبِ خمسہ بتیرہ کی طول و عرض میں حرکت، اوسکا اشکالِ ہندی میں بیان، ان ستاروں کے مقامات، وہیسی، زمین سے بُعدِ جسامت، ظہور، خفا، اور انکا ایک دوسرے کو حائل ہونا۔

۱۱۔ حسابِ مثلثاتِ کردیہ، اور علمِ ہیئتِ کردی کے چند ایسے مسائل جنکی نجومیوں کو ضرورت پڑتی ہوئی اسطرح موجودہ علمِ ہیئت کی تین قسموں یعنی علمِ کردی، علمِ نظری، اور علمِ عملی کا تذکرہ اور علمِ ہیئت میں بہتہ چلتا ہے،

لیکن ان اقسام کے علاوہ ایک قسم اور بھی ہے، جو اگرچہ اہل عرب کے نزدیک ہیئت میں داخل نہ تھی، تاہم آج کل داخل سمجھی جاتی ہے، یہ قسم علمِ میکائیکِ فلکی ہے، جو عربی کتابوں میں علمِ السماء والالعالم کے نام سے مشہور ہے، اس کا موضوع جیسا کہ اخوان الصفا میں لکھا ہوا ہے:

”افلاک و کوکب کی حقیقت، اوکی تعداد، اوکی ترکیب کی کیفیت، اور اوکی حرکت کی علت دریافت کرنا، اور یہ معلوم کرنا کہ آیا وہ کون و فساد کو قبول کر سکتے ہیں یا نہیں؟ نیز ستاروں کی حرکت تیز اور مست کیوں ہوتی ہے؟ افلاک کی حرکت کا کیا سبب ہے؟ زمین کیوں ساکن ہے؟ کیا اس عالم کے علاوہ کوئی عالم اور بھی ہے؟ اور کیا اوس میں آبادی ہے؟ وغیرہ وغیرہ“

چونکہ اہل عرب کے نزدیک یہ مباحث علمِ طبیعی میں داخل تھے، اسلئے وہ علمِ ہیئت میں اذکار ذکر نہیں کرتے، کیونکہ جیسا کہ ابن رشد نے لکھا، ہر علمِ ہیئت کے اکثر مسائل تعالیمی یعنی ریاضی سے متعلق ہیں، اسی طرح علمِ احکامِ النجوم بھی چونکہ اوسکے نزدیک طبیعیات کے سلسلہ میں داخل تھا

۱۲۔ شرحِ جہنمی، ۱۳۔ رسائلِ اخوان الصفا ص ۲۱، ۱۴۔ حاشیہ شرحِ جہنمی للبرہندی، ۱۵۔ کتابِ مابعد الطبیعیہ ص ۶۵

اسی لیے وہ اوسکو بھی علم ہیئت سے خارج سمجھتے تھے، اور یہ بعینہ ارسطو کی رائے ہوگی،  
 اور اس خیال کی وجہ صاف ظاہر ہے، علم طبعی اور ریاضی کے موضوع میں بڑا فرق ہوتا ہے،  
 ایک طبعی ہمیشہ علت کی جستجو کرتا ہے، بخلاف اسکے ایک نجومی کو جو دراصل ریاضی دان ہوتا ہے،  
 صرف ظاہری کیفیت سے بحث ہوتی ہے، مثلاً اگر آسمان کے کردی ہونے پر بحث کی جائے تو  
 ایک طبعی کہے گا کہ چونکہ وہ ایک ایسا جسم ہے جو نہ ہلکا ہے نہ بھاری اسی لیے کردی ہے، بخلاف  
 اسکے نجومی یہ بیان کرے گا کہ چونکہ مرکز سے محیط دائرہ تک جو خطوط نکلتے ہیں وہ مساوی ہیں اسی لیے  
 آسمان کردی ہے، دیکھو! دونوں کے طرز استدلال میں کتنا فرق ہے؟ طبعی ہر چیز کی مادی  
 اور اصلی علت دریافت کرتا ہے، بخلاف اسکے نجومی کو غیر مادی علل و اسباب سے غرض ہوتی ہے  
 اس بنا پر اگر اہل عرب نے اس قسم کو علم ہیئت سے علیحدہ رکھا تو چند ان مستبعد نہیں،  
 غرض اس تمام تفصیل سے ثابت ہوا کہ اہل عرب کے نزدیک خالص علم ہیئت کی صرف  
 تین قسمیں تھیں،

(۱) علم ہیئت کردی،

(۲) علم ہیئت علمی،

(۳) علم ہیئت نظری، لیکن اس میں کسوت، سیاروں کا ایک دوسرے کو حائل ہونا، تاہیج ریاضی  
 اور علم طول بلد و عرض بلد سے بحث ہوتی تھی، حرکات کو اکب کی ماہیت سے  
 بحث کرنا اسکے موضوع سے خارج تھا،

۱۔ علم الفلک بوجہ اتحات السادة شرح احوال العلوم ص ۲۰۸ ج ۱، ۲۔ یہ فلاسفہ  
 عرب کا خیال ہے، لیکن علماء فلک احکام النجوم کو بھی علم نجوم کی ایک شاخ سمجھتے ہیں اسی لیے اسکے  
 نزدیک وہ ریاضیات کے سلسلہ میں داخل ہوگا،

اور چوتھی قسم یعنی علم میکائیک فلکی طبیعیات میں داخل تھی، ایسے اگر ہو کہ یہ معلوم کرنا ہو کہ اہل عرب آسمان میں حرکت غیر استدار کی کو کیوں نامکن سمجھتے تھے؟ یا اونکے نزدیک حرکت آسمانی کا مبد کیا تھا؟ یا افلاک و کواکب کی کیا طبیعت ہے؟ اور وہ کروی کیوں ہیں؟ تو اسکو کتب ہیئت کے بجائے کتب حرکت کلام، اور انکیات میں تلاش کرنا چاہیے،

یورپ | بخلاف اسکے اہل یورپ کے نزدیک یہ تمام مباحث بھی علم ہیئت سے متعلق ہیں، اس لیے اونکے ہاں اس فن کی چار قسمیں ہو گئی ہیں،

(۱) علم ہیئت کروی: اس میں کواکب کی حالت اور اونکی یومیہ اور سالانہ حرکت سے بحث، زمانہ کی تعیین، اور آسمان وزمین کے مواقع کی تشخیص ہوتی ہے،

(۲) علم ہیئت نظری: اس میں فضا کی مری حرکت سے حقیقی حرکت کا پتہ لگایا جاتا ہے، اجرام سماوی کے مقامات کی تقویم بنائی جاتی ہے، سکوت، آفتاب و ماہتاب کا اجتماع، اور ایک ستارے کا دوسرے کو حائل ہونا معلوم ہوتا ہے، اور کسی حد تک زمین کی جسامت اور اسکے بعد سبھی بحث کی جاتی ہے، یہ علم کپلر کے قوانین ثلاثہ پر مبنی ہے (۳) علم ہیئت عملی: اسکے دو حصے ہیں، (۱) رصدی، جس میں نظریہ آلات رصدیہ، رصد کی کیفیت

اور زمانہ کا تخمینہ کرنا شامل ہے، (۲) حسابی، جس میں نزع اور تقویم کے حسابات شامل ہیں

(۴) علم میکائیک فلکی: اس میں حسب ذیل مسائل ہیں، حرکت حقیقی کی کیا علت ہے؟ قوت جاذبہ اور دافعہ جو تمام اجسام میں موثر ہے کیا ہے؟ یعنی حرکت کا کیا قانون ہے؟

لہٰذا علویون المسائل فارابی، رسائل اخوان الصفا، اشارات بوعلی سینا، شرح طوسی، درازی، تہذیب النظائر غزالی، مابعد الطبیعیہ ابن رشد، تفسیر کبیر امام رازی، محصل رازی مع تلخیص طوسی، حکمۃ العین کاتبی، شرح ہدایۃ الحکمۃ صدر الدین شیرازی، تجرید العقائد طوسی، طوائع المانور، مریضنا وی ملائحت عضد الدین ابی وغیرہ



ثقل کی کیا تاثیر ہے؟ جاذبیت کیا چیز ہے؟ اوس کا افلاک ذوات الازدباب،  
 (دو مدار ستارے) زمین، اور دیگر سیاروں کی ہمیت پر کیا اثر پڑتا ہے؟ ان کو دیکھی  
 سطح پر کتنا ثقل ہے؟ اور ان کی حرکت کا محور کیوں بدلتا رہتا ہے؟  
 لیکن ان اقسام کے علاوہ یورپ نے علم ہمیت کی ایک قسم اور ایجاد کی ہے، جس کا نام  
 علم طبیعۃ الاجرام الفلکیہ ہے، اسکی ایجاد صرف ایک آلہ کی وجہ سے ہوئی ہے، جسکو پیکٹر سکوپ  
 کہتے ہیں، اس سے اجرام فلکی کی ترکیب طبیعی و کیمیادی معلوم ہوتی ہے،  
 اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اہل یورپ نے ہمیت میں صرف ایک قسم کا اضافہ کیا ہے  
 اور وہ علم طبیعۃ الاجرام الفلکیہ ہے،

سعید انصاری  
 رفیق دارالصفین، اعظم گڑھ

# مستزح

جرمنی

اور

علوم و فنون

برلن سے فارسی زبان میں کاوہ کے نام سے ایک فارسی اخبار نکلتا تھا، قریباً زائدہ  
ایک ایرانی سیاسی اہل قلم اسکا ایڈیٹر تھا، دوران جنگ میں یہ اخبار سیاسی تنازعوں کے  
اختتام کے بعد یہ ایک علمی پرچہ ہو گیا، اب سنا کہ وہ بند ہو گیا، ۲۲ جون ۱۹۲۰ء کے  
پرچہ میں جرمنی کے مدرسوں اور کتب خانوں پر ایک مضمین شائع ہوا تھا، جسکا ترجمہ ہدیہ  
ناظرین ہے،

مدارس | جرمن نظام تعلیم نے موجودہ زمانہ میں جو وسعت حاصل کی ہے، اُس نے جرمنی کے  
علمی سطح کو تمام دنیا میں بلند کر دیا ہے، اور وہ تعلیمی حیثیت سے سب سے زیادہ متقدم  
سلطنت سمجھی جاتی ہے، جرمنی کی علمی ترقیوں کا آخری دور پروفیسر لٹوئی کا رہنمائی  
ہے، جس نے تیرہویں صدی ہجری کے اوائل میں قدیم نظام تعلیم کو بدل کر ایک جدید  
نظام مرتب کیا جو موجودہ دور تجدید و اصلاح کا سنگ بنیاد قرار دیا گیا ہے،  
جرمنی میں تعلیم جبری ہے اور آٹھ سال تک بچوں کو تعلیم دلانا والدین کے فرائض میں  
داخل کر دیا گیا ہے، اس بنا پر چھ برس کے سن سے چودہ برس کے سن تک ہر شخص

(خواہ عورت ہو یا مرد) اس دائرہ میں مقید رکھا جاتا ہے، اور جو بچہ ان بیڑیوں کو کاٹ کر آگے بڑھنا چاہتا ہے اسکو پولیس قانوناً مجبور کر کے پیچھے ہٹا دیتی ہے،

جبری تعلیم کا قانون فریڈرک ویلم اول کے عہد میں ۱۸۱۹ء میں پاس ہوا تھا، اُس وقت سے لیکر آج تک ہر شخص اس قانون کے آگے سر جھکا رہا ہے، اور اس طرح جو لوگ اسکے موافق نہیں ہیں انکو بھی چارو ناچار اسکو ماننا پڑتا ہے،

۱۸۱۹ء میں سلطنت کی کل آبادی میں ۳۱۱۰۰۰ جاہل پیدا ہوئے، جبکہ اوسطاً ہزار سپاہیوں میں ایک نکلتا ہے،

جرمنی کے تمام آبادی میں ہر شہر، ہر قصبہ، بلکہ ہر قریۃ تک ایک بیت العلوم ہوتا ہے جنہیں مکتب، دارالمطالعہ اور اخبارات بکثرت ہوتے ہیں، ۱۸۱۹ء میں اس سلطنت میں ۹۳۰۰ مکتب تھے، جنہیں ۸۶۶۰۰۰ لڑکے تعلیم پاتے اور ۵۰۰۰۰۰ اساتذہ درس دیتے تھے، اسی سال ۱۱۳ ٹریننگ اسکول (ابتدائی استادوں کے لئے) ۲۴۴ مردانہ اور ۴۰ زنانہ ٹریننگ کالج قائم ہوئے، مکاتب جبکہ نصاب کم از کم آٹھ سال میں ختم ہوتا ہے، عموماً مفت اور بلا فیس ہیں، اور ان پر ۳۴ ملین مارک صرف ہوتا ہے، جنہیں سے ۸ ملین سلطنت اور بقیہ مینوسیلٹی کی طرف سے ملتا ہے، ان مدارس کے علاوہ اور بھی بڑے بڑے مدارس اور کالج قائم ہیں، چنانچہ ۱۸۳۲ء کی رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ انکی تعداد ۵۰۱۲ سے زائد ہے،

جرمنی میں فلاحی، معاشی اور صنعت و حرفت کے بہت سے مدارس ہیں، معنیاً کے ۱۴ مدرسے ہیں جنہیں سے دس پرورشیا اور بقیہ دیگر مقامات میں واقع ہیں تجارتی مدارس انکے علاوہ ہیں، ان میں سب سے بڑے کالج لپزیگ، آخن، ہمبرگ، فرانکفرٹ

کولن اور برکن مین واقع ہیں، ۵۴ چوٹے اور ۱۸۱ ابتدائی تجارتی مدارس بھی موجود ہیں، لیپزگ مین ایک مدرسہ ہے جسین کتجانہ کی ترتیب اور اسکے نظم و نسق کا طریقہ بتلایا جاتا ہے، اسی طرح فوجی، بحری، اور جنگی اکاڈمیاں بھی ہیں، موسیقی اور بیٹاری کے بھی بڑے بڑے کالج قائم ہیں، جنین انہمنٹیس، البرفلڈ، مولہاٹم اور کرفلڈ کو خاص اہمیت حاصل ہے، جرمنی کے دوسرے صوبہ جات مین ورزش خانے، عجائب خانے، مطالعہ خانے اور جانور باغ بکثرت ہیں، جنگو عوام کی اصلاح و تربیت مین بہت زیادہ دخل ہوتا ہے اندھون، گولنگون اور بہرون کی تعلیم کے لئے جو مدارس ہیں انکا شمار اس سے علیحدہ ہے، جرمنی مین ۲۲ یونیورسٹیاں ہیں جنین ۳۲ کی رپورٹ کے مطابق ۵۶۰۳۷ کے تعلیم پاتے ہیں، ۷۹۲ مرد اور ۱۲۷۱ عورتین جو صرف لکچرون کی سماعت مین شریک ہتین اور درج رجسٹر ہتین ہتین انکے علاوہ ہیں،

جرمنی کی سب سے قدیم یونیورسٹی ہایدلبرگ مین ہے جو ۱۸۵۸ مین قائم ہوئی، اور سب سے اخیر اسٹراسبرگ یونیورسٹی ہے جسکا ۱۲۹۰ مین سنگ بنیاد رکھا گیا، جرمن یونیورسٹیوں مین چار موضوع پر لکچر دیا جاتا ہے،

(۱) علم کلام یا فلسفہ الہیات

(۲) قانون

(۳) ڈاکٹری

(۴) فلسفہ

ان مین سب سے زیادہ اہمیت فلسفہ کو حاصل ہے، لیکن بعض یونیورسٹیوں مین اور علوم کو بھی اہمیت دی جاتی ہے، مثلاً بون اور برسلا یونیورسٹی مین چار موضوع کے



مجلس قومی، کتب خانہ، جماعت عالیہ نظامیہ، کتب خانہ بلدیہ، کتب خانہ انجمن اخلاق زیادہ مشہور ہیں ان کتب خانوں میں سالانہ تقریباً ۱۰۰۰۰ ناظرین آتے ہیں اور ۴۰۰۰۰ اشخاص کو کتابیں مستعار دی جاتی ہیں، قومی کتب خانوں میں جنگی تعداد ۷۰ ہے، ۴ کروڑ سے زیادہ کتابیں محفوظ ہیں، درجیہ اسکالرشپ کی رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے ۱۰۰۰۰ اشخاص انکے مطالعہ کے لئے آئے اور چار کروڑ سے زیادہ کتابیں مستعار دی گئیں،

برلن کی علمی عمارت میں قومی رصد خانہ کو بھی خاص طور پر شہرت حاصل ہے جسکے ذریعہ اب تک پانچ بالکل جدید ستارے دریافت ہوئے ہیں، جن میں ایک پنچون بھی ہے، نیز اسی رصد خانہ سے ۱۳ مدار ستاروں کا بھی اکتشاف ہوا ہے،

جرمنی میں اشاعت علوم و فنون کا سب سے بڑا محرک پریس کا وجود ہے، جس نے نہایت کثرت سے نادر کتابیں چھاپ دی ہیں، چنانچہ اسکا اندازہ حسب ذیل فہرست سے ہوگا،

جلد	۲۹۹	۹۷۸
"	۷۹۱	۱۰۰۹
"	۹۵۱	۱۱۲
"	۳۳۳۵	۱۲۱۵
"	۲۶۹۰۲	۱۳۲۰

لیکن سب سے زیادہ حیرت انگیز اہل جرمنی کا ذوق کتب بینی ہے، چنانچہ شہر جنا کے مطالعہ خانہ کے ہتھم نے جو اعداد و شمار شائع کئے ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ جرمن کتب خانوں میں کتابوں کی کتنی تعداد ہے اور ان کا اوسط ناظرین کے لحاظ سے کیا نکلتا ہے، اور وہ حسب ذیل ہے،

نام شہر	فی سوا دی	جلد کتاب
رشد	"	۲۷
برین	"	۴۶
ہبرگ	"	۵۰
لیوبک	"	۵۳
فرانکفرٹ	"	۸۳
اوسنبرگ	"	۱۰۰
ڈارمشاڈ	"	۱۰۴
دساؤ	"	۱۳۵
بارمن	"	۱۶۶
جنا	"	۳۲۷

یہ پبلک کتب خانوں کی رپورٹ ہے، لیکن انکے علاوہ جرمنی میں اور بھی بڑے بڑے کتب خانے قائم ہیں، جکا اس رپورٹ میں ذکر نہیں ہے، اسلئے انکے ناظرین اور کتابوں کی تعداد کا موازنہ نہیں کیا جاسکتا،

ان کتب خانوں کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ ان سے عوام نہایت کثرت کے ساتھ مستفید ہوتے ہیں اور اسلئے ان سے تمدن کا ایک بڑا مقصد حاصل ہوتا ہے، کیونکہ بقول ڈاکٹر ہرمان ڈلیس

”تمدن جدید کی اشاعت اور صنعت و حرفت کی تکمیل کے لئے نہایت ضروری ہو کہ علوم و فنون کو یونیورسٹیوں کے احاطہ کے اندر مقید نہ کیا جائے بلکہ اسکے بجائے انکو

الماریوں اور کوہریوں سے باہر نکال کر منظر عام پر لایا جائے تاکہ اس سے مزدور اور  
کارگیر بھی متبع ہوں، کیونکہ تمدن جدید نے ان فرقوں کو بھی تحصیل علوم پر مجبور کر دیا ہے۔  
اور چونکہ یہ بارہا مشاہدہ میں آچکا ہے کہ دنیا کے بڑے بڑے لوگ عموماً پست  
طباقوں سے پیدا ہوتے ہیں، اسلئے کوئی وجہ نہیں کہ ان طباقوں کو علوم و فنون کی روشنی  
سے محروم رکھا جائے، کیونکہ وہ قابلیت اور استعداد جو ان میں فطری طور پر مخفی ہے  
اس روشنی سے دفعتاً چمک اٹھیں گی،

اہل جرمنی کی اصلاح تربیت کا نہایت موثر ذریعہ  
اخبارات و رسائل ہیں، جو ملک کے مختلف صوبوں سے نہایت کثرت کے ساتھ  
شائع ہوتے ہیں، چنانچہ سن ۱۹۳۲ء میں فقط برلن سے ۱۱۰۰ سے زائد اخبارات نکلتے تھے،  
اسکی وجہ یہ ہے کہ جرمنوں کا ہر طبقہ اخبار بینی کا عادی ہے، اور اسلئے مضمون نگاروں کا  
ایک ایسا گروہ پیدا ہو گیا ہے جو صرف انکار کی اصلاح و تربیت، اور اخلاق کی تہذیب  
و تکمیل کو اپنا فرض سمجھتا ہے، اس بنا پر اسکے مضامین ہمیشہ طبی، علمی، یا اخلاقی ہوتے ہیں،  
جبکہ مفید ہونے میں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا، گیتے نے اسی قسم کے اخبارات کے متعلق  
کہا ہے کہ وہ ”معلومات کا مخزن ہوتے ہیں“



## امنِ عالم

فوری کے معارف میں فریج نلسن پائل رچرڈ کی کتاب پیام امن کا خلاصہ درج کیا گیا تھا، ذیل میں اصل کتاب کے بعض حصوں کا ترجمہ درج کیا جاتا ہے، پوری کتاب اردو میں اشاعت کے لئے تیار ہے۔ (جلد ماہد)

مذہبوں سے انسان کو اسکا احساس ہے کہ نظام کائنات کے اس ادنیٰ ترین جزو کو ارض پر حیات چند روزہ پا کر آپس میں لڑنا جھگڑنا، سنی دہشتاں کے ساتھ تفریق اور تفریق و تفریق قائم کرنا، اور بجائے باہمی خلوص و معادنت کے ساتھ ہنسی خوشی زندگی بسر کرنے کے اہل کی دستبرد میں معین ہونا کس قدر حماقت بلکہ جنون ہے،

مذہبوں سے وہ اس جنون کے ازالہ، اس مرض کے دفتیر کی فکر میں ہے، لیکن اب تک کامیابی نہیں ہوئی، یہ آخر کیوں؟

حکماء نے برکات صلح بیان کئے، انبیاء نے پیام امن کی منادی کی، تاہم دنیا ابھی تک انکی آمد کا انتظار کر رہی ہے، اسکی کٹی ہوئی دھبہ یہ ہے کہ امن کوئی ایسی شے نہیں جو ہر دوسری کی طرح آسمان سے نازل کرے، بلکہ انسان کے احساس انسانیت کا نتیجہ ہے اور انسانیت کے احساس سے اسوقت تک قلوب انسانی نا آشنا ہیں،

بڑی بڑی سلطنتوں نے ہمت کی کہ دنیا میں امن قائم کر دیا جائے، بڑے بڑے فاتحین نے منصوبہ باندھا کہ اپنے زور و قوت سے دنیا میں امن قائم کر کے رہیں گے، لیکن ان ہمتوں کو

زرد آہنی کے بار نے توڑ توڑ دیا، اور یہ خواب ہمیشہ جھوٹے نکلے، اسلئے کہ اس کا جنگ سے اور نرمی کا سختی سے پیدا ہونا محال ہے، یہ ناممکن ہے کہ جنگ سے صلح پیدا ہو سکے،

آج پھر قوموں میں یہی پرانا منصوبہ تازہ ہو رہا ہے وہ یہ سمجھتی ہیں کہ یہ جنگ آئندہ جنگوں کا خاتمہ کر دیگی، اور عسکریت کی یہ طاقت ہمیشہ کے لئے عسکریت کا زور توڑ دیگی،

اگر علاج بالمثل کے اس قابل تخفیر اصول میں کچھ بھی صداقت ہوتی تو مدت ہوئی دنیا سے

جنگ رخصت ہو چکی ہوتی، یہ لوگ اس دہم میں گرفتار ہیں کہ ایک حربی فتح دنیا میں

صلح قائم کر دیگی، حالانکہ دنیا کی صلح وہ صلح نہیں جسکے شرائط فاتح یا قوی ترین فریق مرتب

کرے، دنیا قدیم رومیوں کے شرائط صلح کی پابندی نہیں کر سکتی، دنیا کو جس شے کی ضرورت

ہے اور جس امر کا انتظار ہے وہ نفع انسانی کی صلح ہے، جیسے دستخط مفتوح اقوام کے نہیں

بلکہ آزاد اقوام کے ثبت ہونگے، اور جسکے شرائط خود انسانیت کے ایہار سے تمام اقوام کو

مساد یا نہ املا کئے جائینگے،

دنیا میں قیام امن تو فوجی طاقت سے ہو سکتا ہے، اور نہ فرقہ مصالحانہ کی کمزوریوں سے

اس فرقہ کو روشن ترین تو قعات کے باوجود جیسی تاکامی ابکی نصیب ہوئی، پیشتر کبھی نہیں

نصیب ہوئی تھی، سرکاری حیثیت سے تمام قومیں بلکہ انکے حکمران تک بھی بول بولنے لگے،

اس پیام کی منادی خود زارتک نے کی تھی، اور اسی کے اپیل کے مطابق دوسری

سلطنتوں نے اپنے ہاں اس غرض کے لئے مجلسین منعقد کیں، صلح دامن کے نام سے

۱۷۔ یورپ میں انیسویں صدی کے آخری زمانہ سے ایک فرقہ (Pacifism) کے نام سے

پیدا ہوا ہے جسکا مقصد یہ ہے کہ دنیا میں امن و صلح کی منادی کرتا رہے،

ایک مندر تعمیر کیا گیا، مگر اسی تاریخ سے ان ہولناک محاربات کی بھی بنا پڑ گئی، جنگی نظیر سے تاریخ عالم خالی ہے،

یورپ کے تمام قانون سازوں نے قوانین کی مدد سے بڑی بڑی عدالتیں قائم کر دی ہیں کہ وہ فصل خصوصیات بجائے طاقت و قوت کے حق و استحقاق کی بنا پر کریں اور جنگ تک کے آئین و ضوابط مقرر کر دئے ہیں تاکہ غلبہ و قوت کے وقت بھی حق کا عنصر شامل رہے، بایں ہمہ شاید آج سے زیادہ قوت، حق پر بھی غالب نہ آئی ہو، تمام ممالک کے طبقہ عمال (مزدوری پیشہ گردہ) نے جنگ کے خلاف اتحاد کر لیا تھا، انہوں نے ایک دوسرے سے حلف لے لیا تھا، کہ بصورت جنگ سب بغاوت کر دینگے، انکی مرکزی بین الاقوامی مجلس گویا امن و صلح کی ایک قطعی ضمانت تھی، لیکن آج وہی لوگ ایک دوسرے کے قتل میں مصروف ہیں، اور جن زبانوں پر کل تک مواخات کی تعلیم تھی وہی آج مقابلہ میں مصروف رجز خوانی ہیں!

تمام قوموں نے جنگ سے محفوظ رہنے کے لئے کثرت سے معاہدہ و اتحاد نامہ مرتب کئے تھے اور قیام امن کے لئے صلحناموں کی تعداد حد سے بڑھ چلی تھی، لیکن آج جنگ کی خبیث روح ہر سمت سے مجتمع ہو کر خشک مقامات میں اپنا گھر پیدا کر رہی ہے اور اپنے ہمراہ اپنے سے خبیث تر سات روحوں کو اور لئے ہوئے ہے، اسوقت چودہ قومیں ایک دوسرے کو ہلاک کرنے میں مشغول ہیں،

فرقہ صلح جو اس دہم میں مبتلا تھا کہ روز افزوں اقتصادی مادیت اور فوجی و مددوں کی افراط، سب اُسکی تائید میں ہے، گویا خدا یا تجارت کی خدائی میں آئینہ کے میدان کارزار محض تجارتی منڈیاں رہ جائیگی، آئینہ کے محاربات محض تجارتی مقابلہ و سابقہ

ہونگے، اور آئندہ کے فتوحات محض افزائش پیداوار کے مرادف ہونگے، دنیا کی ہمنائی اسی دنیا سے تجارت نے کی اور قعر ہلاکت کی جانب بھی رہبری اسی دنیا سے تجارت نے کی، یہی اقتصادی جنگ اسوقت دو کردار جانیں لے چکی ہے، اور مال کا جتنا انحصار ہوا ہے وہ اندازہ سے باہر ہے،

پیداوار نے بالآخر خود اپنے پیدا کر نیوالوں کو مضمر کر لیا،

پھر یہ بھی کہا جاتا تھا کہ جدید آلات ہلاکت و مہلک سامان حرب کی دہشت ایسی دلوں میں جاگزیں ہو جائیگی کہ لڑائی چھڑنے کی کسی کوشش ہی نہ ہوگی، لیکن اب تو تجربہ ہو گیا کہ پورے پچیس ہینوں سے مالک دوزخ نے دنیا پر جہنم کے دروازے کھول دیئے ہیں اور ہر طرح کے عذاب و عقوبت کی بارش ہو رہی ہے مگر پھر بھی آگ کے شعلے بجائے ماند پڑنے لگے اور تیز ہی ہوتے جاتے ہیں،

آخر یورپ کے اس صلح جو فرقہ کی کوششوں کی ناکامی کامل کا کوئی سبب؟ بیشک اسکے اسباب ہیں جنہیں سب سے پہلا سبب یہ ہے کہ یہ ایک محض یورپین فرقہ تھا ان اقوام کا، انکے مقننون اور مدبروں کا، انکے عمال اور انکے فرمان رواؤں کا انتہائی مقصود امن نہ تھا، امن کامل نہ تھا، بلکہ محض آپس کا امن، خود غرضاً نہ امن مقصود تھا اس قسم کی جوٹی صلح کی کوششیں ہمیشہ ناکام رہیں گی،

ہیگ میں انکی عدالت صلح بیشک قائم تھی لیکن اس عدالت کا انصاف ان شامت زدوں کے لئے نہ تھا جنکے دور افتادہ مالک پر دندان آرتیز ہو رہے تھے، اس محکمہ انصاف کے ضوابط میں ان غیر مسلح آبادیوں پر فوجی تسلط قائم رکھنا ذرا بھی

لے یہ تخمینہ سترہ کا ہے،

حقوق اقوام اور احترام تمدن کے منافی نہ تھا، جنکا رنگ سفید نہ ہو، یہ مکملی ہوئی تھی، لیکن  
 ہوتی رہیں اور کسی ایک سوشلسٹ نے بھی بغاوت کا ارادہ تک نہ کیا، غرض صلح و  
 امن کی ہر تدبیر میں یہ مقصد کبھی نظر سے نہ ہٹنے پایا کہ ہر سلطنت کی ہوس استعمار و شوق  
 ملک گیری کے لئے نذر ہو نیکی کوئی جدید علاقہ تیار رہے، فرقہ صلح جوئے کبھی اس جانب  
 توجہ نہ کی، اسے اپنے محدود دائرہ سے باہر توجہ کر نیکی کوئی وجہ ہی نہ تھی، وہ اس حقیقت کو  
 فراموش کئے رہی کہ جو شمشیر حملہ کر رہی ہے کل اسپر بھی حملہ کیا جائیگا۔“

مستقل و ممکن امن صرف وہی ہے جو سب کو ایک دوسرے کے مقابلہ میں حاصل ہو  
 جو وقت تک دنیا میں ایک قوم بھی ہدف جنگ بنی ہوئی ہے، دوسروں کو امن سکون سے  
 رہنا ناممکن ہے، یورپ کی یہ تمنا تھی کہ خود یورپ میں صلح رہے، اور آٹا لیک یورپ ہی  
 کی حکمت عملی دوسرے اقطاع ارض میں انسان کا خون بہاتی رہے، آئینہ صلح نامہ پر موجود  
 متحاربین کا دستخط کر دینا بالکل لاعلم رہیگا، تاوقتیکہ اسپر دنیا کا باقی حصہ بھی دستخط کرے  
 تاوقتیکہ آئینہ مجلس صلح میں عالم انسانی کی پوری نیابت ہو، امن کی بخشش صرف  
 انسانیت کے ہاتھ میں ہے، انسانیت اسے اقوام کو عطا کر سکتی ہے، بشرطیکہ اقوام  
 اسے اپنی مجلس کا صدر بنائیں،

اگر صلح منظور ہے تو پہلے اپنے غلاموں کو آزاد کرو کہ وہ تمہارے برابر بچھکر گفتگو

کر سکیں، ورنہ صلح کا نام نہ لو،

اس سے بڑھ کر یہ کہ اپنے قلوب، اپنے نفوس کو آزاد کرو، جنگ و صلح کا اصلی مبداء

دماخذ خود تمہارا قلب ہے، اگر صلح کا وجود تمہارے قلب میں نہیں تو فرقہ صلح جو کی تمام

لے فرقہ اشتراکیہ،

کوششیں قطعاً لاجصل ہیں، جنگ پیدا ہوگی اور اپنے رویہ میں سب کو بہالے جائیگی،  
 نظامات، قوانین، محکمہ جات ثالثی، بین الاقوامی معاہدے، اقرارنامہ اور تجلیں  
 مبادلہ زمین اضافہ، اقوام کے تعلقات باہمی میں افزائش، صلح کو ترقی دینے والے  
 اسباب و حالات .... سیل ہلاکت کی روک تھام کے لئے کتنے مضبوط بند قائم کر دیئے  
 گئے تھے، لیکن جب یہ سیلاب سوج زن ہو تو تمام بند توڑتا ہوا اپنے ہمراہ بہا لیک گیا بلکہ  
 جتنے زاید یہ بند قائم کئے گئے تھے اتنا ہی رک رک کر سیلاب کے حجم میں اضافہ ہوتا رہا،  
 اور اسقدر زیادہ تندی و قوت کے ساتھ اسکا بہاؤ چلا، اگر فی الواقع اسکی روک تھام منظور  
 تھی تو اسکے منبع کو خشک کرنا چاہیئے تھا، حالانکہ یہ تمام بندشیں ظاہری و خارجی تھیں،  
 لوگوں نے چاہا کہ خارجی ذرائع سے امن کو وجود میں لائیں، حالانکہ یہ شے انکے بس کی  
 نہیں، امن کا مولد منبع قلب انسانی ہے، جنگ کا منبع بھی قلب انسانی ہے، انسان کی  
 انسانیت سے بیگانگی، انسان میں دوسروں کے مساوی ہونیکا عدم احساس، انسان کا  
 قلب ہی وہ سرچشمہ ہے جہاں سے سیلاب خون نکل کر تمام کرۂ ارض پر جوش زن ہوتا ہے  
 اسی سرچشمہ کو خشک کر دینے سے دنیا سے جنگ کا وجود ختم ہو سکتا ہے، تا وقتیکہ انسان  
 کے باطن میں، انسان کے نفس میں اصلاح نہ ہوگی، تمام خارجی تدابیر تمام بیرونی کوششیں  
 لاجصل رہیں گی، اور امن و صلح کے ظاہری قالب کے اندر جنگ و بد امنی کی روج  
 حرکت کرتی رہے گی،

اب آنکھوں سے پردہ ہٹ گئے ہیں اور ساتھ ہی امیدوں کا طلسم بھی ٹوٹ گیا ہے  
 قدیم حالات کو رضا مند رکھنا امن کے لئے کافی نہ تھا، راضی نامہ کر لینا امن کے مرادف  
 نہیں، قدیم حالات کے فنا ہو جانیکے ساتھ فرقہ صلح جو کا بھی خاتمہ ہو رہا ہے، لیکن اسکی یہ

ناکامی آئندہ کامیابیوں کے لئے بھی دلیل راہ کا کام دے رہی ہے، حصول کامیابی کیلئے اس شمشیر بے پناہ کا وجود ضروری تھا، جو بڑیوں تک پیوست ہو جاتی ہے، چنانچہ جنگ اُسے تیار کر رہی ہے، یہ شعلہ شمشیر خود شمشیر قتال کو بھی خاکستر کر کے رہیگا،

وہ مقصد جسے بڑی بڑی سلطنتیں اور بڑے بڑے مذاہب زمانہ ماضی میں پورا نہ کر سکے، جسکے انجام دینے میں زمانہ حال کا تمدن ناکام رہا مگر جسکی تیاریاں تمام گزشتہ صدیاں کرتی آئی ہیں، وہ ایک شے اور صرف ایک شے سے ابھی انجام کو پہنچ سکتا ہے آج حاصل ہو سکتا ہے، وہ شے کیا ہے، انسان میں انسانیت کا احساس، جو رد و کُل کا شعور، اسوقت انسان کے قلب سے امن عالم کی پیدائش ہوگی،

(۲)

## بیدار مئی روح

ایک آواز صدیوں سے آرہی ہے، یہ آواز ضمیر کی گمراہیوں سے پیدا ہوئی ہے سب نے اُسکو سنا ہے، مگر اسپرکان اب تک کسی نے نہیں دہرا ہے، اس آواز کو خاموشی کر دینا کسی کے بس کی بات نہیں، یہ صدا سب سے اعلیٰ تر فرمان کی منادی کر رہی ہے کہ ”ہلاک نہ کرنا“

ایک دوسری صدا، صدا سے خوف زمین سے بلند ہو رہی ہے، آہ جنگ کے شدید و مصائب، زبان انہیں بیان کرنے سے قاصر ہے، اُف، وہ جرائم و معاصی جبکا تعلق حقوق العباد سے ہے، کیا بشرہ انسانی کے عقب میں کوئی اثر پوشیدہ ہے؟ ورنہ آخر اسقدر ترقی تمدن کے ساتھ اس سببیت کا اجتماع ممکن کیونکر ہے؟

یہ واقعات ممکن کیوں ہیں؟ محض اسلئے کہ دنیا سے تمدن کے ہر شہر، ہر قصبہ، ہر گاؤں

میں مدارس موجود ہیں، جہاں چھوٹے بچے پڑھنے کے لئے جمع ہوتے ہیں، اور وہاں استاد انہیں روزانہ یہ درس دیتا ہے کہ انسان کا اہم ترین فرض یہ ہے کہ قومی اغراض کی پاسداری کرے، اور اگر قومی اغراض اسی کے مقصدی ہوں تو اپنے بھنسون کا گلا کاٹنا اسکے لئے کار ثواب ہو جاتا ہے، اور اس پر اپنے حاکم کی جو قتل کے لئے ابھارتا ہے، تعمیل ارشاد زیادہ فرض ہے بمقابلہ اس فرمانِ ضمیر کے کہ ”ہلاک نہ کرنا“

ہاں اسی لئے کہ چونکہ ہر شخص کو بچپن ہی سے اسی قسم کی تعلیم ملتی ہے، ہر قوم میں ہر شخص اسکے لئے تیار ہو جاتا ہے کہ ایک روز قاتل بنے اور اپنے بہائی کے حق میں قصائی کا کام دے، اسکے بعد کوئی جرم اسکے لئے جرم نہیں باقی رہ جاتا اور نوازل و مصائب جنگ کی کوئی انتہا باقی نہیں رہ جاتی،

اور آخر ان نوازل و مصائب کو متعین حدود کے اندر محدود رہنے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ غریب جنگلی درندہ کو آزاد چھوڑ دیتے ہو اور پھر اس سے یہ توقع کرتے ہو کہ وہ انسانیت کے حدود میں رہیگا، اگر جنگ کا اس حد تک وحشیانہ دہیانا ہو جانا تو بہت اچھا ہو اگر بغیر اسکے انسان کے دل میں اسکی طرف سے نفرت ہی نہیں پیدا ہو سکتی تھی، انسان کے دل میں اتنا قتل انسانی کی عزت تھی، لیکن جتنی چیزیں اسکی نظر میں جنگ کو زیادہ وحشیانہ ثابت کر رہی ہیں وہ دراصل اس روزِ سعید کی آمد کو قریب لاتی جاتی ہیں، جب قتل انسانی کے جواز کا امکان نہ باقی رہیگا اور قدیم جنونِ رخصت ہو چکا ہوگا،

قتل حرام ہے، ہر حالت اور ہر صورت میں حرام ہے، جب یہ قطعی فتویٰ صادر ہو جائیگا، اسوقت دنیا سے جنگ کا خاتمہ ہوگا،



جو وقت تک اس فتویٰ میں استثنائی کوئی صورت باقی ہے، جو وقت تک یہ خیال قائم ہے کہ بڑی جماعت مرتب کر کے قتل کرنا جائز ہے، جو وقت تک یہ وہم موجود ہے کہ جماعت کا قتل افراد کے قتل سے مختلف بلکہ معزز ہے، اور جو وقت تک یہ اعتقاد باقی ہے کہ تخواہ پابندالون اور درودی پہنے والوں کے لئے دوسروں کی جان لینے کو حکم جواز ہے اس وقت تک جنگ کا وجود بھی برقرار رہیگا اور جنگ بھی مع اپنی تمام شقاوتوں کے، جو وقت تک متدن افراد کے نفوس میں زہریلی تعلیم کی پیدا کی ہوئی فائدہ عظمت کا احساس باقی ہے، اصول اخلاق اس بدترین بد اخلاقی میں معین ہو رہے ہیں، اساتذہ و معلمین اپنے تلامذہ کے دل و دماغ پر محاربات و معرکہ آرائیوں کی عظمت و شوکت کے نقوش بٹھا رہے ہیں، اس اُم الجرائم کو جرم و معصیت کی حیثیت سے ہمیں پیش کیا جانا ہے اور قتل و خون ریزی کو بدترین معصیت کی شکل میں ہمیں پیش کیا جاتا ہے جو وقت تک صورت حال باقی ہے، اس وقت تک باہمی قتل و ہلاکت کی لعنت اپنی تمام شقاوتوں اور میدردیں کے ساتھ قوموں پر مسلط رہیگی،

اس سے بھی بڑھ کر ستم یہ ہے کہ مدارس میں زبانی اسباق کے علاوہ ان چیزوں کی عملی تعلیم بھی دی جاتی ہے، سب سے پہلے تو اسکی مثال ہمارا قانون معاشری ہی پیش کرتا ہے جو جو وقت تک قانون، نفس بشری کی عظمت اور حیات انسانی کا احترام مجرموں تک میں نہ تسلیم کریگا، جو وقت تک تعزیرات کا لفظ خود جرائم کی شکل میں ہوگا، جو وقت تک کسی خونی کے پوشیدہ جرم کے جواب میں دوسرا خون علانیہ اور کمال میدردی کیا جاتا رہیگا، اس وقت اس خون کی پینٹین جو جلاد کی جنبش شمشیر نے بہایا ہے، بارش کے قطرات نیکر تمام عالم پر برستی رہیگی، اور خونی کو جو قتل کی سزا دی جاتی ہے اس سزا کی

سزائیں جنگ کا دیوتا لاکھوں بیگانہوں کی جان لیتا رہیگا،  
یہ وہ پیام جنگ ہے جو انسانیت تمام اقوام کو دے رہی ہے !

وہ دن آئیوا لائے جب ان سب چیزوں کا خاتمہ ہوگا، اسلئے کہ ہلاک نہ کرنا، کسی  
صدا اب کسی غیر کی، کسی باہر والے کی صدا نہیں رہی ہے، یہ صدا خلقت کے قلب سے  
بلند ہو رہی ہے، انسانیت کا یہ پیغام اب نفوس میں زندہ ہو رہا ہے، اور دنیا کو ایک  
نئی ہدایت کر رہا ہے، اسکی تعلیم ایک بلند تر فرض، فریضہ انسانیت کی تعلیم ہے،  
آج تک فرائض انسانی کا سب سے اونچا تنخیل وطن پرستی کا تھا، لیکن اس وطن سے  
بھی بڑھکر، اس سے محبوب تر اور اس سے زیادہ غیر فانی، مگر اس سے زیادہ نامعلوم و  
لاوارث بھی وہ حقیقی مادرِ وطن ہے جسکے فرزندوں کا شمار ڈیڑھ ارب ہے، مگر جسکے  
فرزندان رشید شاید معدودے چند ہی ہیں، کل سے انسان اپنی محبت و عقیدت کا سجدہ گاہ  
اسی کو بنا بیٹھا، اس حقیقی مادرِ وطن کا نام عالمِ انسانی ہے،

سیکڑوں ہزاروں برس میں انسان نے اتنا سیکھا کہ قوم و ملک کے حقوق خاندان کے  
حقوق سے افضل و برتر ہیں، محبتِ وطن کا مرتبہ محبتِ خاندان سے بڑھا ہوا ہے اور وطن کی  
خدمت پر اپنی جان اور اپنے خاندان کو قربان کر دینا چاہیئے، اب ایک قدم اور آگے  
بڑھنا چاہیئے، اب اُسے یہ تعلیم چاہیئے کہ حقوق انسانیت، حقوق وطنیت سے  
بھی بالاتر ہیں، اور محبتِ خلق کا مرتبہ محبتِ وطن سے کہیں بڑھکر ہے، انسان کو اپنی جان  
بیشک قربان کرنا چاہیئے مگر اس شے پر نہیں کہ اسکے وطن کو کوئی بات چل ہو بلکہ اس  
شے پر کہ عالمِ انسانی میں اسکے وطن کو کوئی مرتبہ چل ہو،

جون جون انسان کے دل میں اس وطنِ عظم کا خیال راسخ ہوتا جائیگا، اسی مناسبت سے اس میں انسانیت کا درد و احساس بھی بڑھتا جائیگا،

انسان حقیقتہً صرف وہ ہے جس میں انسانیت کا احساس موجود ہے، جس کا قلب یہ آواز دیتا رہتا ہے کہ میں پہلے انسان ہوں اور اُس گے بعد انگریز، جرمن، روسی یا جاپانی ہوں، محب وطن ہونے سے پیشتر میں انسان ہوں، میرا سب سے مقدم فرض انسانیت کا ہے، اُسکے بعد کسی ملک کے باشندہ ہونیکا۔

قانون انسانی کی سب سے اہم دفعہ یہ ہے کہ ہر شے پر انسانیت اور حیات بشری کا احترام مقدم ہے، اور انسان کے لئے سب سے بڑی شریت یہ ہے کہ ہلاک نہ کرنا۔  
اپنے ملک کے لئے جان دینا بمقابلہ اپنے خاندان کے لئے زندہ رہنے کے بیشک ایک بڑی بات ہے، لیکن ملک کے لئے اپنی جان دینے سے بھی بڑھ کر یہ بات ہے کہ کسی دوسرے کی جان نہ لیجائے کسی حالت میں اور کسی موقع پر بھی،

اسی جنگ کے دوران میں ایسے اشخاص نکلے ہیں جو اس معیار انسانیت پر پورے اُترے ہیں، انھوں نے اپنی جان دینا قبول کیا، لیکن دوسرے کی جان لینا گوارا نہ کیا، وہ پاکیزہ قلب اور غیر آلودہ خون ہاتھوں کے ساتھ دنیا سے اٹھ گئے،  
وہ انسانیت کی رُوح میں شامل ہو گئے ہیں اور اسی کے ساتھ ابد الابد تک زندہ رہیں گے،

انسانیت ایک زندہ وجود ہے، وہ نابینا ہیں جو اسے محض ایک لفظ سمجھتے ہیں، افراد و اقوام کی طرح وہ ایک حقیقی وجود کہتی ہے، اور اپنے وجود کا احساس کہتی ہے خواہ اقوام و افراد اس کے وجود سے بیخبر ہوں، سب کی اصلی مان وہی ہے جو اپنے بطن سے سب کو پیدا

کرتی ہے، اپنے آفوش میں سب کی پرورش کرتی ہے، اور جسکے اوپر سب کی زندگی کا انحصار ہے یہ اسی کی قوت ہے جو اقوام میں زندگی قائم کئے ہوئے ہے، یہ اسی کا خون ہے جو سب کی رگوں میں دوڑ رہا ہے،

یہ زندہ ہستی ایک زندہ جسم بھی کہتی ہے، اور مختلف اقوام اسکے مختلف اعضا ہیں جو بہ تعلقات ایک دوسرے سے بالکل پیوستہ ہیں، اسکا قلب زندہ ہے، مگر اسوقت افراد کے قلوب میں سو رہا ہے، اسلئے کہ ابھی ان میں عام محبت کا جذبہ نہیں پیدا ہوا ہے، وقت آگیا ہے کہ اس زندہ جسم کا ایک غور و فکر کر نیوالا دماغ بھی پیدا کیا جائے، اور اسکے لئے ضرورت ہے کہ ہر قوم کے وہ افراد یکجا ہوں جو گویا انسانیت کے دماغ سے سوچتے رہتے ہیں، آئندہ اقوام کی رہنمائی و سرداری انہیں کے ہاتھ میں ہوگی،

جب شہروں کی طاقتوں نے مجتمع ہو کر اقوام موجودہ کی تخلیق کر دی، اور ان سے عجائب و غرائب کا ظہور ہونے لگا تو جسوقت سارے عالم انسانی کی قوتیں یکجا و متحد ہو جائیں گی، اسوقت معلوم نہیں کن کن معجزات کا ظہور ہونے لگیگا، اسوقت جبکہ انسانیت میں تنظیم پیدا ہو چکی ہوگی، جبکہ انسانیت خود اپنی قسمت کی مالک ہو چکی ہوگی جبکہ وہ اپنی موجودہ ادنیٰ زندگی کی بندشوں سے آزاد ہو چکی ہوگی، اسوقت وہ انسان جدید، کھیدا کرہ گی جسکی آمد کا فطرت کو انتظار ہے، اسوقت موجودہ پُر امان خوابوں کی تعبیر کیلگی،

اے دیوانہ انسان! تو آج اپنا گوشت اپنے ہاتھوں نوچ رہا ہے، اپنے ہاتھوں اپنی قبر کھود رہا ہے، وقت آگیا ہے کہ تیرے امراض کو شفا ہو جائے اور تیرا شعور و احساس بیدار ہو جائے،

اے اقوام! تم آج اس سے پیچھے ہو کہ ایک ہی جسم کے مختلف اعضا ہو، تم آج

ایک دوسرے کی خون ریزی میں مصروف ہو، وقت آگیا ہے کہ تمہیں اس باہمی مقابلہ سے نجات ملے، اور تم میں یہ احساس پیدا ہو جائے کہ تم سب ایک روح ایک قالب ہو، اپنے میں انسانیت کا احساس بیدار کرو،

اور اسے روح ربانی، تو اس وقت افراد و اقوام سب کے نفوس میں حالتِ خواب میں ہے، تیری بیداری کا وقت آگیا، اب بیدار ہو، بیدار ہو!

## اَحْبَابِ اَعْلَیَّہ

مسٹر سمویل ہوفمین، جو امریکہ کے محکمہ جنگ کے شعبہ سائنس میں مدت تک کام کر چکے ہیں رسالہ سائنٹفک امریکن میں اپنی ایک جدید اختراع کا ذکر کرتے ہیں، اس آلہ کی مدد سے تاریکی کا ل میں بھی اشیاء کو دیکھا جاسکیگا، اس آلہ میں حرارت کی شعاعوں کا اخراج ہوتا رہتا ہے اور انکے ذریعہ سے شب تاریک میں طیارہ، بحری جہاز وغیرہ سب نظر آنے لگیں گے،

کیا دنیا میں آج تک کوئی شخص ایک سنکھ (۱۰۰ پدم) کا شمار کر سکا ہے؟ ایک انگریزی اخبار اس سوال کے جواب میں لکھتا ہے کہ ایسا ہونا قطعاً ناممکن ہے، اسلئے کہ اگر ہم نہایت تیزی کے ساتھ فی منٹ دوسو کی شرح رفتار سے شمار کر سکیں اور بفرض محال شب دروزمہ فوت گنتی میں مصروف رہیں تو بھی اسکے گنے کے لئے ۵۱۲ سال ۵ گھنٹہ ۲۰ منٹ کی مدت چاہیئے!

چند ماہ ہوئے امریکہ کی ایک جہیل میں ایک عظیم الشان شہاب ناقب، اگر گرا، جسکے گرنے وقت اس زور کا دھماکا ہوا کہ دور دور تک مکانات میں زلزلہ پڑ گیا، اور یہ خود تیر تک قائم رہا، اسکے علاوہ روشنی اسقدر تیز ہوئی کہ کوئی پچاس میل کا رقبہ ایک عالم نور بن گیا اور لوگ مارے دہشت کے اپنے اپنے گھر چھوڑ کر بھاگ گئے، ایک شخص جو بحری منارہ نور پر تعین تھا اس نے اس منظر کو چشم خود دیکھا تھا، وہ لکھتا ہے کہ

”مجھے جنوب کی جانب کوئی پندرہ میل کے فاصلہ پر ایک آتشیں گولا، جہیل میں

گرتا ہوا دکائی دیا، نہایت تیز رفتاری کے ساتھ وہ سائین سائین کرتا ہوا فضا کو طے کر رہا تھا، جو وقت وہ سطح آب سے اُگر نکلا، ایک زبردست شعلہ اور بہت زور کا شور بلند ہوا۔

شہاب ثاقب کی تالیخ کے سلسلہ میں سائنس کو جس سب سے بڑے وجود کا علم ہے وہ ”ٹوٹا ہوا ستارہ“ ہے جو چند سال ہوئے کمانڈر پیری کو گرین لینڈ میں دستیاب ہوا تھا، اسکی جسامت اسقدر ہیب قفی کہ کمانڈر موصوف کسی طرح اُسے اپنے ہمراہ نہ لاسکا، بلکہ دوبارہ تیار ہو کر اسے لانے کے لئے ایک اور مستقل سفر کرنا پڑا، اسکا طول ۱۰ فٹ، عرض ۵ فٹ اور بلندی ۶ فٹ ۹ انچ قفی، اور اسکی ساخت لوہے کی قفی، روایت ہے کہ ایک اس سے بدرجہا زاید عظیم الشان ٹوٹے ہوئے ستارے کے آثار دنیا میں موجود ہیں، جسکا قطر ۵۰۰ فٹ کا تھا اور جسکے زمین پر گرنے سے ایک سخت خطرناک شکاف واقع ہو گیا تھا، مگر علماء سائنس اسکا کوئی قطعی ثبوت نہیں رکھتے، ۱۸۵۲ء میں ہنگری کے ملک میں ایک اسی قسم کا تارہ مشاہدہ میں آیا تھا جسکے بہت بڑی دم قفی، جو شل بادل کے نظر آتی قفی، اور جسکے کم از کم ایک ہزار ٹکڑے ٹوٹ ٹوٹ کر گرے تھے، جن میں سے ایک بڑے ٹکڑے کا وزن ایک من ۳۵ سیر تھا، اسی طرح ۱۸۶۱ء، ۱۸۶۲ء، ۱۸۶۳ء میں یورپ کے مختلف ممالک میں بڑے بڑے ستارے بخت ہیب و چوناک دہا کون کے ساتھ گرے ہیں، امریکہ کی درجینا یونیورسٹی میں ایک مستقل انجن اہنین کو اکب کے متعلق تحقیقات کے لئے قائم ہے،

پروفیسر پیٹری، اے، آر، ایس نے جو آثار مصر کی تحقیقات میں خاص امتیاز و شہرت حاصل کر چکے ہیں، حال میں اپنا یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ آج سے دو لاکھ برس کے

عرصہ میں سطح ارض سے زندہ مخلوقات کا وجود قطعاً فنا ہو جائیگا، البتہ یہ ممکن ہے کہ عمق سمندر میں بعض ادنیٰ مخلوقات کی زندگی چند لاکھ سال تک اور قائم رہجائے، دیگر علماء سائنس کو ہنوز اس رائے کے تسلیم کرنے میں تامل ہے،

امریکہ کے ایک گھڑی ساز ولیم بلینفورڈ نے پورے چالیس سال کی محنت کے بعد ایک گھڑی تیار کی ہے جو تمام دنیا میں اپنا جواب ہینن رکھتی، بلینفورڈ علم ہیئت کا ماہر تھا، اور اس نے اپنی بڑی گھڑی (کلارک) کو ایک نادر دائمی جنٹری بنا دیا ہے، دس ہزار سال تک ہر سال، ماہ، ویوم کا پورا پورا حساب اس گھڑی سے ظاہر ہوتا رہیگا، دنیا کے سوتے زاید مشہور شہروں کا طول البلد اور ہر مقام کا ٹیک وقت بھی یہ گھڑی بتلائی ہے، ماہتاب کی حرکت، اسکا طلوع و غروب، آفتاب کی گردش بروجی، موسموں کا تغیر و تبدل یہ سب کچھ اس گھڑی سے معلوم ہوتا رہتا ہے،

ڈاکٹر ہرڈین نے برٹش ایسوسی ایشن کے خطبہ صدارت میں بیان کیا کہ سمندر کی سب سے بڑی گہرائیاں قریب چھ میل کے ہیں، اور یہ سطح ارض کے بلند ترین پہاڑوں کی بلندیوں سے کچھ ہی زاید ہے، نیز یہ کہ اگر درے زمین پر دفعۃً سیلاب آجائے اور کل زمین غرق ہو جائے تو موجودہ سطح ارض کے اوپر دو دو میل گہرا سمندر روان ہو جائیگا،

ڈاکٹر کورٹن نے دیکس، جو دوران جنگ میں بحیثیت سرجن کے طویل تجربہ حاصل کر چکے ہیں، کہتے ہیں کہ وہ نومبر ۱۹۱۷ء میں مالٹا میں متعین تھے، اور اس وقت ہزار ہا سپاہی



عارضہ برف زدگی میں مبتلا ہو کر وہاں آرہے تھے، یہ مرض دفعۃً پیر سے شروع ہو کر سارے جسم تک پھیل جاتا تھا، اسوقت یہ امر تجربہ میں آیا کہ جو سپاہی شراب سے محترز تھے، ان پر اس مرض کا حملہ بہت خفیف ہوا، بخلاف اسکے جو مریض تھوڑی مقدار میں بھی شراب نوشی کے عادی تھے انہیں فوراً زہر یاد شروع ہو جاتا تھا، اور انکی صحت بہت دشوار ہو جاتی تھی، اکلکل کی خفیف مقدار کا بھی جسم میں ہونا مریض کو مددِ صحت مرض کے ناقابلِ بناء دیتا تھا،

پروفیسر ایڈنگٹن نے جو برٹش ایسوسی ایشن کے شعبہ طبعیات کے صدر تھے اپنے خطبہٴ صدارت میں بیان کیا کہ اتنی بات ہر شخص جانتا ہے کہ آفتاب اور ستارے اپنے اندر سے برابر اخراجِ حرارت کرتے رہتے ہیں، لیکن اس واقعہ کے اس عملی پہلو پر کوئی غور نہیں کرتا کہ آخر اس ذخیرہٴ حرارت کا منبع کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ ہر ستارہ کے پاس اس قوت کا ذخیرہٴ عظیم الشان ہونا چاہیئے، یہ ذخیرہ سالمات کی اندرونی قوت (انرجی) میں شامل رہتا ہے، جسکا وجود ہر ذرہٴ مادی میں ہے، آفتاب میں یہ ذخیرہٴ حرارت اسقدر مقدار میں موجود ہے کہ پندرہ پدم سال تک کافی ہو سکتا ہے، اور اب ماہرین طبعیات کے زیرِ غور و تحقیق یہ مسئلہ ہے، کہ اس ذخیرہ کو کیونکر انسانی طاقت کے مطیع و محکوم بنایا جائے، کیونکہ ملش بوریر می کے ڈاکٹر سر آرلٹ رد فورڈ مدت سے اسکے متعلق تجربات کر رہے ہیں، اور امید قوی ہے کہ عنقریب انکی کوششیں بار آور ہوں،

شیر خازنِ بچوں اور بالغوں کے مختلف اعضاء جسم کی فصاحت و طول میں جو نسبت

مدارج ہوتی ہے وہ ایک مستند ڈاکٹر کی تحقیقات کے بموجب حسب ذیل ہے :-

بچہ	بالغ
سر	۲
دھڑ	۳
ہاتھ	۴
ٹانگیں	۵

بچوں میں بمقابلہ بالغوں کے دوران خون کی رفتار بہت تیز ہوتی ہے اور چون  
چون سن میں اضافہ ہوتا جاتا ہے، یہ رفتار وہی پڑتی جاتی ہے، چنانچہ ضربات نفس کی  
تعداد فی منٹ مختلف عمروں میں حسب ذیل ہوتی ہے،

۶ ماہ سے ایک سال کی عمر تک	۱۰۵ تا ۱۱۵
۲ سال سے ۶ سال تک	۹۰ تا ۱۰۵
۱۱ سال سے ۱۴ سال تک	۷۵ تا ۸۵

غذا کا اصل مقصد بدل یا تحلیل ہے یعنی جسم کے ذرات جو ہر وقت تحلیل ہوتے رہتے  
ہیں انکی تلافی غذا کے ذریعہ سے ہوتی رہے، بچوں کا نشو و نما چونکہ ہر لحظہ دہراں ہوتا رہتا ہے  
اسلئے انکی غذا میں ان اجزاء کی تعداد زیادہ ہونا چاہیئے جن سے عضلات جسم کی ترکیب اور  
قوت (حرجی) کی تولید ہوتی رہتی ہے، ان غذاؤں کو اصطلاح طب میں اغذیہ بیضیہ،  
(بروٹیسٹس) اغذیہ معدنی (مینرس) اور اغذیہ مدہنہ (کاربوہائیڈریٹس) کہتے ہیں جن میں

اضافہ کے ساتھ اجزاء مدہنہ (دودھ، رومن وغیرہ) کی ضرورت کم ہوتی جاتی ہے، اور اجزاء نفثاجیہ (اساروح) مثلاً شکر، غلہ وغیرہ کی احتیاج بڑھتی جاتی ہے،

ماہرین طب جدید نے انسانی دانتوں کی تین قسمیں کی ہیں، قواطع، یہ دانت منہ کے وسط میں ہوتے ہیں، ان کا کام غذا کو کاٹنا اور کھترنا ہوتا ہے، روٹی، لکٹ، اور بعض پھل انہیں کے مدد سے کھائے جاتے ہیں، انیاب، انکی شکل مثل شیر اور کتے کے دانتوں کے کیلی ہوتی ہے، ان کا کام ریشہ دار چیزوں کو چیرنا، پہاڑنا اور نوچنا ہوتا ہے، گوشت اور بعض پھل انہیں کے ذریعہ سے کھائے جاسکتے ہیں، اخراس یا ڈارہین، ان کا کام غذا کو چباننا اور پیس پیس کر ریزہ ریزہ کر دینا ہوتا ہے، بچوں میں کل دانتوں کی تعداد بیس ہوتی ہے اور بالغوں میں بیس۔

بچپن کے عارضی دانت جہنین دودھ کے دانت کہتے ہیں، حسب ذیل ترتیب کے ساتھ نکلتے ہیں:-

۶	۱۵	۸	تک
۸	۱۲	۸	
۱۲	۱۵	۸	
۲۴	۳۰	۲۴	
۱۸	۲۴	۱۸	

Incisors

Molars

(Canines)

{

قواطع (زیرین)

قواطع (بالائی)

اخراس (اولیہ)

اخراس (ثانویہ)

انیاب -

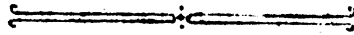
ان عارضی دانتوں کے گر جانے کے بعد مستقل دانت یا اناج کے دانت ترتیب  
ذیل کے ساتھ نکلتے ہیں :-

تواریخ،	۷ سال سے ۸ تک
انیاب	۱۰ " ۱۳
اخر اس (اولیہ)	۶ " ۷
" (ثانویہ)	۱۲ " ۱۴
" (ثالثہ) (اسی کو عقل دارہ کہا جاتا ہے)	۱۸ " ۲۵

بچوں کا معدہ چوٹا ہوتا ہے، اور بالفون کے معدہ کی طرح کام نہیں دیکھتا، اسی لئے  
ایسی غذا میں جنکے ہضم کا انحصار معدہ ہی پر ہوتا ہے، بچوں کو مشکل سے ہضم ہوتی ہیں،  
بمطابق اسکے انکا جگر بڑا ہوتا ہے، اسلئے جن غذاؤں کا جگر سے ہضم متعلق ہے، انہیں  
بہ آسانی ہضم ہو جاتی ہیں، بچوں کی انٹسٹائن بھی بڑی ہوتی ہیں مگر انکی جلد نازک کمزور  
ہوتی ہیں، اسلئے نفاخ غذا میں انہیں بہت جلد نقصان کر جاتی ہیں، بعض غذاؤں کے  
ہضم میں لعاب دہن خاص طور پر معین ہوتا ہے، اور چونکہ بچوں میں اسکی تولید کافی مقدار  
میں نہیں ہوتی، اسلئے اولاد شکر قند، گیہوں و دیگر اقسام غلہ بچوں کے موافق نہیں آتے،

انٹرنیشنل کانگریس آف فلاسفی کا جلسہ، جسکے انعقاد کا اعلان عرصہ ہوا معارف  
میں ہو چکا تھا، آخر ہفتہ ستمبر میں بمقام آکسفورڈ منعقد ہوا، مشہور و معروف فرینچ فلسفی  
برگس صدر نشین تھے، جمعہ کے روز اسکے فاضلانہ خطبہ صدارت کے لئے مخصوص تھا،

ہفتہ کے روز اسٹین کے جدید نظریہ پر بحث رہی، جس میں پروفیسر ایڈنگٹن، ڈاکٹر براؤن، پروفیسر لینڈمین وغیرہ نے حصہ لیا، اسی روز سہ پہر کے اجلاس میں زبان و خیال نگے باہمی تعلقات پر سرگرم مباحثہ رہا، ایکشنہ کو بشپ آف پین کا وعظ رہا جس کا حاصل یہ تھا کہ اصل مسئلہ عبد و معبود کے باہمی تعلق کا ہے، اور اسکے سامنے سب مسائل پیچ و پڑن، سہ پہر کے اجلاس میں ڈاکٹر ولڈن کار، سٹربالغور، وغیرہ کے زیر بحث مذہب و اخلاق کے تعلقات رہے، اسی روز شب کو بھی اجلاس ہوا اور اس میں فنون لطیفہ کی نفسیت پر بحث رہی، دو شنبہ کے اجلاس کی صدارت سٹربالغور نے کی اور اس روز مسئلہ قومیت پر ایک معرکہ الار مباحثہ رہا جس میں انگلستان، فرانس، وائلی کے متعدد حکماء و علماء نے شرکت کی،



# بَابُ التَّحْقِيقِ فِي رُوحِ ادَبِ

## رُوحِ ادَبِ

مصنفہ منشی شبیر حسن خان جوش ملیح آبادی

(ابو عبد اللہ جلدی، ۱۷۱)

اردو کے ذخیرہ ادب میں ادنیٰ و متبذل قسم کے مطبوعات کا جس رفتار سے اضافہ ہو رہا ہے، اسکے لحاظ سے اگر اتفاق سے کبھی کوئی اچھی کتاب نکل آتی ہے تو خاص طور پر سرت ہوتی ہے، جوش صاحب کی تصنیف روح ادب کا شمار بھی اسی آخر الذکر قسم کے نثر پرچہ میں ہے اور اسلئے وہ عالم وجود میں آنے پر ہی خواہ ان اردو کی طرف سے ایک پر جوش غیر مقدم کی متوقع ہے،

مصنف کا نام اردو خوان پبلک کے لئے بالکل نیا نہیں، انکی لطیفین متعدد اخبارات و رسائل میں شائع ہو چکی ہیں، اور ملک ان سے کافی حد تک روشناس ہو چکا ہے روح ادب انکے افادات قلم کے مجموعہ کا نام ہے، جو نثر و نظم کے مختلف حصوں پر منقسم ہے، اور کتاب کی ظاہری زیب و زینت میں متعدد رنگین تصاویر سے بھی افزائش لگائی ہے،

آغاز کتاب میں چند دیباچے شامل کئے گئے ہیں، اور نوجوان مصنف کے فرد امتیاز کے لئے یہ امر کافی ہے کہ ان میں سے ایک دیباچہ حضرت اکبر مدظلہ کے قلم کا ہے، جو شاید مصنف کے نام کوئی خط نہ تھا، ایک دیباچہ کے خاتمہ پر ”شرر لکھنوی“ درج ہے، جس سے ذہن قدرت مولوی عبد الحکیم صاحب شرر مشہور مصنف و ناول نگار کی جانب منتقل ہوتا ہے

لیکن یہ بالکل قطعی ہے کہ اس دیباچہ کی عبارت انکی عبارت نہیں، یہ کوئی دوسرے شعر ہونگے، ایڈیٹر دگلڈ از کی شہرت و مقبولیت نے لکھنؤ میں متعدد و شرر "پیدا کر دئے ہیں بہر حال ان دیباچہ نگار صاحب کے نام کی تصحیح مصنف پر فرض تھی،

اردو میں اس وقت شاعر دن کی کمی نہیں، انکی پوری تعداد مشکل ہی سے شمار میں آسکتی ہے لیکن ان میں سے چند ہی ایسے نکلیں گے جو فی الواقع شاعر کے لقب کے مستحق ہیں، جو شہ صاحب انہیں چند مستثنیات میں سے ہیں، اور اپنے ہم سن شاعر دن میں تو یقیناً وہ اپنا نظیر نہیں رکھتے، وہ رسماً شعر نہیں کہتے بلکہ فطری شاعر ہیں، نہرت تشبیہات و استعارات بلند خیالی، معنی آفرینی، اور درد و گداز انکے کلام کے اوصاف مخصوص ہیں، انکی شاعری جذبات کی شاعری ہوتی ہے "زلف و کاکل" "سرمہ اور پان" "آنکھل اور دو پہ" کی تعلیمات شاید ان کا دماغ نا آشنا ہے، انکے کلام کی نوعیت کا اندازہ اشعار ذیل سے ہوگا۔

یہوشیوں نے اور خبردار کر دیا      سوئی جو عقل، روح کو بیدار کر دیا  
فطرت نے شام ہو تہی ہو گیا اور دکھ      آئینہ تو ابت و سیاہ کر دیا

جمعیتوں نے بڑھکے پریشان بنا دیا      گلشن کو رفتہ رفتہ بیا بان بنا دیا  
آتا ہوں گا راس کسی کو نہ آئے عشق      ہلو تو تیرے درو نے انسان بنا دیا  
دنیا بہت وسیع تھی لیکن میرے لئے      آزادی خیال نے زندان بنا دیا

فناے حرص بیا ہو فداے زہر پرتی ہے      موس! تہچہ میرے پاد نک دنیا بستی ہی  
فنا ہو جا جہلک! آپہنگا سینہ شمع عرفان سے      ابھی تو دل کے آئینہ پہ غافل داغ ہستی ہے

یہ آخری شعر لحاظ بلندی معنی اس پایہ کا ہے کہ اگر کلیات اکبر میں درج پایا جاتا تو  
حیرت نہوتی، چند اور شعر ملاحظہ ہوں :-

جب تم آئے ہو سامنے تو کوئی      اپنی ہستی کو بھول جاتا ہے  
قلب کو دے دو دے خوشی آرام      روح کو درد ہی جگاتا ہے  
دل کے آئینہ میں مرے کوئی      زلفیں بیٹھا ہوا بناتا ہے

کچھ سوچ کے ہر ایک طلبگار فنا ہے      کیا رجز مرے بعد زمانہ پر کھلا ہے  
جس نگاہ کے پردہ میں جھلکتے ہیں آنسو      دراصل وہ سرچشمہ انوار خدا ہے

جاتا ہوں سوے دوست تنہا لے ہوئے      رگ میں اک خلوص کی بنیائے ہوئے  
پھر بارگاہ عشق میں پہنچا ہوں سرکف      زخموں سے پاش پاش کلچہ لے ہوئے  
پھر جلوہ گاہ ناز کی جانب بڑھا ہوں بین      اشکوں کا چشم شوق میں دریائے ہوئے  
پھر خلوت خیال میں بیٹھا ہوا ہے وہ      عارض میں شمع طور کا شعلہ لے ہوئے  
سر کرنے پھر چلا ہوں ہم حُسن و عشق کی      ہر سانس میں شکست کی دنیا لے ہوئے  
ایک اور غزل خصوصیت کے ساتھ قابل ملاحظہ ہے، جیسے چند شعریہ ہیں :-

چشمِ حواس بند ہی مست ہوں موز و ساز سے      طے چلا ہوں اسطرح حُسن جنوں نواز سے  
کہتی ہے آسمان سے ہاں دیکھ یہ سرفرازان      اُنکے جبین بندگی خاک رو نیاز سے  
پیر وے حسنِ چانتان میری نگاہیں پھیر دے      رنگِ طلسمِ دہر سے عشوہِ محض آرز سے  
مسکِ حُسن و عشق میں رکھتی ہوں ربط باطنی      میری نیازِ مندیانِ تیرے غور و نیاز سے



نغمہ پوشش چم گیا، مطرب عقل رو دیا حسن تڑپ کے رہ گیا میرے جوں کے ساتھ

اس طویل غزل کا تقریباً ہر شعر اسقدر بلند پایہ ہے،

اقتباسات بالاحصہ غزلیات کے تھے، لیکن مصنف کا اصلی کارنامہ غزلیات نہیں،

بلکہ قطعات، رباعیات، اور دوسری نظمیں ہیں، جن میں یا کسی منظر طبعی (مثلاً طلوع سورج) کی

مصور می کی گئی ہے، یا اخلاق و موعظت، تصوف و عرفان کے مسائل کی تعلیم نہایت دلکش

پیرایہ میں دی گئی ہے، مصنف کا اصلی جوہر کمال اسی میدان میں اگر کہلتا ہے، دنیا میں اب تک

جتنے الہامی شاعر ہوئے ہیں، سب اپنا اپنا ایک مستقل "پیام" لیکر دنیا میں اسکی تبلیغ کیلئے

آئے تھے، حافظ، عمر خیام، غالب، بیگور، اکبر وغیرہ کل پیمبران سخن اپنے اپنے "پیام"

(فلسفہ حیات) کو دنیا کے کافون تک پہنچا چکے ہیں، جوش کے الہامی شاعر ہونے کی سب سے

بڑی دلیل یہ ہے کہ وہ محض واقعات خارجی کو وزن و قافیہ کی پابندیوں کے ساتھ ادا

نہیں کر دیتے، بلکہ اپنے ایک مستقل "پیام" کی تبلیغ کرنا چاہتے ہیں، وہ پیام کیا ہے؟ اسے

خود پیامبر کی زبان سے سنا چاہیئے، صفحہ ۳۳ سے صفحہ ۳۴ تک ایک طویل نظم درج ہے،

جنکا عنوان "خیالات زمین" ہے، اس میں اس پیام کو نصیح سے ادا کیا ہے، ذیل میں اس کے

جستہ جستہ مقامات درج کئے جاتے ہیں :-

اپنے کو پریشان حال سمجھنا عقل کی یہ کوتاہی ہے

دنیا سے بے پردہ رہنا، سب سے بڑی بہ شاہی ہے

کہتے ہیں جسے شاہنشاہی حاجت کا روا ہو جانا

جس دل میں ہوس کی کثرت ہو دور اس سے حقیقی راحت

آغاز سراپاد ہو کاہی، انجام سرسمر عورت ہے،

تو راز فراغت کیا جانے محدود تری نگاہی ہو

دولت کیا اک روگ ہو دل کا جھوٹا نہیں گمراہی ہے

اس قول کو میرے ماینگا جو صاحب دل ہو دانا ہے

دولت کا نتیجہ کلفت ہو سامانِ مارت دولت ہے

ارمان بہت ہیں کم کر دے مستی یہ نہیں اک غفلت ہے

سایح اٹھا ابتلا گئی وہ دنیا میں خوشی کا نام نہیں  
 اللہ کی رحمت عام ہے سب پر شاہ ہوا میں ہو گا  
 دونوں کے لئے یہ تحفہ ہیں کچھ اگر ہے تو اتنا  
 شاہوں کے سردن میں تاج گرا ہے دوسا اکثر رہا ہے  
 اسباب قبولِ بخیرین، ایوانِ حکومت زندان ہے  
 سکون کی چمک پر رزناہی دولت کیلئے سرگردان ہے  
 اس شے سے تعلق ہی کیسا جو ہیر کر جانوالی ہے  
 شاہوں کی عمارت جسمانی، قافلہ کی حکومتِ معانی  
 دنیا کے تماشے عبرت زرا، عقی کے مناظرِ لاشانی  
 بندے جو ذرا بھی عقل ہو تجھ میں نامِ جہان میں کھانا

جس لڑج ہو سک سک ہو، اس ل کیلئے آرام نہیں  
 یہ چاند یہ سورج، یہ تارے یہ نغمہ بلبلیہ دریا  
 ان جلوؤں سے لذت پاتا ہو آزاد کا دل منعم سے سوا  
 جو اہل صفائیں انکے دل میں نور کا چشمہ بہتا ہے  
 دلچسپ ہے تو سمجھا ہی وحشت کا وہ ساز و سامان ہے  
 تو را ز فناء معلوم تو کر دنیا کے لئے کیوں حیران ہے  
 سامانِ توفیق جمع کئے جا موت بھی آئینہ الی ہے  
 ظاہر کی مسرت سلطان کو، آزاد کو لذت و جدائی  
 مرنے میں حقیقی آزادی، جیسے مین سر اسر حیرانی  
 اللہ اگر توفیق تجھے دے موت سے پہلے مر جانا

”دینا“ ”ٹوٹنا“ بے ثباتی “ وغیرہ متعدد منظومات کے ساز و دھن سے یہی نغمہ پیدا ہو رہا ہے  
 اور جو کان اس نغمہ سے از خود لطف نہیں اٹھا سکتے، انکے لئے کسی بیرونی شخص کی سعی توضیح  
 و تفسیح بھی لا حاصل ہے،

جوش صاحبِ نظم ہی کے شاعر نہیں بلکہ نثر کی شاعری پر بھی یکساں قادر ہیں، ”روح  
 ادب کا ایک شلٹ حصہ انکے کلامِ نثر پر مشتمل ہے، دعا، صداقت، رحمت، امید، محبت  
 وغیرہ مختلف عنوانات پر انکے مختصر مضامین ہیں، جن میں سے کوئی بھی چند سطروں سے زائد  
 طویل نہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ جقدر یہ مضامین مختصر ہیں، اسی نسبت سے لحاظِ معنویت  
 بلند ہیں، اور لطائفِ ادب کی روح انکے لفظ لفظ سے جھلکتی ہے، ایک مضمون جس کا عنوان  
 ”منزلِ رسی“ مناسب ہو سکتا ہے ہم یہاں نقل کرتے ہیں، اس سے ان مضامین کے

عام انداز تحریر و نوعیت کا اندازہ ہو سیکے گا۔

”میں نے ایک سرک دیکھی نہایت دلفریب، جبکہ دونوں طرف سایہ دار اور خوب  
درخت جوم رہے تھے، میرا دل خوش ہوا اور میں نے خیال کیا کہ شاید یہی تیرے مکان کا راستہ“  
میرے دل میں خوشی کا جوش پیدا ہوا، اور اُدھر روانہ ہو گیا، میں برابر چلتا رہا اور  
راستہ اس قدر دلفریب تھا کہ ہر قدم پر جی چاہتا تھا کہ یہیں ٹہر جائیے،  
راہ طے ہوتی جاتی تھی اور میرے دل میں خوشی بڑھتی جاتی تھی، میں مسرور تھا کہ  
اب مجھے تیرا نشان مل جائیگا،

جاگاہ دور سے چند علامات (ایسے نظر آئے کہ میں سمجھ گیا کہ اب راستہ قریب الختم ہے،  
میری رفتار کو ان علامات نے اور بھی تیز کر دیا اور میرا اشتیاق مجھے تڑپانے لگا اور  
آخر کار میں راستہ کی انتہا تک پہنچ گیا،

انتہا تک پہنچتے ہی میرے منہ سے میا ختہ ایک چیخ نکلی، اور میں سر ہلکا کر زمین پر  
بیٹھ گیا، میرا تمام جسم کانپ رہا تھا۔۔۔۔۔ اسلئے کہ میرے سامنے ایک نہایت عین غارتھا،  
جس میں مردوں کے ڈھانچے پڑے ہوئے تھے، اور وہ ہتھاک ورنہ سے ان ہڈیوں کو توڑ رہے تھے  
اور لٹھ اس غار سے اُڑ رہی تھی،

قریب تھا کہ مجھ پر غشی طاری ہو جاتی کہ ایک آواز میرے کان میں آئی، کہنے والا  
کہہ رہا تھا، ”افس“ اے مسافر افس، تو نے راستہ کو خاک اور خونگوار دیکھ کر ہچکچاہٹا  
ہلے مکان کا راستہ یہی ہے، اتنی سی بات بھی تیری عقل میں نہ آئی کہ ہمارے قہر کا راستہ  
تو خوفناک ہڈیوں اور خونگوار سمندر کے اندر سے ہو کر گزرتا ہے۔“ (صفحہ ۱۱۷، ۱۱۸)

میا تنک کتاب کے روشن و خوشگوار پہلو کا ذکر نہ تھا، لیکن حق پوشی ہوگی اگر مصنف کی

توجہ ان امور پر مبذول نہ کرائی جائے جو خصوصیت کے ساتھ محتاج اصلاح ہیں، سفید چاندنی پر معمولی دھبہ بھی سخت بدنامعلوم ہوتے ہیں، اچھے مصنف کی معمولی کموریان بھی سخت تکلیف دہ ہوتی ہیں،

(۱) کتاب متعدد ابواب میں تقسیم کی گئی ہے، لیکن ترتیب ابواب نہایت ناقص ہے، صفحہ ۲۲ تک جو مضامین مندرج ہیں وہ کسی خاص عنوان کے ماتحت نہیں، صفحہ ۲۳ پر ”نظم“ کا عنوان درج ہے، یہ باب صفحہ ۵۹ تک آیا ہے، اس حصہ میں متفرق نظمیں ہیں، لیکن غزلیات، ادبیات وغیرہ کو اس حصہ سے الگ رکھا ہے، حالانکہ ”نثر“ کے مقابلہ میں جب نظم کا اطلاق کیا جاتا ہے تو اسکے تحت میں غزل، قصیدہ، قطعہ، رباعی جملہ اصناف سخن آجاتے ہیں، صفحہ ۶۱ سے صفحہ ۶۷ تک کا حصہ ”غزلیات“ کے زیر عنوان ہے، اور صفحہ ۷۷ سے صفحہ ۷۸ تک ”سبد گل“ کے، حالانکہ اس حصہ میں غزلیات بھی ہیں، اور نوعی حیثیت سے ان دونوں حصوں میں کوئی فرق نہیں، اسی طرح اور بھی نقص ترتیب و تدوین سے متعلق موجود ہیں، (۲) اس مجموعہ میں دو ایک شعرا ایسے بھی آگئے ہیں جنکا اندراج خود مصنف کی مناسبت، پاکیزہ خیالی، وحسن ذوق کے لئے باعث عار ہے، مثلاً صفحہ ۱۵۹ پر یہ شعر ہے

زنگین بخون نے زنج کیا دل کو برین  
مرنے کو اور جانیئے پنجاب میل پر

یا یہ شعر ہے

ہراسٹیشن پہ دواک زخم کاری لاق کہاتے ہیں  
سفر کرتے ہیں یا ہم گنا کے میدان میں جاتے ہیں  
غیبت ہے کہ اس قسم کے اشعار کی تعداد دو چار سے زائد نہیں ورنہ بدگمان طبائع میں مصنف کی شخصی زندگی سے متعلق خدا معلوم کیا کیا خیالات قائم ہوتے،

(۳) علم و ادب کی دنیا میں افادہ و استغادہ کا سلسلہ برابر قائم ہے، کسی اہل کمال کیلئے

یہ امر مطلقاً باعثِ عار نہیں ہو سکتا کہ اس نے کسی دوسرے با کمال سے خوشہ چینی کی ہے، البتہ اسکا اعتراف نہ کرنا بیشک قابلِ اعتراض ہے، عالی کے کمال شاعری میں اس سے مطلق فرق نہیں آیا کہ انھوں نے غالب و شیفتہ سے مستفید ہو بیگا بار ہا اعتراف کیا، غالب کے مرتبہ میں اس سے ایک ذرہ کی کمی نہیں پیدا ہوئی کہ انھوں نے میر کی اولیت و افضلیت کو ایک سے زائد موقع پر تسلیم کیا، ہمارے نوجوان شاعر کو اس وصف میں بھی ممتاز ہونا چاہئے نہ تہا جن لوگوں نے ٹیگور کے کلام کا مطالعہ کیا ہے، انہیں ایک نظر میں پتہ چل جاتا ہے کہ جوش کس بڑی حد تک ٹیگور سے مستفید ہوئے ہیں، خصوصاً حصہ نہرین، علی ہذا حصہ نظم میں حضرت اکبر کا کلام قدم قدم پر انکے لئے دلیلِ راہ کا کام دے رہا ہے، خیالات کا توار دالگ ہا بعض مقامات پر مسلم الفاظ و ترکیبات تک ٹیگور و اکبر کے ہاں سے جوش کے ہاں منتقل ہو آئے ہیں، اور حیرت ہے کہ کسی مقام پر اسکا اعتراف اشارۃً بھی نہیں کیا گیا ہے، جوش صاحب کا ایک شعر ہے، ۷

چشمِ حواس بند ہست ہوں سوز و ساز سے      لئے چلا ہوں اس طرح حُسنِ جنون نواز سے  
حضرت اکبر اس سے بہت پیشتر فرما چکے ہیں،

چشمِ خرد سے عارِ نتا حُسنِ جنون نواز کو      عقل نے آنکھ بند کی اس نے حجابِ اٹھا دیا

کون کہہ سکتا ہے کہ پہلا شعر دوسرے شعر کو سامنے رکھ کر نہیں کہا گیا ہے، اکبر و ٹیگور کے بعد جا بجا کلامِ عزیز کا رنگ بھی جوش کے ہاں جھلکتا ہوا نظر آتا ہے، جوش صاحب کو حضرت عزیز سے نسبت تلمذ رہی ہے، لیکن افسوس ہے کہ ۳۰-۳۱ صفحے کے جس تفصیلی مقدمہ میں جوش صاحب کے ذاتی و خانہ دانی مناقب کا ایک ایک جزئیہ بیان کیا گیا ہے، اُس میں اس ”مشورہ سخن“ کے لئے ایک سطر سے زائد جگہ نہ نکل سکی، ان حضرات کے علاوہ کہیں

کہیں دوسرے شاعر دن سے بھی حضرت جوش کو حیرت انگیز قرار دے رہا ہے، مثلاً صفحہ ۴۸ پر جوش صاحب کا یہ شعر درج ہے،

میری دافنگی معاذ اللہ تم بھی آسے تو کچھ خبر نہوئی

ناظرین معارف کو یاد ہوگا کہ مئی ۱۹۴۷ء کے معارف میں ایک غزل اسی زمین میں شائع ہوئی تھی اسکا ایک شعر یہ تھا

اسقدر محویت معاذ اللہ اُنکے آئینکی بھی خبر نہوئی

ان چند اصلاح طلب پہلوؤں سے قطع نظر کر کے کتاب بحیثیت مجموعی نہایت قابل قدر ہے

اسکا وجود اردو لٹریچر میں ایک بیش بہا اضافہ ہے، جن لوگوں کو اعلیٰ لٹریچر، شاعری، یا فلسفہ تصوف کا کچھ بھی ذوق ہے، ان سب کی جانب سے کلام جوش کا پر جوش استقبال ہونا چاہیے گا، کاغذ، طباعت، وغیرہ محاسن ظاہری کے لحاظ سے بھی کتاب قابل قدر ہے، قیمت کتاب پر درج نہیں، غالباً غیر میں مصنف کے پاس سے طبع آباد کھنڈ کے پتہ سے ملے گی،

علوم القرآن، جناب مرزا سلطان احمد صاحب (پبلشر اکسٹرا سسٹنٹ ٹاکشنریجناب)

کا نام اردو خوان جماعت میں تعارف کا محتاج نہیں، وہ ایک مدت دراز سے جمہور کی علمی

خدمت انجام دے رہے ہیں، علاوہ وقتی مضامین کے وہ متعدد کتابوں کے مصنف بھی ہیں

علوم القرآن انکی ایک تازہ تصنیف ہے،

کتاب کا موضوع یہ ہے کہ قرآن مجید نے علم کو کس قدر عظمت بخشی ہے، اور جو علوم و فنون

اسوقت تک دریافت ہو چکے ہیں، انکی طرف کس قدر صاف اشارات و تلمیحات سے انسانوں کو

متوجہ کیا ہے، مصنف نے مقدمہ کے سات تبصروں میں مطلق علم اور قرآن مجید کے باہمی

تعلق پر مختلف پہلوؤں سے بحث کی، اور اسکے بعد ۳۳ علوم پر قرآن مجید کے اشارات

تعلیمات کی تفصیل کی ہے، اور بتایا ہے کہ ان علوم سے قرآن مجید کا کیا منشا ہے،  
 عربی زبان میں علامہ سیوطی نے اتقان میں قدیم علوم کو اور شیخ الاسلام قطنطنیہ نے  
 انقلاب و دستور کے بعد جدید علوم کو پیش نظر رکھ کر چند ابواب میں ایک رسالہ لکھا ہے، لیکن  
 مرزا صاحب جمہور (پبلک) کے شکریہ کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اس خاص بحث پر ۳۱  
 صفحوں کی ایک مستقل کتاب لکھ دی،

مرزا صاحب کے علمی خدمات کے اعتراف کے ساتھ ساتھ ہرچند باتیں بھی انکی  
 خدمت میں عرض کرنی ہیں، انکی تحریروں کے متعلق عام شکایت یہ ہے کہ وہ پیچیدہ ہوتی ہیں  
 دوسری شکایت یہ ہے کہ وہ سیدھی بات کو بھی فلسفہ و تقسیم کے چکر میں ڈال کر رائی سے پہاڑ  
 آباد دیتے ہیں، اور مصنف کے صفحے اُسکے نذر ہو جاتے ہیں، ہمیں خوشی ہے کہ اس کتاب میں  
 لوگوں کو اس قسم کی شکایتوں کے کم موقع ملیں گے،

دوسری بات یہ ہے کہ مصنف نے جو حدیثیں نقل کی ہیں، افسوس ہو کہ انکا اکثر حصہ  
 صحیح نہیں، مگر چونکہ وہ عوام میں مشہور ہیں اسلئے آجکل کی تحریروں میں وہ عام طور سے  
 مستعمل ہیں، مثلاً (۱) العلم علان، علم المعاملۃ و علم المکاشفۃ، (۲) العلم علان علم الابدان  
 و علم الادیان، (۳) اطلبوا العلم و لو کان بالصین، (۴) لا فرق بین الانسان و الحيوان  
 الا العلم، (۵) العالم کالذهب و المتعلم کالفضۃ و سائر الناس بالوصاص

ایک اور بات یہ عرض کرنی ہے کہ قرآن مجید کی آیتوں میں جہاں لفظ حکمتہ مذکور ہے  
 اسکو فلسفہ کا مرادف نہیں قرار دینا چاہیئے، نیز اور آیتوں میں جہاں خدا کے مختلف مظاہر  
 قدرت کا ذکر ہے، انکو خاص خاص علوم میں محدود کر کے دکھانا بھی ہمارے نزدیک صحیح نہیں،  
 مصنف نے اس تقریب سے کہ مسلمانوں نے قرآن مجید کی انہیں تعلیمات سے

متاثر ہو کر فلسفہ اور سائنس میں کس درجہ ترقی کی تھی، اور انھوں نے کس قدر تحقیقات اپنی یادگار چھوڑی ہیں، مسلمان فلسفیوں کے اور انکی تصنیفات کے نام لکھے ہیں، شاید یہ نام کسی انگریزی کتاب کو پیش نظر رکھ کر لکھے گئے ہیں، اسلئے ان میں کہیں کہیں غلطی پائی جاتی ہے ثابت بن قرۃ کو ثابت بن زرعہ لکھا گیا ہے (صفحہ ۳۲) اور پھر مسلمان فلسفیوں میں اُسکو دکمایا گیا ہے حالانکہ وہ مذہباً مسلمان نہ تھا، صابئی تھا، صفحہ ۳۵ میں ایک کا نام کتاب الانوار لکھا ہے، حالانکہ کتاب الانوار ہے، ابویوسف کندی کا مشہور نام یعقوب کندی ہے،

زبان کے معاملہ میں بھی مصنف نے ذرا تساہل سے کام لیا ہے، کئی جگہ مثلاً صفحہ ۳۵

۳۹ و ۴۰ و ۴۱ و ۹۱ ”طبیعیات“ لکھا ہے، حالانکہ یا طبیعیات یا طبیعیات لکھنا چاہیئے صفحہ ۵۸

میں عنوان ہے ”پھر کس دنیا سے اسلام بند کرتا ہے“ ”بند کرتا“ کے بجائے ”منع کرتا ہے“ یا روکتا ہے ”چاہیئے، فارسی اور اردو الفاظ کی یہ ترکیب ناپسندیدہ بلکہ غلط ہے، در بیان

رصد در زبان عربی اور سریانی ”در جوار بہا ثا“ رسالہ در فرائض اور سنن، در شمار بقراط

دن کے ”اتسام پھر دن میں“ وغیرہ، فلاسفی یا فلسفہ کی جگہ فلسفی کا استعمال قطعاً غلط ہے،

سبکو معلوم ہے کہ ہمارے مرزا صاحب فلسفی الطبع ہیں، اور فلسفہ اور شعر بہت کم کیجا

ہو سکتے ہیں، اسی لئے جہان جہان آپ نے کسی شعر کو اول بدل کر موقع و محل کے مناسب

بنانا چاہا ہے وہ قواعد فن سے آزاد ہو گیا ہے یا لفظ کی صحت مشتبہ ہو گئی ہے،

(۱) این قرۃ فال بنام قرآن نبردند

(۲) ز کفر عمل تو تار یک گشت روی زمین،

(۳) چہ دلا درست زاد کہ بدنیاسے دین فرد شد

(۴) قیمت غیرت چہ داند ہر کہ خود غیور نیست،



(۵) پڑھیں پھر ذکا و فہم پر اپنے،

حسب ذیل اشعار لفظ و معنی اور وزن سب میں صحت کے محتاج معلوم ہوتے ہیں،

(۱) ثبوتِ احدیت موجود ہی کثرتِ کثرت میں عیان ہے آشکارا ہی بزرگ بونہان ہو کر

(۲) کہیں پنہان بھٹائی کہ بنظری آید ہمہ چون لطف نمایان بنظری آید

(۳) چھوڑ بیٹھے فلسفہ قرآن مجید ہم سرسبز خاتمہ ہی فرضِ مسنت پر ہی اب قرآن کا

باجود ان نکتہ چینیوں کے ہم مصنف ممدوح کی محنتوں کے مستترف اور شکر گزار ہیں،

قرآن مجید کی جن آیتوں میں مناظرِ قدرت کا ذکر ہے، انکو ایک باب میں علحدہ علحدہ جن کر

جمع کرنا اور ان سب پر ترتیبی نظر ڈالنا، اور علمی حیثیت سے ان عجائباتِ قدرت کی تفصیل کرنا

اور ان سے علمی و اخلاقی نتائج پیدا کرنا بجا ضروری و مفید و کار آمد ہے، اور مصنف نے

اس فرض کو عمدگی کے ساتھ انجام دیا ہے، ہلو امید ہے کہ قرآن مجید کے شائقین کو یہ تحفہ

پسند آئے گا،

لکھائی چھپائی متوسط، ضخامت ۳۱۷، تقطیع ۲۰ × ۲۶، قیمت ۴۰، مصنف سے

کوٹھی الریاض لاہور سے ملے گی،

## مطبوعات جدید

شیخ حسن، مشرق کے ایک مغربی سیاح نے افسانہ کی صورت میں ارداح دروہانیات پر ایک رسالہ لکھا تھا، جناب مولوی سید ممتاز علی صاحب جو ہماری زبان کے پرانے محنون میں ہیں، شیخ حسن کے نام سے اسکا اردو ترجمہ کیا ہے، ترجمہ ردان اور صاف اور افسانہ دلچسپ ہے، ضخامت ۸۴، تقطیع بڑی، قیمت ۱۲ روپے، دفتر کبکشان لاہور،

حدیقۃ الوداد، ابوالاعجاز حکیم سید یوسف حسین صاحب رضوی اختر لکھنوی نے مختلف اسلامی فرقوں کی موجودہ نزاعات، اور خصوصاً فرقہ بوبہرہ کے متعلق گزشتہ سال جو تحریریں اخبارات میں چھپی تھیں انکی تشریح، اور علمائے دنیا کے بیان میں حدیقۃ الوداد کے نام سے یہ شتوی لکھی ہے قیمت معلوم نہیں، پتہ: عالم افروز پرنٹنگ پریس نمبر ۹، بمبئی،

ایشیا رحیم، مرزا سلطان احمد نیشنل کسٹراسسٹنٹ کمشنر نے اس نام سے حضرت امام حسین علیہ السلام کے واقعہ شہادت کے نتائج و بصائر پر ایک مفید رسالہ لکھا ہے، چوٹی تقطیع، ضخامت ۲۴، قیمت ۳ روپے،

روداد اجلاس منتم آل انڈیا مسلم لیڈر کا نفرنس، اپریل سنہ میں مجلس خواتین اسلام اگرہ میں منعقد ہوئی تھی، اسکی روداد ۲۴ صفحات میں چمکے شائع ہوئی ہے، اس میں اجلاس منتم کی عام اور معمولی کاروائیوں کی تفصیل کے علاوہ خواتین کی وہ تقریریں، انجیریں اور نظمیں بھی درج ہیں، جو جلسہ مذکور میں پڑھی گئیں، روداد میں منشی سید احمد صاحب ہتم صفیر فاطمہ نسوان اسکول اگرہ کا تاریخی مضمون اگرہ کی گزشتہ عورتوں کی تعلیم پر مرقفانہ ہے، مضمون نگار نے ۲۴ صفحہ کی ایک تعلیمی رپورٹ نقل کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ غدر سے پہلے صوبہ اگرہ کی مسلمان عورتوں میں اب تک کہیں زیادہ تعلیم تھی،

## مولانا سید سلیمان ندوی

رض القرآن جلد اول، قرآن مجید کے مخاطات کا خلاصہ اور اقوام قرآن میں سے عاوانو، جرہم، سبا، صحابہ کرام کی تاریخ مع نقشہ مقامات عرب قیمت ۱۰۰ عمار  
رض القرآن جلد دوم، اقوام قرآن میں سودین، صحابہ لایک، قوم ادب بنو نضیل، صحابہ لرس، اصحاب الجرح، بنو قیدار، انصار اور قریش کی تاریخ، اور عرب کی تجارت زبان اور مذہب تفصیلی مباحث صفحہ ۲۵۵ عمار  
لغات جدیدہ، چار ہزار جدید عربی الفاظ کی لکھنؤی شرح دروس الادب عربی کی پہلی ریڈر طبع سوم مع ترجمہ ۲۰  
دوسری ریڈر طبع دوم ۳۰  
رسالہ اہل السنۃ والجماعت فرقہ اہل السنۃ والجماعت کے اصولی عقائد کی تحقیق ۸

بہادر خواتین اسلام  
مولوی محمد یونس صاحب فرنگی محلی روح الاجتماع، موسیو سلیمان کی کتاب جامعہ انسانیت کے اصول نفسیہ کا اردو ترجمہ صفحہ ۱۲۲ عمار  
مولانا عبدالسلام ندوی

سیرۃ عمر بن عبدالعزیز یعنی اموی خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کی مفصل سوانح عمری اور اس کے عہد حکومت کا نام علمی مذہبی اور سیاسی کارناموں اور اس کے مجازاتہ اعمال کی تشریح و توضیح صفحہ ۱۹۰ قیمت ۱۰۰ عمار  
مولوی عبدالباری ندوی

برہکے اور اس کا فلسفہ مشہور فلاسفر برہکے کے حالات زندگی اور اس کے فلسفہ کی تشریح جلد عمار غیر جلد غیر مبادی علم انسانی، مادیت کی تردید میں برہکے کی مشہور کتاب نیلن کف ہین نلن کا کتاب نمبر اور سیرۃ ترجمہ جلد عمار

## مولوی عبدالماجد بی

فلسفہ اجتماع جماعات انسانی کا علم نفس عمر  
تاریخ اخلاق یورپ میں کی کارل ہنری آف بریک  
ترجمہ جلد اول قیمت ۱۰۰ عمار  
مکالمات برہکے برہکے کو دلا گس کا ترجمہ جلد اول غیر  
قسم دوم غیر  
پروفیسر سید نواب علی ایم اس

معارج الدین جدید علم کلام پر ایک متفقہ تصنیف اور فلسفہ جدید اور مذہب کی اپنی تطبیق پر بہترین تبصرہ عمار  
تاریخ صحف سماوی اتوارۃ نبیل اور قرآن مجید کی جمع و ترتیب کی تاریخ کا بابی مولانا اور مخالفین اسلام کے اعتراضات و بارہ جمع قرآن کا جواب نمبر اول ۱۰۰ عمار  
مولوی عبدالحق بی لے منصف لکھنؤ

اساس التعلیم فن تعلیم پر ایک فلسفیانہ تصنیف عمار  
منہجی انوار الحق صاحب ناظم تعلیمات جھویال  
حقائق اسلام، اسلامی مسائل کی فلسفیانہ عقلی تشریح عمار  
منشی محمد حمیدی صاحب سب مہتمم تاریخ جھویال  
انسان، علم و حاصل الاعضاء کے ابتدائی مسائل  
سلیس و عام فہم زبان میں قیمت ۱۰۰ عمار

تحفہ سائنس پروفیسر فیروز الدین مراد، ایم ایس کی سائنس فک مضامین کا مجموعہ قیمت ۱۰۰ عمار  
حکیم محمد ابراہیم صاحب شریف خانی  
معیار صحت، اس میں اصول حفظان صحت پر بحث کی گئی ہے، صفحہ ۲۰ عمار

ادیب النساء، عورتوں کی اخلاقی و معاشرتی تعلیم کا مصنوع ہے صفحہ ۵۵  
تذکرۃ الجہیب معنی بول صلحہ کی جامع و مختصر و فخری، عمار

تذکرۃ الجہیب معنی بول صلحہ کی جامع و مختصر و فخری، عمار

## مستدکرا

مولانا ابوالکلام آزاد اصرار کے خاندان کے بعض اکابر شیوخ کے سوانح و حالات مصنف، ۲۱ قسم دوم ہے

## ”یاد آتام“

از مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب  
اس میں گجرات کی اسلامی تاریخ کے مختلف پہلو دکھائے گئے ہیں وہاں کے امراء و وزراء و علماء اور شاخ کے حالات اور علوم و فنون کی ترقی غایت تاریخی تحقیق و تفصیل سے دکھائی گئی ہے صفحہ ۴۸۰ قیمت ۵۰

و موز فطرت طبیعات طبقات الارض ہیستاد حضرت  
طبعی کے ابتدائی مسائل عام فہم اور سلیس عبارت میں  
پروفیسر محمد سجاد مرزا بیگ دہلوی  
الاستدلال اس میں علم منطق کے مہول نہایت خوبی  
عمدگی کے ساتھ سلیس زبان اور سہل طریقہ کر بیان کیے  
کئے ہیں صفحہ ۱۰۰ قیمت ۵۰

الانسان اس میں انسان کے تمام قوار و نفسانی و جسمانی  
و جسمی و طبیعی کی علمی تشریح کی گئی ہے یہ کتاب مفید  
معارف کے لالہ مال ہے زبان سہل و درجہ چہ صفحہ ۱۰۰

## قواعد کثیت و المصنفین ترجمہ چار

۱۔ ہر شخص جو دار المصنفین کو ”الیکٹ“ ادا کرے گا وہ ”رکن“ و ”ا“ قرار دیا جائیگا، اور وقت رکیت کے دار المصنفین کی تمام مطبوعات ماہانہ و سالانہ اس کو ہدیہ دیکر دیا جائیگا،

۲۔ جو دار المصنفین کو مکتبہ سالانہ ادا کرے گا وہ ”اول رکن اعانت“ ہوگا اور ہر سال ہر رکن ایک سال کا ہر سالہ (معارف) اور سال کی تمام مطبوعات بلا قیمت نذر کرے گا،

۳۔ ہر سالانہ ادا کرے گا وہ ”دوم رکن اعانت“ ہوگا اس کو معارف بلا قیمت و دیگر مطبوعات نصف قیمت پر خریدائیگی

## معارف

۱۰۔ معارف کی سالانہ قیمت ۵۰ روپے اور قیمت فی پرچہ ۸

(۲) نمونہ کا پرچہ ۴ روپے دینا پڑے گا۔

۱۱۔ سالہ ہر ماہ کی ۲۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے اگر کسی صاحب کے پاس ۵۰ روپے یا ۵۰ روپے کے برابر نقد یا نقدی کے بدلے ہفتہ تک وہ اطلاع دین ورنہ بعد کو ۲۰ روپے پرچہ قیمت بھیجا جائیگا ہندوستان سے باہر کے خریدار دوسرے مہینہ کی آخر تاریخ تک مطلع کریں،

۱۲۔ جو دار المصنفین کی خط و کتابت میں اپنا نام تحریر کریں ورنہ میل میں قسط اور سب اوقات پہنچائی  
۱۳۔ قومی انجمنوں اور کتب خانوں سے اکثر مفت کی یا تحفہ قیمت کی درخواستیں آ رہی ہیں افسوس ہے کہ ان کی تعمیل کی قدرت نہیں رہ سکتی،

مولانا ندوی







